مضامین

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل

(اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو)

(جلد دوم)

یکے از مطبوعات شعبہ اشاعت لجنہ اماء اللہ ضلع کراچی بسلسلہ صد سالہ جشن تشکر

83/

مضامین

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل

(اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو)

جلد دوم

مرتبہ

امۃ الباری ناصر

یکے از مطبوعات

شعبہ اشاعت لجنہ اماء اللہ ضلع کراچی

بسلسلہ صد سالہ جشن تشکر

(احمدی احباب کی تعلیم و تربیت کے لئے)

نام کتاب	مضامین حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل
جلد	دوم
مرتبہ	امۃ الباری ناصر
پبلشر	لجنہ اماء اللہ ضلع کراچی
شمارہ نمبر	78
طبع	اوّل
تعداد	1000
کتابت	خالد محمود اعوان
پرنٹر	**پرنٹ گرافکس** ڈیزائنر اینڈ پرنٹرز

فون 0300-2560760, 0300-2260712

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ حال

اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے مضامین حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل ؓ کی دوسری جلد پیشِ خدمت ہے۔ یہ لجنہ اماء اللہ ضلع کراچی کی اشاعتی پیش کش ہے۔

حضرت اقدس مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے انفاسِ قدسیہ نے جو پیکر علم وعرفان تراشے وہ بجائے خود مینارۂ نور ہیں۔ آپ اللہ تعالیٰ سے بے قرار تڑپ کے ساتھ، کشتِ ایمان کی آبیاری کے لئے آسمانی تائید یافتہ معاونین کی دعا مانگتے تھے۔ حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل جیسے فنا فی اللہ نابغۂ روزگار قبولیتِ دعا کا ایک ثمر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اپنا چہرہ دکھلانے کے اپنے ہی انداز ہیں۔

حضرت اقدس مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) فرماتے ہیں۔

تیرے مُنہ کی بھوک نے مجھ کو کیا زیر و زبر
اے مرے فردوسِ اعلیٰ اب گرا مجھ پر ثمار
مجھ کو خود اُس نے دیا ہے چشمۂ توحید پاک
تا لگا دے از سرِنَو باغِ دیں میں لالہ زار

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ باغِ دیں کے ثمار اور لالہ زار کی ایک تصویر پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ اس دوسری جلد میں ہم حضرت میر صاحب کے قرآنِ پاک پر تدبر اور غور وفکر کے ساتھ ساتھ خالقِ قرآن مولا کریم کی طرف سے

نت نئے نکات سمجھنے اور سمجھانے کے انداز مشاہدہ کریں گے۔

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل کے رشحاتِ قلم کو سمیٹ کر اپنی بساط کے مطابق خوبصورتی سے پیش کرنے کی سعی بجائے خود بہت بڑی خوش نصیبی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری حقیر کوششوں کو قبول فرمائے اور ہمیں توفیق دے کہ ایک تیسری جلد میں حضرت میر صاحب کی باقی تصانیف اور بعد میں ملنے والے مضامین شامل کر کے پیش کر سکیں یہ وہ ورثۂ علم ہے جو آپ جماعت کے سپرد کر گئے تھے جماعت نے اسے سینے سے لگا کر رکھا ورنہ حوادثِ زمانہ باقی ہر قسم کے اثاثے کھا جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ حضرت میر صاحب کے ورثاء میں نسلاً بعد نسلٍ ان تحریرات کے جذبۂ صادق کے اثر سے حُسنِ تربیت کے پھل لگتے رہیں اور جس طرح آپ نے اپنے اندر صفاتِ الٰہیہ جذب کر لی تھیں آئندہ بھی ایسے خدا نما وجود جماعت کو عطا ہوتے رہیں۔ آمین۔

قارئین کرام کی طرف سے غلطیوں کی نشان دہی ہمیں اپنے کام کو بہتر بنانے میں مدد دے گی۔

خاکسار

امۃ الباری ناصر

مندرجات جلد دوم

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
	بابِ نہم	
	بعض مضامین کے متعلق قرآنِ مجید سے استدلال	
۱	دعویٰ با دلیل	۶۴۸
۲	نبی کا کام	۶۴۸
۳	دُنیا کیا ہے؟	۶۴۹
۴	خودکشی کی ممانعت	۶۵۰
۵	دہریوں کی نیکیاں مذہب کے طفیل	۶۵۰
۶	قرآن میں سب خوبیاں	۶۵۱
۷	الہام حقہ سے محرومی	۶۵۲
۸	دین میں جبر نہیں	۶۵۲
۹	عبد اور معبود کے فرائض	۶۵۳
۱۰	شرک کیوں نہیں بخشا جاتا	۶۵۳
۱۱	نشان پانے کے بعد گمراہی	۶۵۴
۱۲	خشیت پیدا کرنے والے اسوۂ حسنہ	۶۵۵
۱۳	فتح کے بعد صلح کی درخواست	۶۵۶
۱۴	نبی کے خواب کی تعبیر	۶۵۷
۱۵	قرآن کریم اور صحیفۂ فطرت	۶۵۸
۱۶	تقدیر معلق	۶۵۹
۱۷	اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام	۶۶۰
۱۸	نبی پر مسمریزم کا اثر	۶۶۱

باب دہم

سوالات کے جوابات

باب یاز دہم ـــــ شجرہ نسب اور برگ و بار

باب نہم

بعض مضامین کے متعلق قرآنِ مجید سے استدلال

اے عزیزو ! سنو کہ بے قرآن — حق کو ملتا نہیں کبھی انسان
اس لیے شوق سے اسے سیکھو — تا بنو تم مقربِ یزدان
میرے پیارو پڑھو اسے ہر روز — صبح دم اُٹھ کے بادلِ شادان
محض الفاظ میں بھی برکت ہے — پُر معانی سے آئے گا عرفان
ترجمہ اور حقیقت اور مطلب — دینِ اسلام کی یہی ہیں جان
جب تلک آئیں گے نہ سب معنی — مشکلیں ہوں گی کس طرح آسان
کام کرنے کے اور نہ کرنے کے — کیونکر معلوم ہوں گے میری جان
ہے ملاقات نصف یہ مکتوب — پورے کرتا ہے وصل کے ارمان
حُسن و احسان حضرت باری — آئینہ ان کا ہے فقط قرآن
عشق ہو گا بھلا کہاں پیدا — خوبیاں اُس کی گر رہیں پنہان
اپنے مالک کی یہ کتاب پڑھو — اُس کی مرضی کے ہو اگر جویان
عقل آتی ہے اس کے پڑھنے سے — علم بڑھتا ہے ہر گھڑی ہر آن
پاک کرتی ہے سب گناہوں سے — دُور کرتی ہے کفر اور عصیان
اس سے حیوان بن گئے انسان — اور انسان باخدا انسان
اس سے وابستہ ہے نجات و فلاح — منحصر اس پر جنت و رضوان
یارِ جانی کے مُنہ کی باتیں ہیں — ہجر کے درد کا ہیں یہ درمان
یا الٰہی ! بنا دے ہم سب کو — فضل سے اپنے ماہرِ قرآن
فیض سے اپنے خاص کر ہم کو — تا کہ ہم دوسروں کو دیں فیضان

آمین — (بخارِ دل صـــ ۱۳۸، ۱۳۹)

اکثر باتیں جو ہمارے سلسلہ کے عقائد میں داخل ہیں۔ ان کے
حوالے لوگوں کو یاد بلکہ ازبر ہیں۔ مثلاً ہر ملک اور قوم میں خدا کی طرف سے
رسول آیا۔ یہ سنتے ہی فوراً آیت

وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر: ۲۵)

ترجمہ: اور کوئی قوم ایسی نہیں جس میں (خدا کی طرف سے) کوئی ہوشیار کرنے والا نہ آیا ہو۔
ہر احمدی کے ذہن میں آ جاتی ہے۔ یا یہ بات کہ انسان کی پیدائش کی غرض
اللہ تعالیٰ نے کیا بیان فرمائی ہے فوراً

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذّٰریٰت: ۵۷)

ترجمہ: اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔
زبان سے نکل جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کے
علاوہ ہمارے اور بھی عقائد ہیں۔ مگر عام لوگوں کو ان کی بابت قرآنی حوالہ جات
یاد یا معلوم نہیں ہوتے اور وقت ضرورت تکلیف محسوس ہوتی ہے اس
لئے نمونہ کے طور پر چند حوالے عرض کر دیتا ہوں۔ مزید خود کوشش کر کے
نکال لیں۔ اور ایک نوٹ بک پر بطور یادداشت لکھ لیں۔

۱۔ دعویٰ با دلیل

قرآن جو صداقت پیش کرتا ہے، اس کے ساتھ عقلی دلیل بھی دیتا ہے۔ یہ بات کتب سابقہ میں نہ تھی۔ قرآن کریم میں آتا ہے

وَقَالُوا لَوْلَا يَأْتِينَا بِآيَةٍ مِّن رَّبِّهِ ۚ أَوَلَمْ تَأْتِهِم بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ (طٰهٰ: ۱۳۴)

ترجمہ: اور وہ کہتے ہیں کہ کیوں وہ ہمارے پاس اپنے رب کی طرف سے کوئی نشان نہیں لاتا۔ کیا اُن کے پاس ویسا نشان نہیں آیا جیسا کہ پہلی کتابوں میں بیان ہو چکا ہے۔

یعنی مخالف کہتے ہیں کہ کیوں نہیں یہ رسول کوئی نشانِ الٰہی ہمارے پاس لے کر آتا اُن کو جواب دے۔ کہ کیا یہ نشانِ صداقت کافی نہیں کہ جو کچھ پہلی کتب میں تھا۔ اب اس قرآن میں اس کی دلیل بھی ان کے پاس آگئی ہے یعنی پہلی کتب صرف احکام اور دعویٰ اور بیانِ صداقت پر کفایت کرتی تھیں۔ مگر قرآن ان پر دلائل بھی دیتا ہے۔ اسی طرح اور کئی جگہ آیاتِ بینات کا لفظ قرآن میں آیا ہے اور اس کے معنی ہی مدلل احکام اور مدلل نشاناتِ صداقت کے ہیں۔

۲۔ نبی کا کام

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے کیوں نمازیں نہیں پڑھاتے تھے۔ یا بعض بیٹھ کر دوسروں سے کیوں پڑھواتے تھے۔ سو یاد رکھنا

چاہئے کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر کام نبی ہی کیا کرے۔ یہ تو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہی ہر بات کا نمونہ کر کے دکھایا۔ ورنہ دراصل ضروری نہیں مثلاً بادشاہی نبی کا اصل کام نہیں۔ اسی طرح سپہ سالاری بھی۔ اِن

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

(آل عمران: ۱۶۵)

ترجمہ: اور اُن کے قرآن پڑھ کر سناتا ہے اور اُنھیں پاک کرتا ہے اور اُنھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے یقیناً اُن پر احسان کیا ہے اور وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی (کھلی) گمراہی میں (پڑے ہوئے) تھے۔

اصل کام نبی کا ہے۔ باقی کام دوسروں سے لے سکتا ہے۔ حوالہ ملاحظہ ہو جس میں طالوت کا قصہ ہے

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ

(البقرہ: ۲۴۸)

ترجمہ: اور اُن کے نبی نے اُن سے کہا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت (یعنی جدعون) کو بادشاہ بنا کر (اس کام کے لئے) کھڑا کیا ہے۔

یہاں نبی کے موجود ہوتے ہوئے بادشاہ اور سپہ سالار طالوت کو مقرر کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بعض دفعہ کافر شاعروں اور خطیبوں کے مقابلہ میں مسلمان شعراء اور خطباء کو کھڑا کر دیا کرتے تھے۔

۲۔ دُنیا کیا ہے؟

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ

وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ (آل عمران ۱۵)

ترجمہ۔ لوگوں کو (عام طور پر) پسند کی جانے والی چیزوں کی یعنی عورتوں اور بیٹوں اور سونے اور چاندی کے محفوظ خزانوں اور خوبصورت گھوڑوں اور مویشیوں اور کھیتی کی محبت اچھی شکل میں دکھائی گئی ہے۔

یہ ہے دُنیا۔ یعنی عورت، اولاد، مال، جانور اور زمین

۴۔ خودکشی کی ممانعت

خودکشی کی ممانعت احادیث میں ہے مگر قرآنِ کریم کی کون سی آیت اس سے منع کرتی ہے؟

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (النساء ۳۰)

یعنی اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ تو تم پر نہایت مہربان ہے پھر یہ باتیں، ناامیدی والی کیوں کرتے ہو۔

۵۔ دہریوں کی نیکیاں مذہب کے طفیل

دہریہ اور لامذہب لوگ بھی نیکی کرتے ہیں۔ اور پھر کہتے ہیں دیکھو ہم میں اور تم میں کیا عمل فرق ہے۔ ہم جواب دیتے ہیں کہ تمہاری نیکی بھی اہلِ مذاہب کی نقل ہے بھلا کوئی نئی نیکی تو اپنی دکھاؤ۔ جو مذہب نے نہ سکھائی ہو۔ بلکہ تم نے خود ایجاد کی ہو۔ بس یہیں وہ ساکت ہو جاتے ہیں۔ دہریہ بھی حلال و حرام اور رشتے ناتوں میں اہلِ مذاہب کے ہی پیچھے چلتے ہیں۔ بس ان کی سب نیکیاں دوسروں کے طفیل ہیں۔ حوالہ ۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ

فِي النَّاسِ (الانعام : ۱۲۳)

یعنی مومن کی کیا ہی شان ہے کہ مردہ تھا پھر ہم نے اس کو ہدایت دے کر زندہ کیا۔ اور اس کو ایک نور دیا۔ جس کو لے کر وہ مخلوقات میں پھرتا ہے اور اس کے نور سے اور لوگ بھی قدرتاً فائدہ اٹھاتے ہیں اور ٹھوکروں اور برائیوں سے بچتے ہیں۔ جیسا کہ کسی کے پاس رات کو لالٹین یا ٹارچ ہو تو اس کی روشنی سے دوسرے لوگ بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہی حال لامذہب انسان کا ہے۔ وہ اہلِ مذاہب خصوصاً مسلمانوں کی روشنی اور شریعت سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ مگر بے وقوفی سے انکار کرتا ہے اور نیکیوں کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ حالانکہ وہ اسلام سے آئی ہیں۔

۶۔ قرآن میں سب خوبیاں

قرآنِ مجید میں تمام کتبِ سابقہ کی خوبیاں جمع کر دی گئی ہیں

فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝ (البینۃ ۲۰)

ترجمہ: جن میں قائم رہنے والے احکام ہوں۔

اس میں سب سچی کتابیں داخل ہیں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ (الانعام ۹۲)

ترجمہ: اور یہ (قرآن) ایک عظیم الشان کتاب ہے جسے ہم نے اُتارا ہے (اور وہ) برکات کی جامع ہے۔

یعنی اس کتاب میں سب کتابوں کی خوبیاں جمع کر دی گئی ہیں بلکہ

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ (انعام ۶۰)

ترجمہ: اور نہ کوئی تر (چیز) ہے اور نہ خشک (چیز) جو اس کی (کھلی کھلی) حفاظت میں نہ ہو۔

سے تو استنباط ہوتا ہے کہ اس میں تازہ اور نئی صداقتیں بھی ہیں اور پرانی کتابوں کی سب صداقتیں بھی۔

۷۔ الہامِ حقّہ سے محرومی

مخالفینِ اسلام معارف اور آسمانی علوم اور الہامِ حقّہ سے محروم رہتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَاسۡتَکۡبَرُوۡا عَنۡهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمۡ اَبۡوَابُ السَّمَآءِ (اعراف ۴۱)

یعنی مکذب اور متکبر لوگوں پر آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔ مطلب یہ کہ آسمانی علوم اور الہامِ حقّہ سے وہ بے نصیب رہتے ہیں۔

۸۔ دین میں جبر نہیں

جبر دینِ اسلام بلکہ پہلے ادیان میں بھی نہ تھا۔

قَالَ اَوَ لَوۡ کُنَّا کٰرِهِیۡنَ (الاعراف ۸۹)

ترجمہ:۔ اس پر اُس نے کہا اگر ہم (اس فعل کو) ناپسند بھی کریں تو کیا پھر بھی (نکال دو گے)

یعنی صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی

لَاۤ اِکۡرَاهَ فِی الدِّیۡنِ (البقرہ ۲۵۷)

ترجمہ:۔ دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر (جائز) نہیں

نہیں فرماتے بلکہ بہت پہلے زمانہ کے ایک نبی حضرت شعیبؑ بھی یہ فرماتے ہیں کہ زبردستی مذہب نہیں بدلا جاتا۔

۹۔ عبد اور معبود کے فرائض

جس طرح مخلوق پر خدا کی عبادت فرض ہے۔ اسی طرح معبود کے لئے کلام کرنا اور مخلوق کی ہدایت کا انتظام کرنا فرض ہے۔

اَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّهٗ لَا یُکَلِّمُهُمۡ وَلَا یَهۡدِیۡهِمۡ سَبِیۡلًا ۘ

(الاعراف، ۱۴۹)

ترجمہ: کیا اُنھوں نے اتنا نہ سوچا کہ وہ نہ تو ان سے کوئی معقول بات کرتا ہے اور نہ اُنھیں کوئی ہدایت کا راستہ دکھاتا ہے۔

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے جو بچھڑا بطور معبود کے بنایا تھا۔ اس کے معبود نہ ہونے کے لئے یہی دلیل کافی تھی۔ کہ وہ نہ تو اپنے پرستاروں سے کلام کرتا تھا۔ نہ اس نے کوئی شریعت یا ہدایت ان کے لئے مقرر کی تھی۔

۱۰۔ شرک کیوں نہیں بخشا جاتا

ہر انسانی روح مکلّف ہے وجود باری اور توحید باری کے ماننے کی۔ یہ فطرتی مطالبہ ہے اور ضروری نہیں کہ اسے توحید کا معلم ہی ملے۔ تو وہ مکلّف سمجھی جائے باقی ہر مسئلہ کے لئے علم اور تبلیغ کا ہونا ضروری ہے۔ توحید کے لئے نہیں اس کا جوہر اور مکلّف ہونا خدا تعالےٰ نے انسان کے اندر ہی رکھ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرک بخشا نہیں جاتا۔ حتیٰ کہ یہ عذر بھی مقبول نہیں کہ ہمارے بزرگ اور ہمارے چاروں طرف سب مشرک ہی مشرک تھے۔ اور ہم نے کسی کو توحید پر عامل دیکھا ہی نہ تھا۔

وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّکَ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّیَّتَهُمۡ
وَاَشۡهَدَهُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ ؕ قَالُوۡا

بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۙ اَوْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ (الاعراف ۱۷۳،۱۷۲)

ترجمہ:۔ اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں میں سے اُن کی اولادوں کو لیا اور ان کو اپنی جانوں پر گواہ ٹھہرایا (اور پوچھا) کیا میں تمہارا رب نہیں؟ انہوں نے کہا، ہاں! ہاں! ہم (اس بات کی) گواہی دیتے ہیں (اور ہم نے یہ اس لئے کیا) کہ (ایسا نہ ہو کہ) تم قیامت کے دن کہہ دو کہ ہم تو اس (تعلیم) سے بالکل ناواقف تھے۔

یا یہ کہہ دو کہ (ہمارے زمانے سے پہلے صرف ہمارے باپ دادوں نے شرک کیا تھا۔ اور ہم ان کے بعد ایک کمزور نسل تھے کیا تو ہم کو ان لوگوں کے فعل کے بدلہ میں ہلاک کرے گا جو جھوٹے تھے۔

۱۱۔ نشان پانے کے بعد گمراہی

خود نشان پاکر بھی انسان گمراہ ہو سکتا ہے۔ جیسے بعض مرتدین اور عبدالحکیم۔ ان لوگوں نے باوجود خود ملہم ہونے کے آیات اللہ کی قدر نہ کی۔ یا ان کو معمولی سمجھا یا تکبر کیا کہ ہم کو بھی مامور یا اس کے خلیفہ کے مقابلہ میں یہ فضیلت حاصل ہے یا دنیا کو مقدم کر لیا۔ فرمایا۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْۤ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا

لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ

(الاعراف ۱۷۶،۱۷۷)

ترجمہ ۔ اور انہیں اس شخص کے حالات پڑھ کر سُنا جس کو ہم نے اپنے نشانات دیئے تھے پھر وہ اُن سے پھسل کر الگ ہو گیا تھا۔ پس شیطان اُس کے پیچھے چلا اور وہ گمراہوں میں جا شامل ہوا۔

اور اگر ہم چاہتے تو اسے ان (نشانوں) کے ذریعہ سے اونچا کر دیتے لیکن وہ زمین کی طرف جا گرا۔ اور اپنی خواہشات کے پیچھے چل پڑا۔

۱۲۔ خشیت پیدا کرنے والے اسماء الحسنہ

بعض لوگ ہمیشہ خدا کے رحم اس کی مغفرت، کرم ستاری اور عفو ہی کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس یکطرفہ بیان سے ان کو اور سُننے والوں کو نافرمانی اور گناہوں پر جرأت ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی دوسری صفات کو چھپانے کے باعث ہلاک ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ قہار منتقم اور ذو عقاب الیم بھی ہے۔ پس سیدھا راستہ صفاتِ الٰہی کے بیان کا اختیار کرو اور اس آیت کے معنوں پر غور کرو۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْۤ اَسْمَآىِٕهٖ ؕ (الاعراف ۱۸۱)

ترجمہ ۔ اور اللہ کی بہت سی اچھی صفات ہیں۔ پس تم ان کے ذریعہ سے اس سے دُعائیں کیا کرو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کی صفات کے بارہ میں غلط راہ خیال چلاتیں کرتے ہیں۔

۱۳۔ فتح کے بعد صلح کی درخواست

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف کبھی جنگوں میں ابتدا نہیں کی۔ بلکہ جنگ کے بعد بھی نوٹس دیا کہ اگر تم لڑائی بند کر دو تو اچھا ہے کیونکہ ہم ہرگز لڑنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ فتح بدر کے بعد ہی یہ نوٹس کفار کو مل گیا تھا۔

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ (انفال ۲۰)

ترجمہ: (اے کفارِ مکہ) اگر تم فتح کا نشان مانگتے تھے تو تو تمہارے پاس فتح آگئی اور اگر اب بھی تم باز آ جاؤ تو یقیناً یہ تمہارے لئے اچھا ہوگا۔ اور اگر تم (شرارت کی طرف) لوٹو تو ہم بھی (سزا کی طرف) لوٹیں گے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ (الانفال ۳۹)

ترجمہ: تو کافروں سے کہہ دے کہ اگر وہ باز آجائیں، تو جو (قصور) ان سے پہلے ہو چکا ہے انھیں معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہ پھر (انہی کرتوتوں کی طرف) لوٹیں گے تو پہلے لوگوں کی (جو) سنت گذر چکی ہے (وہی ان سے معاملہ ہوگا)

یعنی اے کافرو اگر تم فتح ہی کا انتظار کرتے تھے۔ تو وہ تو تم نے دیکھ لی۔ اگر تم باز رہتے تو اچھا تھا۔ لیکن اگر تم پھر جنگ کرو گے تو ہم کو بھی مجبوراً کرنی پڑے گی۔ اور ان کافروں سے کہہ دو۔ کہ اگر یہ اب بھی باز آجائیں۔ تو ہم اُن کے پہلے مظالم معاف کر دیں گے۔ لیکن اگر یہ باز نہ آئے تو پھر یاد رکھیں۔ ان کا بھی وہی حشر ہوگا۔ جو ان سے

پہلے لوگوں کا ہوا۔

ان آیات سے صریح طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف ابتداء نہیں کی۔ بلکہ بعد میں بھی لڑنے سے پرہیز کرنا چاہا۔ اور کفار سے کہتے رہے کہ لڑائی بند کرو۔ خود کلام الٰہی ہی اس بات کو بتصریح رد کرتا ہے جس کا الزام مخالف قومیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر لگاتی ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر فرمایا ہے کہ

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الانفال ۶۲)

ترجمہ۔ اور اگر تمہاری تیاریوں کو دیکھ کر) وہ (کافر) صلح کی طرف مائل ہوں تو (اے رسول!) تو بھی رسول کی طرف مائل ہو۔

یعنی اب بھی اگر ذرا صلح کی طرف یہ کافر لوگ مائل ہوں۔ تو اے محمدؐ تو فوراً صلح کے لئے جھک جا۔

اس سے ظاہر ہے کہ ہر ممکن کوشش صلح کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی۔ اور جب کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ تب جا کر تلوار اٹھائی۔ فتح کے بعد صلح کی درخواست کرنا یہ اسلام ہی کی شان ہے۔

یاد رکھو کہ " دفاعی جنگ " کی اصطلاح بھی قرآنی اصطلاح ہی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (الحج ۳۹)

ترجمہ۔ اللہ یقیناً ان لوگوں کی طرف سے جو کہ ایمان لائے ہیں دفاع کرتا رہے گا۔

۱۴۔ نبی کے خواب کی تعبیر

مشہور ہے اور بالکل سچ ہے۔ کہ انبیاء کے خواب وحی ہوتے ہیں۔ مگر بعض لوگوں کو اس سے یہ غلطی لگی ہے۔ کہ وہ بعینہٖ اپنے ظاہر پر پورے ہوتے ہیں۔ حالانکہ اصل مطلب یہ ہے کہ انبیاء کے رویا گو ہمیشہ وحی کی مانند سچے ہوتے ہیں۔ مگر ان کی تعبیر

بھی ہوتی ہے۔ اور وہ ظاہر سے مختلف بھی ہوتے ہیں چنانچہ قرآن مجید نے فرمایا ہے

إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا (الانفال ۴۴)

ترجمہ: (یہ واقعہ اس وقت کا ہے) جبکہ اللہ نے تیری خواب میں تجھے اُنہیں کم کر کے دکھایا تھا۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دشمنوں کی تعداد تھوڑی دکھائی۔ اس لئے کہ اگر اصل تعداد دکھا دیتا تو بعض لوگ ڈر جاتے۔ اور جنگ کے لئے باہر نکلنے سے کتراتے۔

۱۵۔ قرآن کریم اور صحیفۂ فطرت

خدا کا کام اور خدا کا کلام ہمیشہ ایک دوسرے کے مطابق اور موافق ہوتے ہیں۔ اگر کوئی الٰہی کلام خدا کے کام سے مخالف ثابت ہو تو وہ حقیقتاً الٰہی کلام نہ ہوگا۔ بلکہ کلام الٰہی الٰہی کام کی اور الٰہی کام۔ کلام الٰہی کی تفصیل بیان کرنے میں مدد دیتا ہے کیونکہ دونوں کا منبع ایک ہی ہے۔ اس مضمون کو ذیل کی آیت بیان کرتی ہے۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس ۳۸)

ترجمہ: اور اس قرآن کا اللہ کے سوا (کسی اور) کی طرف سے جھوٹے طور پر بنایا جانا (ممکن ہی) نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ (تو) اس (کلام الٰہی) کی تصدیق (کرتا) ہے جو اس سے پہلے (موجود) ہے اور کتاب الٰہی میں جو کچھ پایا جانا چاہیئے اس کی تفصیل (بیان کرتا ہے اور) اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ تمام جہانوں کے رب کی طرف سے ہے۔

یعنی یہ قرآن خدا کے سوا کسی دوسرے کا کلام نہیں ہے۔ بلکہ اس کی وجہ سے تمام پہلی کتابیں سچی ٹھہرتی ہیں۔ نیز یہ تفصیل کرنے والا ہے۔ اس کتاب کی جس کے رب العالمین کی طرف سے ہونے میں کسی کو بھی شک نہیں ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ایسی کتاب جس کے خدا کی طرف سے ہونے میں کسی کو بھی شک نہ ہو۔ اور جس کی تفصیل خود قرآن ہو۔ وہ صرف صحیفۂ نیچر ہے اور کوئی نہیں۔ دوسری سب کتب الٰہیہ کا ذکر تو اس آیت کے پہلے حصّہ میں ہو چکا بس معلوم ہوا کہ قرآن کے نزدیک بھی اس کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ وہ صحیفۂ فطرت کے عین مطابق ہے۔ بلکہ اُسی کی تفصیل ہے۔

نیز واضح ہو کہ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ کا فقرہ یا تو قرآن کے لئے آسکتا ہے۔ یا صحیفۂ نیچر کے لئے۔ صحیفۂ نیچر کے لئے اس لئے کہ دُنیا کی کوئی قدرتی چیز ایسی نہیں جسے انسان بنا سکے۔ لہٰذا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ بلاشُبہ خدا نے ہی قدرتی اشیاء کو بنایا اور یہی دعوے اپنی نسبت قرآن مجید نے کیا یعنی

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (البقرہ:۲)

ترجمہ۔ وہی کامل کتاب ہے۔ اس (امر) میں کوئی شک نہیں۔

اس لئے کہ اس نے بھی تمام دُنیا کو چیلنج دیا۔ کہ اگر یہ خدا کا کلام نہیں ہے تو کوئی اس کی مثل بنا کر دکھائے اور چونکہ کوئی نہیں لا سکا۔ اس لئے یہ بھی بلاشُبہ خدا کا کلام ٹھہرا۔ آیتِ مذکورہ میں کتاب کے لفظ سے خود قرآن مراد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ اپنے تئیں اس کتاب کی تفصیل کہتا ہے۔ جو قرآن سے الگ ایک چیز ہے۔

۱۶۔ تقدیرِ معلّق

تقدیرِ معلّق کے متعلق ہمارے احباب کو بہت کچھ واقفیت ہے۔ یعنی ایک امر

مقدر ہو جاتا ہے۔ پھر خدا تعالیٰ کسی کی آہ و زاری یا اور مصالح سے اس تقدیر کو بدل دیتا ہے۔ اس کے متعلق قرآن کریم میں بہت سی آیات ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ایک جگہ اپنی یہ صفت ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ (یوسف ۲۲)

ترجمہ:۔ اور اللہ اپنی بات (کو پورا کرنے) پر (کامل) اقتدار رکھتا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ ایک حکم دیتا ہے مگر پھر اس کا ہی نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اپنے حکم اور تقدیر پر پھر بھی اس کا مالکانہ تصرف باقی رہتا ہے۔ جب چاہے اپنے حکم کو بھی توڑ ڈالے اور اپنے حکم کے منسوخ کرنے کا نام تقدیر معلق ہے۔

۱۷۔ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام

اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام سوائے اسلام کے کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا۔ ہر زبان اور مذہب میں صفاتی نام تو ہیں لیکن ذاتی نام ندارد ہمارے اس بات کا حوالہ قرآن مجید میں بھی موجود ہے

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا فَاعْبُدْہُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِہٖ ھَلْ تَعْلَمُ لَہٗ سَمِیًّا (مریم ۶۶)

یعنی اللہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سب کا رب ہے پس تو اسی کی عبادت کر اور اس پر جا رہ۔ کیا کسی مذہب میں بھی اس کا کوئی ہم نام جانتا ہے؟ حقیقت یہی ہے کہ کسی مذہب میں اللہ تعالیٰ کا خاص نام یعنی اسم ذاتی موجود نہیں ہے سوائے اسلام کے۔ دیگر مذاہب میں صفات وجود تو پایا جاتا

۱۸۔ نبی پر مسمریزم کا اثر

نبی پر توجہ یعنی مسمریزم کا اثر ہوتا ہے۔ گو اللہ تعالیٰ اُسے اپنی تسلّی و وحی اور نُصرت کے ذریعہ سے دُور کر دیتا ہے۔ مگر یہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ اصُول کے طور پر مانا جائے کہ نبی اس اثر سے بالکل بچا رہتا ہے۔ یہ درست ہے۔ کہ کوئی نبی انفرادی طور پر کسی وقت بالکل اثر قبول نہ کرے مگر

فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ (طٰهٰ : ٦٧)

ترجمہ۔ کہ تم (اپنی تدبیر) پھینکو (یعنی ظاہر کرو) پس (انھوں نے جو تدبیر کی) اس کے نتیجہ میں ان کی رسّیاں اور سونٹے موسیٰ کو (ان کے فریب کی وجہ سے) یوں نظر آئے گویا کہ وہ دوڑ رہے ہیں۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کچھ اثر ضرور محسوس کیا تھا اور اسی مسمریزم کو جسے آج کل ماس MASS مسمریزم کہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی حصہ لیا تھا۔ گو بعد میں خدا تعالیٰ نے بطور معجزہ ان کی توجہ سے سب کا سحر فنا کروا دیا۔

۱۹۔ غذا کا اثر اخلاق اور اعمال پر

غذاؤں کا اثر ضرور انسان کے اخلاق اور اعمال پر ہوتا ہے۔ اس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا (المؤمنون: ۵۲)

یعنی اے رسولو! تم پاک اور طیب اشیاء کھاتے جاؤ اور اس کے نتیجہ میں نیک عمل کئے جاؤ۔

۲۰۔ رحم کی بے مثال تعلیم

اسلامی رحم کے نمونے قرآن نے ایسے بیان کئے ہیں کہ نہ مسیحیت دکھا سکی نہ کوئی اور مذہب۔ حوالہ کے طور پر ملاحظہ ہو۔

وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ (النور: ۲۳)

ترجمہ:۔ اور تم میں سے (دین و دُنیا میں) فضیلت رکھنے والے اور کشائش رکھنے والے لوگ قسم نہ کھائیں کہ اپنے رشتہ داروں اور مسکینوں اور اللہ کے راستہ میں ہجرت کرنے والوں کی مدد نہ کریں گے اور چاہیئے کہ وہ عفو سے کام لیں اور درگذر کریں کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمھارے قصور معاف کرے۔ اور اللہ بہت معاف کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

یہ آیت مسطح کے لئے ہے۔ جو حضرت عائشہؓ والے بہتان میں شریک تھا۔ اس وجہ سے حضرت ابوبکرؓ نے اس کے ساتھ سلوک کرنا بند کر دیا تھا مگر قرآن کریم میں حکم نازل ہوا۔ کہ اگر خدا کی مغفرت چاہتے ہو۔ تو اسے معاف کر دو۔ اور اس کا وظیفہ پھر لگا دو۔ غرض کہ اسلام بیٹی اور بیوی پر زنا کا جھوٹا الزام لگانے والے کے ساتھ تعلق مروّت بند کرنے کو بھی منع کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا رحم کی تعلیم کوئی مسیحی یا کسی اور مذہب والا دکھا سکتا ہے۔ ان کے ہاں کچھ نقلی تعلیم شاید ہو بھی۔ مگر یہاں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ نے اس پر عمل کر کے دکھا بھی دیا۔

۲۱ اچھا کھانا کھانا اور بازاروں میں پھرنا

اچھا کھانا کھا لینے اور بازاروں میں پھرنے کا ذکر قرآن میں بھی ہے۔ وہاں بھی معترضین نے کہا تھا۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ (الفرقان ۸)

یہ کیسا رسول ہے کہ پاکیزہ کھانے کھاتا ہے اور بازاروں میں پھرتا ہے مگر ساتھ ہی جواب بھی دے دیا ہے کہ

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ (الفرقان ۲۰)

ترجمہ:۔ اور تجھ سے پہلے ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے تھے، وہ سب کے سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے تھے۔

یعنی سب نبی یہ کام کرتے آئے ہیں۔ اندھا مخالف یہ نہیں دیکھتا کہ کیا نبی اور خلیفہ اپنے فرائض ادا کرتا ہے یا نہیں۔ اس طرف سے تو وہ نظر ہٹا لیتے ہیں۔ ہاں یہ دیکھتے ہیں۔ کہ وہ کھاتا پیتا۔ بیوی بچوں مکان والا کیوں ہے۔

۲۲۔ اسلام میں اعلیٰ صداقتیں

دیگر مذاہب میں جو اعلیٰ باتیں ہیں۔ ان سے زیادہ عمدہ اور لطیف پیرایہ میں وہی باتیں قرآن میں موجود ہیں۔ اس کے لئے دیکھو سورۃ فرقان

وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا (الفرقان ۳۴)

ترجمہ:۔ اور (تیری تردید کے لئے) وہ کوئی بات نہیں کہتے کہ ہم اس کے جواب میں ایک پختہ بات بیان نہیں کر دیتے اور اس کی اچھے سے اچھی توجیہ نہیں کر دیتے۔

یعنی مخالف کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ صداقت پیش نہیں کرتے۔ مگر ہم نے پہلے ہی تجھے وہ صداقت دے رکھی ہے بلکہ ہمارا بیان اس کی بابت ان کے بیان سے بہت بہتر ہے۔

۲۳۔ نفع مند چیز ہی قائم رکھی جاتی ہے

ڈارون نے مسئلہ ارتقاء میں جو اصول بیان کئے ہیں۔ ان میں ایک اصول SURVIVAL OF THE FITTEST کا بھی ہے۔ یعنی زندہ مخلوقات میں سے وہی مخلوق دُنیا میں بقائے دوام حاصل کرتی ہے جو اپنے اندر زندہ رہنے کی قابلیت رکھتی ہے۔ یہ فقرہ نوجوان سائنسدان طبقہ کے زبان پر بہت چڑھا ہوا ہے اور وہ اسے علم کی جان سمجھتے ہیں۔ اور بعض دفعہ کہہ بھی دیتے ہیں کہ کیا قرآن میں بھی اس مضمون کا حامل یا ہم معنیٰ کوئی فقرہ ہے۔ میں ان کو سنا دیتا ہوں کہ ہاں ہے۔ اور اس سے بہتر یعنی

وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ۔ (رعد: ۱۰)

مطلب یہ کہ جو چیز انسانوں کے لئے سب سے زیادہ نفع رساں ہوتی ہے وہی زمین میں باقی رکھی جاتی ہے۔ ورنہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ مقولہ ڈارون کے مقولہ سے زیادہ فلسفیانہ ہے۔ کیونکہ تمام مخلوقات اس زمین کی انسان ہی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ قرآنی مسئلہ میں ہر چیز کی بقا کے پیچھے ایک ارادہ پایا جاتا ہے مگر ڈارون کے ہاں ایسا نہیں۔ وہ بقائے اَصْلَحْ کا مدعی ہے اور قرآن بقائے اَنْفَعْ کا۔

جاتا توبہ کے پہلے مفہوم کو ادا نہیں کرتا۔ اس کے لئے حوالہ یہ ہے۔

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللّٰهِ مَتَابًا (الفرقان، ۷۲)

ترجمہ:۔ اور جو توبہ کرے اور اس کے مطابق عمل کرے، تو وہ شخص حقیقی طور پر اللہ کی طرف جھکتا ہے۔

یعنی جو کوئی گناہ سے منہ موڑ لے۔ اور مزید برآں عمل صالحہ بھی کرے۔ تب وہ توبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصل توبہ ہے

۲۵ پیشگوئیوں میں اخفا کا پہلو

نشانات اور پیشگوئیوں میں ایک پہلو اخفاء کا بھی ہوتا ہے۔ جس کا علم خدا ہی کو ہوتا ہے۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے کئی جگہ فرمایا ہے۔ قرآن مجید میں اس کو اس آیت میں ظاہر کیا گیا ہے۔

قَالَ أَكَذَّبْتُمْ بِآيَاتِي وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا (النمل، ۸۵)

ترجمہ:۔ وہ ان سے کہے گا۔ کیا تم نے میرے نشانات کا اس کے باوجود انکار کیا تھا کہ تم نے علم کے ذریعہ سے ان کی پوری واقفیت حاصل نہیں کی تھی۔

یعنی خدا کفار سے کہے گا۔ کہ میں نے اپنے نشان دکھائے مگر تم نے ان کی تکذیب کی۔ صرف اس وجہ سے کہ کچھ حصہ ان کا تمہاری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ مثلاً دو سو نشانات میں سے تین چار سمجھ میں نہ آئے۔ تو تم منکر ہو گئے!!

۲۶۔ امی کے معنی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن میں بعض جگہ اُمّی کہا گیا ہے۔ ایک اور جگہ جا کر اُمّی کے معنی خود قرآنِ مجید نے بیان کر دیئے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ (العنکبوت: ۴۹)

ترجمہ: اور اس (قرآن) کے نازل ہونے سے پہلے تُو کوئی کتاب نہ پڑھتا تھا نہ لوگوں کو سناتا تھا اور نہ اُسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا۔

یعنی جو پڑھنا لکھنا نہ جانتا ہو۔ تعجب ہے۔ کہ بعض لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھے لکھے تھے۔ اور امی کے معنے اس کے مخالف کرتے ہیں۔

۲۷۔ چندے کیوں دیں

اگر خدائی سلسلہ ہے۔ تو ہم چندے کیوں دیں۔ خدا خود بندوبست ان کارکنوں کی پرورش۔ اور بجٹ پورے کرنے کا سامان کرے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ (یٰسٓ: ۴۸)

ترجمہ: اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ تم کو خدا نے دیا ہے اس سے خرچ کرو۔ تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ان کو کھلائیں جن کو اگر اللہ چاہتا تو آپ ہی کھلا سکتا تھا۔

۲۸- عمر میں کمی بیشی

مسلمانوں میں مشہور ہے کہ عمر مقرر ہوتی ہے۔ ایک ساعت کم و بیش نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ قرآن مجید عمر کی کمی بیشی کا قائل ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا
فِيْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (فاطر ۱۲)

ترجمہ: اللہ نہ کوئی بڑی عمر والا بڑی عمر پاتا ہے اور نہ کسی کی عمر میں کوئی کمی کی جاتی ہے۔ مگر وہ ایک قانون کے مطابق ہے۔ یہ بات اللہ کے لئے بالکل آسان ہے۔

یعنی عمر کا معاملہ تقدیر معلق ہے۔ زیادہ بھی ہوتی ہے۔ کم بھی ہو جاتی ہے۔ اور یہ خدا کی آسان تبدیلیوں میں سے ہے۔ مشکل اور مبرم باتوں میں سے یہ بات نہیں ہے۔

۲۹۔ ذبیح اللہ کون ہے

عیسائی اور یہودی تو حضرت اسحاقؑ کو ذبیح کہتے ہی تھے۔ مگر بعض مسلمان بھی اُن کی نقل کرنے لگے۔ حالانکہ قرآن سے حضرت اسماعیلؑ کا ذبیح ہونا ثابت ہوتا ہے سورۃ صافات میں ذبیح لڑکے کا قصہ مفصل بیان کر کے قرآن مجید فرماتا ہے

وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (الصّٰفّٰت ۱۱۲)

ترجمہ: اور ہم نے اُسے اسحاق کی بھی خبر دی تھی جو نبی تھا اور صالحین میں سے تھا۔

یعنی یہ اسماعیلؑ کا قصہ تھا۔ اس کی جزا میں ہم نے اسحاقؑ کی پیدائش کی بشارت ابراہیم کو دی۔ پس ظاہر ہے کہ حضرت اسحاقؑ ذبیح نہ تھے بلکہ ذبیح دوسرا لڑکا تھا اور حضرت ابراہیمؑ کے اس فعل پر خوشنودی کی جزا میں حضرت اسحاقؑ کی بشارت ملی تھی۔

۳۰۔ طین لازب

سائنس دان اس امر پر متفق ہیں کہ دُنیا میں حیات اور زندگی پہلے پہل مادہ کی اس حالت میں پیدا ہوئی ہے کولائڈ COLLOID کہتے ہیں۔ یہ لفظ گویا ترجمہ ہے طین لازب کا۔

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ (الصّٰفّٰت ۱۲)

ترجمہ: ہم نے اُن کو ایک چپکنے والی مٹی سے بنایا ہے۔

اسی طرح حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (الحجر ۲۹)

ترجمہ: یعنی سیاہ گارے سے جس کی ہیئت تبدیل ہو چکی ہو۔

کے بھی یہی معنی ہیں۔

۳۱۔ نیا آسمان اور نئی زمین پیدا کرنا

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (المؤمن ۵۸)

ترجمہ: آسمانوں اور زمین کی پیدائش انسانوں کی پیدائش سے بڑا کام ہے۔ مگر اکثر انسان جانتے نہیں۔

یہاں خلق ناس سے خلق دجال اکثر تفاسیر نے مراد لیا ہے بلکہ خود حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے بھی ایسا لکھا ہے۔ مگر ساری آیت ہی اس زمانہ کے متعلق سمجھی جائے تو مطلب بالکل مکمل ہو جاتا ہے اور ترجمہ پھر یوں ہوگا کہ مسیح موعود کا نئے آسمان اور نئی زمین کو پیدا کرنا دجال کے خلق سے بہت زیادہ عظیم الشان کام ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے۔

کوئی وجہ نہیں کہ اس حوالہ کو حضرت مسیح موعود کے کشف بابت خلق نیا آسمان اور نئی زمین کے نہ لیا جائے جبکہ اس کا پچھلا حصہ دجال کے متعلق مانا جاتا ہے ۔

۲۲ ۔ انسانی فطرت ایک خدا چاہتی ہے

انسان کی فطرت ایک خدا کو چاہتی ہے ۔ اس کے وجود کی متقاضی ہے ۔ اُسے مانگتی ہے اور اسی کی محتاج ہے ۔ پھر زبانی لفاظی سے اُسے رد کرنا فضول ہے ۔ سارا جہاں اُسے دل کی گہرائیوں سے مانتا ہے ۔ کیونکہ اس کی ضرورت کو بشدت محسوس کرتا ہے پھر چند لوگوں کے زبانی انکار سے کیا ہوتا ہے ۔ یہ دلیل قرآن مجید نے ان الفاظ میں دی ہے

وَالَّذِيْنَ يُحَاجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ
حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ
وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ (الشوریٰ ۱۷)

ترجمہ ۔ اور وہ لوگ جو اللہ کے بارہ میں بحثیں کرتے ہیں جبکہ (لوگوں کی ایک بڑی تعداد) اس کی آواز کو قبول کر چکی ہے ان کی دلیل اُن کے رب کے حضور توڑی جانے والی ہے اُن پر غضب نازل ہوگا اور اُن کے لئے سخت عذاب (مقدر) ہے ۔

یعنی خدا تعالیٰ کی قبولیت انسان کی فطرت میں موجود ہے اور فطرتِ انسانی نے اُسے قبول کر لیا ہے ۔ پھر اس کے بعد خدا کے وجود کی بابت بحث مباحثہ کرنا ہی فضول ہے کیونکہ یہ بحث ہی باطل ہوگی ۔ فطرت کی بھوک اور اس کے شدید تقاضے کو کون مٹا سکتا ہے اور یہی خدا کے وجود پر ایک زبردست دلیل ہے ۔

۲۳ انفلوئنزا کے متعلق پیشگوئی

سورۃ الرحمٰن میں جہاں اور پیشگوئیاں اس زمانے کی ہیں۔ وہاں جنگِ عظیم اور انفلوئنزا کی بھی پیشگوئیاں ایک ہی آیت کے اندر موجود ہیں۔

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ (الرحمٰن: ۳۶)

ترجمہ۔ تم پر آگ کا ایک شعلہ گرایا جائے گا اور تانبا بھی (گرایا جائے گا) پس تم دونوں ہرگز غالب نہیں آ سکتے۔

یعنی بھیجے جائیں گے تم پر شعلے آگ کے۔ اور دُھواں۔ ایسا کہ تم ان کا تدارک نہیں کر سکو گے۔ حدیث میں بھی انفلوئنزا کو دُھواں کہا گیا ہے

۲۴۔ سچی وحی

حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے کئی جگہ لکھا ہے۔ کہ سچی وحی جو واقعی خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ وہ صاحبِ وحی کے دل میں میخِ فولاد کی طرح داخل ہو جاتی ہے قرآنِ مجید میں اس کا حوالہ یہ ہے۔

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (البقرہ: ۹۸)

ترجمہ۔ اس نے تیرے دل پر اللہ کے حکم سے اِس (کتاب) کو اُتارا ہے جو اس (کلام) کو جو اس سے پہلے موجود ہے۔

یعنی اگرچہ وحی الٰہی الفاظ میں ہوتی ہے اور نبی ان الفاظ کو سنتا اور دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ وہ دل میں بھی داخل ہوتی ہے۔ برخلاف شیطانی وحی کے کہ وہ کمزور اور صرف لفظ ہی لفظ ہوتے ہیں۔ دل کے اندر نہیں گڑ جاتی۔

۳۵۔ دفاعی جنگیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگیں دفاعی جنگیں تھیں۔ اور آپ نے پہل نہیں کی تھی۔ اس کو قرآن نے نہایت صاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ
الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ (توبہ ۱۳)

ترجمہ:۔ (اے مومنو!) کیا تم اس قوم سے نہیں لڑو گے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ دیں
اور رسول کو (اس کے گھر سے) نکالنے کا فیصلہ کر لیا اور تم سے (جنگ
چھیڑنے میں) انہوں نے (ہی) ابتداء کی

یعنی تین باتیں کفار نے کی ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت ملی ہے۔
اوّل انہوں نے معاہدات توڑ دیئے۔ دوسرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وطن سے بے وطن کیا۔ تیسرے لڑائی کی ابتدا انہوں نے ہی کی مسلمانوں نے نہیں کی۔ غرض جنگ بہ مجبوری ان وجوہات کے باعث پیش آئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود مکہ سے نہیں نکلے تھے۔ بلکہ کافروں نے حضور کو نکال دیا تھا۔ جیسا کہ فرمایا۔

اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (التوبہ ۴۰)

ترجمہ:۔ اللہ اس کی اس وقت بھی مدد کر چکا ہے۔

یعنی اس نبی کو مکہ سے کافروں نے نکالا ہے۔ یہ خود نہیں نکلا۔

۳۶۔ منافق عورتیں

سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقوں کی جماعت میں عورتیں بھی برابر کی شریک ہوا کرتی تھیں۔ اسلئے عورتوں پر بھی ویسی ہی نگاہ رکھنی چاہیئے جیسی مردوں پر

۲۷۔ طوفانِ نوح میں کون غرق ہوئے

حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں ساری دُنیا غرقِ طوفان نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ صرف حضرت نوحؑ کی قوم کے کفار۔ کیونکہ قرآن نے کہیں نہیں فرمایا کہ ہم نے اس وقت ساری دُنیا غرق کر دی تھی بلکہ یہ کہا ہے کہ

اَغْرَقْنَا الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا (اعراف: ۶۵)

یعنی ہم نے ان لوگوں کو غرق کیا جنہوں نے ہمارے نشانات کی تکذیب کی تھی۔

۳۸۔ سچے مذہب کی علامات

سچے مذہب میں ہمیشہ۔ اور ہر زمانے میں انوار و برکات اور سلسلۂ وحی والہام و قبولیت دُعا موجود ہوتے ہیں۔ بمقتضائے آیت

تُؤْتِیْٓ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّھَا (ابراہیم: ۲۶)

ترجمہ: وہ ہر وقت اپنے رب کے اذن سے اپنا (تازہ) پھل دیتا ہے

اسی طرح دُنیا میں ہمیشہ اہلِ حق کو دلائل سے غلبہ حاصل رہتا ہے چنانچہ فرمایا۔

یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (ابراہیم: ۲۸)

ترجمہ: جو لوگ ایمان لائے ہیں انہیں اللہ اس قائم رہنے والی (اور پاک) بات کے ذریعہ سے (اس) ورلی زندگی میں (بھی) ثبات بخشتا ہے

(الفضل ۲ مارچ ۱۹۳۸ء)

۳۹۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مجنون ہونے کے الزام کی تردید

قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مجنون ہونے کا الزام کئی جگہ رد کیا گیا ہے۔ کہیں تو صاحبِ خلقِ عظیم ہونے کو تردید میں پیش کیا ہے۔ کہیں اور دلائل دیئے ہیں۔ مگر ایک جگہ سورہ حجر کے پہلے ہی رکوع میں نہایت لطیف دلیل دی ہے جب کفار کہتے ہیں کہ تو مجنون ہے تو خدا تعالیٰ اس کا جواب دیتا ہے کہ یہ قرآن جسے تم ایک مجنون کا کلام کہتے ہو۔ یہ تو سینوں اور زبانوں اور صحیفوں میں محفوظ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کیا کبھی پاگلوں کی بڑ بھی محفوظ رکھی جاتی ہے۔ آج یہ دلیل خلقِ عظیم والی دلیل سے بھی زیادہ زبردست ہے۔ کیونکہ صاحب خلق عظیم ہمارے سامنے نہیں ہے مگر یہ محفوظ کلام اب بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔

۴۰۔ مختلف شریعتوں کی مثال

سورہ محمد میں لَبَنٍ اور الثَّمَرٰتِ اور عَسَلٍ مُّصَفًّى (محمد ۱۶) مختلف زمانوں کی شریعتوں کی مثال دی ہے۔ سب سے ابتدائی شرائع دودھ کی طرح تھیں۔ جو بچوں کی پرورش کرتا ہے۔ اور جلد پھٹ جاتا ہے۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ شریعت میں نسلِ انسانی کے ساتھ ارتقاء ہوا۔ وہ شریعتیں میووں کی طرح تھیں کہ بڑے آدمی بھی ان سے غذا حاصل کر سکتے تھے۔ مگر ان میں بھی یہ نقص تھا کہ نشہ اور سکر ان سے بن سکتا تھا۔ اور لوگوں نے ان کا ناجائز استعمال کیا۔ مگر یہ آخری شریعت عسلِ مصفیٰ ہے۔ اور اس کی مثال شہد سے اس لئے دی کہ سب کا خلاصہ اور سڑنے سے پاک بلکہ دوسری اشیاء کو سڑنے سے بچاتی ہے۔ اور شِفَاءٌ لِّلنَّاس ہے

۴۱۔ جنت کی نعمتیں

آریوں نے جنت پر ایک اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ جنتی آخر دوام کی وجہ سے وہاں کی نعمتوں سے اُکتا جائیں گے۔ خدا تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس کا جواب دے رکھا ہے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا (الکہف : ۱۰۹)

ترجمہ:۔ وہ اُن میں رہتے چلے جائیں گے (اور) ان سے الگ ہونا نہیں چاہیں گے

یعنی باوجودیکہ وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے پھر بھی وہاں کے حالات ایسے ہوں گے کہ وہ کبھی اس سے الگ ہونا نہیں چاہیں گے۔ یعنی اکتائیں گے نہیں۔

۴۲۔ سلسلہ الہام اور وحی

سلسلہ وحی الہام ابتدائے آفرینش انسان سے قیامت تک کبھی منقطع نہ ہوا۔ نہ ہو گا۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝
اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝

(القصص ۵۲، ۵۳)

ترجمہ:۔ اور ہم اُن کے لیے پے در پے وحی اُتارتے رہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

وہ لوگ جن کو ہم نے اس (قرآن) سے پہلے کتاب دی تھی وہ اس (قرآن) پر (دل میں) ایمان رکھتے ہیں۔

یعنی کلام الٰہی دنیا میں مسلسل اور پے در پے نازل ہوتا رہا ہے اور پہلے سب اہل کتاب اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

۴۳۔ زکوٰۃ نہ دینا

زکوٰۃ نہ دینے والے کو بھی قرآن نے مشرک کہا ہے۔

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

(حم السجدۃ : ۷، ۸)

ترجمہ : (اور یاد رکھو کہ) مشرکوں کے لیے عذاب (مقدر) ہے (وہ مشرک) جو زکوٰۃ نہیں دیتے ہیں۔

زکوٰۃ نہ دینا گویا روپیہ کو اپنا معبود سمجھنا ہے۔ اور جو ہر سال اس معبود کا چالیسواں حصہ اپنے ہاتھ سے توڑ تا رہتا ہے وہ مشرک نہیں رہ سکتا۔

۴۴۔ ترقیوں کے ساتھ ابتلا

حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی جماعت جس کا ذکر سورۂ فتح کی آخری آیات میں

يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (الفتح : ۳۰)

ترجمہ : پھر اپنی جڑ پر مضبوطی سے قائم ہو گئی یہاں تک کہ زمیندار کو پسند آنے لگ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کفار اُن کو دیکھ دیکھ کر جلیں گے۔

کے الفاظ میں آتا ہے۔ اس کے متعلق ہمارے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی لگی ہوئی ہے کہ یہ مخالفتیں چند روزہ ہیں جب جماعت ترقی کرے گی تو بس فتح ہی فتح ہے۔ اور ابتلا اور دشمنوں کے حملے سب جاتے رہیں گے۔ حالانکہ بات یہ ہے کہ جُوں جُوں یہ سلسلہ ترقی کرے گا اس کے مخالف بھی غیظ و غضب میں بڑھیں گے اور عداوتیں ترقی کریں گی بمقدار ترقی جماعت احمدیہ۔ پس ابتلاء ترقیوں کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہی جائیں گے۔

جس دن منافقیں گئیں اُس دن سے تو زوال کا خطرہ ہے ۔

۴۵ ۔ قومِ ثمود کے غیر مبائعین

معلوم ہوتا ہے کہ کچھ غیر مبائع ثمود کی قوم میں بھی موجود تھے ۔ جو کہا کرتے تھے ۔

اَبَشَرًا مِّنَّا وَّاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ اِنَّاۤ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ (قمر : ۲۵)

ترجمہ : اور کہا تھا کہ کیا ہم اپنے میں سے ہی ایک آدمی کی (جو ہماری طرف بھیج دیا گیا ہے) اتباع کریں ؟ اگر ہم ایسا کریں گے تو بڑی گمراہی اور جلنے والے عذاب میں پڑ جائیں گے

یعنی کیا ہم ایک آدمی کو پیر بنا کر پیر پرستی کی گمراہی اور جہنم میں داخل ہو جائیں ۔

۴۶ ۔ اُمّتِ محمّدیہ میں نبوت

اُمّتِ محمدیہ میں نبوت کا اشارہ سورہ حدید کی ایک آیت میں بھی پایا جاتا ہے ۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ یُؤْتِكُمْ كِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ (الحدید : ۲۹)

ترجمہ : اے ایمان والو ! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ ۔ تب تم کو اللہ اپنی رحمت سے دوہرا حصہ دے گا

ایک کفل تو شہادت اور صدیقیت ہے جو پہلے سے رائج ہے اور جس کا ذکر اسی سورت کی اس آیت میں ہے ۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ (الحدید : ۲۰)

ترجمہ : اور جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی اپنے رب کے

نزدیک صدیق اور شہداء کا درجہ پانے والے ہیں۔
اور دوسرا کفل نبوت ہے جو نیا انعام ہے اور پہلے انبیاء کی اطاعت میں مضمر نہ تھا۔ بلکہ

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (النساء : ۷۰)

ترجمہ : اور جو لوگ) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں

کے ماتحت صرف اسی اُمّت سے خاص ہے۔

۷۴ حضرت مسیح موعود کا ایک کشف

حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے ایک کشف کا حوالہ قرآنِ مجید میں بھی ہے۔ سورۂ انفال کے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے وعدہ کیا کہ اس جنگ بدر میں ایک ہزار فرشتوں کی مدد پہنچے گی۔ چنانچہ وہ پہنچی۔ اس کے بعد سورہ اٰلِ عمران میں جنگِ احد کے بیان میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ اس جنگ میں تین ہزار فرشتوں کی امداد نازل فرمائے گا۔
(اگر ایک غلطی سے) وہ مدد نازل نہ ہوئی۔ اس کے بعد کسی اور جنگ میں ہزاروں فرشتوں کا بدر کی طرح باقاعدہ نازل ہونا ثابت نہیں ہے۔ ہاں عام نصرت بذریعہ ملائکہ نازل ہوتی رہی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بدر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مجموعی طور پر تین ہزار ملائکہ نصرت کے لئے نازل ہوئے ہوں۔ اس تین ہزار کی مدد کے وعدہ کے بعد خدا تعالیٰ ایک تیسری مدد کا ذکر کرتا ہے جو پانچ ہزار فرشتوں سے پہنچے گی اور اس کا ذکر یوں کیا ہے۔

بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ

هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ (اٰلِ عمران : ۱۲۶)

ترجمہ:۔ کیوں (کافی) نہ ہوگی : اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو۔ اور وہ (کافر) تم پر اسی دم چڑھ آئیں تو تمہارا رب پانچ ہزار سخت حملہ کرنے والے فرشتوں کے ذریعے سے تمہاری مدد کرے گا۔

یعنی اگر تم صبر سے (آخری زمانہ کا) انتظار کرو گے۔ اور تقویٰ کو ہاتھ سے نہ دو گے اور مخالفینِ اسلام قرنِ اول کے کفار سے بھی زیادہ جوش و خروش سے اسلام کا نام و نشان مٹانے کو چاروں طرف سے حملے کریں گے۔ جیسا کہ اظہر من الشمس ہے۔ تو ہم نے بھی اس وقت کے لئے ابھی سے پانچ ہزار فرشتے تعین لگا کر رکھے ہوئے ہیں۔ جو اس زمانہ میں نازل ہو کر اہلِ حق کے لشکر کی مدد کریں گے۔ یہی مضمون حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے اس کشف میں ہے جس میں آپ نے ایک لاکھ فوج مانگی۔ مگر حکم ہوا۔ صرف پانچ ہزار سپاہی دیا جائے گا۔ اور چونکہ ان پانچ ہزار ملائکہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کچھ پتہ نہیں ملتا۔ اس لئے اس پیشگوئی سے یہی زمانہ مراد ہے۔ جس کی تصریح خود دوسری وحی نے صاف طور پر کر دی۔ (حصّہ ۵ براہین ۴۲۸)۔

۴۸۔ غلامی کی جائز صورت

اسلام نے صرف ایک قسم کی غلامی جائز رکھی ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ (الانفال ۶۸)

ترجمہ:۔ کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ قیدی بنائے جب تک کہ وہ ملک میں خونریزی نہ کرے۔

یعنی کسی نبی کے لئے جائز نہیں کہ وہ انسانوں کو قید کرے سوائے جنگ کے قیدیوں کے۔ سو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں صرف یہی صورت جائز غلامی کی تھی۔ وہ لوگ با اخلاق اور نیک اور حقوق کا خیال رکھنے والے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے اپنے غلاموں کو اپنی ذات اور اپنی آل واولاد سے بڑھ کر آرام دیا اور غلام بھی بڑے نیک تھے۔ جو بھاگا نہیں کرتے تھے۔ نہ شرارتیں کیا کرتے تھے۔ مگر اب چونکہ کچھ تو خود لوگوں کی اخلاقی حالت خراب ہو گئی ہے اور ایسے غلاموں کے بھاگ جانے کا بھی ڈر ہے۔ اس لئے اگر کوئی زمانہ اسلام پر ایسا پھر آیا۔ تو جنگی غلام بجائے انفرادی طور پر تقسیم ہونے کے خود گورنمنٹ کی زیر نگرانی کیمپوں میں رہا کریں گے اور وہیں وہ کام کریں گے۔ اور تعلیم حاصل کیا کریں گے کیونکہ اس زمانہ میں ایسے عمدہ انتظامات ممکن ہیں۔ یا فریقین نادان جنگ سے کر ایک دوسرے کے قیدیوں کو چھوڑ دیا کریں گے۔

۴۹ ایک لغو سوال

اگر خدا تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ تو کیا وہ جھوٹ بھی بول سکتا ہے؟ یہ ایک نہایت لغو سوال ہے جو اللہ تعالیٰ کے متعلق سننے میں آتا رہتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (النساء: ۸۸)

ترجمہ: اور اللہ سے بڑھ کر کس کی بات سچی ہو سکتی ہے۔

اور وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (النساء: ۱۲۳)

یعنی کون اپنی بات میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا ہے۔ خدا تعالیٰ تو خود اپنے تئیں اَصدقُ یعنی سب سے زیادہ راست گو کہے تو اس صورت مسی یہ کہنا کہ کیا وہ جھوٹ بولنے پر بھی قادر ہے کیسا بے ہودہ سوال ہے چونکہ کذب اور جھوٹ ذلیل چیز ہے۔

اور شانِ الوہیت اور قدرتِ الٰہیہ کے منافی اس لئے بسبب مُزِل حیثیت رکھنے ہونے کے وہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس میں عیب اور کمزوری ہوئی وہ خدا اور قادرِ مطلق ہوا ہی کیونکر ؟

۵۰۔ مذہب میں بیجا رُعب نہیں چلتی

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (الجاثیہ ۲۷)

ترجمہ:۔ لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے۔

کی آیت کے درس کے وقت حضرت خلیفۃ المسیح اوّل فرمایا کرتے تھے۔ کہ خوب یاد رکھو بیجا رُعب مذہب میں نہیں چلتی۔ بلکہ میں تو یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ دھڑے بندی اور پارٹی سسٹم بھی اس اسلامی حکومت اور پارلیمنٹ میں نہیں ہوگا جسے احمدیت قائم کرے گی کیونکہ الٰہی حکم ہے کہ

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (الانعام ۱۵۳)

یعنی جب بھی تم بات کرو تو عدل کو ہاتھ سے کبھی نہ دینا خواہ تمہاری بات تمہارے اپنے عزیز و اقرباء کے مخالف پڑتی ہو۔ مگر پارٹی سسٹم میں تو اقرباء نہیں بلکہ غیر بھی ہوتے ہیں۔ اور ان کی خاطر حق سے رُکنا پڑتا ہے۔ اور پارٹی کی ہاں میں ہاں ملانی پڑتی ہے۔ پس یہ کیونکر اسلامی طرزِ حکومت اور اسلامی شوریٰ ہو سکتا ہے ؟

۵۱۔ علم اور خلق

حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے آریوں کے مقابل پر فرمایا ہے کہ جب تم خدا کو علیم یعنی کامل علم والا مانتے ہو تو پھر لازم ہے کہ اُسے خالق بھی مانو کیونکہ خلق علمِ کامل کا نتیجہ ہے اور اس کو لازم پڑی ہوئی ہے۔ اس مضمون کی آیت جو قرآن

میں ہے وہ یوں ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۙ (الزخرف ۱۰)

یعنی اگر ان مخالفین سے پوچھا جائے۔ کہ کس نے آسمان اور زمین پیدا کئے۔ تو وہ اقرار کریں گے کہ ان کو کسی غالب اور کامل علم والے نے پیدا کیا ہے۔ یہاں، خلق کی وجہ ہی یہ تسلیم کی گئی ہے کہ وہ ایسی ذات سے ظہور میں آسکتی ہے جس میں علم کامل ہو۔ اور یہ وہ دلیل ہے جسے مخالف بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس مضمون کی اور آیات بھی قرآن مجید میں موجود ہیں۔

پہلے ایک جگہ میں وہ آیت پیش کر چکا ہوں۔ کہ علم کامل خلق کا مقتضی ہے اگر اللہ تعالیٰ کامل علم رکھتا ہے تو وہ خلق بھی کر سکتا ہے۔ اب وہ آیت پیش کرتا ہوں کہ جو خلق کرتا ہے۔ وہ علم کامل بھی رکھتا ہے۔

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ (الملک ۱۵)

کیا جس نے پیدا کیا، اس کا علم بھی ناقص ہو سکتا ہے۔ خود خلق کرنے والے کے سوا چونکہ اس مخلوق کا کامل علم کسی اور ذات کو نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی ربوبیت اور اس کی قیومیت بھی صرف وہی ذات کر سکتی ہے۔ اس کا علم تفصیلی ہونا چاہیئے نہ کہ مجمل۔ ؎

جس نے پیدا کیا وہی جانے
دوسرا کیونکر اس کو پہچانے

۵۲ فاتحہ خلف امام

ایک حنفی صاحب ایک دفعہ اعتراضاً فرمانے لگے کہ جب قرآن میں یہ حکم موجود ہے کہ:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الاعراف: ۲۰۵)

ترجمہ: اور (اے لوگو!) جب قرآن پڑھا جائے، تو اُس کو سُنا کرو اور چُپ رہا کرو۔ تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو اسے سنو اور خاموش رہو تو پھر احمدی لوگ امام کے پیچھے فاتحہ کیوں پڑھتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اسی آیت کی وجہ سے پڑھتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو خاموشی سے سنو نہ کہ جب فاتحہ پڑھی جائے۔ خدا تعالیٰ نے فاتحہ کو قرآن سے بالکل الگ رکھا ہے چنانچہ اس آیت کو پڑھئے۔

لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (الحجر: ۸۸)

یعنی ہم نے تجھ کو دو چیزیں دی ہیں ایک تو سورہ فاتحہ ہے جو خلاصہ یا متن ہے جو ہمیشہ دہرائی جاتی ہے اور مختصر ہے اور دوسرا قرآنِ عظیم ہے جو تفسیر اور تفصیل ہے۔ اسی وجہ سے وہ عظیم اور ضخیم ہے۔ پس ہم تو صرف فاتحہ کے وقت امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتے ہیں کیونکہ نہ صرف یہ کہ اس کی ممانعت نہیں بلکہ شانِ نزول سے اس حکم کا پتہ لگتا ہے۔ کہ جب امام فاتحہ پڑھے تو مقتدی اس کے ساتھ ساتھ اسے دہرائیں۔ ہاں جب امام قرآن کا کوئی حصہ پڑھتا ہے تو ہم خاموشی سے سُنتے ہیں۔ جیسا کہ حکم ہے۔

۵۳۔ قرآنی پیشگوئیاں

پیشگوئیوں کی بابت مخالفین کا ہمیشہ یہ رویہ رہا ہے کہ پوری ہونے کے بعد کہہ دیتے ہیں کہ نبی نے حالات سے اندازہ لگا لیا تھا۔ پس کم از کم تین پیشگوئیاں قرآن مجید کی ایسی ہمیشہ ذہن میں مستحضر رہنی چاہئیں۔ جن کی بابت دشمن بھی تسلیم کرے کہ یہ اندازے سے ممکن نہیں ہو سکتیں۔ خلو پہلی غلبہ روم کی پیشگوئی کے ساتھ کا حصہ کہ جب رومی پھر فتح مند ہوں گے تو اُس دن مومن بھی اللہ تعالیٰ کی نصرت کی وجہ سے نہایت خوش ہوں گے۔ یعنی فتح بدر کی وجہ سے حالانکہ مکہ میں ابھی ہجرت اور جنگوں اور پھر اس جنگ بدر کا خیال اور وہم بھی کسی کو نہ تھا۔ دوسری پیشگوئی سورہ مزمل میں ہے جو بالکل ابتدائی مکی سورت ہے۔ اس میں یعنی قریباً ہجرت سے دس سال پہلے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْہُ (المزمل: ۲۱)

یعنی ایک زمانہ آئے گا جب یہ قرآن پڑھنے والے خدا کے راستہ میں جہاد کے لئے نکلیں گے۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب صرف چند مسلمان تھے۔ اور ان کو بھی سر چھپانے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ تیسرے مثلاً فرعون کی لاش کی پیشگوئی جس کا تورات تک میں بھی اشارہ نہیں۔ (الفضل ۱۰ مارچ ۱۹۳۸ء)

۵۴۔ استعانت دُعا کو کہتے ہیں

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں استعانت سے مراد دُعا ہے کیونکہ عبادت اور استعانت یہی وہ دو چیزیں ہیں۔ جو خدا کے سوا کسی اور سے جائز نہیں

سو اگر استعانت سے عام مدد مانگنا مراد ہو تو وہ تو دوسری مخلوقات سے بھی جائز ہے اور ہم ہر روز ایک دوسرے سے امداد مانگتے رہتے ہیں۔ یہاں وہ استعانت مراد ہے جو عبادت کی طرح خدا کے سوا دوسرے سے ناجائز ہو اور وہ صرف دعا ہے۔ کیونکہ دُعا اور کسی سے کرنی حرام ہے۔ اِیَّاکَ کا لفظ ہی شاہد ہے کہ عبادت اور دُعا غیر اللہ سے منع ہیں۔

۵۵۔ کان افضل ہے یا آنکھ

سمع اور بصر یا کان اور آنکھ میں سے کس کو فضیلت ہے۔ اس کا فیصلہ دنیا کے عقلمندوں نے یہی کیا ہے کہ کان افضل ہیں آنکھ سے۔ کیونکہ آنکھ نہ ہو تو صرف کان سے ہی بہت سا علم انسان حاصل کر سکتا ہے اور پھر آگے فیضان چلا سکتا ہے۔ لیکن اگر کان معدوم ہوں تو انسان ترقی نہیں کر سکتا نہ کسی کو فیض پہنچا سکتا ہے۔ بلکہ بیوقوف رہ جاتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی یہی بات تسلیم کی ہے۔ اور جہاں سمع و بصر کا مقابلہ کیا ہے وہاں سمع کو مقدم رکھا ہے مثلاً

وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۚ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۔ (البقرہ ۸)

ترجمہ: اور ان کے کانوں پر مُہر کر دی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ (پڑا ہوا) ہے۔

اسی طرح وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ (النحل ۷۹) میں

ترجمہ: اور اس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں پیدا کئے ہیں۔

نیز وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا (الاحقاف ۲۶)

ترجمہ: اور ہم نے اُن کو تمہاری طرح کان اور آنکھیں اور دل بھی دیئے تھے۔

بلکہ خود اپنے لئے بھی اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (النساء ۵۹)

ترجمہ: اللہ یقیناً بہت سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔
ہی فرمایا حق یہی ہے کہ ہدایت اور علم کے لئے سمع فضیلت رکھتی ہے بصر سے کیونکہ کلام کو فضیلت ہے نظارہ پر۔

۵۶۔ علم الترب کی حقیقت

مسمریزم کو روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر مسمرائزر ہی خدارسیدہ ہے تو کیکر سنگھ بھی خدارسیدہ تھا کیونکہ اس نے بھی ایک دنیاوی اور جسمانی کمال پیدا کر لیا تھا۔ اور بڑے بڑے مضبوط جوانوں کو چٹکی بجاتے میں گرا لیتا تھا۔ اس علم کا نام حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کو عمل الترب بتایا گیا تھا۔ یعنی یہ الہٰی اور آسمانی علم نہیں بلکہ زمینی یا سفلی علم ہے جیسے اور زمینی علم ہوتے ہیں۔ مثلاً پہلوانی، طب، سرجری، موسیقی، اسی طرح یہ بھی ہر شخص حاصل کر سکتا ہے سچے مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ خواہ اسے عیسائی حاصل کرے یا ہندو یا سکھ یا مسلمان خواہ دہریہ یا چوڑا چمار۔ آسمانی نور نہیں ہے۔ صرف مشق ہے۔ تزکیۂ نفس نہیں ہے۔ اعصابی ورزش ہے سب سے بڑے ساحر تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھے۔ وہ دیکھو کیسی ذلیل حرکت کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ

اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ (الاعراف ۱۱۴)

یعنی اگر ہم موسیٰ پر غالب آگئے تو کیا کچھ انعام بھی ملے گا۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ۔ یہ انعام مانگنا ہی ثابت کرتا ہے کہ ان کو معرفت اور للہیت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ صرف دنیا مقصود تھی۔ سب مسمرائزر اور توجہ کرنے والے عموماً ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس فن کو خداشناسی سے کوئی واسطہ نہیں جیسے اور فنون میں انسان کمال حاصل کر

لیتا ہے۔ مقرر تقریر میں۔ پہلوان کشتی میں۔ منطقی زبان چلانے میں۔ اسی طرح توجہ کرنے والا ساحر توجہ میں دوسروں سے سبقت لے جاتا ہے اور کمزوروں کو قوتِ ارادی میں مغلوب کر لیتا ہے۔ یہ بے وقوف ساحر جب اس علم کو مذہبی حلقہ میں لے آتے ہیں۔ تو گویا خدا کو بھی اپنی توجہ کے زور سے قابو کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہ تو عاجزی اور انکسار اور فروتنی سے ہاتھ آتا ہے۔ کیا وہ بھی ایک کمزور معمول ہے۔ جو توجہ کرنے سے متاثر ہو جائے۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (المؤمنون، ۹۲)

ترجمہ: اللہ پاک ہے اس سے جو یہ باتیں کرتے ہیں۔

۵۷۔ خون کا نشان

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نشانات میں سے ایک نشان عذابِ دم یعنی خون بھی تھا۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ قف (الاعراف، ۱۳۴)

ترجمہ: تب ہم نے ان پر طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈک اور خون بھیجا۔ (یہ) الگ الگ نشان (تھے)

ہم نے فرعونیوں پر جب پے در پے دریائے نیل کی طغیانیاں بھیجیں تو کثرتِ رطوبت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ٹڈیاں، چچڑیاں اور مینڈک پیدا ہو کر وبالِ جان بن گئے اور ایسی بیماریاں اور وبائیں ظاہر ہوئیں جن میں خون آتا ہے۔ مثلاً خون کی قے جیسی سخت ملیریا یا زرد بخار میں یا پیشاب میں خون جیسے بلیک واٹر فیور میں۔ یا خون تھوکنا جیسے نمونیہ اور طاعون میں یا خون کی نکسیر جیسے ٹائیفائیڈ میں یا خون کے دست اور خونی پیچش یا تمام جسم میں خون پھوٹ کر اس کے داغ جلد پر پڑ جانا اور مسوڑھوں سے خون بہنا جیسے

سکردی وغیرہ امراض میں۔ مگر غالباً قیاس یہ ہے کہ وہ سخت قسم کا ملیریا ہوگا۔ جو نہ صرف سیلابوں اور طغیانیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوجاتا ہے بلکہ یوں بھی مصر ملیریا کا گھر ہے اور مہلک ملیریا کی وجہ سے خون ہر رستہ سے آتا ہے۔ نکسیر سے بھی۔ مسوڑھوں سے بھی۔ دستوں اور پیچش کے راستہ بھی سقے سے بھی اور پیشاب سے بھی۔

۵۸۔ سبت کی مچھلیاں

اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (الاعراف، ۱۶۳)

جبکہ ان کی مچھلیاں اُن کے سبت کے دن گروہ در گروہ آتی تھیں اور جس دن وہ سبت نہیں کرتے تھے نہیں آتی تھیں اسی طرح ہم اُن کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کا امتحان لیتے تھے۔

یہودیوں کی ایک بستی دریا یا سمندر کے کنارے تھی۔ ان کی شریعت میں ہفتہ کے دن شکار منع ہے مگر ہفتہ کے دن مچھلیاں کنارے پر آجاتی تھیں۔ مگر باقی چھ دنوں میں نہیں آتی تھیں۔ اس قصہ میں تفسیروں میں لکھا ہے کہ چونکہ خدا نے ان کا امتحان لینا تھا۔ اس لیے فرشتے ہفتہ کے دن مچھلیاں گھیر کر لاتے تھے۔ اور باقی دنوں میں ان کو بھگا دیتے تھے۔ آخر یہودیوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ تو انہوں نے دریا کے کنارے چھوٹے چھوٹے تالاب بنا دیئے جہاں مچھلیاں حسب معمول سبت کے دن آجاتی تھیں۔ اس دن بجائے شکار کے وہ تالابوں کا راستہ جو دریا سے ملا ہوتا تھا بند کر دیتے تھے۔ اس طرح وہ قید ہو جاتی تھیں پھر اتوار کے دن ان کو پکڑ لیتے تھے۔ یہ گناہ سے بچنے کا حیلہ تھا۔ مگر خدا تعالیٰ نے منع کر دیا۔ اس قصہ میں لوگوں کو یہ دقت پیش آئی کہ چونکہ مچھلیاں خاص ہفتہ کے دن آتی تھیں باقی دنوں میں

نہیں آتی تھیں۔ اس لئے فرشتے ان کو گھیر کر لاتے ہوں گے۔ لیکن واضح ہو کہ تمام ذی روح کو وقت کا اندازہ اور احساس ہے۔ اور جب ایک لمبے تجربہ سے معلوم ہو جائے کہ ہفتہ میں ایک دن شکار نہیں ہوتا۔ اور کوئی مچھلی اس دن نہیں ہوتی تو مچھلیوں کو بھی علم ہو جاتا ہے کہ یہ دن خطرہ کے ہیں مگر ساتواں بے خطر ہے۔ اس لئے وہ بھی وقت تاک کر کنارہ کے ساتھ اسی دن آجاتی تھیں۔ یہ کوئی معجزہ نہیں تھا۔ رات صبح و شام گھنٹے بلکہ منٹ تک کا احساس جانوروں میں ہے۔ جب انہیں تجربہ سے معلوم ہو جائے کہ فلاں وقت یا دن خطرہ ہے تو وہ اس وقت باہر نہیں نکلتے۔ اور جب تجربہ سے کوئی دن وقت یا گھنٹہ یا منٹ اس کا معلوم ہو جائے تو اس وقت بے دھڑک باہر آجاتے ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں جب میں گوجرہ میں متعین تھا تو پہلے اکیلا صرف ایک خادم کے ساتھ وہاں گیا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ شفاخانہ ۱۱ بجے رات کے بعد بند ہوتا تھا۔ میں اس وقت گھر میں آ کر کھانا کھایا کرتا تھا۔ شروع میں میں میں ایک دن ایک کوّا دیوار پر آ بیٹھا۔ میں نے اُسے روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال دیا۔ وہ لے کر اُڑ گیا۔ اگلے دن پھر آیا۔ میں نے بھی اسی طرح پھر ایک ٹکڑا پھینک دیا۔ چند دن مسلسل ایسا ہی ہوتا رہا۔ پھر تو یہ ہو گیا کہ پورے گیارہ بجے وہ آیا کرتا اور دس منٹ ٹھہر کر چلا جاتا۔ گویا اس کی جیب میں ریلوے ریگولیٹر گھڑی تھی۔ جس دن مجھے دیر ہو جاتی اور میں کوّے کو نہ ملتا تو میرا نوکر کہتا کہ وہ تو پورے گیارہ بجے آیا تھا۔ پانچ دس منٹ کائیں کائیں کر کے چلا گیا۔ اس طرح کھانے کے وقت بعض کتے ہیں جو دُور دُور سے آجاتے ہیں۔ ریل کے آنے کے وقت چند منٹ پہلے پلیٹ فارم پر کوّے اور کتے کھانے کی طمع پر جمع ہو جاتے ہیں کتے تو شہر کے اندر سے ۲-۲ میل کے فاصلہ پر سے آجاتے ہیں۔ (الفضل ۱۲ر مارچ ۱۹۳۸ء)

۵۹ - احمدیت کا اعلان ضروری ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ

يَشْتَرُونَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ
اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (البقرہ، ۱۷۵)

یعنی جو لوگ اللہ کے سچے دین کو چھپاتے ہیں۔ تاکہ وہ نقصانوں سے بچے رہیں۔ ان سے خدا تعالیٰ قیامت کے دن بات بھی نہیں کرے گا۔ اور نہ اُن کا تزکیہ نفس ہوگا۔ ہزاروں ہزار لوگ ہیں جو احمدیت کو حق سمجھتے ہیں۔ مگر دنیاوی منافع کی وجہ سے اعلان اور اظہار نہیں کرتے۔ سو وہ دیکھ لیں اس کا کیا نقصان ہے تزکیہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک اظہار نہ ہو۔ اور آخرت ہاتھ سے جاتی ہے جب تک اعلان نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ اسلام کی پانچ شرطوں میں سے پہلی شرط اعلان ہے۔

۶۰۔ آیت قصاص کا مطلب

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى ۖ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ
وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۖ (البقرہ، ۱۷۹)

ترجمہ:۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر مقتولوں کے بارہ میں برابر کا بدلہ لینا فرض کیا گیا ہے اگر (قاتل) آزاد (مرد) ہو تو اسی آزاد (قاتل سے) اور اگر (قاتل) غلام ہو تو اسی غلام (قاتل) سے اور اگر (قاتل) عورت ہو تو اسی عورت (قاتل) سے۔ (البقرہ، ۱۷۹)

اس کے یہ معنی نہیں کہ آزاد کے بدلے آزاد قتل کیا جائے۔ اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت خواہ کوئی قاتل ہو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی حُر نے یہ جرم کیا ہے تو بدلہ میں وہی حُر مارا جائے گا۔ اور اگر کسی غلام نے قتل کیا ہے تو

قصاص میں وہی غلام مارا جائے گا۔ اور اگر کوئی عورت قاتلہ ہے تو وہی قتل کی جائے گی۔ حُر کی حریت اسے نہیں بچا سکتی۔ جیسے بقول لوگوں کے گوروں کو کالوں کے قتل کے عوض کبھی پھانسی ملتی نہیں سننے میں آئی۔ یا بادشاہوں سے کوئی قصور نہیں ہو سکتا۔ وہ قانون سے بالا ہیں۔ یا عورت نے خون کیا۔ تو اس کا عورت ہونا اسے پھانسی سے نہیں بچا سکتا۔ جیسا کہ عوام میں مشہور ہے کہ عورتیں پھانسی نہیں پاتیں۔ یا غلام اور نوکر قاتل ہوں تو لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ بچارے اصل مجرم تھوڑا ہی ہیں۔ اصل تو اُن کے آقا ہوں گے۔ پس انہیں پہلے پکڑو۔ اس آیت کو سمجھنے کے لئے ایک اور آیت بطورِ کُنجی کے ہے وہ یہ ہے۔

بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ (البقرہ: ۱۹۵)

یعنی اگر کفار شہرِ حرام میں جنگ کریں تو تم بھی اسی شہرِ حرام میں جنگ کرو۔ اسی طرح اگر کوئی حُر قتل کرے۔ تو تم بھی اُسی حُر کو قتل کر دو۔

۶۱- اذیٰ کے معنی

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى (البقرہ: ۲۲۳)

یعنی لوگ حیض کی بابت سوال کرتے ہیں تو کہہ دے کہ وہ اذیٰ ہے یہاں اذیٰ کے معنی لوگوں نے مختلف کئے ہیں۔ یعنی بیماری، تکلیف، مکروہ چیز اور گندگی وغیرہ۔ مگر آگے چل کر خود ہی قرآن نے اس کے معنی کر دیئے ہیں یعنی۔

وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ (البقرہ: ۲۲۳)

ترجمہ۔ اس لئے تم عورتوں سے حیض (کے دنوں) میں علیحدہ رہو اور جب تک وہ پاک (صاف) نہ ہولیں اُن کے پاس نہ جاؤ۔

کہہ کر بتا دیا ہے کہ اَذیٰ وہ چیز ہے جو طہارت کے مخالف ہو۔ اب معنی صاف ہوگئے۔ یعنی ناپاکی۔ قرآن مجید بہت سی جگہ اپنے الفاظ کے معنی بھی خود ہی کرتا ہے۔ اور یہ مضمون بھی بہت دلچسپ ہے۔

۶۲۔ نکاح کے مقاصد

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عورت صرف بچے پیدا کرنے کے لئے ہے۔ اور یہ جب
آیت نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ (البقرہ ۲۲۳)
ترجمہ: تمہاری بیویاں تمہارے لیے (ایک قسم کی) کھیتی ہیں

بالکل درست ہے۔ مگر نکاح کے اور مقاصد بھی ہیں۔ عورت انسان کی آخرت سنوارنے کے لئے بھی ہے۔ (وَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ) اور وہ اس کے جذبات کی تسکین کے لئے بھی بنائی گئی ہے۔ ترجمہ: اور اپنے لئے (کچھ) آگے بھیجو۔
لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا (الروم ۲۱) ترجمہ: تاکہ تم ان کی طرف مائل ہو کر تسکین حاصل کرو۔

بچے کی بھوک۔ جوان کی شہوت اور بڈھے کی کمزوری اور اضطراب کو اور کون دور کرسکتا ہے۔ اسی طرح وہ دوستی اور شفقت کے اخلاق کا مرکز بھی ہوتی ہے۔
وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (الروم ۲۱)
ترجمہ اور تمہارے درمیان پیار اور رحم کا رشتہ پیدا کیا ہے۔

وہ یوں بھی دنیا کی سب سے زیادہ پسندیدہ چیز ہے۔ (مَا طَابَ لَكُمْ) (النساء ۳)

نیز مختلف آیات کے مطابق وہ تمہاری اولاد کی بہترین ربوبیت کرنے والی ہیں اور تمہاری کمائی اور روپیہ خرچ کرنے کی جگہ۔ زمین کی زینت۔ رونق۔ نیز آدمی کے لئے سب سے بڑا

امتحان اور ابتلاء بھی ہیں۔ ساتھ ہی وہ اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ حسین مخلوق اور مردوں کی سب سے زیادہ ہمدرد ہیں۔ اس لئے صرف حورٌ تک ہی ان کو محدود سمجھنا خود قرآن مجید کے خلاف ہے۔

۶۳۔ تبرکات

بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔ والے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے الہام پر بعض لوگ تبرکات کی اصل قرآن مجید سے بھی دریافت کرتے ہیں۔ حدیث میں تو صاف آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بال اور کپڑے اور پسینہ تبرک تھا۔ آنحضرتؐ خود دیتے تھے یا صحابہ مانگ لیتے تھے۔ مگر قرآن مجید نے بھی تبرکات کو تسلیم کیا ہے۔

وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ

(البقرہ ۲۴۹:)

ترجمہ: اور اس چیز کا بقیہ ہوگا جو موسیٰ کے متعلقین اور ہارون کے متعلقین نے اپنے پیچھے چھوڑا۔ فرشتے اُسے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

۶۴۔ اسماء الٰہی کا تعلق آیات کے مضمون کے ساتھ

قرآن مجید کی اکثر آیتوں کے آخر میں اور کبھی شروع میں بھی خدا تعالیٰ کے اسماء آتے ہیں۔ یہ اسماء ہمیشہ اس آیت کے مضمون سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر یہ آیت بالکل واضح ہے۔

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ

عَلِيۡمٌ (البقرہ: ۲۴۸)

ترجمہ: اُس نے کہا اللہ نے اُسے تم پر یقیناً فضیلت دی ہے اور اُسے علمی اور جسمانی لحاظ سے (تم سے زیادہ) فراخی عطا کی ہے اور اللہ جسے پسند کرتا ہے اُسے اپنا ملک عطا کرتا ہے۔ اور اللہ کشائش دینے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔

یعنی طالوت کو خدا تعالیٰ نے اس لئے بادشاہ مقرر فرمایا کہ اس کو علم اور جسم میں بڑی وسعت عطا ہوئی۔ یہ صفت جسمانی خدا کے اسم واسع کے ماتحت اور علم اسے خدا کے اسم علیم کے ماتحت دیا گیا ہے۔ اسی طرح

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ
مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ (الانعام: ۱۳۴)

ترجمہ: اور تیرا رب کسی کا محتاج نہیں (اور) رحمت والا ہے اگر وہ چاہے تو تمہیں ہلاک کر دے اور جس طرح تمہیں ایک دوسری قوم کی نسل سے کھڑا کیا ہے (اسی طرح) جسے چاہے تمہارے (ہلاک کرنے کے) بعد تمہارا جانشین کر دے۔

یہاں غنا اور رحم دو متضاد صفات کو ملایا ہے۔ یعنی وہ بے پروا بھی ہے اور رحمت والا بھی۔ غنا کی وجہ سے اے کافرو اب یہ حکومت تم سے لے لے گا اور رحم کی وجہ سے وہ اسے مسلمانوں کے حوالے کر دے گا۔

۵۔ داؤد نے خواب

إِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَآءَهٗ (آل عمران: ۱۷۶)
ترجمہ: یہ (ڈرانے والا) صرف (ایک) شیطان ہے وہ اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے۔

۹۹۔ عدالتوں کی اصلاح

آج کل عدالتوں میں بعض وکلاء عموماً گواہ پر نہایت تکلیف دہ نامناسب اور غیر متعلق جرح کرتے ہیں۔ جو یا تو خود اس کے مخالف پڑتی ہے یا اس کے جس کا وہ گواہ ہے۔ اور خواہ مخواہ ان کی تذلیل کی جاتی ہے۔ جب اسلامی اصول پر عدالتوں کی کارروائیاں ہونے لگیں گی تو اس وقت وکیلوں کے ایکٹ میں یک فقرہ بھی داخل کی جائے گی

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۵ (البقرہ: ۲۸۳)
ترجمہ: اور یہ امر یاد رہے کہ) نہ کاتب کو تکلیف دی جائے اور نہ گواہ کو۔
یعنی لکھنے والے اور گواہ کو کسی قسم کی تکلیف اور نقصان نہ پہنچایا جائے۔
(الفضل ۱۹ مارچ ۱۹۳۸ء)

۹۷۔ غنی کے لئے الاؤنس نہیں

سلسلہ کے بہت سے کام مبشروں اور ان لوگوں کو جن کا اپنا گزارہ معقول ہے مفت کرنے چاہئیں اور کرتے ہیں تاہم بعض لوگ ایسے کام کے لئے الاؤنس لینے کا خیال رکھتے ہیں۔ قرآن مجید کا فرمان ایسے لوگوں کے لئے یہ ہے۔

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء: ۷)
ترجمہ: اور جو کوئی مالدار ہو اُسے چاہئے کہ وہ (اس مال کے استعمال سے) بچتی

طور پر اجتناب کرے۔ لیکن جو نادار ہو وہ مناسب طور پر (اس مال میں سے) کھائے۔

یہ آیت گو بظاہر قومی یتیموں کی پرورش اور خدمت کے لئے ہے اور حکم یہ ہے کہ اگر ان کا نگران کھاتا پیتا ہو تو مفت ان کی خدمت اور تربیت اور تجارت اور معاملات کیا کرے اور ان کا حساب باقاعدہ رکھے۔ ہاں اگر خود محتاج ہو تو کچھ مناسب الاؤنس لے لے تاہم دین اور قوم کے سب کاموں پر بھی یہی اصول حاوی ہے۔ اور ہونا چاہیئے۔

۶۸۔ جن سے نکاح حرام ہے

مائیں (دادیاں۔ نانیاں ان میں داخل ہیں) بیٹیاں (پوتیاں، نواسیاں ان میں داخل ہیں) سگی بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں، بہوئیں۔ دو بہنوں کا ایک وقت جمع کرنا (اسی طرح بھتیجی اور پھوپھی، نیز خالہ بھانجی کا جمع کرنا) سوتیلی لڑکی جس کی ماں سے صحبت کر لی ہو۔ غیر کی منکوحہ سازواج النبی، مشرکات اور سوتیلی مائیں نیز رضاعت سے وہی رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو خون سے حرام ہیں۔ مُنہ بولے یا لے پالک بیٹے کی بیوی بعد طلاق جائز ہے کیونکہ لے پالک کا اسلام میں ناجائز ہے۔ وہ بیٹا نہیں ہوتا۔ چچیاں، ممانیاں بھتیج بہوئیں بھانجی بہوئیں اور سالے کی بیوی بعد طلاق یا وفات کے جائز ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں بعض رشتے خونی ہیں بعض تعلیمیؔ بعض باعثِ فساد ہونے کی وجہ سے اور بعض دودھ کی وجہ سے حرام کئے گئے ہیں۔ اسلام نے ایک درمیانی درجہ ان رشتوں کے لئے اختیار کیا ہے۔ نہ تو یہ مصیبت کہ گوت میں بھی نہ ہو۔ خواہ رشتہ سو پشت میں جا کر ملتا ہو۔ اور نہ اتنا قریب کیا۔ کہ سگی بہنوں سے شادی کر لی جانے۔ نہ پرانے لوگوں کی طرح دوسروں کی جوروؤں سے تعلق پیدا کرنے کی

اجازت دی۔ نہ ایک بیوی کے کئی کئی خاوند پہاڑی علاقوں کی قوموں کی مانند جائز قرار دیئے حقیقتاً نکاح کے متعلق پاکیزگی کا معیار اس سے پہلے کسی اور مذہب میں اتنا بلند پایا نہیں جاتا اور نہ اتنی سہولتیں پائی جاتی ہیں۔ نیوگ کے متعلق بیچارے ہندوؤں سے کیا کہیں جبکہ خود کتب مقدس میں بھی اس کا ذکر ہے۔ اسی طرح بیوہ عورتوں کی اور لونڈی غلاموں کی شادی اور پردہ پر زور دے کر دنیا کو بہت حد تک گندے حالات سے پاک کر دیا ہے۔ نیز مردوں کے لئے تعدد ازدواج جائز کر کے۔ زانیوں کو سزا دے کر تہام لگانے والوں کا منہ بند کر کے۔ جائز صحبت کے سوا ہر طریقہ شہوت رانی کو حرام کر کے متعہ، عزل، حلالہ اور محض شہوت رانی کے لئے نکاح کو منع فرما کر دنیا کو ہزارہا آلودگیوں سے صاف کر دیا ہے۔ الحمدللہ۔

۶۹۔ محکمات اور متشابہات

هُوَ الَّذِىْ يُصَوِّرُكُمْ فِى الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ
اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ هُوَ الَّذِىْۤ اَنْزَلَ عَلَيْكَ
الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ
مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ (آل عمران، ۶ء۷)

ترجمہ: وہی ہے جو رحموں میں جیسی چاہتا ہے تمہیں صورت دیتا ہے۔ اس کے سوا کوئی پرستش کا مستحق نہیں۔ وہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔
وہی ہے جس نے تجھ پر کتاب نازل کی ہے جس کی بعض (آیتیں تو) محکم آیتیں ہیں جو اس کتاب کی جڑ ہیں اور کچھ اور (ہیں جو) متشابہ ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے انسانی اور قرآنی سلسلہ کو آپس میں تشبیہہ دی ہے۔ یعنی ام الکتاب آیات (محکمات) ام انسانی کی طرح ہیں اور متشابہ آیات یُصَوِّرُكُمْ

فِی الْاَرْحَامِ یا حمل کے بچہ کی طرح ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اہل علم پران متشابہات کے معنی کھلتے ہیں۔ اور وہ بچہ بڑا ہو کر اپنے صاف نقش ونگار ظاہر کرکے کبھی اُم کے ماتحت آجاتا ہے جنین کی طرح متشابہ نہیں رہتا۔ پھر اور زمانہ گزرنے کے بعد خود اُم بن جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ متشابہ سے متشابہ متعلق بہ محکم اور پھر خود محکم بن جانے کا انسان کے بچہ کی طرح قرآنی آیات میں بھی زمانہ کے ساتھ برابر جاری رہے گا۔ بعض آیات قرونِ اولیٰ میں بالکل متشابہ تھیں۔ پھر قرونِ وسطےٰ میں وہ کسی محکم آیت کے ماتحت آگئیں یا اس سے متعلق ہوگئیں۔ اور اب اس زمانہ میں وہ اتنی صاف ہوگئیں۔ کہ خود محکمات میں داخل ہیں مثلاً پیشگوئیوں کی حامل آیات بعینہٖ اسی طرح جس طرح جنین ناقابلِ شناخت ہوتا ہے پھر لڑکی ہوا اور پیدا ہو جائے۔ تو وہ ماں کے ساتھ ساتھ پھرتی۔ اور اس سے مشابہ نقش ونگار رکھتی ہے۔ پھر بڑی ہو کر خود ماں بن جاتی ہے۔ یہ ارتقا تو لوگوں کے لئے ہے۔ ورنہ خدا کے نزدیک تو سب آیات اُم الکتاب یعنی محکمات ہی ہیں

وَاِنَّهٗ فِیْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ (الزخرف ۵۰)

ترجمہ:۔ اور وہ (یعنی قرآن) اُم الکتاب میں ہے اور ہمارے نزدیک بڑا عالی شان والا (اور) بڑی حکمتوں والا ہے۔

۷۰۔ آخرت کیا ہے۔

دُنیا کا ذکر تو پہلے پڑھ چکے۔ اب آخرت کا حال سن لو۔

جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ (آلِ عمران ۱۶)

ترجمہ:۔ ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں (وہ) اُن میں بسیں گے اور (نیز اُن کے لیے) پاک بیویاں اور اللہ کی

رضا مقصود ہے۔

یعنی تین چیزیں نہروں والے میوہ دار باغات۔ پاک بیویاں اور رضائے الٰہی۔ اور یہ سب دائمی۔ پہلی چیز انسان کے جسم کے بقا اور صحت کے لئے ہے۔ دوسری اس کے اخلاق و جذبات کی صحت و تکمیل کے لئے اور تیسری اس کی روح کی غذا ہے کیونکہ انسان تبھی کامل ہوتا ہے۔ جب اس کے جسم اور اخلاق اور روح تینوں کے لئے غذا اور سامان میسر ہو۔ ورنہ ناقص رہے گا۔ خواہ کسی عالم میں رہے۔ دنیا میں یہ چیزیں بغیر رضوان اللہ کے لعنت ہیں۔ پھر دائمی نہیں۔ ہاں رضائے الٰہی حاصل ہو تو بقدر ضرورت جائز ہیں۔

۱۷۔ حاجی لوگ خیال رکھیں

اللہ تعالیٰ نے حج کے ذکر میں یہ فرمایا ہے۔

وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (اٰل عمران : ۹۸)

یعنی جو کعبہ میں داخل ہوا وہ امن میں آگیا۔ سو حاجیوں کو قیام مکہ معظمہ میں کعبہ میں داخل ہو کر دُعا کرنا ضروری ہے۔ مگر وہاں یہ حال ہے کہ دروازہ مقفل اور بہت اونچا ہے۔ اور اتنے پیسے لے کر اندر جانے دیتے ہیں کہ غریب کے لئے تو کوئی موقعہ ہی نہیں۔ اس لئے خدا تعالیٰ کی مشیت نے غرباء کے لئے بھی ایک انتظام کر رکھا ہے یعنی وہ حطیم میں دُعا کریا کریں۔ حطیم وہ جگہ ہے جو کعبہ میں داخل ہے۔ مگر چھت کی لکڑی کم ہو جانے کی وجہ سے قریش نے مرمت کعبہ کے وقت اُسے باہر چھوڑ دیا تھا۔ اور اس کو چھوڑ وانا اور اب تک اسی حالت پر قائم رکھنا اس آیت کی مصلحت کے لئے ہے۔ تاکہ مسکینوں اور دوسرے لوگوں کو بھی ہر وقت موقع کعبہ میں داخل ہونے کا ملتا رہے۔ کیونکہ وہ درگاہِ غریب نواز ہے۔ (الفضل ۲۳ مارچ ۱۹۲۸ء)

۷۲۔ شرک اور مغفرت

ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے میرے گناہ گار بندو میری رحمت سے ناامید نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سب گناہ معاف کر دیتا ہے۔ اور دوسری جگہ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب گناہ معاف کر دیتا ہے مگر شرک ہرگز معاف نہیں کرتا۔

یہ بظاہر اختلاف ہے۔ مگر وہ اس طرح دُور ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں گناہوں کی معافی کے دو طریق ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خود ہی لوگوں کے گناہ بغیر ان کے توبہ کرنے کے بخشا رہتا ہے۔ بعض وجوہات سے اور تقاضائے صفتِ عفو کی وجہ سے۔ دوسرا طریق یہ کہ جب بندہ کسی گناہ سے توبہ کرے۔ تب وہ گناہ بخشا جاتا ہے ورنہ نہیں۔ شرک اس دوسری فہرست میں داخل ہے۔ اور اس کی بخشش خود بخود ہرگز نہیں ہو گی۔ ہاں توبہ کرے تو معاف ہو گا۔ پہلی قسم کے گناہ بغیر توبہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ شرک والی فہرست میں صرف شرک ہی نہیں۔ بلکہ بہت سے اور گناہ بھی ہوں گے۔ مثلاً خدا کے وجود سے ہی انکار کرنا۔ یا ایسے ہی اور کبائر۔

۷۳۔ وقت ضائع کرنا

لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ وقت ضائع کرنا بڑی بھاری غلطی ہے۔ قرآن نے اس کے متعلق کچھ نہیں فرمایا۔ افسوس ہے کہ انہوں نے غور نہیں کیا کہ قرآن نے مسلمانوں پر اتنی موقت پابندیاں اعمال اور عبادات کی لگا دی ہیں کہ وقت کو ضائع کرنا مسلمان کے لئے ممکن ہی نہیں رہا۔ کوئی عبادت مثلاً پانچ نمازیں۔ تہجد۔ روزہ، زکوٰۃ، حج اور اذکار و نوافل، اشراق، ضحیٰ۔ قرآن الفجر وغیرہ ایسی نہیں کہ وہ وقت سے مستغنی ہو۔

إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۔ (النساء : ۱۰۳)

ترجمہ : نماز مومنوں پر یقیناً ایک مؤقت فرض ہے ۔

اس کے علاوہ جنگ و جہاد کے لئے صرف آٹھ مہینے حلال ہیں باقی حرام۔ اور جرابوں پر مسح قائم رہنے تک کا بھی وقت مقرر ہے۔ اسی طرح مدتیں ۔

غرض کوئی چیز وقت کی حدود سے باہر نہیں۔ اگر کوئی وقت گنوا کرنے یا ضائع کرنے کے لئے باقی چھوڑا ہی نہیں۔ پھر صاف صاف حوالہ درکار ہے تو

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (المؤمنون ۲)

ترجمہ : اور جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں ۔

موجود ہے ۔

۴۷۔ عرب کے بدو

قرآن مجید میں جہاں متقیوں کے لئے نصیحتیں اور ہدایات ہیں وہاں لٹیرے بدوؤں کو بھی مخاطب فرمایا گیا ہے ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ (المائدہ ۲)

ترجمہ : اے ایمان والو! اللہ کے (مقرر کردہ) نشانوں کی بے حرمتی نہ کرو اور نہ حرمت والے مہینہ کی اور نہ (حرم کی طرف لے جائی جانے والی) قربانی کی اور نہ ایسی قربانیوں کی) جن کے گلے میں حرم کے ذبیحہ کے نشان کے طور پر ہار پہنائے گئے ہوں اور نہ بیت الحرام کی طرف جانے والے لوگوں کی ۔

یعنی اے مسلمانو شعائر اللہ اور کعبہ کو جانے والی قربانیوں کی بے حرمتی نہ کرو ۔

نہ حاجیوں کو تنگ کرو۔ یہ آخری خطاب خاص کر عرب کے لیٹرے بدوؤں سے ہے جو بیچارے حاجیوں پر لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ یہ حالت صدیوں تک رہی۔ اب اس کا تو امن ہے۔ مگر حاجیوں سے سرائیں۔ ریلوں۔ جہازوں اور بندرگاہوں پر بدسلوکی کرنے والے اسی طرح ٹھگ اور جیب کترے اب بھی بہت سے موجود ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کی بھی اصلاح کرے۔

۷۵۔ قرآن کی ایک عجیب خصوصیت

قرآنِ مجید نے اصلاح کی خاطر دوسری قوموں کے بڑے بڑے عیب بیان کئے ہیں۔ مگر وہ کبھی WHOLE SALE CONDEMNATION نہیں کرتا۔ ہر قوم کی برائی کرتے وقت نیکوں کا استثنا کر لیتا ہے۔ یہ بھی اس کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے۔ اس کا یہ اصول ہے کہ کوئی چیز ساری کی ساری بُری نہیں ہوتی۔ اور خواہ کیسی ہی خراب ہو۔ ایک حصّہ ضرور اچھا ہوتا ہے۔ یعنی شرِ محض کوئی چیز نہیں۔ مثال کے طور پر پڑھو۔

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (المائدہ ۱۴)

ترجمہ: اور تو ان کے چند (ایک افراد) کے سوا ہمیشہ ان (کی طرف) سے کسی (نہ کسی) خیانت پر اطلاع پاتا رہے گا۔

یعنی یہ اہل کتاب بڑے خائن ہیں۔ ہاں ان میں سے کچھ دیانتدار بھی ہیں۔

۷۶۔ نماز باجماعت

حضرت خلیفۃ المسیح ثانی نے کئی دفعہ فرمایا ہے کہ میرے نزدیک بلا عذر اگر کوئی جماعت کو ترک کرے تو اُس کی نماز نہیں ہوتی۔ اُن کے نزدیک اقامتِ صلوٰۃ

کے معنی ہی نماز باجماعت کے ہیں۔ ورنہ صَلُّوْا کہنا کافی تھا۔ اس اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃِ کے معنی خود قرآن میں دوسری جگہ ایسے الفاظ میں آئے ہیں۔ کہ اس کا مطلب سوائے نماز باجماعت کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور وہ ہے آیت

وَاَقِیْمُوْا وُجُوْھَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ۔ (اعراف ۳۰)

ترجمہ۔ اور یہ کہ ہر مسجد کے پاس اپنی توجہ درست کر لیا کرو

یعنی اَقِیْمُوْا الصَّلٰوۃِ میں نماز سیدھی کرنے کے معنی یہی ہیں کہ تم اپنا رُخ نماز کے لئے مسجدوں میں ہی جا کر سیدھا کیا کرو۔

۷۷۔ دوطرفہ محبت

تمام شعرا اور عشاق نے اس مضمون کو ادا کیا ہے کہ عشق و محبت دوطرفہ جذبہ ہے۔ عاشق کے دل میں تو محبت ہوتی ہی ہے مگر معشوق بھی ضرور اس سے محبت رکھتا ہے۔ بلکہ ابتدا محبوب کی طرف سے ہی ہوتی ہے۔ اس صداقت کو خدا تعالیٰ نے بھی بیان فرمایا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ

یُحِبُّھُمْ وَ یُحِبُّوْنَہٗٓ (المائدہ ۵۵)

ترجمہ۔ جن سے وہ محبت کرتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے۔

یعنی خدا کی محبت بھی ایسا ہی رنگ رکھتی ہے کہ وہ اپنے عاشقوں سے محبت کرتا ہے اور وہ اس کے شیدا ہوتے ہیں اور اس محبت میں پہل اسی کی طرف سے ہوتی ہے۔ حضرت مسیح موعودؑ (آپ پر سلامتی ہو) نے بھی اس مضمون کو ذیل کے شعر میں ادا کیا ہے

بے تیغ آگہی نبود زعشق و وفا مرا
خود ریختی متاع محبت بدامنم (الفضل ۲۷ مارچ ۱۹۴۸ء)

۸۷۔ بعض قول عمل سے بھی افضل ہوتا ہے

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ (المائدہ ۸۶۱)

ترجمہ ۔ پس اللہ ان کی (اس) بات کے بدلہ میں انھیں وہ بہشت عطا فرمائے
گا۔ جن کے اندر نہریں بہتی ہوں گی۔

یعنی ان کے اس قول کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے کہنے والوں کو جنت میں داخل کر دیا۔
یہاں بِمَا عَمِلُوا نہیں فرمایا۔ واقعی کوئی قول ہی ایسا ہوتا ہے کہ انسان
اس کی جزاء میں جنت پالیتا ہے۔ جیسے ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
کہا کہ یارسول اللہ۔ آپ ہم کو موسائیوں کی طرح

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ (المائدہ ۲۵۱)

ترجمہ ۔ تو اور تیرا رب (دونوں) جاؤ اور (ان سے) جنگ کرو۔

کہنے والا نہ پائیں گے۔ بلکہ ہم آپ کے دائیں اور بائیں۔ آگے اور پیچھے دشمنوں سے
لڑیں گے۔ اور وہ ہماری لاشوں پر سے گزرنے کے سوا آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔
یہ سن کر ایک دوسرے صحابی بیان کرتے ہیں کہ کاش یہ بات میرے مُنہ سے نکلتی اور اس
کے عوض وہ کہنے والا میرے سارے اعمال اور جہادوں کا ثواب لے لیتا۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ قول ہے جو انھوں نے اسلم کے
جواب میں کہا یعنی

اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (البقرہ ۱۳۲)

ترجمہ ۔ میں تو پہلے ہی سے تمام جہانوں کے رب کی فرمانبرداری اختیار کر چکا ہوں۔

۷۹۔ اللہ کے معنی

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو مباحثہ اپنی قوم سے کیا۔ اور کواکب آسمانی کی الوہیت کی تردید کی۔ اس میں

هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ (الانعام: ۷۹)

ترجمہ: یہ میرا رب ہو سکتا ہے یہ بیشک سب سے بڑا ہے۔

اور لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (الانعام: ۷۷)

ترجمہ میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

کہہ کر یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ اللہ ایسا ہونا چاہیئے جس میں کوئی نقص نہ ہو بلکہ جس میں سب سے زیادہ اور عظیم الشان خوبیاں ہوں۔ یہی تعریف خدا کی، اور یہی معنی اللہ کے اسلام نے بھی کئے ہیں۔ بلکہ حدیث میں تو اللہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ یعنی جو ہر نقص سے پاک ہو۔ ہر خوبی رکھتا ہو۔ پھر اس کی خوبیاں بھی معمولی رنگ کی نہ ہوں۔ بلکہ اتنی عظیم الشان ہوں کہ اس کے مقابلہ پر کسی کی خوبی کچھ حقیقت نہ رکھتی ہو۔ مثلاً خدا بخیل نہیں ہے بلکہ وہ سخی ہے۔ اور اس کی سخاوت اتنی عظیم الشان ہے کہ اس کی گرد کو بھی کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ یہی حال باقی سب صفات کا ہے۔

۸۰۔ متشابہ و غیر متشابہ

وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ (الانعام: ۱۰۰)

ترجمہ اور انگوروں اور زیتون اور انار کے ایسے باغات (نکالتے ہیں) جن

میں سے بعض آپس میں ملتے جلتے ہیں اور (بعض) مختلف ہیں ۔
فوائد اور تاثیر میں بعض تو اکر بعض کے موافق ہیں اور بعض بعض کے مخالف بشتو آم اور جامن آپس میں مخالف ہیں۔ سنگترہ اور ماش آپس میں موافق ۔ انجیر قبض کشا ہے تو ٹیلے یا ٹینٹ سخت قابض۔ لیموں سے کھانسی ہوتی ہے تو شہتوت سے دُور ہو جاتی ہے ۔

۱۰۸۔ ہر آدمی آدم ہے

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (الاعراف ۱۱)

ترجمہ :۔ اور ہم نے تمہیں (پہلے مبہم شکل میں) پیدا کیا تھا۔ جس کے بعد تم کو (تمہاری مناسب حال) صورتیں بخشی تھیں پھر ملائکہ سے کہا تھا کہ آدم کی اطاعت کرو ۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم والا قصہ ہر انسان پر چسپاں ہوتا ہے۔ ہر ایک کی خدمت کے لئے ملائکہ اور بہکانے کے لئے شیطان متعین ہوتا ہے۔ پھر جب بھی حضرت کا بلس اُترتا ہے تو وہ نافرمانیٔ الٰہی سے ہی اُترتا ہے ۔ اور انسان دھوکے میں آکر اُس فطرتی جنت کو کھو بیٹھتا ہے ۔ جو اسے ملی تھی۔ ہاں پھر توبہ کرے تو ایک نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔

غرض مجملاً تمام واقعات آدم والے اس کے ہر فرزند کو پیش آتے ہیں۔ پس بجائے آدم اوّل کے اپنے حالات پر غور کرو تو یہ قصہ زیادہ دلچسپ ہو جائے گا۔ اس آیت میں ہر انسان مخاطب ہے۔ اس لئے کہ یہ معاملہ ہر انسان کو ہی پیش آتا ہے

۸۴ رسُولوں سے باز پرس

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ (الاعراف: ۷)

ترجمہ: پس ہم (ان لوگوں سے بھی) ضرور پوچھیں گے جن کی طرف رسُول بھیجے گئے تھے اور ہم رسُولوں سے ضرور پوچھیں گے۔

یعنی ہم قیامت کو نہ صرف ان لوگوں سے باز پرس کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے۔ بلکہ خود رسولوں سے بھی باز پرس ہوگی چنانچہ ایک رسول کی باز پرس کا تفصیلی نمونہ سورۂ مائدہ کے آخری دو رکوعوں میں مذکور ہے اور یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ (المائدہ: ۱۱۰)

ترجمہ: اس وقت اللہ (عیسیٰ ابن مریم سے بھی) کہے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! جو نعمت میں نے تجھ پر اور تیری ماں پر نازل کی تھی اس کو یاد کر۔

یہاں سے خدا تعالیٰ ایک ایک کرکے سب نعمتوں کی فہرست گنواتا ہے جو اس نے عیسیٰ علیہ السلام پر کیں۔ اس لمبی فہرست کے بعد پھر پوچھتا ہے کہ

.... يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (مائدہ: ۱۱۷)

یعنی اب فرمایئے۔ کیا باوجود ان احسانات کے آپ نے لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی کہ مجھے اور میری ماں کو پوجا کرو۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باقاعدہ طول طویل اور مدلل جواب درج کیا ہے پھر اس جواب کو منظور کیا ہے اور آفریں فرمایا ہے۔

هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ..... الخ (المائدہ ۱۲۰)

ترجمہ۔ یہ دن (ایسا) ہے جس میں صادقوں کو اُن کی سچائی نفع دے گی۔

غرض باوجود اس کے کہ مسیح علیہ السلام بے گناہ تھے اور ان کا حساب کتاب حِسَابًا يَسِيْرًا کے ماتحت ہے۔ پھر بھی اس سوال جواب نے دہشت زدہ کر دیا ہے۔ لیکن ہم لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ جو سراسر آلودہ اور گناہوں کی پوٹ ہیں۔ اور ہم نے اپنے افعال کے بارے میں وہاں کے لئے کیا کیا جواب اور کیا کیا دلائل تیار کر رکھے ہیں۔

۸۳۔ بوجھ سر پر یا پُشت پر؟

دُنیا میں اکثر قومیں پُشت پر بوجھ اُٹھاتی ہیں۔ مگر ہندوستان میں عموماً بوجھ سر پر اٹھایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق بحث بھی رہی ہے کہ بوجھ اٹھانے کے لئے سر موزوں ہے یا پُشت۔ اور فریقین نے موافق اور مخالف ہر طرح کے دلائل بھی دیئے مگر فیصلہ نہ ہوا۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے پُشت کو بوجھ اٹھانے کے لئے بنایا ہے۔ چنانچہ حیوانوں میں یہی ہے۔ اس لئے انسانوں میں یہی ہونا چاہیئے مگر اس آیت نے تو مضمون صاف ہی کر دیا۔

وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ (الانعام ۳۲)

ترجمہ۔ اور وہ اس وقت اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

۸۴ ۔ بنیوں کی قوم میں رسول

ہر قوم میں رسول آیا۔ بنیوں میں بھی۔ کیونکہ یہ قوم ہر ملک میں پائی جاتی ہے اور وہ رسول حضرت شعیبؑ تھے جو بنیوں سے کہتے تھے کہ

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ

(الاعراف ۸۶)

ترجمہ:۔ پس چاہیئے کہ ماپ اور تول دونوں پورے دیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں حق سے کم نہ دیا کرو۔

یعنی ناپ تول پورا کرو اور لوگوں کو چیزیں کم نہ دیا کرو۔ ڈنڈی مارنا تو بنیوں کی ہی صفت ہے۔ دوسری قومیں یہ کام نہیں کیا کرتیں۔ ہندوؤں میں مشہور ہے کہ ہر قوم میں اوتار ہوا ہے۔ چھتری۔ ویش۔ شودر۔ حتیٰ کہ مگرمچھ اور کچھوے کی شکل میں بھی اوتار ظاہر ہوئے۔ مگر آج تک دُنیا میں کبھی کوئی اوتار برہمنوں میں پیدا نہیں ہوا۔ سوائی کو مُبارک ہو کہ ”برہمن اوتار“ بھی آگیا۔ اور ہم نے اسے خود دیکھ لیا اور خدا تعالیٰ نے اس کا نام ہی اپنے الہام میں برہمن اوتار رکھا۔ تاکہ ایک قوم کے متعلق جو کمی تھی وہ پوری ہو جائے۔ علمی زمانے کے لئے برہمن ہی موزوں تھا۔ (الفضل ۳۰ مارچ ۱۹۳۸ء)

۸۵ ۔ حضرت ابراہیمؑ اور جھوٹ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بابت لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے بھی (نعوذ باللہ) تین ایسے جھوٹ بولے جو تاریخی ہو گئے۔ ایک تو یہ کہ اپنی جان بچانے کو اپنی بیوی سارہ کو بادشاہ مصر کے سامنے اپنی بہن ظاہر کیا۔ دوسرے اپنے تئیں بیمار کہا اور جب لوگ ان کو کلام کیلئے چھوڑ کر چلے گئے تو ایک وزنی کدال سے کر بُت خانہ کے قریباً سب

بت توڑ ڈالے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیمار نہ تھے۔ بیمار ہوتے تو تھوڑی دیر بعد یہ سخت کام کس طرح کر سکتے۔ تیسرا جھوٹ یہ کہ جب سب بُت توڑ ڈالے تو بڑا بُت باقی چھوڑ دیا۔ لوگوں نے جب دیکھ کر غل مچایا۔ تو کہا کہ ان بتوں کو اس بڑے بُت نے توڑا ہے میں نے نہیں توڑا۔ اس وقت میں صرف جھوٹ نمبر ۲ کا ذکر کروں گا۔ اس مضمون کے لئے سورۃ صافات دیکھیں جہاں لکھا ہے

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ ۝ فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ ۝
فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِينَ ۝ فَرَاغَ إِلَىٰ آلِهَتِهِمْ
فَقَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ۝ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُونَ ۝ فَرَاغَ
عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ ۝ (الصّٰفّٰت، ۸۹ تا ۹۴)

ترجمہ: پھر اس نے ستاروں کی طرف دیکھا۔ اور کہا کہ میں بیمار ہونے والا ہوں۔
پس وہ لوگ اُسے چھوڑ کر چلے گئے۔ اور وہ بھی اُن کے معبودوں کی
طرف چپکے سے چلا گیا اور اُنھیں دیکھ کر کہا، کیا تم کچھ کھاتے نہیں؟
تمھیں کیا ہوا کہ تم بولتے بھی نہیں؟ پھر چپکے سے اپنے دائیں ہاتھ سے
ایک کاری ضرب اُن پر لگائی۔

مطلب یہ کہ ایک دن اپنے باپ اور اپنی برادری سے انہوں نے کہا۔ کہ تم کیوں جھوٹے معبودوں کی پرستش کرتے ہو۔ رب العالمین کی بابت تمہارا کیا خیال ہے اسے کیوں ترک کر رکھا ہے۔ اس پر ابراہیم علیہ السلام اور ان لوگوں میں نجوم سماویہ کے مؤثر حقیقی ہونے کی بابت ایک باقاعدہ مناظرہ ہوا۔ کیونکہ ان کی قوم ستارہ پرست تھی۔ یہ وہی مناظرہ ہے جو دوسری جگہ کوکب اور قمر اور شمس اور لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مناظرہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اب جاؤ کافی بحث ہو چکی ہے۔ میری طبیعت اچھی نہیں میں زیادہ گفتگو نہیں کر

سکتا۔ اس پر وہ لوگ چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ابراہیم علیہ السلام اُٹھ کر چپکے سے بُت خانہ میں گئے اور چھوٹے بتوں کو توڑ ڈالا۔

بس اتنا قصہ ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام راستباز تھے۔ ان کی طبیعت ضرور یا تو پہلے سے ناساز ہو گی۔ یا ساری برادری کی کیں کیں سے جو ایسے مباحثوں کے وقت ہونی لازمی ہے۔ ناساز ہو گئی ہو گی۔ ایک ادھر سے کھینچتا ہو گا۔ دوسرا ادھر سے۔ غرض انہوں نے سر کھایا ہو گا۔ کیونکہ اس زمانہ میں پریذیڈنٹ میرمجلس تو ہوتے نہ تھے اور برادری یوں بھی سر کھانے کا حق رکھتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ شدید سردرد ہو گیا ہو گا۔ غرض انہوں نے مشکل سے ان لوگوں سے پیچھا چھڑایا جب وہ چلے گئے تو آپ آرام کے لئے لیٹ گئے۔ اور کچھ مدت کے بعد جب درد کو سکون ہوا تو بت توڑنے کو نکلے۔ یہ کہنا کہ بیمار تھے تو چل پھر کیونکر سکتے تھے۔ غلط ہے۔ کیونکہ ٹائیفائیڈ یا فالج یا وجع المفاصل کے بیمار تو نہ تھے کہ ہل نہ سکتے۔ اگر ایسے ہوتے تو ایسا جنگی مباحثہ کیونکر ہو سکتا۔ جو غالباً ایک شام سے شروع ہو کر دوسری شام تک رہا ہو گا۔ ورنہ کوکب اور چاند اور سورج سب کا طلوع اور غروب کیونکر دیکھا جا سکتا اور ایسے مباحثہ کے بعد جو غروب آفتاب کے وقت بند ہو۔ انہوں نے رات بھر ضرور آرام کیا ہو گا۔ صبح کو جب لوگ اپنے کاموں پر چلے گئے۔ تو ان کے لئے اچھا موقعہ تھا کہ بُت شکنی کریں۔ بالفرض اگر رات بھر نہیں بلکہ گھنٹہ دو گھنٹہ بھی آرام کیا تھا۔ تب بھی بُت توڑنا مشکل کام نہ تھا۔ کیونکہ مباحثہ کی سردردی دو گھنٹہ آرام سے کم بھی دُور کی جا سکتی ہے۔ اور مباحثہ کے لئے تو وہ سقیم تھے۔ کیونکہ وہ دماغی کام تھا۔ مگر بُت توڑنا صرف جسمانی کام تھا۔ اس لئے وہ کر سکتے تھے۔ بلکہ جسمانی کام تو دماغی کوفت کو دُور کر دیتا ہے۔ کیونکہ دماغ آرام کرتا ہے اور جسم کام کرتا ہے۔ غرض یہاں سقیم کے معنی صرف عارضی کوفت اور تکان اور سردرد وغیرہ ہے۔ زیادہ نہیں ورنہ مباحثہ کس طرح ہو سکتا۔

پھر کچھ آرام کر کے محض ایک جسمانی کام کرنا یعنی برتن کو توڑ ڈالنا ایک دماغی کوفت اور تکان والا بخوبی کرسکتا ہے۔ اور وہ بت بھی معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے اور نازک تھے کہ صرف ایک ہاتھ کی مار سے ٹوٹ جاتے تھے۔ جیسا کہ ضَرۡبًا بِالۡیَمِیۡنِ سے معلوم ہوتا ہے۔ سو اس ساری واردات میں جھوٹ کہاں سے آیا۔ انہوں نے اپنے تئیں مریض تو نہیں کہا صرف سقیم ہی کہا ہے۔ اور وہ معمولی شکایات کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کلام میں کچھ نقص ہو تو اسے بھی کلام سقیم کہہ دیتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ایسا مرض ہو جو گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ والا حال رکھتا ہو۔ بعض دفعہ کمزوری اعصاب کی وجہ سے وہی انسان ابھی مردہ کی طرح ہو جاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر میں اُٹھ کر کام بھی کرنے لگ جاتا ہے۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) اکثر اس طرح بیمار ہو جایا کرتے تھے کہ گویا قریب المرگ ہیں۔ پھر تھوڑی دیر میں اُٹھ کر تصنیف کے کام میں اسی طرح مصروف ہو جاتے تھے۔ سو ایسی بھی کئی بیماریاں ہوتی ہیں خصوصاً دردِ سر دوران والی امراض۔

۸۶۔ دُعا بھی عبادت ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ الدعاء ھو العبادۃ۔ یعنی دُعا ہی تو اصل عبادت ہے۔ اس مضمون کی اصل قرآن مجید میں موجود ہے۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ (المومن: ۶۱)

ترجمہ: اور تمہارا رب کہتا ہے مجھے پکارو، میں تمہاری دُعا سنوں گا۔ جو لوگ ہماری عبادت کے معاملہ میں تکبّر سے کام لیتے ہیں وہ ضرور جہنم میں رُسوا ہو کر داخل ہوں گے۔

یعنی خدا کا حکم ہے کہ لوگ مجھ سے دعا کیا کریں۔ مَیں ان کی دُعائیں قبول کروں گا۔ یقیناً وہ لوگ جو تکبر کے مارے میری یہ عبادت نہیں کرتے وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ سو یہاں دعا کا نام عبادت ہی رکھا ہے۔

۸۷۔ بدی کا علاج

بدی کا علاج بدی بھی ہے۔ اور بدی کا علاج نیکی بھی ہے۔ مگر دونوں طریق علاج برابر نہیں ہیں۔ بدی کے بدلے بدی کرنا جو طریق علاج ہے۔ وہ ادنیٰ ہے اور بدی کے بدلے نیکی کر کے اس کا علاج کرنا یہ طریقہ خدا تعالیٰ کو بہت پسند ہے دونوں طریقے علاج کے برابر نہیں ہو سکتے۔ مؤخر الذکر طریقہ زیادہ مؤثر اور اعلیٰ لوگوں کی سُنت ہے۔

ایک جگہ فرمایا کہ۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ (الشوریٰ: ۴۱) ترجمہ: کہ بدی کا بدلہ اتنی ہی بدی ہوتی ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ
اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ (حٰم السجدہ: ۳۵)

اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتی۔ اور تُو بُرائی کا جواب نہایت نیک سلوک سے دے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شخص کہ اس کے اور تیرے درمیان عداوت پائی جاتی ہے، وہ تیرے حُسنِ سلوک کو دیکھ کر ایک گرم جوش دوست بن جائے گا۔ (الفضل ۳۱ مارچ ۱۹۳۰ء)

۸۸۔ شیطان

جنگ بدر میں کہتے ہیں کہ شیطان بھی آیا تھا۔ جب فرشتوں کی فوج دیکھی تو اُلٹا

جیا گا ۔ لوگ ہمیشہ ایسے سوال کرتے رہتے ہیں کہ کیوں جی ۔ شیطان کا الگ کوئی وجود ہے کیا اس کی نوع یا ذریت بھی ہے ۔ کیا آدم کے وقت والا اب بھی زندہ ہے یا نہیں ۔ ایسے سوالات اُن لوگوں کے لئے تو جائز ہیں جو فرشتوں کے وجود کے منکر ہیں ۔ لیکن تعجب ہے کہ یہ سوالات وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو دوسروں سے بڑا ملائکہ فرشتوں کا وجود منواتے ہیں ۔ اگر لطیف اور غیر مرئی وجود ہوا کرتے ہیں ۔ تو پھر جیسا جبرائیل کا ماننا ویسا شیاطین اور جنات کا ماننا ۔ اگر نیکی کے محرک غیر مرئی وجود کو مانتے ہو تو بدی کے غیر مرئی وجود کے محرک کو ماننے میں کیا دقّت ہے ۔ اگر آدم کے وقت کے فرشتے اب تک زندہ ہیں تو اس وقت کا شیطان بھی زندہ رہ سکتا ہے ۔ اگر ہر فرشتہ کے ماتحت ہزاروں ، لاکھوں چھوٹے درجہ کے فرشتے مانتے ہو تو کسی بڑے شیطان کی ذریت یا اس کا لشکر ماننے میں کیا خرابی ہے ۔ ایک دائمی خیر ہے ۔ دوسرا دائمی شر ۔ ہمارے نزدیک تو فرق صرف اتنا ہے کہ ہم کو ایک کی بات ماننی چاہیئے ۔ اور دوسرے کی نافرمانی اور کفر کرنا چاہیئے ۔ باقی جو دلائل ایک کے وجود کے ہیں ۔ وہی دوسرے کے اگر فرشتہ نیک تحریک کرتا ہے تو شیطان بُری اگر فرشتہ الہام کرتا ہے تو شیطانی الہام بھی مشہور ہیں ۔ اگر فرشتہ ایمان کو مضبوط کرتا ہے ۔ تو خناس وسوسے ڈالتا ہے ۔ اگر فرشتہ متمثل ہو سکتا ہے تو شیطان کیوں نہیں ۔ غرض مثبت اور منفی بجلیوں والا فرق ہے ۔ ورنہ اس عقیدہ پر کوئی اعتراض تو پیدا نہیں ہوتا ۔

۸۹ ۔ سرحد پر چوکیاں

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ

(الانفال ۶۱)

اے مسلمانو! تم دشمنوں کے مقابلہ کے لئے تیاری کرو۔ اپنی قوت بڑھاکر۔ اور سرحد پر گھوڑے باندھ کر۔ تاکہ دشمنانِ خدا اور تمہارے دشمن خوف کے مارے سر نہ اُٹھا سکیں۔

ایک رباط الخیل یعنی سرحد پر چوکیاں بنا کر اُسے مضبوط کرنا روحانی بھی ہوتا ہے اور مُراد اس سے یہ ہے کہ اعضاء اور جوارح کو گناہوں سے بچاؤ اور فرمانبرداری پر لگاؤ۔ اور ان کی حفاظت کرو۔ تاکہ دل جو دارالخلافہ ہے خودبخود محفوظ رہے۔ جوارح مملکتِ جسمِ انسانی میں بطور سرحد کے ہیں۔ اور انہی کے راستے شیطان انسان کے اندر داخل ہوتا ہے۔ اسی لئے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے فرمایا ہے کہ اپنی آنکھ کو نیچا رکھ۔ تاکہ تیرا دل پاک رہے۔

۴۰۔ سُوْرَةٌ مِّنْ مِّثْلِهٖ

فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (البقرہ ۲۴)

ترجمہ:۔ اِس جیسی ایک سورۃ لے آؤ۔

یعنی اس سورۃ بقرہ جیسی کوئی سورۃ بنا کر دکھاؤ۔ بعض چھوٹی سورتوں میں دعویٰ کیا گیا ہے۔ کہ ایسی دس سورتیں بنا کر لاؤ۔ جس جس سورۃ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے وہاں من مثلہ سے وہی سورۃ مراد ہے۔ مثلاً یہاں یہ مراد ہے کہ سورۃ بقرہ جیسی حجم میں۔ احکام میں۔ علوم الٰہیہ میں۔ عبرت میں۔ نصائح میں۔ جسمانی اور روحانی ہدایات میں۔ دلائل و مباحثات میں۔ مخصوص مطالب میں۔ فصاحت و بلاغت میں پیشگوئیوں میں۔ دعاؤں میں نتائج و اثرات میں۔ یعنی سب خوبیوں کی جامع۔

۹۱۔ جہنم کا نمونہ

ایک دفعہ ایک نیچری نے دوزخ پر ہنسی اُڑائی۔ کہ وہ کہاں ہوگا۔ اور اتنی آگ جس میں اتنی مخلوق پڑے کس جگہ رکھی جائے گی۔ اور وہ لاکھوں برس کس طرح جلتی رہے گی۔ اور ایندھن اس کا کہاں رکھا ہوگا۔ میں نے کہا۔ روحانی جہنم تو انسان کے اپنے اندر ہے۔ مگر ذرا کمرے سے باہر تشریف لائیے تو جسمانی جہنم آپ کو اپنی آنکھوں سے دکھا دوں۔ باہر دھوپ میں نکل کر میں نے کہا کہ وہ اوپر کیا ہے۔ کہنے لگا سورج۔ میں نے کہا یہ جہنم ہے یا نہیں۔ اگر اس میں زمین کے باشندے تو کیا لاکھوں کروڑوں گنا انسان بھی ڈال دیئے جائیں تو کیا سما نہیں سکتے۔ کیا اس کا ایندھن عجارہ نہیں ہیں۔ کیا اس میں شعلے مارنے والی آگ لاکھوں برس سے جل نہیں رہی۔ آگے خدا کو علم کہ اصلی جہنم کیا ہوگا۔ مگر تمہاری بصیرت کے لئے تو یہ نمونہ کافی ہے۔

۹۲۔ قرآن سے اُتر کر تورات افضل ہے

جتنے سلسلے انبیاء کے اسلام سے پہلے گذرے ہیں۔ ان میں سب سے افضل موسوی سلسلہ تھا اور سب سے افضل کتاب تورات۔ قرآنِ مجید نے اسی بات کے لئے فرمایا:۔

قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ
إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (القصص، ۵۰)

ترجمہ:۔ تو کہہ دے کہ (اگر موسیٰ اور ہارون اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب کی باتیں جھوٹی ہیں تو) اگر تم سچے ہو تو اللہ کے پاس سے ایک

ایسی کتاب لاؤ جو ان دونوں کتابوں سے زیادہ ہدایت دیتی ہو تا کہ میں اس
کی اتباع کروں۔

یعنی قرآن کے بعد جملہ کتب میں سے تورات سب سے زیادہ درجہ رکھتی ہے
مگر لطف یہ ہے کہ جب قرآن اور تورات کا مقابلہ کیا جائے تو پھر قرآن مجید کی قدر
معلوم ہوتی ہے۔

۹۳۔ ایکٹ قتل اولادِ نرینہ

یہ ایکٹ بھی پرانی تہذیبوں کا ایک نمونہ ہے۔ مصر کے فراعنہ۔ بنی اسرائیل پر
کبھی کبھی دفعہ ۱۴۴ یا تعزیری پولیس کی طرح۔ ایکٹ قتل پسران و موقت جاری کر دیتے
تھے اور وہ بھی قومی سزا کے طور پر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت بھی
یہ ایکٹ جاری تھا۔ پھر ان کے مبعوث ہونے پر جاری ہوا۔ جیسا کہ فرعون نے سنقتل
ابناء ھم کہہ کر یہ اشارہ کیا کہ عنقریب ہم پھر اس ایکٹ کو نافذ کر دیں گے۔ اگر ہمیشہ
جاری رہتا۔ تو وہ قوم بالکل فنا ہو جاتی یا بغاوت کر دیتی۔ یا ملک سے نکل جاتی۔

۹۴۔ قتلِ انبیاء

وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ (البقرہ ۶۲)

ترجمہ۔ اور نبیوں کو ناحق قتل کرنا چاہتے تھے۔

قتلِ انبیاء کے بارے میں دو عقیدے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ ناممکن ہے
دوسرا گروہ اس کا قائل ہے۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے حَکَم بن کر یہ
فیصلہ کیا ہے کہ کسی سلسلہ کا اول اور آخر نبی قتل نہیں ہوتا۔ درمیان کا کوئی نبی قتل ہو سکتا

ہے۔ تاریخ بھی یہی شہادت دیتی ہے۔ مثلاً موسوی سلسلہ میں حضرت یحییٰ شہید ہوئے۔
قتلِ انبیا اس لئے بھی جائز ہے کہ خدا تعالیٰ نے انبیاء میں سے شہدا کے نمونے بھی لینے
تھے۔ اور اس لئے بھی کہ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ کے مطابق نبی کے لئے موت اور
قتل دونوں جائز ہیں۔

۹۵۔ ذبحِ بقر

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً (البقرہ ۶۸)
ترجمہ: اللہ تمہیں گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔
کے فرمان کے مطابق قادیان میں بھی حالات نے مجبور کر کے ایک مذبح بنوا دیا۔
حضرت مسیح موعود آپ پر سلامتی ہو فرمایا کرتے تھے۔ کہ اکابر امت نے لکھا ہے کہ
لحم البقر بھی کشف حاصل کرنے کا ایک نسخہ ہے۔ سو وہ ایسی ہی گائے ہو گی جیسی
بنی اسرائیل نے ذبح کی تھی۔ یعنی جوان زرد شوخ رنگ۔ آزاد بے عیب ایسی گائے
سے البتہ کشوف ہونے ہوں گے۔

۹۶۔ جہنمی ہونے کا اصل

جہنمی بن جانے کی شرط یہ ہے کہ ارادۃً خدا کی نافرمانی کرے۔ اور پھر گناہوں
کی اتنی کثرت کرے کہ وہ اس شخص کا احاطہ کر لیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے
بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّاَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْٓـَٔتُہٗ فَاُولٰٓئِکَ
اَصْحٰبُ النَّارِ (البقرہ ۸۲)
ترجمہ: کیوں نہیں، جو لوگ بھی کسی قسم کی بدی کمائیں گے اور ان کا گناہ انہیں
(چاروں طرف سے) گھیرے گا وہ دوزخ (میں پڑنے) والے ہیں۔ وہ

اس میں (پڑے) رہیں گے۔ (الفضل یکم اپریل ۱۹۳۸ء)

۹۷۔ حق تلاوت

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ (البقرہ: ۱۲۲)

ترجمہ: وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کی (اسی طرح) پیروی کرتے ہیں جس طرح اس کی پیروی کرنی چاہیئے۔

حق تلاوت یہ ہے کہ کتاب الٰہی کو پڑھے۔ ایمان سے محبت سے غور و دل سے، غور و فکر سے، خوش آوازی سے، عمل کے لئے مقدم کرنے کے لئے طلب ہدایت کے لئے، عبرت کے لئے، باقاعدہ اور دن رات کے مختلف اوقات میں اور کچھ حصہ حفظ بھی ہو۔

۹۸۔ جو بھی گندے کام بتائے وہ شیطان ہے

اِنَّمَا یَاْمُرُکُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ (البقرہ: ۱۷۰)

یعنی شیطان ہی برائی اور بے حیائی کے کام بتاتا ہے۔

نوجوانوں کو یہ خاص طور پر یاد رکھنا چاہیئے کہ جو بھی بدی اور بے شرمی کی باتیں سکھائے وہ شیطان ہے۔ اس سے دور رہیں۔

۹۹۔ بہشتی مقبرہ

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا

بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ○ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ○ (حٰم السجدہ ۳۱،۳۲)

جن لوگوں نے کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اُس پر ثابت قدم رہے۔ اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کھاؤ بلکہ خوشخبری ہو تم کو اس جنت کی جس کا وعدہ تمہیں دیا گیا تھا۔ ہم دُنیا اور آخرت دونوں جگہ تمہارے دوست اور مددگار ہیں۔

اس آیت کی رو سے ضروری ہے کہ ہر سچا مومن دنیا میں ہی اپنے مرنے سے پہلے خدا کی طرف سے بہشتی ہونے کی خوشخبری پالے۔ ورنہ اُس کا حساب خدا کے ساتھ ہے۔ اس زمانہ میں بطفیل حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) یہ بشارت بہت زیادہ آسان ہو گئی ہے۔ کیونکہ یہ زمانہ

وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ (التکویر ۱۴)

(ترجمہ) اور جب جنت کو قریب کر دیا جائے گا۔

کا ہے۔ اب مومن سے مراد وہ لوگ ہیں جو سلسلہ احمدیہ میں داخل ہیں اور بشارت دہندہ فرشتے کارکنان مجلس کارپرداز مقبرہ بہشتی ہیں اور بشارت وہ سرٹیفکیٹ ہے۔ جو وصیت قبول ہو کر جاری ہوتا ہے۔ پہلے زمانوں میں تو جان و مال دونوں کا پورا سودا ہوتا تھا۔ اب دسواں حصہ مال کا اور دو مومنوں کی شہادت کافی ہے کہ موصی نیک عامل بر شریعت اور منہیات سے بچنے والا متقی ہے۔

اور پہلوں کے جنتی ہونے کا آج تک کسی کو پتہ نہیں۔ مگر یہاں تو جو اُس مقبرہ میں داخل ہو گیا۔ وہ مرتے ہی بہشتی مشہور اور ریکارڈوں میں بہشتی مندرج اور واقعی بہشتی بلا ریب و بلا شبہ۔ اب بھی جو وصیت نہ کرے۔ وہ بدقسمت ہے۔

۱۰۰۔ دعوے کے ساتھ دلائل کے نمونے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زبان سے خدا نے فرمایا کہ میں عالم الغیب نہیں ہوں۔ یعنی ولا اعلم الغیب۔ اس کی دلیل ایک جگہ یوں دی۔

وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۛ (اعراف، ۱۸۹)

یعنی اگر میں عالم الغیب ہوتا تو ہمیشہ فائدہ ہی میں رہتا۔ اور مجھے کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَقِمِ الصَّلٰوةَ یعنی تو نماز پڑھ۔ ساتھ ہی اس کی دلیل یہ دیتا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ یعنی نماز بے حیائی اور نامعقول باتوں سے بچاتی ہے۔ اسی طرح

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (الانعام: ۱۰۴)

انسانوں کی نظریں خدا کو نہیں دیکھ سکتیں۔ بلکہ وہ ان کی بینائی کو دیکھتا ہے۔ دلیل اس پر یہ ہے کہ وہ لطیف ہے۔ اس لئے لوگ اُسے نہیں دیکھ سکتے اور خبیر ہے اس لئے وہ لوگوں کی قوتِ بینائی اور ان کے سمی نقوش تک کو دیکھ لیتا ہے۔

غرض قرآن اول سے آخر تک نہایت مدلل کتاب ہے اور ہر مسئلہ پر یا وہیں یا آگے پیچھے کہیں نہ کہیں دلیل موجود ہوتی ہے۔ یہ بڑا دلچسپ مضمون ہے اگر کوئی اس طرف متوجہ ہو۔

۱۰۱۔ روحانی زندگی اور جسمانی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ (الانفال ۲۵)

(ترجمہ) اے مومنو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو جب وہ تم کو پکارتا ہے کہ تمہیں زندہ کرے۔ عام طور پر اس زندگی سے مراد روحانی زندگی لیتے ہیں کیونکہ حقیقتاً اصل زندگی وہی ہے۔ لیکن اس آیت کا ماقبل دیکھ کر معلوم ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کے لئے مومنوں کو دعوت دے رہے ہیں۔ اور بدر کے بعد دوسری جنگ کے لئے ان کو تیار کر رہے ہیں۔ اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ اے لوگو کیا تم سمجھتے ہو کہ رسول مرنے کے لئے تمہیں بلاتا ہے۔ حالانکہ وہ تو تم کو زندگی دینے کے لئے بلاتا ہے بالکل الٹی بات ہے جو تم سمجھتے ہو۔ یعنی اب تو باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی ہے۔ اگر اس وقت جہاد نہ کرو گے اور لڑائی سے جی چراؤ گے تو مفت میں مارے جاؤ گے اور دشمن تمہارے گھروں میں گھس کر ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑے گا۔ اب تمہاری دنیا کی زندگی بھی اسی میں ہے کہ تلواریں پکڑ پکڑ کر ہمت سے مقابلہ کو باہر نکلو۔

۱۰۲۔ نئی باتیں

قرآن مجید میں پہلی کتابوں کی صداقتوں اور ان کی تفصیلات کے علاوہ اپنی بھی نئی صداقتیں اور نئی باتیں ہیں۔ نمونہ کے طور پر عصمت انبیاء کا مسئلہ

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ (انبیاء ۲۸)

(ترجمہ) وہ خدا کی بات سے ایک لفظ بھی زیادہ نہیں کہتے اور وہ اس کے حکموں پر عمل کرتے ہیں۔

حالانکہ پہلی کتابوں میں نبی بھی گنہگار تسلیم کئے جاتے تھے۔ اسی طرح شوریٰ کا حکم

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشوریٰ ۳۹)

ترجمہ :۔ اور ان کا طریق یہ ہے کہ اپنے ہر معاملہ کو باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ

ترجمہ :۔ اور حکومت (کے معاملات) میں اُن سے مشورہ (لیا) کر۔

یعنی حکومت مشورہ سے ہو۔ مساواتِ انسانی کا مسئلہ جس سے عالمگیر اخوت

کی بنیاد قائم کی ہے۔ نہ کہ قومی تفاضل

نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ (المائدہ ۱۹)

ترجمہ :۔ ہم اللہ کے بیٹے (ہیں) اور اس کے پیارے ہیں۔

والے مذاہب تھے) اجتہاد کی اجازت اور تفقہ کا دخل دین میں۔

وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ (النساء ۱۱۶)

ترجمہ :۔ اور مومنوں کے طریق کے سوا (کسی اور طریق) پر چلے گا۔

یہود اور نصاریٰ وغیرہ کی افراط و تفریط چھوڑ کر۔ میانہ روی

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا (البقرہ ۱۴۴)

ترجمہ :۔ اور (اے مسلمانو! جس طرح ہم نے تمہیں سیدھی راہ دکھائی ہے)

اُسی طرح ہم نے تمہیں ایک اعلیٰ درجہ کی اُمت بنایا ہے۔

بجائے مختص القوم اور مختص الملک تبلیغ کے عالمگیر تبلیغ اسلام سے خاص ہونا

لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ ۚ (الانعام ۲۰)

ترجمہ :۔ تاکہ میں تمہیں اس کے ذریعہ سے (آنے والے عذاب سے) ہوشیار کروں۔

اور ان (سب) کو بھی جن تک یہ پہنچے۔

خدا تعالیٰ کی قولی کتاب کا خدا کی فعلی کتاب سے مطابق ہونے کا مسئلہ۔ عقل
و حکمت پر مذہب کی بنیاد کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو ہر ضروری مسئلہ پر دلیل کیوں دیتا۔ تناسخ
کا ابطال ہونا۔ ہر مخلوق میں نر و مادہ کا مسئلہ

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (الذاریت، ۵۰)

ترجمہ۔ اور ہر ایک چیز کے ہم نے نر اور مادہ بنائے ہیں۔

عملی حصہ مذہب کی بنیاد یسر پر رکھنا نہ کہ عسر پر یا اباحت پر تاکہ شریعت تمام دنیا کے
حالات پر حاوی ہو نہ کہ کسی خاص ملک پر۔ بدی کو نہیں بلکہ اس کی جڑ کو کاٹنا (اس کی تفصیل
آگے آئے گی)۔ خود دعوےٰ کرنا اور خود ہی دلیل دینا۔ ایک نئے انعام یعنی نبوت کے
دروازے کا اپنے متبعین کے لئے کھولنا۔ حفاظت قرآن کا مسئلہ۔ اس کلام الٰہی کا ہر زمانہ
ہر قوم اور ہر حالت کے لئے کافی ہونا اور مسائل ضروریہ کے لئے اس کا بطور خزانہ یا
انسائیکلوپیڈیا کے ہونا اسی طرح

فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ (البقرہ، ۲۴)

ترجمہ۔ تو اس جیسی ایک سورۃ لے آؤ۔

کا دعویٰ بھی نئی چیز ہے جو پہلی کتب نے نہیں کیا۔ شراب کی حرمت بھی صرف
قرآن سے خاص ہے۔ پہلے کسی مذہب نے اس گندگی کو دور نہیں کیا تھا۔ دنیا کی ہر امت اور
ہر ملک میں رسول اور نبی ہونے تسلیم کئے ہیں۔ نیز یہ اصول پیش کیا ہے کہ ہر مخلوق میں
زندگی ہے۔ خواہ وہ نباتات ہو یا جمادات بلکہ ہر ذرہ ایک زندگی رکھتا ہے۔ یہ بات کہ
قرآن مجید میں کتب سابقہ کے علاوہ نئی باتیں بھی ہیں۔ اس آیت سے واضح ہے

مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ
وَهُمْ يَلْعَبُونَ (الانبیاء: ۳)

یعنی ان لوگوں کے پاس رب کی طرف سے کوئی نئی بات بطور ذکر کے آتی ہے تو وہ

اسے مذاق اور کھیل سمجھ کر سنتے ہیں اسی طرح آیت

وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ (الشعراء ۶)

ترجمہ:- اور رحمٰن کی طرف سے کبھی کوئی نیا ذکر نہیں آتا کہ جس سے لوگ اعراض نہ کرتے ہوں۔ (الفضل ۲ اپریل ۱۹۳۸ء)

۱۰۳۔ رضاعی رشتوں کی حرمت

گو کوئی ظاہری اور جسمانی دلیل ابھی ان رشتوں کی حرمت پر قائم نہ ہوتی ہو تاہم سائیکالوجی یعنی نفسیاتی زبردست دلیل موجود ہے۔ اور علم النفس کی دلیل بھی علمی دلیل ہی ہوتی ہے انسان صرف جسم ہی نہیں ہے۔ بلکہ دراصل جذبات اس کا اصل اور بڑا حصہ ہیں۔ شریعت اسلامی جہاں جسمانی ترقی کی دعویدار ہے وہاں وہ اعلیٰ لطیف انسانی جذبات کو بھی قائم رکھتی بلکہ ترقی دیتی ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ رضاعت کا ماحول بھی وہی ہوتا ہے جو رحم کے رشتوں کا۔ بچہ کا وہی تعلق رضاعی ماں سے ہوتا ہے جو سگی ماں سے اور اسی طرح رضاعی بہنیں اور دیگر رشتہ دار ایسے ماحول میں ہوتے ہیں۔ جو سگے رشتہ داروں کا ماحول ہے اور ان سے تعلق ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسا کہ اصلی رشتہ داروں سے اور جذبات محبت باہم آمیختہ ہو کر وہ ایک دوسرے پر سگوں کی طرح جان چھڑکتے ہیں۔ پس ان لطیف جذبات کو قائم رکھنا۔ احسان کی ایسی ہی عزت اور حرمت رکھنا جیسی اپنی ماں اور بہن اور بیٹا بیٹی کے لئے رکھی جاتی ہے۔ یہ قرآن مجید کا کمال ہے وہ کبھی سچے اور نازک احساسات کو دھکا نہیں پہنچاتا۔ اور انسان کو بجائے حیوانیت کے اوپر اور اوپر ہی لے جاتا ہے پس جیسے خون کے رشتے شریعت نے حرام کئے ہیں۔ ویسے ہی رضاعی بھی۔

۱۰۴- عبرت

تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ (التوبہ ۹۲)

ترجمہ:۔ اور (یہ جواب سُن کر) وہ چلے گئے اور (اس) غم سے اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے کہ افسوس اُن کے پاس کچھ نہیں جسے (خدا کی راہ میں) خرچ کریں۔ (التوبہ ۹۲)

ایک وہ سلف تھے کہ روتے تھے کہ ہمارے پاس راہِ خدا میں خرچ کرنے کو کچھ نہیں ایک وہ ناخلف ہیں کہ چند پیسے چندہ دے کر روتے ہیں۔ کہ ہائے لُٹ گئے۔

ع   ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔

۱۰۵- طہارتِ جسمانی

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (مدثر ۶)

ترجمہ:۔ اور شرک کو چھوڑ دے۔ یعنی گندگی کو الگ کر دے۔ یہ اسلام کے بہت ابتدائی احکام میں سے ہے اور اس کے سمجھنے کے لئے کسی دقیق علم کی ضرورت نہیں بلکہ ہر انسان فطرتاً گندگی سے نفرت کرتا ہے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ پانچ چیزیں انسان کی فطرت میں داخل ہیں۔ یعنی خود بخود ان کو کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اول ناخن ترشوانا۔ دوسرے مونچھیں کتروانا۔ تیسرے زیرِ ناف بال صاف کرنا چوتھے بغل کے بال دُور کرنا۔ پانچویں ختنہ کرانا۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ دین کی تربیت دینے والوں کی بے توجہی کی وجہ سے کئی نوجوان لڑکے نہ بغلیں صاف کرتے ہیں۔ نہ زیرِ ناف بالوں کو علیحدہ کرتے ہیں۔ اگلے زمانہ کے لوگ تو شریعت کے ہر رکن پر عمل

کرتے تھے اور اسے سکھانے میں شرم نہیں کرتے تھے۔ وہ ثواب واجر کو ایک بڑی بات جانتے تھے اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی رضائے الٰہی کے طالب رہتے تھے۔ مگر اب کوئی نصیحت کرو۔ تو فوراً سوال ہوتا ہے کہ اس کا کیا فائدہ یعنی ہر بات صرف دنیاوی مفاد کے لئے ہی سمجھتے ہیں۔ اس ذہنیت سے اقتداء تام اور رضائے الٰہی کی طلب اور آخرت کے ثواب کا مسئلہ خاک میں مل جاتا ہے۔ ہماری جماعت کے لوگ تو مطمئن ہو جاتے ہیں۔ کہ لڑکا قادیان کے بورڈنگ میں داخل ہے۔ خود ہی سب دین سیکھ لے گا۔ مگر وہاں آکر بے شک نمازیں اور قرآن پڑھ جاتے ہیں۔ مگر اس نگرانی سے شرماتے ہیں۔ کہ لڑکا بغلیں اور زیرناف صفائی بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ اس لئے مجھے خان صاحب ڈاکٹر عبداللہ صاحب نگران سے یہ درخواست کرنی پڑی کہ لڑکوں کے ذہن نشین ایسی باتیں بھی کر دیں۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک بیمار نوجوان میرے پاس آیا۔ اور میں نے سینہ دیکھنے کے لئے اسے کپڑے اُتارنے کو کہا۔ مگر وہ شرم کے مارے بُنیان نہ اُتار سکا۔ آخر معلوم ہوا کہ یہ حیا والی شرم نہ تھی بلکہ اس بات سے شرم تھی کہ لوگوں کو بغل کے بال نظر نہ آجائیں۔ جو لڑکے نائی سے بغلیں صاف کرانا مشکل سمجھتے ہیں۔ ان کو ان کے والدین یا ٹیوٹر سیفٹی ریزر مول لے دیں یا اس سے بہتر بال اُڑانے کا صابن ہے وہ ایک ٹکیہ خرید دیا کریں جس سے چند منٹ میں بال صاف ہو جاتے ہیں۔ ہاں یہ خیال رکھیں کہ یہ چیزیں ٹھوڑی کی صفائی کے لئے استعمال نہ ہوں۔ ان کا ہفتہ وار استعمال جسمانی صفائی رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اسی طرح ایک اور مسئلہ ہے۔ بعض نوعمر بچے لاعلمی کی وجہ سے جنبی حالت میں مسجدوں میں نمازیں پڑھ لیتے ہیں۔ نہ انہیں خبر ہے کہ جنبی کیا ہوتا ہے اور نہ یہ کہ ان کے لئے کیا احکام ہیں۔

۱۰۶۔ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ

جنتیں وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ (الواقعہ ۱۷) جل گے جن کے معنی ہیں ایسے لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔ بڑے نہ ہوں گے جس طرح خود جنتی کر جوان ہی رہیں گے بڈھے نہ ہوں گے۔ قرآن مجید سورۃ واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سابقون اور اصحاب الیمین میں اور سب نعمتیں تو مشترک ہیں۔ یعنی باغات۔ مکانات۔ بیویاں۔ ثمرات اور طعام وغیرہ مگر ایک چیز سابقون کے انعام میں ہوگی جو اصحاب الیمین کے پاس نہ ہوگی۔ اور وہ ہیں وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ اس کی وجہ یہ ہے۔ سابقون نے اپنی ذریت اور اُمت اور متبعین کو نسلاً بعد نسلٍ خدا کے دین کی خدمت کے لئے لگا دیا۔ اس لئے ان کو آخرت میں خدا بھی ذریت اور وَلْدَانٌ عطا فرمائے گا۔ برخلاف عام مومنوں کے جو خود نیکو کار رہے۔ اس لئے ان کو صرف ذاتی آرام اور انعام ملیں گے۔

۱۰۷۔ آیتوں کا تعلق اور ربط

ہم قرآن مجید میں آیتوں کا تعلق اور ربط مانتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں جو انسانی کتابوں میں ہوتا ہے کہ تکرار نہ ہو۔ اور ابواب و فصول ہوں اور منطقی ترتیب ہو۔ بلکہ قرآن وعظ نصیحت اور ذکر ہے۔ اس لئے انسانی سائیکالوجی کے مطابق اس کے مضامین ہوں گے اور ربط ثابت کرنے کیلئے صرف یہ ضروری ہے کہ جہاں کوئی معترض اعتراض کرے وہاں ہم ربط دکھا دیں۔ نہ یہ کہ سارا قرآن لے کر ایک ایک آیت کا ربط دکھائیں۔ کیونکہ اکثر جگہ تو ربط موٹی عقل والے کے نزدیک بھی موجود ہے۔ اعتراض تو صرف خاص خاص جگہ پر ہوتا ہے مثلاً

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ

سَبِيْلِ اللّٰهِ لا فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝
يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ
وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ
فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ (التوبہ ۳۴، ۳۵)

ترجمہ: اور وہ لوگ (بھی) جو سونے اور چاندی کو جمع رکھتے ہیں۔ اور اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خبر دے۔
(یہ عذاب) اس دن (ہوگا) جبکہ اس (جمع شدہ سونے اور چاندی) پر جہنم کی آگ بھڑکائی جائے گی پھر اس (سونے اور چاندی) سے ان کے ماتھوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغ لگائے جائیں گے (اور کہا جائے گا کہ) یہ وہ چیز ہے جس کو تم اپنی جانوں کے لیے جمع کرتے تھے۔ پس جن چیزوں کو تم جمع کرتے تھے ان کے مزہ کو چکھو۔

سو تعلق اگلی آیت

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ
كِتٰبِ اللّٰهِ (التوبہ ۳۶)

ترجمہ: یقیناً مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے (ہی) ہوتی ہے۔ یہ اللہ کا قانون ہے ہے کیا ہے۔ سو تعلق یہ ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے جو لوگ مال جمع کرتے ہیں اور اس میں سے زکوٰۃ نہیں دیتے۔ ان کو عذاب ملے گا۔ آگے فرمایا کہ ایسی زکوٰۃ ہر بارہ ماہ کے بعد دینی چاہیئے۔ ورنہ ساری عمر میں ایک دفعہ یا برسوں میں کبھی کبھی کچھ خیرات کرنا کافی نہ ہوگا اس طرح دونوں آیتوں میں تعلق قائم ہو گیا۔ جو بظاہر پہلے نظر نہ آتا تھا۔ یہ ایک نمونہ ہے ربط کا۔ اسی طرح غور کرتے رہو تو مشکلات حل ہوتی رہیں گی۔ انشاء اللہ۔ (الفضل ۳، اپریل ۱۹۳۸ء)

۱۰۸۔ وہ جن تھا اور کافر

کسی جاہل صوفی کو ابلیس کا ذکر کرتے دیکھو تو حیران ہو جاؤ۔ فرماتے ہیں۔ وہ فرشتہ تھا۔ پکا موحد۔ دس لاکھ سال عرش کے نیچے عبادت ذکر سجدہ اور رکوع میں مصروف رہا۔ اسی لئے اسے فرشتوں کا استاد بنایا گیا۔ اس کا اسم شریف عزازیل تھا۔ مگر یہ قرآن مجید نہ پڑھنے کا نتیجہ ہے۔ ورنہ وہ فرشتہ نہیں تھا جن تھا۔

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (الکہف ۵۱)

ترجمہ ۔ وہ جنوں میں سے تھا سو اُس نے (اپنی فطرت کے مطابق) اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔

اور خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ

ترجمہ ۔ تو نے میری فطرت میں آگ رکھی ہے۔ (الاعراف ۱۲)

وہ خود اپنے تئیں کہتا ہے۔ فرشتے تو

وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۩ (النحل ۵۱)

ترجمہ ۔ اور جس بات کا اُنھیں حکم دیا جاتا ہے (وہی کرتے ہیں۔

ہوتے ہیں۔ موحد نہیں تھا بلکہ تمام مشرکوں کا استاد۔ عبادتوں کا کیا ذکر وہ تو ہمیشہ کا کافر تھا

وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (البقرہ ۳۵)

ترجمہ ۔ اور وہ (پہلے سے ہی) کافروں میں سے تھا۔

فرشتوں کا استاد نہ تھا۔ استاد ہوتا تو پہلے اُسی کو سجدہ کے لئے کہا جاتا نہ کہ شاگردوں کو۔ اسم شریف آپ کا عزازیل نہیں بلکہ ابلیس علیہ اللعنۃ اور شیطان الرجیم تھا۔ اور آپ جیسا جھوٹا اور دھوکہ باز اور کوئی سننے میں نہیں آیا۔ ہاں جو اس کی ذریت

ہوں وہ اسے اپنا بزرگ سمجھ کر اس کی تعریف کریں تو کریں۔

۱۰۹۔ علماء کے بائیں ہاتھ کا کرتب

حضرت مسیح ناصری کو آسمان پر چڑھانا قرآن کا نہیں بلکہ مولویوں کا کام تھا جو

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۔ المائدہ ۱۴۔

ترجمہ: چنانچہ وہ کتاب کے الفاظ کو ان کی جگہوں سے اول بدل دیتے ہیں۔

کے فن کے استاد تھے۔ وہ تو خیر نبی تھے۔ ان لوگوں نے تو فرشتوں کو زانی اور ایک زانیہ کو آسمان کا تارا بنا دیا جو چاہیں کہتے پھریں۔ تحریف ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے اور انبیاء کی عزت و تقدس پر ہاتھ ڈالنا ان کی پرانی عادت۔ آدم کو مشرک انہوں نے کہا۔ ابراہیم علیہ السلام کو جھوٹا انہوں نے بنایا۔ داؤد علیہ السلام کو دوسروں کی جوروئیں لینے کے لئے ان کے خاوندوں کو حکمت سے مروا دینے والا کہنا انہی کا کام ہے۔ سلیمان علیہ السلام کو بہانے سے کسی جوان عورت کی پنڈلیاں ننگی کرا کر دیکھنا ان کی ایجاد ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زینبؓ پر فریفتہ ہو کر طلاق دلوانا ان کی خباثت سے۔ خدا تعالیٰ و کھلے صلوٰۃ و سلام حضرت مسیح موعود آپ پر سلامتی ہو آپ ہی تھے کہ انہوں نے صحیفہ دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے تقدس اور عصمت کو قائم کیا ورنہ اندھیرا چھایا ہوا تھا

۱۱۰۔ العجب ثم العجب

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (الاعراف: ۱۷۷)

یعنی ہم نے تو چاہا تھا کہ بلعم کو نشانات عنایت کر کے اونچے مدارج عطا فرمادیں لیکن وہ کمبخت زمین کی طرف جھک گیا۔ یہاں رفع اور ارض کے الفاظ کے باوجود کوئی مولوی آسمان پر اٹھایا جانا اور زمین میں گھس جانا نہیں مانتا۔ بلکہ سب اس کے معنی بلندی

درجات اور پستیٔ روحانی کے کہتے ہیں مگر مسیح علیہ السلام کے لئے اتنی خصوصیت اور غیرت ہے کہ اکیلے رفع کے لفظ سے ہی ان کا اس جسم کے ساتھ آسمان پر چڑھ جانا واجب ہوگیا۔

۱۱۱۔ ایک نبی کی تکذیب سب کی تکذیب ہے

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ (الشعراء ، ۱۶۱)

ترجمہ ، لوط کی قوم نے بھی رسولوں کا انکار کیا۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ (الشعراء ، ۱۴۲)

ترجمہ ، ثمود نے بھی رسولوں کو جھٹلایا تھا۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ (الشعراء : ۱۰۶)

ترجمہ ، نوح کی قوم نے (اپنے) رسولوں کا انکار کیا ۔

كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِينَ (الشعراء ، ۱۲۴)

ترجمہ ، (اسی طرح) عاد نے بھی رسولوں کا انکار کیا ۔

ان آیات میں ایک رسول کو مرسلین کہا گیا ہے۔ اسی طرح

وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِّتَتْ (المرسلات ۱۲)

ترجمہ ، اور جب سب رسول اپنے وقتِ مقررہ پر لائے جائیں گے ۔

میں مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کو جمع کے لفظ میں بیان کیا گیا ہے ۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ ایک رسول کی تکذیب سب کی تکذیب ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم حضرت مسیح موعود کے منکر کو جملہ انبیاء کا منکر سمجھتے ہیں ۔ اور ان کو ایسی جماعت میں یقین کرتے ہیں جس میں جملہ انبیاء کے منکر داخل ہیں ۔ یہ ہے مسئلہ کفر و اسلام ۔

۱۲۔ ابن اور ولد

بن اور اَبْ کے الفاظ گے باپ اور بیٹے کے سوا دوسروں پر بھی آسکتے ہیں۔ برخلاف اس کے والد اور وُلدہ کے الفاظ گے ماں باپ کے لئے ہی آتے ہیں مثلاً

تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ (آلِ عمران، ۶۲)

ترجمہ:۔ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو۔

یہاں حضرت علیؓ بھی آسکتے ہیں۔

مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (المائدہ، ۱۰۵)

ترجمہ:۔ ہم نے جس (بات) پر اپنے باپ دادا کو پایا تھا۔

یہاں سب بزرگ داخل ہیں۔ اسی طرح یہ الفاظ اَبْ اور ابن کے کنیتوں وغیرہ کے ساتھ بھی آتے ہیں۔ جیسے ابالوفا اور ابن السبیل مگر والد اور ولد اس طرح نہیں آتے۔ قرآن مجید نے ابناء اللّٰہ ہونے کی تردید نہیں فرمائی۔ بلکہ ولد کی تردید فرمائی ہے۔ اور ابناء اللّٰہ کا استعارہ قبول کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر تم ابناء اللّٰہ ہو۔ تو پھر تم پر عذاب کیوں آتے ہیں۔ ہاں ولد کے لئے کہا ہے

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ (مریم، ۳۶)

ترجمہ:۔ خدا کی شان کے یہ خلاف ہے کہ وہ کوئی بیٹا بنائے۔ وہ اس بات سے پاک ہے۔

اوپر کے بیان سے تین دقتیں حل ہوگئیں۔

اول یہ کہ جنت میں جو ولدان ملیں گے وہ جنتیوں کی اپنی حقیقی اولاد ہوگی۔ جو دُنیا میں بچپن کی عمر میں فوت ہو چکی ہوگی۔ بس آریہ کا وہ اعتراض "لونڈے" والا جاتا رہا۔

دوسرا اعتراض حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اَبْ آزر کے متعلق بھی صاف ہو گیا۔ کیونکہ اَبْ چچا بھی ہو سکتا ہے۔

تیسرے ابناء اللہ کی اصطلاح اور استعارہ کے معنی بھی واضح ہو گئے مطلب یہ کہ اللہ کے بہت پیارے نہ کہ بیٹے جیسا کہ مسیح مانا جاتا ہے۔

۱۱۴۔ خط و کتابت کا طریق

قرآن مجید نے جہاں ہر طرح کی تعلیمیں سکھائی ہیں۔ وہاں خط و کتابت کی تعلیم بھی دی ہے۔ چنانچہ ایک نمونہ خط کا یہ ہے۔

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ (النمل ۳۱، ۳۲)

توجمہ:۔ (جس کا مضمون یہ ہے کہ) یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ جو بے انتہا رحم کرنے والا (اور) بار بار کرم کرنے والا ہے اس کے نام سے ہم شروع کرتے ہیں۔

اور کہتے ہیں کہ ہم پر نیا دتی نہ کرو اور ہمارے حضور فرمانبردار بن کر حاضر ہو جاؤ۔

یعنی پہلے لکھنے والے کا تعارف ہو یعنی نام و پتہ۔ پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس کے بعد مضمون مختصر TO THE POINT اب دُنیا نے یہی طریقہ ایک لمبے تجربہ کے بعد حاصل کر لیا ہے۔ اور اسی پر عمل کرتے ہیں۔ مگر خود مسلمان یعنی ناواقف قرآن مسلمان ابھی تک بحضور فیض گنجور بدیع کوکب سعادت۔ منبائے دین و ملت بدر ہدایت حضرت قبلہ و کعبہ حاجی الحرمین الشریفین نجیب الطرفین مصدر فیوض ربانی واقف رموز نہانی و پنہانی وغیرہ وغیرہ۔ دو ورق صرف القاب کے۔ پھر مضمون وہ خیطان کی آنت کہ خدا کی

بناہ ، اور آخر میں فقیر حقیر پر تقصیر ، نفس کا اسیر ناکارہ ' بے چارہ لاشئی کمترین ' ندوی ' احمق الحمقاء ، وأجهل الجهلاء ' عاجز خاکسار ۔ خاکپائے بزرگان کفش بردار برادران ، خردمان عفی اللّٰہ عنہ ۔ اللّٰھم اغفر لکاتبہ ولمن سعی فیہ ۔

(الفضل ۵ اپریل ۱۹۳۸ء)

۴۱۔ حفاظت قرآن

قرآن مجید کی حفاظت کا بھی دُنیا میں عجیب انتظام ہے ۔ مخالف تک مانتے ہیں کہ یہ معجزہ ہے ۔ پرانی مذہبی کتابوں کی تحریف تو قرین قیاس ہے ۔ مگر آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ گرنتھ صاحب بھی الحاق سے خالی نہیں رہے اور ستیارتھ پرکاش تک کی حفاظت بھی نہ ہو سکی ۔ بلکہ ابتدائی ایڈیشن کی بابت تو پنڈت دیانند صاحب نے خود غل مچایا ہے کہ اس میں لوگوں نے تحریف کر دی ہے ۔ پس محفوظ مذہبی کتب قرآن کے سوا کوئی نہیں ۔ اور

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر ۱۰)

ترجمہ ۔ اس ذکر (یعنی قرآن) کو ہم نے ہی اُتارا ہے اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے ۔

ایک عظیم الشان ثابت شدہ صداقت ہے ۔ اس حفاظت کی ایک شاخ یہ بھی ہے کہ وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ (النحل ۱۰۴) یعنی یہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے جو مبین یعنی زندہ زبان ہے ۔ باقی سب الٰہی کتابوں کی زبانیں مُردہ ہو چکی ہیں اور اُن کو کوئی نہیں بولتا ۔ اس لئے ان کے معانی تک دریافت کرنے مشکل ہو گئے ہیں عبرانی ، سنسکرت ، پہلوی ، پالی وغیرہ زبانیں بولنے والی کوئی قوم اس زمانہ میں موجود نہیں ۔ البتہ عربی ایسی زبان ہے جو بیان کرتی ہے اور بولتی ہے اور بولی جاتی ہے ۔ اس لئے زندہ

۱۱۵۔ سحر

سحر یا جادو کے ایک معنی تو مسمریزم کے ہیں۔ یعنی علم توجہ کے وہ کمالات جو فرعون کے ساحروں نے دکھائے اور قرآن میں مفصل حال ان کا موجود ہے۔ دوسرے معنی ہیں اس کے دل پسند باتیں۔ یا دل بہلانے والی باتیں۔

وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَّبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ
لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ

(ھود ۹)

یعنی جب تو بعث بعد الموت کا ذکر ان کافروں سے کرتا ہے تو وہ جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو سحر ہے۔ حالانکہ یہاں ایسی کوئی بات نہیں۔ جو عرفِ عام میں جادو کہلاتی ہو۔ بلکہ ایک دل پسند عقیدہ کا نام کفار نے سحر رکھا ہے۔ پس سحر کا اطلاق ایسے معنوں میں بھی آتا ہے۔

۱۱۶۔ وصیّت مسیح موعود و خلیفۃ المسیح اوّل

وصیّت کو بدل دینا سخت گناہ ہے۔

فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ
يُبَدِّلُونَهُ (البقرہ ۱۸۲)

یعنی جو شخص وصیّت سُننے کے بعد اُسے بدل ڈالے۔ تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے جنہوں نے اس کو بدل ڈالا۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) اور حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل (اللہ تعالیٰ آپ پر راضی ہو) کی ہر دو کی وصایا چھپی ہوئی اب بھی موجود ہیں۔ دونوں کو غور سے

خصوصاً مولوی محمد علی صاحب نے بدل ڈالا۔ یعنی ان کے معنی تبدیل کر دیئے۔ ان کی مخالفت کی۔ اور اُن کو منسوخ کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ

۱۱۷۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت موسیٰؑ سے مماثلت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے بیٹے مارے جاتے تھے اور لڑکیاں زندہ رہنے دی جاتی تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ عذاب دُور کرایا۔ جب وہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اُلٹی بات تھی۔ لوگ لڑکیوں کو مار ڈالتے تھے اور لڑکوں کو زندہ رکھتے تھے۔ وہاں تو سلطنت کی طرف سے ظلم تھا۔ مگر یہاں کم بخت ماں باپ خود مارتے تھے۔ آخر یہ ظلم آپ کی برکت سے دُور ہوا۔ یہ بھی ایک مماثلت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے۔

۱۱۸۔ اظہار علی الغیب

اظہار علی الغیب نبیوں کا خاصہ ہے۔ یہ آیت مشہور ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ صرف نبیوں کو ہی کثرت سے غیب دیا جاتا ہے۔ دوسرے لوگوں کو کثرت سے الہام ہو سکتے ہیں مگر کثرت سے غیب نہیں ملتا۔ بعض لوگ جب کسی شخص کو دیکھتے ہیں۔ کہ وہ روزانہ ایک کاپی کے چار پانچ ورق الہامات سے بھر لیتا ہے تو تشویش و پیچ میں پڑ جاتے ہیں۔ کہ یہ کیا ہوا۔ کیا یہ نبی ہے؟ مگر ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کثرتِ الہام نبی کے لئے شرط نہیں بلکہ کثرتِ غیب شرط ہے۔ اگر روزانہ ہزار ایسے الہام ہوں۔ مگر غیب اور پیشگوئی سے خالی ہوں۔ تو بھی معاملہ مشتبہ نہیں ہو سکتا۔

۱۱۹۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ حسن و خوبی والا پیش کرنا چاہیئے۔ ہماری تو ساری امیدیں اسی سے وابستہ ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ ہمارا خدا عادتاً سخت گیر اور بے وجہ شدید العقاب ہو۔ اس جیسا نرمی کرنے والا۔ رحم کرنے والا۔ ڈھیل دینے والا۔ توبہ قبول کرنے والا اور معاف کرنے والا کوئی دکھائے تو۔ اتنا رحم اور اتنی نرمی ہے کہ فوری گرفت نہ ہونے اور مسلسل درگزر کرنے کی وجہ سے بعض لوگ اس کے وجود سے ہی منکر ہو گئے ہیں۔

۱۲۰۔ خدا کے سوا کس کا حوصلہ ہے کہ گناہ بخشے

وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ (آل عمران: ۱۳۹)

یہ اللہ تعالیٰ کا چیلنج ہے کہ بتاؤ سوائے میرے کون گناہ بخشتا ہے میں نے تو دیکھا ہے کہ انسان گناہ نہیں بخش سکتا THE PUBLIC IS MOST UNFORGIVING یعنی مخلوق لوگوں کے گناہوں کو مبالغہ کے ساتھ باہر نکالتی ہے۔ ان کی تشہیر کرتی ہے اور کبھی معاف نہیں کرتی۔ یہ صرف خدا کی ہی خصوصیت ہے کہ وہ نہ صرف بخشتا ہے۔ بلکہ گناہ گاروں کو بلاتا ہے کہ آؤ میں تمہارے گناہ بخشوں

يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ (ابراہیم ۱۰)

ترجمہ: وہ تمہیں اس لئے بلا رہا ہے تاکہ وہ تمہارے گناہوں میں سے بعض بخش دے۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ اس نے بعض انتظام ایسے کر رکھے ہیں جن سے بنی آدم کے گناہ بغیر مغفرت مانگے بھی معاف ہوتے رہیں اور اعمال ناموں سے کٹتے جاتے ہیں۔

۱۲۱۔ مضطر کا لفظ عام ہے

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ (النمل ۶۳)

یعنی کون ہے۔ جو خدا کے سوا مضطر کی دُعا سنتا ہے اور اس کی تکلیف کو رفع کرتا ہے۔ یہاں جو اضطرار ہے۔ اس کے ساتھ مومن کافر، انسان حیوان کسی کی شرط نہیں اضطرار کسی مخلوق کو بھی ہو۔ اور وہ چاہے فوراً قبولیت نازل ہوتی ہے۔ جانوروں تک کو سخت ایذا کوئی دے کر دیکھے۔ اس ذلیل جانور کی چیخ و پکار پر انسانوں پر سزا نازل ہو جاتی ہے اور غریب جانور کی خصوصی خدا تعالیٰ کرا دیتا ہے۔ سالہا سال کا ذکر ہے کہ ایک سوتری شخص یعنی شکر رکھ کر اُس میں بارود ملا دیا کرتا تھا۔ جب اس پر مکھیاں جمع ہو جاتیں تو ذرا سی چنگاری سے آگ لگا دیتا بھُنبھر ہو کر آدھی مکھیاں جل جاتیں اور آدھی نیم برشت ہو کر وہیں تڑپا کرتیں۔ اس تڑپنے میں وہ شخص بہت لطف لیا کرتا۔ یہ اس نے اپنا شغل بنایا تھا۔ اور لوگوں کو بھی یہ تماشا دکھایا کرتا تھا۔ آخر ایک دن ایک چنگ آگ کا بارود کی تھیلی میں بھی جا پڑا جو پاس ہی کھُلی پڑی تھی۔ وہاں آگ پہنچنے کی دیر تھی کہ یکدم ایک شعلہ اور جبا کا اٹھا جس نے سوتری کو جھُلس دیا۔ اور اسی سے وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ سب کہتے تھے کہ یہ بھی مکھیوں کے جلنے اور تڑپنے کو تماشا دیکھا کرتا تھا۔ سو خدا نے ان عاجزوں کی فریاد آج سن لی۔

فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ (الحشر ۳)

ترجمہ: پس اے سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگو عبرت حاصل کرو۔

(الفضل ۱۶ اپریل ۱۹۳۰ء)

۱۲۲۔ عربی اُمّ الالسنہ ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (ابراہیم ۵)

ترجمہ: اور ہر ایک رسول کو ہم نے اس کی قوم کی زبان میں ہی (وحی دے کر)

بھیجا ہے تاکہ وہ اُنھیں (ہماری باتیں) کھول کر بتائے۔

ہم نے ہر رسول کو اُسی زبان میں رسالت اور وحی بھیجی جو اس کی قوم کی زبان تھی۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم دُنیا کی ہر قوم اور ہر مُلک کے لئے رسول تھے۔ اس لئے آپ کو وحی رسالت اُس زبان میں ہوئی جو ہر قوم اور ہر ملک کی ابتدائی اور اصل اور مشترکہ زبان تھی۔ لہٰذا عربی ام الالسنہ ہے۔

۱۷۳۔ مکر اور کید

وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ (آل عمران ۰۵۵)

ترجمہ:۔ اور اُنھوں نے (یعنی مسیح کے دشمنوں نے) بھی تدبیریں کیں اور اللہ نے بھی تدبیریں کیں اور اللہ سب تدبیر کرنے والوں سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

(آلِ عمران : ۵۵)

مکر عربی میں تدبیر اور تجویز کو کہتے ہیں جو اچھی بھی ہوتی ہے اور بُری بھی۔ خدا نے اپنی تدبیر کو خَيْرُ الْمَاكِرِينَ کے لفظ سے ظاہر کیا ہے۔ یعنی وہ عمدہ اور اچھی تدبیر کرنے والا ہے۔ اور اس کی تدبیر بدی کو مُفقد کرنے والی۔ اور سراسر خیر و برکت ہے۔ بُرے مکر کو جو کفار کرتے ہیں۔ ان کو مکر السیئ کہا ہے۔ یہ دونوں مکر اس آیت سے واضح ہیں۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ أَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ۔ (النمل ۵۱)

یعنی ان کے مکر کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے ان کو اور ان کی ساری قوم کو ہلاک کر دیا۔

کید کے معنے ہیں۔ جنگ۔ مقابلہ۔ کوشش۔ حیلہ۔ تدبیر اور یہ بھی اچھی بُری دونوں ہوسکتی ہیں۔ خدا نے اپنے کید کو متین کہا ہے

وَاُمْلِیْ لَهُمْ ۚ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ (اعراف، ۱۸۴)

ترجمہ:۔ اور میں اُنھیں (سردست) ڈھیل دے رہا ہوں، میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔
کیا متین کوئی اوچھی اور چالاکی کی حرکت ہو سکتی ہے؟ بُرا کید تو خدا تعالیٰ کرانا ناپسند
ہے کر فرماتا ہے۔

اَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ كَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ (یوسف، ۵۲)

ترجمہ:۔ اور یہ کہ (میرا ایمان ہے کہ) خیانت کرنے والوں کی تدبیر کو اللہ
کامیاب نہیں کرتا۔

مخالفین انبیاء ہر طرح کے حیلوں اور کوششوں سے ان کو ہلاک اور ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر انکی سب تدابیر اور چالیں اُلٹی پڑتی ہیں۔ فرعون نے موسیٰ اور بنی اسرائیل کے ہلاک کرنے کو ایک مکر کیا تھا۔ اس کا جوابی مکر خدا کی طرف سے یہ ہوا کہ وہ اور اس کا لشکر خود غرق ہو گئے۔ خدائی مکر و تدبیر اور کید و جنگ کے نمونے کے لئے یوسفؑ کا قصہ۔ ہجرت کا قصہ۔ فتح مکہ کا قصہ، موسیٰؑ کی نجات کا قصہ۔ نوحؑ کی نجات کا قصہ قرآن مجید میں مذکور ہیں۔

۱۲۴۔ نسیان

خدا تعالیٰ نے یہ لفظ اپنے متعلق بھی منسوب کیا ہے۔ بحکم آیت جس کے ماتحت
اس کے معنی ہوں گے۔ یہ ہے

لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی (طٰهٰ، ۵۲)

ترجمہ:۔ میرا رب نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔

یعنی خدا تعالیٰ کبھی نہیں بھولتا۔ اب اس محکم آیت کو مضبوط پکڑ کر اور خدا کی ذات کو ہر عیب اور کمزوری سے پاک سمجھ کر ہم باقی آیتوں کے معنی کر سکتے ہیں۔ نسیانؔ کے معنے علاوہ بھلانے کے تاخیر میں ڈال دینے کے بھی ہیں۔ جیسے کہ

إِنَّمَا النَّسِيٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ (التوبہ ۳۷)

کا ترجمہ یہ ہے کہ مہینوں کا آگے پیچھے کر لینا ۔ نماز کفر کی ایک زیادتی ہے ۔ اسی طرح آیتوں کے نسیان سے یہی مراد ہو سکتی ہے کہ ہم بعض آیات کو مقدم مؤخر کر دیتے ہیں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی ۔ تو حضور بعض آیات کو اگلی نازل شدہ آیات کے آگے لگا دیتے تھے بعض کو ایسی آیات کے پہلے یا درمیان میں داخل کر دیتے تھے بموجب ترتیب خدائی کے چنانچہ سب سے آخری آیت جو آپ پر نازل ہوئی حضورؐ نے اس کو سورہ بقرہ کے اندر داخل کر دیا

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ (البقرہ ۲۸۲)

ترجمہ ۔ اور اس دن سے ڈرو جس میں تمہیں اللہ کی طرف لوٹایا جائے گا ۔

دوسرے معنی نسیان کے إِنَّا نَسِينَاكُمْ (السجدہ ۱۵) میں ہیں یعنی تَرَكْنَاكُمْ ۔ یہاں بھول کے معنی ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ متکلم خود خدا تعالیٰ ہے ۔ پس جب ایک طالب سے بات چیت ہو رہی ہو تو اس وقت بھولنا چہ معنی دارد ۔ مطلب یہ ہے کہ تم کو اتنا لمبا عذاب ہو گا کہ تمہیں یہ خیال ہو گا کہ ہم کو دوزخ میں ڈال کر گویا خدا بھول گیا ۔ اور جس طرح بھولی ہوئی چیز کی طرف توجہ نہیں جاتی ۔ اسی طرح تمہاری طرف توجہ نہیں کی جائے گی ۔

نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ (التوبہ ۶۷)

کے معنی ہوئے کہ انہوں نے خدا کو چھوڑ دیا ۔ تو خدا نے بھی ان کو چھوڑ دیا ۔

تیسرے اگر بالفرض واقعی بھول کے معنی بھی لئے جائیں ۔ تو یہ معنے ہوئے کہ انہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے بھی ان کو اس بھلانے کی سزا دی جو گناہ ہو ۔ اس کی سزا کو بھی عربی زبان میں انہی الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔ ایک نیا حوالہ اس کے متعلق اقرب الموارد میں میں نے دیکھا ہے یہ حَسَدَ کے لفظ کے نیچے لکھا ہے جہاں مصنف کہتا ہے (حَسَدَنِي اللهُ ان كنتُ احسُدُك) اے عاقَبَنِي على الحَسَدِ یعنی

یہ ضرب المثل ہے کہ کہا کرتے ہیں۔ اگر میں تیرے ساتھ حسد کروں۔ تو خدا مجھ سے حسد کرے۔ یعنی خدا مجھے حسد کی سزا دے۔

۱۲۵ - استہزاء

اللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (۱) یہ کلام اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ کا جواب ہے۔ یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تمسخر کرتے ہیں۔ اللہ ان کے تمسخر کی سزا ان کو دے گا (۲) دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہم ان کو خفیف بنانے والے ہیں۔ ھزوا کے معنے ہیں خفیف۔ یہ ٹھٹھے کا لازمہ ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ ان کو ذلیل کرے گا۔ مثلاً زید بکر سے کوئی تمسخر کی بات کرے۔ جب بکر اس بات سے ناراض ہو۔ تو زید کہے کہ بھائی میں نے تو ہنسی کی تھی۔ اس پر بکر ناراض ہو کر زید کو دو تھپڑ لگا دے اور کہے کہ بھئی میں بھی ہنسی ٹھٹھے میں یہ لگا دیتا ہوں۔ اب بکر نے جو سزا دی۔ وہ ہنسی میں نہیں دی بلکہ ناراضگی سے دی۔ وہ زید کی طرح مذاق نہیں کر رہا تھا۔ مگر کہا اس نے یہی کہ لو یہ میری ہنسی ہے۔ کیونکہ درحاصل وہ زید کی ہنسی کی سزا تھی۔ پس کسی جرم کی سزا کو بھی انہی الفاظ میں اظہار کر دیتے ہیں۔ جن میں خود وہ جرم ظاہر کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ اس رنگ کی نہ ہو۔ خدا کی طرف ہنسی ٹھٹھے کو اس لئے منسوب نہیں کرتے۔ کہ وہ خدا کی شان کے مخالف ہے۔

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (البقرہ ۶۸)

ترجمہ:- (موسیٰ نے) کہا میں (اس بات سے) اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ (ایسا فعل کر کے) جاہلوں میں شامل ہو جاؤں۔

سے واضح ہے کہ جب پیغمبر بلکہ عام انسانوں کے لئے بھی ٹھٹھہ بازی جہل کی علامت ہے تو خدا کی مقدس ذات کی طرف اسے کیونکر منسوب کیا جا سکتا ہے

۱۲۶۔ خدا کی کرسی

عرش کے متعلق حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ رہی کرسی۔ سو اس کے معنے خود قرآن کریم نے کر دیئے ہیں۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ (البقرہ ۲۵۶)

یعنی خدا تعالےٰ انسانوں کا اگلا اور پچھلا سب علم رکھتا ہے اور وہ اس کے علم پر کچھ بھی احاطہ نہیں کر سکتے۔ سوائے اتنے علم کے جتنا وہ چاہے۔ بلکہ اس کی کرسی (یعنی علم) نے تو تمام آسمانوں اور ساری زمین کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اب یہاں کسی اور کے کہنے کی حاجت ہی نہیں۔ آیت خود ہی کرسی کے معنی علم کے کر رہی ہے پہلے انسانی علم کے احاطہ کا ذکر ہے۔ پیچھے خدائی علم کے احاطہ کا ذکر ہے۔ واضح ہو کر قرآن شریف بہت سے مقامات پر خود اپنے معنی اسی طرح کیا کرتا ہے اور اپنی آپ تفسیر کرنا اس کا ایک طریق ہے یفسر بعضہ بعضًا۔

(الفضل ۸ اپریل ۱۹۲۸ء)

۱۲۷۔ قرآن کو کوئی کتاب منسوخ نہیں کرے گی

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (الکھف ۲۸)

یہ کتاب جو تیرے رب کی طرف سے وحی کی گئی ہے اُسے پڑھ کوئی کلام اس کے کلمات کو تبدیل نہیں کرے گا۔ یعنی اب یہ دائمی کتاب ہے اور تجھے اس کتاب کے سوا اور کہیں بھی پناہ کی جگہ نہیں ملے گی۔

۱۲۸۔ آدم معصوم تھا

آدم نبی تھا کیونکہ اس پر امر و نہی دونوں نازل ہوئے۔

وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا ۔۔۔ اور وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (البقرہ: ۳۶)

ترجمہ: اور اس میں سے جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ۔ مگر اس (یعنی فلاں) درخت کے قریب نہ جانا۔

امر بھی احکام ہوں گے۔ مگر جو کچھ اس سے ہوا وہ بشریت کی کمزوری تھی نہ کہ نافرمانی۔ اس نے ارادۃً گناہ نہیں کیا اور اس کے پاس خود خدا کا سرٹیفکیٹ موجود ہے کہ وہ بھول گیا اور اسے دھوکہ دیا گیا۔ یہ دونوں باتیں اسے ارادی نافرمانی کی حدود سے باہر لے آتی ہیں۔ فنسی آدم ولم نجد لہ عزما اور فدلٰھما بغرور سے آدم کی معصومیت میں فرق نہیں آتا کیونکہ نسیان اور دھوکہ کھا جانا بشری لوازم ہے خصوصاً پہلے انسان کی پہلی بھول ہو اور سادہ فطرت ناتجربہ کار آدم کو پہلی دفعہ ہی دھوکہ دیا گیا ہو۔ باقی یہ کہ اسے پھر یہ سزا کیوں ملی کہ جنت سے نکالا گیا۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا نے انسان کو جنت میں ہمیشہ رہنے کے لئے بنایا ہی نہ تھا۔ خواہ وہ بھولتا یا نہ بھولتا اس نے تو وہاں سے نکلنا ہی تھا۔ کیونکہ وہ تمام زمین کا خلیفہ اور حاکم بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اور وہ جنت بھی زمینی تھی نہ کہ آسمانی۔ پس نکلنا مصلحت الٰہی کے ماتحت تھا نہ کہ سزا کے طور پر۔

۱۲۹۔ طیبات

سوائے معدودے چند اشیاء کے باقی تمام چیزیں حلال ہیں۔ گویا حلال کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مگر قرآنی تحریص یہی ہے کہ مومن نہ صرف حلال بلکہ حلال میں سے بھی طیب اشیاء کھایا

کریں۔ یعنی ایسی پاکیزہ چیزیں جن سے گھن نہ آئے۔ اکثر لوگ ان کو کھاتے ہوں۔ شرفا میں ان کا رواج ہو۔ انبیاء کی پاک جماعت کی پسندیدہ ہوں۔ بیماری نہ پیدا کرتی ہوں یا اخلاق پر بُرا اثر نہ ڈالتی ہوں۔ مزے میں دل پسند ہوں۔ بُو نہ ہو۔ غفلت اور خمار یا نشہ پیدا کرنے والی نہ ہوں اپنے مزاج کے موافق ہوں ۔

كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ؀ (البقرہ ۱۶۹)

ترجمہ : جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے جو کچھ حلال اور پاکیزہ ہو اسے کھاؤ ۔

یعنی حلال بھی ہو اور طیب بھی۔ مثلاً دُنبہ کی چربی طیب ہے لیکن اگر دُنبہ غیر اللہ کے نام کا ہو۔ تو بوجہ اس کے حرام ہونے کے وہ طیب چیز بھی ناجائز ہو جائے گی ۔ بیمار کے لئے اگر آم مضرِ صحت ہے تو گو حلال ہے مگر طیب نہیں ۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو تہجد کی عادت ہو۔ لیکن جس رات وہ پراٹھا کھا کر سوتا ہو۔ اس دن تہجد غفلت اور نیند کی وجہ سے ناغہ ہو جاتی ہو۔ تو اس کے لئے وہ پراٹھا غیر طیب ہے بعض نوجوان طلباء کے لئے ممکن ہے کہ مسلسل گوشت کھانا غیر طیب ہو۔ کیونکہ وہ ان کے بعض قویٰ کو نامناسب اور ناجائز طور پر تحریک دے کر دماغ کو پراگندہ کر دیتا ہے میں نے ایک دوست کو دیکھا کہ جب وہ تیز مرچوں والا سالن کھاتے تو ایک دو لقموں کے بعد ہی ان کو گھنٹوں تک سخت ہچکی لگی رہتی۔ اسی طرح بعض ملکوں قوموں اور افراد کا طیب الگ الگ بھی ہوتا ہے۔ سخت سرد ملکوں میں گوشت انڈے مچھلی کی کثرت مفید ہے۔ گرم ملکوں میں نہیں۔ ہندوستان میں لسی پسندیدہ ہے آئس لینڈ کے باشندوں کے لئے مصیبت اسی طرح بعض صوفی کھیر سالن اور کھچڑی ملا کر بلکہ اسے باسی کر کے اور سڑا کر یا اس میں راکھ کی چٹکی ڈال کر کھاتے ہیں ۔ کہ ہم نفس کو مارتے ہیں۔ یہ ناجائز ہے۔ کیونکہ ایسا کھانا طیب ہی نہیں رہتا۔

۱۳۰ - ایک آیت کے زیادہ معنی

قرآن مجید کی آیات اور الفاظ کے کئی کئی معانی ہوسکتے ہیں اور اسی وجہ سے قرآن مجید ذوالمعارف کہلاتا ہے۔ نمونہ کے طور پر یہ آیت یعنی

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ (بنی اسرائیل ، ۳۷)

ترجمہ ، اور (اے مخاطب) جس بات کا تجھے علم نہ ہو اس کی اتباع نہ کیا کر

پہلے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کا علم نہ ہو۔ وہ مونہہ سے نہ نکال۔ مثلاً الف کے نام سے نہیں آتی۔ مگر ایک رسالہ جاری کر دیا اور نام رکھ دیا اس کا "ادیب"۔ دوسرے معنی ہیں کہ اس چیز کی پیروی نہ کر جس کی حقیقت علمی طور پر تجھے معلوم نہیں۔ یعنی بغیر دلیل کے یونہی باتیں نہ مان لیا کرو۔ مثلاً کیمیا کی کوئی دلیل علمی یا عملی نہیں پائی مگر کیمیا گروں کے شاگرد بن گئے اور ساری دولت برباد کر دی۔ تیسرے معنے یہ ہیں کہ ایسی چیز کے پیچھے نہ پڑ جس کا علم تجھے نفع مند نہ ہو۔ مثلاً ایک طالب علم اپنے باقاعدہ مطالعہ کو چھوڑ کر موسیقی اور گانے بجانے میں منہمک ہو جائے۔ تو اگرچہ موسیقی بھی ایک علم ہے۔ مگر اس طالب علم کے لئے نفع مند نہیں ہے۔ اس لئے اسے اپنا وقت اس میں نہیں لگانا چاہیئے۔

اب ایک اور آیت لیجئے۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ؗ (البقرہ ، ۱۹۸)

ترجمہ ، اور زادِ راہ (ساتھ) لو اور (یاد رکھو) کہ بہتر زادِ راہ تقویٰ ہے

یعنی حج کے سفر میں ضرور زادِ راہ لے لیا کرو۔ کیونکہ زادِ راہ کا فائدہ یہ ہے کہ انسان جبری تنگی اور سوال سے بچا رہتا ہے۔ دوسرے معنے یہ ہیں کہ زادِ راہ لے لیا کرو۔ اور کامل تقویٰ بہترین زادِ راہ ہے۔ یعنی سفر میں تقویٰ اور پرہیزگاری سب توشوں سے بہتر

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (الکافرون ۶)

ترجمہ :۔ (اُوپر کا اعلان تیجہ ہے اس کا کہ) تمہارا دین تمہارے لئے (ایک طریق کار مقرر کرتا) ہے اور میرا دین میرے لیے (دوسرا طریق کار مقرر کرتا) ہے کے ایک معنے ہیں کہ تمہیں بدلہ تمہیں ملے گا۔ اور میرا مجھے یعنی انجام فیصلہ کرے گا کہ کون سچا ہے ؛ دوسرے معنے کہ تمہارا دین تمہیں مبارک رہے اور میرا مجھے یعنی میں تمہارے دین سے بیزار ہوں۔ تیسرے یہ کہ میں تمہارے مذہب میں جبر نہیں کرتا نہ تم میرے مذہب میں کرو۔ یہ معنی لَا اِكْرَاهَ فِی الدِّین کے مطابق ہوں گے ۔

اسی طرح لَا تَقْتُلُوا اَنْفُسَكُم کے ایک معنی یہ ہیں کہ انسانوں کو قتل نہ کرو دوسرے یہ کہ اے مسلمانو! آپس میں نہ لڑو۔ تیسرے یہ کہ خودکشی نہ کرو۔

اسی طرح وَالْعَصر یعنے قسم ہے زمانہ کی یا یہ کہ قسم ہے تیسرے پہر کی۔ یا یہ کہ قسم ہے تمام مقتولوں اور جملوں اور سچی تعلیموں کے نچوڑ اور خلاصہ کی ۔

یومنون بالغیب کے تین معانی سُن لو (۱) غیب پر یعنی خدا و رسالت قیامت فرشتے اور وحی جو غیب کی چیزیں ہیں ان پر ایمان لاتے ہیں ۔ (۲) اور جدا ہوتے ہیں تخلیہ میں یعنی کچھ وقت تخلیہ کا ہمیشہ نکالتے ہیں تاکہ اس میں خدا کو یاد کریں ۔ (۳) اندر بھی وہی ایمان رکھتے ہیں جو زبان سے ظاہر کرتے ہیں ۔ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا (النور ۶۴) کے ایک معنی یہ ہیں کہ تم رسول کو اس طرح نہ پکارا کرو۔ جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ (ادب سے بلایا کرو) دوسرے یہ کہ تم رسول کی دعا کو اس درجہ کی نہ سمجھو۔ جس طرح آپس میں ایک دوسرے کی دُعا کو سمجھتے ہو (بلکہ وہ بہت بلند ہے) تیسرے یہ کہ رسول جب تم کو بلائے۔ تو اس کے بلانے کو آپس کے بلانے کی طرح معمولی نہ سمجھو (بلکہ فوراً حاضر ہو خواہ نماز میں ہو۔ اور بے اجازت واپس نہ جاؤ) چوتھے تم رسول پر جو درود بھیجتے ہو اس کو دوسرے لوگوں کی

دعاؤں جیسا نہ سمجھو۔ بلکہ درود بہ نسبت اوروں کے لئے دُعا کرنے کے بہت افضل چیز ہے (الفضل ۱۳ اپریل ۱۹۳۸ء)

۱۳۱۔ دنیاوی مصائب

آریہ صاحبان کہتے ہیں کہ دُنیا کی تنگی ترشی ان کے گزشتہ اعمال کا نتیجہ ہیں۔ اور قرآن فرماتا ہے کہ

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ

(الشوریٰ : ۲۸)

یعنی اگر اللہ اپنے بندوں کے لئے رزق کشادہ کر دیتا۔ تو ضرور وہ سرکشی اور فساد کرتے۔ اسی لئے وہ ایک اندازے کے ساتھ جتنا چاہتا ہے اتارتا ہے۔ کیونکہ وہ بندوں کے حالات۔ اور ان کی فطرت سے خوب واقف ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تنگیٔ رزق بھی لوگوں کے فائدہ اور دُنیا کے نظام کے لئے ضروری ہے اور کئی لوگ اسی لئے نجات یافتہ ہوں گے کہ وہ غریب تھے۔ اسی طرح اور مصائب بھی انسان کی اصلاح کرتے ہیں۔ مثلاً بیماری بھی انسان کی بہت اصلاح کرتی ہے۔ صحت کی قدر اور خدا تعالیٰ کی طرف سے رجوع اور دُعا۔ صدقات وخیرات وغیرہ نیکیاں مصائب کی وجہ سے ہی انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ اسی طرح بیماریاں انسان کی اصلیت اور اس کے ظرف کو ظاہر کر دیتی ہیں۔ تاکہ وہ اپنی اصلاح کر سکے۔

ایک دن ایک بچہ سر سے پیر تک پھوڑوں سے لگا ہوا ہسپتال میں لایا گیا۔ اس کی ماں اس کے ساتھ تھی۔ ایک دہریہ ڈاکٹر کہنے لگا۔ کہ اگر کوئی رحیم خدا ہوتا تو یہ حالت دُنیا کے لوگوں کی نہ ہوتی۔ میں نے کہا ہمارا خدا صرف رحیم نہیں بلکہ حکیم اور ذو انتقام

بھی ہے۔ اس کی دوسری صفات کا مظاہرہ ہونا بھی دُنیا میں ضروری ہے۔ رحیم ہونے کی وجہ سے وہ اس بچہ پر دوسری قسم کے فضل نازل کرے گا دُنیا میں اور آخرت میں حکیم ہونے کی وجہ سے ممکن ہے کہ اس کو کسی اور مہلک مرض سے بچانے کی غرض سے یہ بیماری دی ہو۔ کیونکہ بعض بیماری دوسری زیادہ خطرناک بیماری سے بچا لیتی ہیں۔ مثلاً گائے کی غیر مہلک چیچک انسانی مہلک چیچک سے یا ملیریا بعض قسم کے خطرناک جنون سے۔ اسی طرح ایک یہ حکمت ہے کہ ان بچوں کی وجہ سے آپ کو مفت کا ثواب ملتا ہے۔ اور علاج کے متعلق آپ کا علم بڑھتا ہے۔ اور پھر لاکھوں ایسے مریض شفا یاب ہو سکتے ہیں۔ یا حفظِ ماتقدم اس بیماری کا دُنیا میں رائج ہو سکتا ہے۔

ذوانتقام اس وجہ سے کہ قدرت اس کی اور اس کے والدین کی بد پرہیزی کا بدلہ لے رہی ہے تاکہ دوسرے لوگ عبرت پکڑیں اور اُسے سزا ملے۔ کہنے لگا کیا بچوں کو بھی سزا؟ میں نے کہا۔ کہ اگر بچہ آگ میں ہاتھ ڈال دے تو کیا اس کا ہاتھ نہیں جلے گا۔ قانونِ قدرت تو چھوٹے بڑے سبھی پر حاوی ہے۔

اسی طرح بہت تمول سے انسان خدا کی طرف سے لاپروا ہو جاتا ہے اور زندگی میں بھی خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ بیسیوں کروڑپتی اس بات کے گواہ ہیں۔ بلکہ کئی تو ان میں سے خودکشی کر کے مرگئے اور مرتے وقت لکھ کر چھوڑ گئے۔ کہ دُنیا کی دولت میں فکر اور غم زیادہ ہے۔ بلکہ غور سے دیکھا جائے تو رنج و راحت اکثر لوگوں کو برابر برابر ہی تقسیم کیا گیا ہے۔ امیر کے آگے سو نعمتیں ہوں مگر اسے ان میں لذت نہیں۔ غریب کو حاقت ایک سوکھے ٹکڑے میں ملتی ہے اور جو لطف اس کے چبانے میں آتا ہے وہ امیر کو مرغ پلاؤ میں بھی نہیں آتا۔ جیسی میٹھی نیند غریب سوتا ہے۔ ویسی امیر کہاں سوتا ہے۔ میں نے خود بعض دولت مند تاجروں کو دیکھا ہے جو چوروں اور قاتلوں کے ڈر کے مارے پلنگ کسی کمرہ میں بچھواتے تھے۔ اور سوتے کسی اور کمرہ میں تھے۔ ہر روز ان کی

چارپائی کسی علیحدہ جگہ پر ہوتی تھی۔ ہاں یہ میں مانتا ہوں کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو اکثر حصہ عمر میں راحت و آرام نصیب نہیں ہوا۔ سو ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے آخرت میں مزید انعامات کا وعدہ کیا ہوا ہے اور وہ اُمراء سے سینکڑوں سال پہلے جنت میں چلے جائیں گے۔ مگر یہ بات غلط ہے کہ کوئی شخص بلا کسی راحت و آرام کے زندہ ہے۔ کیونکہ اگر غریبوں کو مرنے کے لئے کہا جائے۔ تو وہ اس پر ہرگز راضی نہ ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی آرام تو ہے ورنہ وہ زندگی کو لمبا کرنے اور دُنیا میں رہنے کے ——— خواہش مند نہ ہوتے۔ نہ اپنی بیماریوں کا علاج کرواتے۔ نہ یہ خواہش رکھتے کہ ہمارے ہاں اولاد ہو۔ جو ہماری طرح مصیبت اُٹھائے۔

میرے پاس ایک غریب کمپونڈر تھا۔ اور اُس کا ایک ہی لڑکا تھا۔ ایک دن آہ بھر کر کہنے لگا۔ کہ دیکھو اس علاقہ کے نواب کو کہ دولت کی وجہ سے کس قدر راحت و آرام میں ہے۔ اور مجھے دیکھو کہ غربت سے اتنا تنگ ہوں۔ میں نے اُسے کہا۔ میاں اللہ دتہ نواب نے تین شادیاں کی ہیں اور اتنی دولت ہے مگر اس کے اولاد نہیں۔ اسی حسرت میں مرا جاتا ہے کہ میں لاولد ہوں۔ اور یہ غم اس کے دل کو کھائے جاتا ہے کیا تمہیں یہ منظور ہے کہ تمہارا اکلوتا بیٹا اس کو مل جائے اور اس کی دولت تم کو۔ میں نے ابھی فقرہ ختم نہیں کیا تھا کہ اُس نے چیخ ماری اور رو کر کہنے لگا کہ سائیں خدا کے لیے میرے بیٹے کا بُرا نہ چاہو۔ لعنت ہے اس دولت اور ریاست پر جس میں میرا پیارا قادر بخش میری آنکھ سے اوجھل بھی ہو اس وقت اسے پتہ لگا کہ واقعی میں غریب ہو کر بھی نوابوں سے زیادہ خوش ہوں۔

حقیقت اس اختلاف و تکالیف کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک دنیا دارالابتلاء ہے اور اصل گھر انسان کا آخرت ہے۔ جو بہتر اور باقی رہنے والا گھر ہے۔ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے۔ وہی دنیا میں آرام اور اپنے اعمال کے اجر کے طالب ہوتے ہیں۔

اور دُنیا کو ہی آخرت اور دارالاجر ماننے لگتے ہیں۔ ان کے نزدیک سب نعمتیں بس دُنیا پر ختم ہیں۔ مسلمان کے نزدیک یہ جگہ اور اس کی نعمتیں کچھ بھی نہیں۔ بھلا وہ نعمتیں بھی کیا۔ جو زوال پذیر ہوں اور پھر ہر قسم کی تلخیاں بھی ان کے ساتھ ساتھ لگی ہوں بل تحبون العاجلہ۔ جلد باز انسان چاہتا ہے کہ خواہ تھوڑا سا بھی آرام ہو فوراً اور ابھی مل جائے مگر مومن کی نظر وسیع ہوتی ہے۔ وہ اپنا ذخیرۂ اعمال اپنے مستقل گھر کے لئے رکھتا ہے۔ کیا کسی نے ریلوے ویٹنگ روم کو بھی اپنے فرنیچر اور سامان سے آراستہ کیا ہے؟ جہاں تھوڑی دیر ٹھہرنا ہو۔ وہاں بستر کھول کر لیٹ جانا کیسی بے وقوفی کی بات ہوگی۔

یاد رکھو کہ جو مصائب لوگوں پر اس دُنیا میں نازل ہوتی ہیں۔ وہ یا تو سزائیں اسی دنیا کی بداعمالیوں کی۔ یا ابتلا ہیں انعام اور ترقی کے لئے۔ یا عام قانونِ قدرت کے ماتحت ہیں۔ جو غفلت اور لاعلمی کی وجہ سے انسان بھگتتا ہے۔ یا لوگوں کی طرف سے اس پر مظالم ہیں جن کی سزا مجرم کو اور جزا مظلوم کو آئندہ ملے گی چنانچہ فرمایا

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (یونس: ۴۵)

ترجمہ:۔ اللہ کی شان) یقیناً (ایسی ہے کہ وہ) لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ اپنی جانوں پر (آپ ہی) ظلم کرتے ہیں۔

یعنی لوگ آپس میں ظلم کرتے ہیں اور الزام خدا پر لگاتے ہیں۔

۱۳۲۔ اختلاف کی وجہ ذاتی عناد بھی ہے ۔

فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ (الجاثیہ: ۱۸)

ترجمہ:۔ اور بنی اسرائیل نے اُسی وقت اس کے بارہ میں اختلاف کیا جب

ان کے پاس کامل علم (قرآن) آگیا (یہ اختلاف) اُن کی باہمی سرکشی کی وجہ سے تھا۔

یعنی ہم نے دین حق کے لئے روشن نشان اور علمی دلائل دونوں نازل کر دیئے پھر بھی غیر مبائع۔ اور ان جیسے لوگوں نے اختلاف کیا۔ صرف اس لئے کہ ان کو بعض لوگوں سے خاص رنجشیں اور ذاتی عناد تھا۔ (الفضل ۵؍اپریل ۱۹۳۸ء)

۱۳۳۔ دنیا میں اَجر اور آخرت میں محرومی

کفار بھی نیکیاں کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ان کا بدلہ ہم اس دنیا میں دے دیتے ہیں۔ اور وہ یہیں ان کا فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔

اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ فِىۡ حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا وَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهَا ۚ

(الاحقاف ۲۱)

ترجمہ:۔ (اور کہا جائے گا) تم دُنیا کی زندگی میں اپنے سب انعامات ختم کر چکے ہو اور دُنیا کی زندگی سے جتنا فائدہ اُٹھانا تھا اُٹھا چکے ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ گو نیکی ایک ہی طرح کی ہو۔ اور عمل برابر ہو۔ مگر دُنیادار اور مومن کی نیت میں فرق ہوتا ہے۔ دنیادار دُنیا کے دکھاوے اور دنیا کے خوش کرنے اور اپنے دنیاوی فائدہ کے لئے نیکیاں کرتا ہے۔ اس لئے اس کا اجر دنیا میں ہی پا لیتا ہے۔ لوگوں کی طرف سے بھی واہ واہ ہو جاتی ہے۔ معاوضہ بھی مل جاتا ہے اور خدا تعالیٰ بھی اس کی نیکی کا بدلہ اپنی عادت کے مطابق دنیا میں ہی بہت بڑھا چڑھا کر دے دیتا ہے۔ مگر آخرت میں اس کے لئے محرومی ہے

۱۳۴ ۔ مومن باذاق ہوتا ہے

يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ (الطور ۲۴)

ترجمہ ۔ وہ آپس میں ایسے پیالوں کے متعلق جھگڑیں گے جن کا نتیجہ نہ لغو بکنا ہوگا اور نہ گناہ کرنا ہوگا ۔

مومن سڑیل اور خشک نہیں ہوتا ۔ بلکہ بے تکلف باذاق لطیفہ گو اور بذلہ سنج ہوتا ہے ۔ البتہ اس میں بے ہودگی اور خباثت نہیں ہوتی ۔

۱۳۵ ۔ آسماں حملے کرے گا کھینچ کر اپنی کٹار

پس جب فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (رحمٰن ۳۸)

ترجمہ ۔ جب آسمان پھٹ جائے گا اور سرخ چمڑے کی طرح ہو جائے گا (وہ آخری فیصلہ کی گھڑی ہوگی)

پڑھتا ہوں تو مجھے یہ مصرع حضور (آپ پر سلامتی ہو) کا یاد آتا ہے ۔

آسماں حملے کرے گا کھینچ کر اپنی کٹار

۱۳۶ ۔ رہبانیہ کے متعلق

وَرَهْبَانِيَّةَ ِۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (الحدید ۲۸)

اس کا یہ مطلب ہے کہ رہبانیت کو ہم نے ان پر فرض نہیں کیا تھا بلکہ رضائے

الہٰی کے حصول کے لئے وہ خود اس پر بطور نوافل کے عمل کرتے تھے۔ مگر نقص یہ پیش آیا کہ انہوں نے رہبانیت کی صحیح رعایت نہ کی بلکہ افراط تفریط میں پڑ گئے۔ اس سے رہبانیت کی مذمت اور انکار نہیں نکلتا۔ بلکہ خدا نے تو فرمایا ہے کہ اگر صحیح طور پر حق رہبانیت ادا کرتے تو خدا راضی ہو جاتا۔ اور اس نے ایمانداروں کو رہبانیت کا اجر بھی دیا۔ لیکن بعض لوگوں نے اس رہبانیت کو ہی دنیا کمانے کا ذریعہ بنا لیا۔ سو اگر کوئی شخص افراط تفریط سے بچے۔ رہبانیت کا حق ادا کرے یعنی بطور مشق نفس اسے عمل میں لائے۔ اور دل کو دنیا میں نہ لگائے اور کم سے کم تعلق دنیا سے رکھے۔ تو اس کو بھی اجر ملے گا۔ بے شک انہوں نے یہ طریقہ خود ایجاد کیا تھا۔ مگر کیا ہر انسان رضائے الہٰی کے کئی کئی طریقے خود ایجاد نہیں کرتا رہتا۔ یہ بھی ایک نیک ایجاد تھی مگر چونکہ بعض لوگ اعتدال اور حدود شریعت سے گزر جاتے تھے۔ اس لئے ان کو اس سے نقصان بھی پہنچا ورنہ نیت اچھی ہو۔ اور تقویٰ سے نبھائی جائے اور جہاں منع ہو وہاں انسان رک جائے۔ تو اس حالت میں اس کی مذمت نہیں معلوم ہوتی۔ اور لا رھبانیۃ فی الاسلام کے معنی بھی یہی ہیں کہ رہبانیت اسلام میں فرض نہیں ہے۔

۱۳۷۔ ولی کسے کہتے ہیں؟

یہ سوال ہمیشہ پوچھا جاتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ ہر مومن اور متقی ولی ہے کیونکہ
وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ (الجاثیہ، ۲۰)

ترجمہ: اور اللہ متقیوں کو پناہ دینے والا ہے

اور وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ (آل عمران، ۶۹)

ترجمہ: اور اللہ مومنوں کا دوست ہے۔

سے بھی تمیز نکلتی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لوگ شاید ولی کی علامات پوچھتے ہیں جس سے پتہ لگ جائے کہ آیا ہم میں بھی کچھ ولایت آگئی یا نہیں سو حسب ذیل نشانات قرآن نے ولیوں کے بیان کئے ہیں ۔

۱۔ ان کو نہ خوف ہو نہ غم خوف آئندہ کا اور غم گزشتہ کا ۔

۲۔ وہ مومن مشہور ہوں اور واقعی ایسے ہی ہوں۔ یعنی ان کے اعمال اور طرز زندگی مومنانہ ہو۔

۳ وہ متقی مشہور ہوں لوگ جانتے ہوں کہ یہ شخص خدا کا خوف اپنے دل میں رکھتا ہے۔ اور وہ شخص بھی اپنے دل میں خدا کی خشیت محسوس کرتا ہو۔

۴۔ ان کو خدائی بشارات دنیاوی امور میں بھی اور آخرت کے متعلق ملتی ہوں ۔

۵۔ ان کو ایک معرفت حاصل ہو۔ جس سے وہ نور و ظلمت میں تمیز اور غلط و صحیح میں فرق کر لیتے ہوں۔ اور ان کی بصیرت روحانی امور میں دوسروں سے زیادہ ہو۔

اب پڑھئے ۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ (یونس ۶۲، ۶۳، ۶۴ — ۵۰)

ترجمہ: سُنو! جو (لوگ) اللہ سے سچی محبت رکھنے والے ہیں اُن پر نہ کوئی خوف (مستولی ہوتا) ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔

(یعنی وہ لوگ) جو ایمان لائے اور تقویٰ کو (ہمیشہ) لازم حال رکھتے تھے۔

اُن کے لئے (اِس) ورلی زندگی میں (بھی خدا کی طرف سے) بشارت (اپنے کا انعام مقرر) ہے اور بعد والی (زندگی) میں بھی۔

اَللّٰهُ وَلِىُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ

اِلَى النُّوْرِ (البقرہ: ۲۵۸)

ترجمہ: اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لاتے ہیں۔ وہ اُنھیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔

۱۳۸۔ سابقون الاوّلون

صفِ اول ہونا یعنی سبقت زمانی بھی ایک بڑی فضیلت ہے۔ یوں تو ہمیشہ پہلوں کو مصائب بھی زیادہ آتی ہیں۔ مگر نہ آئیں تب بھی وہ امت پر صفِ اول ہونے کی وجہ سے فضیلت رکھتے ہیں۔

لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا (الحدید: ۱۱)

ترجمہ: اے مومنو! فتح سے پہلے جس نے خدا کی راہ میں خرچ کیا اور اس کی راہ میں جنگ کی وہ اس کے برابر نہیں ہو سکتا جس نے فتح کے بعد خرچ کیا اور فتح کے بعد جنگ کی۔ فتح سے پہلے خرچ کرنے والے اور جنگ کرنے والے درجہ میں بہت زیادہ ہیں۔

یعنی فتح مکہ سے پہلے خرچ کرنے والے اور جہاد کرنے والے درجہ میں ان لوگوں سے بہت بالا ہیں جنہوں نے فتح مکہ کے بعد مالی امداد دی اور جہاد کیا۔ کئی سال گزرے اس مسئلہ کی صداقت مجھ پر عملی طور پر منکشف ہوئی۔ ہم کئی لوگ ایک دفعہ قادیان کسی جلسہ سے واپس جا رہے تھے کہ بٹالہ پر سیکنڈ کلاس گاڑی میں بسبب ہجوم کے بہت تنگی ہوگئی۔ یہاں تک کہ ہم میں سے بعض کو اوپر کے برتھ پر اسباب کے بنڈلوں میں پھنس کر بیٹھنا پڑا اور بعضوں کو بیت الخلاء کے آگے کھڑا ہونا پڑا۔ اس وقت اوپر والے صاحب

نے کہا کہ میر صاحب کوئی بات کریں۔ میں نے کہا کہ میں

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ (التوبہ: ۱۰۰)

ترجمہ:۔ اور جو مہاجرین اور انصار میں سے سبقت لے جانے والے ہیں ۔

کی آیت کی تفسیر کر رہا ہوں۔ فرمانے لگے کس طرح۔ میں نے کہا کہ دیکھئے ہم نے اور ان سب لوگوں نے برابر کرایہ ادا کیا ہے۔ لیکن کئی ان میں سے آرام کے ساتھ گدوں پر بیٹھے ہیں۔ بعض نیچے کھڑے ہیں۔ اور آپ تو چھت پر ہی معلق ہیں۔ ان لوگوں میں سے کچھ تو پچھلے سٹیشنوں سے آ رہے ہیں وہ بہترین جگہوں کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ پھر کچھ لوگ ہمارے ساتھ ہی بٹالہ سے چڑھے۔ مگر جو پہلے چڑھ گیا وہ اچھی جگہ لے گیا۔ اور جو پیچھے گھسا وہ کھڑا رہ گیا۔ اور جو سب میں پیچھے آیا وہ اسباب کی طرح اوپر ٹھونس دیا گیا۔ حالانکہ سب نے کرایہ برابر دیا ہے۔ صرف فرق پہلے پیچھے آنے کا ہے۔ سو یہی حال خدا کے ہاں بھی ہے۔ ٹکٹ کی قیمت برابر بھی ہو تو پہلے آنے والا بہترین سیٹ لے لیتا ہے۔ یہی وجہ مہاجرین کی جماعت کو انصار پر فضیلت کی بھی ہے

(الفضل ۱۹ اپریل ۱۹۳۰ء)

۱۲۹۔ حضرت ابراہیمؑ کی بُت شکنی

اس کا ذکر سورۂ انبیاء میں ہے اور یوں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور برادری کو جمع کر کے بُت پرستی اور اعتراض کئے اور فرمایا کہ یہ کیا فضول مورتیاں ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ پھر اُن سے کہا کہ جب تم ادھر اُدھر نظر سے اوجھل ہو جاؤ گے تو کسی دن میں تمہارے ان بتوں کو توڑ کر رکھ دوں گا پھر ایک دن انہوں نے جو کہا تھا وہ کر کے چھوڑا۔ صرف بڑے بُت کو رہنے دیا۔ جب وہ لوگ بُت خانہ میں آئے تو کہنے لگے یہ کام کس نے کیا ہے۔ حاضرین کہنے لگے کہ ہم نے ایک جوان کو جس کا نام ابراہیم ہے یہ کہتے سنا تھا کہ میں ان کو توڑ دوں گا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سب

کے سامنے لایا گیا اور پوچھا گیا کہ کیا تو نے یہ کام کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا:۔

بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ

(الانبیاء ، ۶۳)

کسی کرنے والے نے ضرور یہ کام کیا تو ہے۔ یہ بڑا بُت بھی موجود ہے۔ باقی تم خود انہی سے پوچھ لو۔ اگر یہ کچھ بتا سکیں اس ساری عبارت کو پڑھ کر جھوٹ کا الزام لگانا کسی بے وقوف ہی کا کام ہے۔ وہ ساری برادری کے سامنے کہہ چکے ہیں۔ کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان بتوں کو ضرور توڑ دوں گا۔ اور تمہاری غیر حاضری میں توڑوں گا۔ واقعہ کے بعد بھی لوگوں نے یہی کہا کہ ایک شخص ابراہیم نام یہ بات کہا کرتا تھا کہ میں انہیں توڑ دوں گا۔ پھر آپ نے ان کی غفلت اور بے وقوفی ظاہر کرنے کے لئے ایسے الفاظ میں ان کو توجہ دلائی۔ جن سے زیادہ صاف الفاظ کوئی راستباز کہہ نہیں سکتا تھا۔ اس کے بعد باقاعدہ لیکچر ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی خوب خبر لی ہے اور کہا ہے۔

اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ (الانبیاء ، ۶۸)

ترجمہ :۔ (ہم) تم پر افسوس (کرتے ہیں) اور اس پر بھی جس کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو۔

کیا ایسا شخص اپنی جان بچانے کو جھوٹ بول سکتا تھا ہرگز نہیں بلکہ وہ تو حکمت سے ان کو سمجھاتا تھا۔ اور خود بالکل نڈر تھا۔ ہر آدمی کا جھوٹ بر نا چہ معنی دلیر اجلا بڑے بت کو ثابت چھوڑ دینے سے ایک عجیب مضحکہ خیز نظارہ انہوں نے پیدا کر دیا کہ آس پاس سلامی فوج کٹی پڑی ہے۔ اور بیچ میں بڑے میاں سخت ذلیل اور شرمندہ صورت بیٹھے ہیں۔ جو نہ منہ سے بولتے ہیں اور نہ سر سے کھیلتے ہیں۔ اگر حکمت کا نام جھوٹ ہے تو اس قسم کے کلام سے تو کوئی کتاب اور کوئی نبی خالی نہیں بلکہ بعض نے تو تمثیلات میں کلام کرنے ہی کا لکر رکھا تھا۔ ایسے بزرگ تو پھر کذاب ہی ہوں گے۔ نعوذ باللہ

۱۴۰۔ تاویل

تاویل کے معنی ہیں حقیقت یا اصلیت کے جیسے

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ (آل عمران : ۸)

ترجمہ : حالانکہ اس کی تفسیر کو سوائے اللہ کے اور علم میں کامل دستگاہ رکھنے والوں کے (کہ) جو کہتے ہیں (کہ) ہم اس (کلام) پر ایمان رکھتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا

اور هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ (یوسف : ۱۰۱)

ترجمہ : یہ میرے پہلے سے (خواب میں) دیکھی ہوئی بات کی تعبیر ہے۔

سے ظاہر ہے۔ مگر اس زمانہ کے مولوی تاویل کے معنی یہ کرتے ہیں۔ کہ جو معنے ظاہری الفاظ سے ذرا بھی مختلف ہوں۔ خواہ صحیح یعنی وہ تاویل کہلاتے ہیں۔ اور غلط ہوتے ہیں۔ ایک لطیفہ یاد آیا۔ یوپی کے کسی شہر میں احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان مباحثہ قرار پایا۔ اور شرط اول یہ رکھی گئی۔ کہ الفاظ اپنے ظاہر پر محمول ہوں گے۔ کوئی تاویل جائز نہ ہوگی۔ اس کے بعد مباحثہ شروع ہوا۔ غیر احمدی مولوی نے حیات مسیح کی حدیث پیش کی اور کہا

کیف انتم اذا نزل فیکم ابن مریم ... الخ

اور تقریر کی کہ حاضرین! دیکھئے یہاں ابن مریم کا لفظ ہے۔ تاویل نہیں جائز۔ یہاں سوائے عیسٰی ابن مریم کے اور کوئی مراد نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ثابت ہوا کہ وہ زندہ ہے اور وہی اُترے گا۔ اس پر احمدی مقرر نے کہا۔ صاحبان شرط اول سے ہی ان کی دلیل غلط ثابت ہوتی ہے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتم اور کم کہہ کر حاضر الوقت صحابہ سے کہا کہ تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے اندر ابن مریم نازل ہوگا۔ سو یا تو وہ انہی صحابہ کے سامنے نازل ہو چکا۔ اب انتظار فضول ہے۔ یا پھر یہ حدیث

ہی غلط ہے کیونکہ کسی تاریخ یا حدیث سے ابن مریم کا ان صحابہ کے سامنے نازل ہونا ثابت نہیں۔ غیر احمدی مولوی نے کہا اس سے مطلب آئندہ زمانہ کے لوگ بھی ہیں۔ احمدی نے کہا تاویل نہیں کرنی۔ اور اگر کرنی ہے تو پھر جہاں آخری زمانہ کے لوگ صحابہ بن سکتے ہیں۔ وہاں مرزا غلام احمد ابن مریم بھی بن سکتے ہیں۔ آخر حاضرین نے غیر احمدی مولوی کو شرط توڑنے والا بتایا اور احمدی کی دلیل کو مضبوط بتا کر اسے غالب قرار دیا۔

۱۴۱۔ مکی و مدنی سورتیں

مکی اور مدنی سورتوں میں عبارت اور مضامین کا نمایاں فرق ہے۔ لحاظ مضامین مکی سورتیں ثبوت ذاتِ باری توحیدِ الٰہی۔ صفاتِ الٰہیہ۔ نیک اخلاق۔ اعمالِ صالحہ۔ جنت دوزخ۔ ملائکہ۔ بعثت بعد الموت۔ قیامت۔ حشر نشر پیشگوئیاں دلائل نبوت۔ بتوں کی مذمت۔ خورونی حلال و حرام۔ مناظرہ با مشرکین و دہریہ وحی۔ اپنی کامیابی کی تحدی وغیرہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ اور ان میں اختصار ہے اور مشکل ہیں۔ مدنی سورتیں۔ احکام و شرائع و حدود مناظرہ با اہل کتاب۔ جہاد و غنیمت۔ آداب مجلس۔ منافقین اور حکومت و سیاست کے متعلق ہیں۔ ان میں اختصار کم ہے اور زیادہ آسان ہیں۔

۱۴۲۔ خلاصۂ کتاب اللہ

قرآن مجید پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب دراصل اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا آئینہ ہے۔ جو الفاظ اور آیات اللہ تعالیٰ کے حسن و محامد کے متعلق ہیں۔ ان کو اگر نکال دیا جائے تو شاید معدودے چند آیات رہ جائیں گی۔ جو غالباً سارے قرآن کا سواں حصہ بھی نہ ہوں گی۔

۱۴۳۔ خوفناک بائیکاٹ

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۡ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

(النور ۱ ۲)

یعنی ایسا سزا یافتہ زانی اگر نکاح کرنا چاہتا ہے۔ تو ایسی مسلمان عورت سے کرے جو خود بھی اسی کی طرح سزا یافتہ ہے۔ ایسی نہ ملے تو پھر کسی مشرکہ سے کرے۔ کوئی پاکباز مومنہ اس سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اسی طرح سزا یافتہ زانیہ یا تو کسی سزا یافتہ زانی سے ہی نکاح کرے۔ یا نہ ملے تو کسی مشرک سے کرے۔ پاکباز مسلمان سے اس کا نکاح جائز نہیں۔ اور عام مسلمانوں کے لئے یہ بات حرام ہے (یعنی سزا یافتہ زانیہ یا مشرکہ سے نکاح کرنا) گویا زنا کرنے والوں کی برادری ہی الگ بنا دی۔ یہ ایک خوفناک بائیکاٹ ہے۔ اور مشرکہ سے اس لئے اجازت دی۔ کہ جب مومنہ نہ ملے گی۔ تو پھر زنا میں گرفتار ہوگا۔ اور سزا پائے گا۔ اس لئے شریعت نے اس کے لئے سہولت نکال دی۔ حالانکہ دوسرے مومنوں کے لئے یہ منع ہے کہ مشرکات سے نکاح کریں۔ (الفضل ۱۷ اپریل ۱۹۳۰ء)

۱۴۴۔ قرآن مجید کا طرز بیان

قرآن مجید کا طرز بیان ایسا ہے گویا کوئی اپنے عزیز کو سمجھاتا ہے اور نصیحت کرتا ہے۔ بیچ میں قصے بھی ہیں۔ نرمی بھی ہے اور زجر بھی ہے۔ خطاب بھی ہے۔ عقل سے بھی اپیل ہے۔ جذبات سے بھی ہے۔ دلائل بھی ہیں۔ غرض ناصحانہ رنگ ہے۔ تصنیف والی بات نہیں۔ نہ لیکچر والی۔ بلکہ سامنے بیٹھ کر جس طرح آہستہ آہستہ کسی شخص کو اس کا بزرگ اور حقیقی خیر خواہ سمجھاتا ہو باتوں باتوں میں یعنی

هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ (آل عمران، ۱۳۹)

ترجمہ: یہ (ذکر) لوگوں کے لئے بہت وضاحت کرنے والا ہے اور متقیوں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔

۱۴۵۔ اضطرار کی حدود

اسلام نے اضطرار کو تسلیم کیا ہے۔ اور مجبور و مضطر کے لئے شریعت میں الگ حکم اتارا گیا ہے۔ مثلاً سؤر، خون اور مردار وغیرہ کو حرام قرار دے کر فرمایا

فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (البقرہ، ۱۷۴)

یعنی جو بے بس ہو اور حد سے نہ بڑھے۔ نہ سرکش ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے رحم سے بخش دے گا۔ یعنی کوئی بھوک سے مرنے لگا ہو تو مردار کھانا جائز ہے۔ بشرطیکہ دل میں اسے حرام سمجھے۔ اور صرف اتنا کھائے جس سے زندگی برقرار رہے۔ زیادہ نہیں۔ یہ دو شرطیں (مقدار کی اور باوجود کھا لینے کے اسے حرام اور نفرت کے قابل سمجھنے کی) ضروری ہیں۔ ایک شخص لاہور میں تھا۔ جو ایک فرقہ کا لیڈر بنا ہوا تھا۔ اس نے کوئی ناجائز شہوانی حرکت مسجد میں کی۔ جب لوگوں نے اسے پوچھا تو کہنے لگا کہ میں مضطر تھا اور قرآن نے مضطر کیلئے ناجائز چیزیں جائز کر دی ہیں۔ افسوس کہ اس نے اپنے علم قرآن کو بالکل غلط استعمال کیا۔ اضطرار کی بابت یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ صرف ایک صورت میں شریعت نے تسلیم کیا ہے۔ یعنی جان نکلتی ہو یا نکلنے کا ڈر ہو۔ سو وہ کھانے پینے کے متعلق ہو سکتا ہے۔ اور کسی خواہش کے متعلق نہیں۔ مثلاً رشوت لینا یا ڈاکہ مارنا یا غیبت کرنا یا شہوت کے متعلق کوئی جذبہ انسان کو اضطرار کی حد تک نہیں لے جاتا۔ یعنی یہ نہیں کہ غیبت نہ کروں گا تو مر جاؤں گا۔ یا شہوت پوری نہ ہوگی تو جان نکل جائے گی۔ ہاں

یہ پچ ہے کہ کھاؤں گا۔ یا پیوں گا نہیں تو ضرور مر جاؤں گا۔ دوسرا اضطرار بیمار کا ہوتا ہے۔ یعنی اگر فلاں دوا جو ناجائز ہے نہ پیوں گا۔ تو مرنے کا ڈر ہے۔ ایسی دوا بھی جائز ہے۔ حتیٰ کہ اونٹ کا پیشاب بھی استسقاء کے لئے پیتے ہیں۔ اور شراب بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ تیسرا اضطرار وہ ہے۔ جسے شریعت نے اِکْرَاہ کہا ہے یعنی جبر۔ قرآن میں ہے۔ کہ اگر کسی کے دل میں ایمان ہو مگر دشمن اُسے مار مار کر ہلاک کر دے یا قتل کی دھمکی دے کر ہتھیار استعمال کرنے لگے۔ اور وہ تکلیف کے مارے کلمۂ کفر کہہ دے۔ تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

(اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ)(النحل، ۱۰۶)

ترجمہ: سوائے اُن کے جنہیں (کفر پر) مجبور کیا گیا ہو لیکن اُن کا دل ایمان پر مطمئن ہو (وہ گرفت میں نہ آئیں گے)

یا جبراً کسی عورت سے کوئی بدکاری کرے۔ تو وہ عورت گنہگار نہ ہوگی

فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (النور، ۳۳)

ترجمہ: اور جو کوئی اُن کو مجبور کرے۔ تو اللہ اُن عورتوں کی مجبوری کے بعد بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ (وہ اُن پر گرفت نہیں کرے گا)

حالانکہ مرد گنہگار ہوگا۔ اُسے خواہ کتنی ہی شہوت ہو۔ وہ مضطر نہیں کہلائے گا۔ مگر عورت مجبور ہو سکتی ہے۔ کیونکہ بقوت بازو لاچار کی جا سکتی ہے۔ غرض اضطرار کھانے پینے اور بیماری میں ہو سکتا ہے۔ نیز جبر اور زدوکوب سے کوئی شخص مجبور اور بے بس ہو سکتا ہے۔ باقی سب بہانہ ہے۔ حرص، غصہ اور شہوت کو اضطرار تسلیم نہیں کیا گیا کہ اُن کے نتیجہ میں جو گناہ ہو وہ بالکل معاف ہی سمجھا جائے حالانکہ بھوک کے اضطرار کے وقت اگر ناجائز چیز نہ کھائے گا اور مر جائے گا تو گنہگار ہوگا۔

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (مائدہ ۳۰)

ترجمہ، لیکن جو شخص بھوک (کی حالت) میں مجبور ہو جائے اور وہ گناہ کی طرف جھکنے والا نہ ہو (اور حرام چیزوں میں سے کچھ کھالے) تو (یاد رکھو کہ) اللہ یقیناً (مجبوری کی لغزشوں کو) بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں تو اضطرار کے معنی صاف صاف بھوک کے ہی کر دیئے ہیں۔

۱۴۶۔ ناسخ منسوخ

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (البقرہ ۱۰۷)

ترجمہ، جس کسی پیغام کو بھی ہم منسوخ کر دیں یا بھلا دیں تو اس سے بہتر یا اس جیسا (پیغام) ہم (دوبارہ دُنیا میں) لے آتے ہیں۔

سے ناسخ منسوخ تو ثابت ہے۔ اور ناسخ آیات سب قرآن میں موجود بھی ہیں۔ مگر ہمارا اختلاف صرف منسوخ آیات کے بارہ میں ہے۔ ہمارے نزدیک کوئی منسوخ آیت اب قرآن میں موجود نہیں ہے اور ہمیں کسی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اتنا ہی کافی ہے کہ اگر کسی کو شبہ ہو تو وہ کوئی ایک منسوخ شدہ آیت قرآن میں دکھا دے کہ دیکھو اس پر کبھی عمل نہیں ہو سکتا۔ یا عمل کرنا فلاں آیت کی رُو سے منع ہے۔ چلو اسی بات پر فیصلہ ہے۔ جب ہم تمام احکام قرآنی کو قابلِ عمل مانتے ہیں۔ تو پھر منسوخ کے معنے ہی کیا ہوئے۔ اور امکانِ نسخ کے لئے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے کی ضرورت ہی کیا۔ آپ کوئی منسوخ آیت پیش کیجئے۔ ہمارے علماء بتا دیں گے کہ یہ منسوخ نہیں ہے اور اس کا یہ مطلب ہے امکانِ نسخ اور امکانِ عدول صرف الجھن اور فساد میں ڈالنے والی بحثیں ہیں۔

۱۴۷۔ دین میں حیلہ آخر ہلاک کر دیتا ہے

لوگ عجیب عجیب طریقوں سے دینی امور میں حیلے اور فریب کرتے تھے یہودی لوگوں نے سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے میں حیلہ استعمال کیا۔ تو وہ ملعون اور بندر اور سؤر کے نام سے یاد کئے گئے۔ خدا کے ہاں مکاری اور حیلہ نہیں چلتا۔ اس کی دلوں پر نظر ہے اس لئے شریعت میں حیلہ بہانہ سے مطلب برآری کرنا سخت ترین گناہ ہے۔ باوجود اس کے استادوں نے کتاب الحیل بنا رکھی ہے۔ ہمارے ایک بزرگ حکیم فضل الدین صاحب مرحوم جب قادیان میں زندہ تھے تو ایک طالب علم ان کے پاس آیا جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ اپنے وطن بھیرہ بمعہ اہل خانہ تشریف لے گئے اور گھر میں اس طالب علم کو آباد کر گئے تاکہ گھر اور اثاثۃ البیت کی حفاظت رکھے۔ اس نے گھر کے سب پیپوں اور گھڑوں کو کھول کر خوب گھی، چاول، شکر ہضم کیا اور برابر کھاتا رہا حتیٰ کہ سب اشیاء کی قریباً صفائی کر دی جب حکیم صاحب واپس آئے تو جس برتن کو کھول کر دیکھا اسے خالی پایا۔ آخر حیران ہو کر اس سے پوچھا کہ ہمارا گھی کہاں ہے اس نے کہا میں نے کھا لیا۔ چاول کہاں ہیں۔ میں نے کھا لئے شکر کہاں ہے۔ میں نے کھالی۔ غرض اسی طرح بڑی صفائی سے ہر چیز کا اقرار کر لیا۔ آخر جب انہوں نے پوچھا کہ کیوں کھایا؟ تو آپ کہنے لگے کہ آپ ہی نے قرآن کی یہ آیت پڑھائی تھی

أَوْ مَا مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهُ أَوْ صَدِيقِكُمْ (النور: ۶۲)

ترجمہ: یا اپنے دوستوں کے گھروں سے کوئی چیز لے کر کھا لینے میں کوئی حرج ہے۔

یعنی تم پر کوئی الزام نہیں اگر اپنے دوستوں کے ہاں سے کچھ کھاؤ۔ یا ان لوگوں کے ہاں سے کھاؤ جن کی کنجیاں تمہارے پاس ہوں۔ سو میں آپ کا دوست تھا۔ اور گھر کی کنجی بھی میرے پاس تھی۔ میں نے خدا کے حکم کے مطابق اگر کھا لیا تو ناراضگی کی کونسی بات ہے۔ سو اس طرح کے حیلے

لوگ کلامِ الٰہی سے نکال کر گویا خدا کے ساتھ بھی ہنسی کرتے ہیں۔ ان حیلوں سے حرام کو حلال کریں اور فرائض سے سبکدوشی حاصل کرلینا اسی کا نام قرآن مجید نے اعتداء رکھا ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ (البقرہ: ۶۶)

ترجمہ: اور تم ان لوگوں (کے انجام) کو جنہوں نے تم میں سے (ہوتے ہوئے) سبت کے معاملہ میں زیادتی کی تھی یقیناً جان چکے ہو۔ اس پر ہم نے انہیں کہا تھا کہ (جاؤ) ذلیل بندر بن جاؤ۔ (الفضل ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء)

۱۴۸۔ سونے کی خاک

جب میں قرآن میں سامری والے سونے کے بچھڑے کی بابت یہ آیت پڑھا کرتا تھا کہ

لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا (طٰہٰ: ۹۸)

ترجمہ: ہم اس کو جلائیں گے اور پھر اس کو سمندر میں پھینک دیں گے۔

یعنی ہم اسے جلا دیں گے پھر اس کی خاکستر دریا میں بکھیر دیں گے۔ تو میں حیران ہوتا تھا کہ سونے چاندی کو آگ میں ڈالیں تو پگھل کر ایک تھوبا بن جائے گا۔ نہ کہ خاک۔ کیا وہ کوئی مٹی ہے جو خاکستر بن جائے گا۔ اور اڑ کر سمندر میں ملا دیا جائے گا۔ مگر پھر یہ عقدہ کھلا کہ پہلے آگ میں ڈالا۔ جب وہ پگھل گیا تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کاٹ کر ہر قبیلہ کو دیئے کہ اسے کوٹ کوٹ کر چکنا ریزہ ریزہ کرو۔ تاکہ ان کے اپنے ہاتھوں سے اس معبود کی ذلت ہو۔ اس طرح ہر شخص نے ایک ٹکڑا اس کا پتھروں سے کوٹ۔ اور ذرّہ ذرّہ بنایا۔ پھر ان ذرّات کو اڑا کر سمندر میں بکھیر دیا۔ یہی مضمون پھر تورات میں بھی مل گیا۔ (خروج) "اور اس نے اس بچھڑے کو جسے انہوں نے بنایا تھا۔ لیا۔ اور اس کو آگ میں جلایا۔ اور اُسے باریک پیس کر پانی پر چھڑکا۔ اور اسی میں سے بنی اسرائیل کو پلایا۔

۱۴۹ ۔ مکالمہ مخاطبہ

حضرت مسیح موعود آپ پر سلامتی ہو، نے ایک اصول باندھا ہے۔ کہ الہام کی اعلیٰ قسم یہ ہے کہ بندہ خدا سے سوال کرے۔ اور خدا جواب دے یا اس کے برعکس وہ سوال کرے اور بندہ جواب دے۔ اور یہ سوال جواب کئی کئی دفعہ باتوں کے طور پر آپس میں مسلسل ہوتا رہے گویا دو دوست گفتگو کر رہے ہیں۔ اسی کا نام حضور نے مکالمہ مخاطبہ رکھا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ یہ اعلیٰ اور مقربین کے الہام کی شناخت ہے۔ ورنہ ایک دو لفظ یا ایک فقرہ کبھی زبان پر آجائے تو وہ مشتبہ الہام ہے اور شیطان بھی ویسا الہام کر سکتا ہے۔ قرآن مجید میں اس الہام کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔

قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا (مریم ۵۳)

ہم نے موسیٰ کو باتیں اور گفتگو کر کے یعنی مکالمہ مخاطبہ کے ساتھ اپنا مقرب کیا۔ اس طرح کے سوال و جواب والے نمونے الہام کے بہت سے انبیاء کے قرآن میں درج ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مکالمہ مخاطبہ کا نمونہ

رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (البقرہ ۲۶۱)

ترجمہ: اے میرے رب! مجھے بتا کر تو مُردے کس طرح زندہ کرتا ہے۔

نیز لوط کی قوم کی سفارش والا مکالمہ (ہود) حضرت حزقیل نبی

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ (البقرہ ۲۶۰)

ترجمہ: اور (کیا تُو نے) اس شخص کی مثل (کوئی آدمی دیکھا ہے) جو ایک ویسے شہر کے پاس سے گذرا۔

حضرت زکریا کا مکالمہ مخاطبہ

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ (مریم ۵)

ترجمہ :۔ (اور) کہا اے میرے رب! (میری حالت تو یقیناً ایسی ہے کہ) میری تمام
ہڈیاں تک کمزور ہو گئی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مکالمہ مخاطبہ

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَامُوسَىٰ (طٰہٰ : ۱۸)

ترجمہ :۔ (اور ہم نے اس وقت موسیٰ سے کہا کہ) اے موسیٰ یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟

اور دوسرا رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ (اعراف : ۱۴۴)

ترجمہ :۔ اے میرے رب! اپنا وجود مجھے دکھا تاکہ میں تجھے دیکھوں۔

ان کا لطف تب آئے گا جب آپ قرآن کھول کر یہ سارے سوال و جواب پڑھیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نمونہ معراج کی حدیث میں آتا ہے اور حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کا نمونہ میاں عبدالرحیم خان صاحب پسر نواب محمد علی خان صاحب کے مرض کے متعلق دعا اور شفاعت کے نشان میں پڑھئے۔ لیکن ابلیس سے جو بات چیت قرآن میں درج ہے۔ وہ

فَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا (مریم : ۵۳)

ترجمہ :۔ اس کو اپنے اسرار بتاتے ہوئے اپنے قریب کر لیا۔

میں داخل نہیں ہے کیونکہ اس میں بجائے قرب کے لعنت ہے۔ اور بجائے مناجات اور دوستانہ باتوں اور مشفقانہ کلام کے جھگڑے اور ناراضگی کی صورت ہے۔ صرف کثرتِ الہام نبوت کے لئے کافی نہیں بلکہ کثرتِ غیب۔ اور مکالمہ مخاطبہ

۱۵۰۔ آیت شہادت فی العدالت

عدالت میں شہادت کے متعلق ایک آیت سورہ نساء میں آتی ہے جس پر عمل کرنا موت کے برابر ہے۔ مگر حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے ڈاکہ کھانے والے مقدمہ

میں اور اپنی جدی جائداد کے مقدمات میں اس پر عمل کرکے دکھایا۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَیْہِ وہ یہ ہے

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰۤی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰۤی اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (النساء: ۱۳۶)

یعنی اے مومنو! عدل و انصاف کو کبھی نہ چھوڑنا۔ اور ہمیشہ خدا لگتی گواہی رضائے الٰہی کے لئے دینا۔ خواہ وہ گواہی تمہارے اپنے خلاف پڑے

یا تمہارے والدین اور عزیزوں کے مخالف پڑے۔ یہ نہ خیال کرنا۔ کہ ان میں کوئی مالدار ہے۔ تو تمہیں نقصان پہنچائے گا۔ یا غریب ہے۔ بیچارہ مارا جائے گا۔ خدا کے مقابلہ میں امیر غریب کوئی ہستی نہیں رکھتے۔ کہیں نفسانیت تم سے انصاف کا خون نہ کرا دے۔ اگر دبی زبان سے گواہی دو گے۔ یا کچھ باتیں دبا جاؤ گے یعنی WHOLE TRUTH نہ بیان کرو گے۔ تو یاد رکھو۔ خدا سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں۔

۱۵۰۔ قلم کا اُلٹا بہنا

وَمَا کُنْتَ لَدَیْھِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَھُمْ اَیُّھُمْ یَکْفُلُ مَرْیَمَ (آل عمران: ۴۵)

ترجمہ: اور جب وہ اپنے تیروں کو (اس لیے) پھینکتے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی خبرگیری کرے۔

جب حضرت مریم کے متکفل ہونے کے متعلق بیت المقدس کے فقیہوں فریسیوں میں

شائع ہوا۔ تو یہ فیصلہ ہوا۔ کہ آؤ اپنی اپنی قلمیں بہتے پانی میں ڈالیں۔ جس کی اُلٹی تیرنے لگے تو وہ کفیل ہو۔ غرض سب نے قلمیں ڈالیں۔ باقی تو سیدھی پانی کے ساتھ بہہ گئیں۔ صرف حضرت زکریا کی قلم اُلٹی چلنے لگی۔ یعنی جدھر سے پانی آتا تھا اُسی طرف بہنے لگی۔ ناواقف آدمی اسے اچنبھا سمجھے گا۔ حالانکہ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ جو چاہے آج ہی تجربہ کر کے دیکھ لے۔ پانی خواہ دریا میں بہتا ہو یا نہر میں۔ یا کھیت کی نالی میں۔ اس کا بالکل کنارے کا حصہ زمین کی رگڑ کی وجہ سے اُلٹا بہتا ہے اور درمیانی حصہ سیدھا بہتا ہے۔ پس اگر قلم بالکل کنارے کے ساتھ بہائی جائے اور رُلٹی نوک میں بہائے تو اُلٹی تیرنے لگے گی۔ یہ بھی قرعہ نکالنے کی ایک ترکیب ہے جسے واقف لوگ استعمال کیا کرتے ہیں مگر عام لوگوں نے بے خبر ہونے کی وجہ سے اُسے معجزہ یا کرامت بنا لیا ہے۔

گزشتہ انبیاء کے قصوں میں معجزات کا حصہ بہت شامل ہو گیا ہے۔ جو دراصل معمولی واقعات تھے۔ مگر عجوبہ پسندی نے ان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ یہاں تک کہ اس زمانہ کی ہر چیز معجزہ اور کرامت نظر آنے لگی۔ اور اس کا یہاں تک زور بڑھا کہ اُمّتِ موسوی کے آگے اُمّتِ محمدیہ ماند نظر آنے لگی۔

۱۵۲۔ انسان بھی معیار ہوتے ہیں

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ (آل عمران ۱۶۳)

ترجمہ:۔ وہ (لوگ) اللہ کے نزدیک مختلف مدارج پر ہیں۔

یعنی یہ لوگ خود معیار اور STANDARD ہو جاتے ہیں۔ جب مومن اعلیٰ درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو وہ معیار بن جاتا ہے جس پر دوسروں کی نیکیوں کا اندازہ کیا جاتا ہے جیسے مولم عوام میں حاتم طائی سخاوت کا ایک معیار ہے۔ یا رستم بہادری کا۔ یا قیس عشق مجازی کا۔ اور افلاطون عقلمندی کا۔ اسی طرح مسلمانوں میں حضرت علیؓ اور حضرت خالدؓ بن ولید شجاعت میں۔ اور منصورؒ

عشق حقیقی میں اور ابراہیم ادھم زہد میں اور حضرت امام حسینؓ مظلومیت میں معیار مانے جاتے ہیں۔ (الفضل ۲۳ راپریل ۱۹۳۸ء)

۱۵۲۔ موسیٰؑ کی عمر دریا سے نکالے جانے کے وقت

لوگ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے ان کو پیدا ہوتے ہی دریا کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ ان کی کرامت تھی کہ انہوں نے فرعون کے ہاں جا کر کسی دائی کا دودھ نہیں پیا چھاتی منہ میں سے کر چھوڑ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی والدہ ان کی دائی بن کر آئیں۔ اس قصہ میں کسی عجائب پسندی کی بات نہیں۔ کیونکہ اصل بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ اتنے بڑے اور ہوشیار ہو گئے تھے کہ ماں کی چھاتی پہچاننے لگے تھے۔ ایک دو دن کی عمر نہ تھی۔ بلکہ کئی مہینے کے تھے۔ قرآن مجید نے یہ قصہ سورہ قصص میں اس آیت سے شروع فرمایا ہے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ..... الخ (القصص: ۸)

ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی تھی کہ اس کو (یعنی موسیٰ کو) دودھ پلا۔

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ خدا نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی۔ کہ اسے اپنا دودھ پلائے جا اور چھپائے رکھ۔ یہاں تک کہ جب اتنا بڑا ہو جائے کہ پھر اس کا چھپنا مشکل ہو جائے تو اسے دریا میں بہا دے۔ مثلاً آواز اتنی بلند ہو جائے۔ کہ محلے میں سُنائی دے۔ یا لڑکے کی شہرت اتنی ہو جائے۔ کہ پکڑے جانے کا خوف ہو۔ یا مخبری ہو جائے۔ اس وقت اس کو ٹوکرے میں ڈال کر دریا میں ڈال دے۔ بموجب تورات اس وقت بنی اسرائیل اپنی الگ بستی میں رہتے تھے۔ جہاں ایک بچہ کا مخفی رکھنا بہت آسان تھا۔ ٹوکرے کو چاروں طرف مٹی اور رال لگا کر واٹر پروف کر دیا گیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ کی عمر اس وقت تین مہینہ کی ہو چکی تھی۔ اس عمر میں کئی ہوشیار بچے ماں کی چھاتی اور غیر عورت کی چھاتی میں خوب تمیز کرنے

لگ جاتے ہیں۔

ہمارے کرم نواب محمد علی خان صاحب کی لڑکی کے لئے ایک دفعہ دودھ پلانے کو دائی بلائی گئی۔ اُس وقت لڑکی تین ماہ کی تھی۔ اُس نے دُودھ لیا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ مجبوراً دایہ کو واپس کر دینا پڑا۔

غرض یہ کوئی عجُوبہ نہیں۔ بلکہ عام بات ہے۔ اور توریت کا بیان قرآن کے مخالف نہیں۔ مگر ہمارے مفسرین کی عجوبہ پسندی کا کیا علاج۔

۱۵۴۔ قبطی کا قتل

فَوَكَزَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ ۖ (القصص ۱۶:)

ترجمہ:۔ اس پر موسیٰ نے اس (دشمن) کو ایک گھونسہ مارا اور اس (گھونسے) نے اس کا کام تمام کر دیا۔

اور فَعَلْتُهَا إِذًا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ ۞ (الشعراء ۲۱:)

ترجمہ:۔ وہ کام (جس کا تو نے اشارہ کیا ہے) میں نے اُس وقت کیا تھا جبکہ حقیقت مجھے معلوم نہ تھی۔

وغیرہ آیات سے جو اس قتل کے متعلق ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قتل عمد نہ تھا۔ قتل خطا تھا۔ بلکہ کچھ سیلف ڈیفنس بھی تھا یا دوسرے اسرائیلی کا ڈیفنس تھا۔ مگر موسیٰ نے پھر بھی اس قصور کے بدلے پورے دس سال کی جلاوطنی اُٹھائی۔ پھر جب پہلا فرعون مرگیا اور دوسرا تخت نشین ہوا تو اس کے زمانہ میں واپس تشریف لائے۔ یہ ممکن ہے کہ اس وقت ان کے قانون میں دس سال کی جلاوطنی قتلِ خطاء کی سزا ہوتی ہو۔ یا یہ ہوگا کہ نئے بادشاہ کی تخت نشینی پر سب قصور واروں کو معاف کر دیا جاتا ہوگا۔ چنانچہ ایسے اعلانِ معافی کے نئے بادشاہ اکثر کیا کرتے ہیں۔ بہرحال قانوناً اس قتل پر کوئی گرفت نہیں ہو سکتی تھی۔ صرف عجیب بات ہے

کہ فرعون اس قتل کا ذکر تو اپنے دربار میں کیا کرتا تھا مگر موسیٰؑ کو پکڑتا نہ تھا۔ بلکہ ان کو صرف ناشکرا اور احسان فراموش کہہ کر ٹال دیا کرتا تھا۔

وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (شعراء ۲۰)

ترجمہ: اور تو نے وہ کام بھی کیا ہے جو تو کر چکا ہے اور تو (ہمارے احسانوں کا) ناشکر گزار ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے قانونی گرفت حاصل نہ تھی۔ اور اس ملک کے قانون کے موافق دس سال باہر رہ کر ان کا قصور قابل سزا نہ رہا تھا۔

۱۵۵۔ اسمائے آدم

قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ..... الخ (البقرہ ۳۴)

ترجمہ: (اس پر اللہ نے) فرمایا۔ اے آدم! ان (فرشتوں) کو ان کے نام بتا۔

تمام مخلوقات کے نام خدا تعالیٰ نے آدم سے رکھوائے۔ اور آدم نے ان کے وہ نام رکھے جو مسمیٰ کی اصلیت اور جوہر اور کمال اور فلسفہ کو ظاہر کرتے تھے۔ یہی خاصیت ہر ابن آدم کی ہے۔ انسان جب بھی کسی چیز کا نام رکھتا ہے تو پہلے اس چیز کی صفت معلوم کرتا ہے۔ پھر اس صفت کو اس کے نام کے اندر ٹھونس دیتا ہے۔ اس طرح وہ نام اسم بامسمیٰ ہو جاتا ہے۔ تمام اسماء میں انسان علم کی کنجی داخل کر دیتا ہے اور نام سے ہی نام والی چیز کی حقیقت اور خواص ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ہر زبان کے الفاظ کو کریدا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان میں اشیاء کی حقیقت اور اصلیت کو مضمر کر دیا گیا ہے۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) اس نکتہ کو فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو انبیاء کے نام میں ان کے متعلق پیشگوئی یا علم مخفی ہے۔ مثلاً یوسف اس لئے ہے کہ وہ

يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ (یوسف ۸۵)

ترجمہ ۔ ار اسلا میرے خدا) یوسف کے واقعہ پر میں پھر فریاد کرتا ہوں ۔

کا محل تھا موسیٰ اس لئے کہ وہ پانی سے نکالا گیا تھا۔ مسیح اس لئے کہ وہ مسیحا نبی تھا۔ یعقوب کا مفہوم وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ (ہود ۲۱،۷)

ترجمہ ۔ ار اسحٰق کے بعد یعقوب کی پیدائش) کی بشارت دی ۔

کی آیت میں وَمِنْ وَّرَآءِ سے ظاہر کیا گیا ہے

فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ (ہود ۲۱،)

ترجمہ ۔ راس پر وہ گھبرائی تب ہم نے اس کی تسلی کے لئے اس کو اسحاق کی بشارت دی ۔

۔اسحاق کا منبع فضحکت ہے ۔اسماعیل کی بابت یہ کہ باجرہ کی دُعا اس کے بارہ میں سُنی گئی ۔ نوحؑ اس لئے کہ ایک عمر انہوں نے دردِ دل سے نوحہ کیا مگر بے کار ۔ ابراہیم علیہ السلام قوموں کا باپ ۔ ذکریا بہت ذکر کرنے والا ۔ اور یحییٰؑ یعنی شہید ہوگا ۔ (بل اجیاء) یا آخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ وہ سب سے زیادہ برگزیدہ اور اور قابلِ تعریف ہوگا ۔ داؤد محبت کرنے والا ۔ اور سلیمانؑ اس لئے کہ اس کی وجہ سے ایک شہزادی اسلام لائی

وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (النمل : ۴۵)

ترجمہ ۔ اور میں سلیمان کے ساتھ رب العالمین خدا پر ایمان لاتی ہوں ۔ علاوہ ان اسماء کے حضور فرماتے تھے کہ دوسرے اسماء بھی لے کر دیکھ لو ۔ ارض کے معنی اپنے محور پر گھومنے والی جس کی حرکت محسوس نہ ہو ۔ لعبدہ کے معنی پھاڑنے والا ۔ یعنی زمین پھاڑنے کے لئے سب سے موزوں جانور ۔ زنجبیل ۔ زن جبل سے یعنی پہاڑ پر چڑھ گیا ۔ یعنی تاثیر میں بہت گرم کافور کفر سے یعنی جوشوں اور گرمی کو دبانے والا ۔ غرض حضور نے یہ بات کھول دی کہ اسمائے اشیاء حاصل حقائق اشیاء ہیں ۔ پہلے زمانے تو جانے دو ۔ اب بھی لوگ نئی اشیاء کا بامعنی نام ہی رکھتے ہیں ۔ مثلاً ریڈیو ، وائرلیس ۔ گراموفون ٹیلی گراف ، خوردبین ، دوربین ۔

عینک، چارپائی، فونوگراف، گلوبند، پنسل، لپ اسٹک وغیرہ وغیرہ۔ یہاں تک کہ چیل کا نام اس کے چلچلانے کی وجہ سے ہے اور کوا کاں کاں کرنے کی وجہ سے اور چڑیا چڑ چڑ بولنے کے باعث۔ خلاصہ مطلب یہ کہ خدا نے آدم میں یہ عادت رکھی ہے کہ وہ ہر چیز کا نام رکھتا ہے۔ اس میں وہ اس کی خاصیت یا علم کو بند کر دیتا ہے۔ یوں ہی نام نہیں رکھتا بلکہ نام سے پہلے اس کے خواص معلوم کرتا ہے یہی علم کی کرید اور پھر اس علم کے خزانہ کو نام میں بند کر کے آئندہ نسلوں تک پہنچانا اس کا کمال ہے۔ اور یہ بات فرشتوں کو بھی نصیب نہیں۔
انگریزی والے یوں سمجھیں کہ:۔ TO COIN A TERM FOR A LONG PHRASE
THE HEIGHT OF HUMAN INTELECT

۱۵۶۔ نکاح معاہدہ ہے مگر بڑا مضبوط

وَاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (النساء ۲۱)

ترجمہ:۔ اور وہ (بیویاں) تم سے ایک مضبوط عہد لے چکی ہیں۔

نکاح اسلام کے نزدیک بے شک ایک معاہدہ ہے مگر دوسرے معاملات سے اتنا پختہ اور بڑھا ہوا کہ اس کا نام "میثاق غلیظ" ہے۔ پس نہ وہ آسانی سے ٹوٹ سکتا ہے اور نہ ایسا سخت ہے۔ کہ کبھی بھی شکستہ نہ ہو سکے۔ ایک طرف امریکہ کے نکاح ہیں۔ کہ بے وقت چھینک آنے سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف اہل ہنود کے پھیرے ہیں کہ کوئی صورت ان کی شکستگی کی نہیں۔ اور خونی رشتے کے مثل بنا لئے گئے ہیں (الفضل ۱۴ اپریل ۳۰ء)

۱۵۷۔ اُونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا

حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ (الاعراف ۴۱)

ترجمہ:۔ یہاں تک کہ اُونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو۔

وہ لوگ جنہوں نے ہمارے نشانات کی تکذیب کی اور تکبر کے مارے ان کو نہ مانا۔ ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو جائے۔ یہاں متکبروں کا ذکر ہے۔ اوران کے لئے آسمانی دروازے نہ کھلنے کی خبر ہے اور آسمانی دروازہ کھلنا ایک استعارہ ہے یعنی آسمانی علوم اور الہام الٰہی سے وہ بے نصیب رہیں گے۔ اسی طرح اگلا فقرہ بھی استعارہ ہے۔ اونٹ کا سوئی کے ناکہ میں سے گزرنا انسانی کلام میں ناممکن کو نہیں بلکہ مشکل کو ظاہر کرتا ہے۔ استعارہ کا ثبوت یہ ہے کہ اوّل تو انسانی کلام میں اُونٹ کا سوئی سے نکلنا ہمیشہ استعارہ کے طور پر ہی بولا جاتا ہے دوسرے یہ کہ لفظی معنے اس کے درست بیٹھتے ہی نہیں۔ کیونکہ جمل یعنی اونٹ خدا کی مخلوق ہے اور خیاط یعنی سوئی انسانی ساخت کی چیز ہے۔ اور انسانی چیز چھوٹی بڑی ہر طرح کی بن سکتی ہے اور ایسی بڑی بھی جس کے ناکہ میں سے واقعی اونٹ نکل جائے۔ پس اگر لفظی ترجمہ صحیح ہو تو انسان ایسی سوئی آج بنا سکتا ہے جس کے ناکہ میں سے اُونٹ نکل جائے اور اگر یہ ہو تو پھر عذاب جہنم ایک بالکل ہی معمولی چیز بن گئی۔ پس معلوم ہوا کہ لفظی معنے یہاں نہیں لئے جا سکتے۔ بلکہ یہ ایک استعارہ اور محاورہ ہے جو بہت مشکل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً مسیح علیہ السلام نے بھی کہا ہے کہ جنت میں دولت مند کا داخل ہونا ایسا ہی مشکل ہے جیسے سوئی کے ناکہ میں سے اُونٹ کا گزرنا۔ یہ ٹھیک ہے مگر دیکھو آخر نیک امراء بھی خدائی سلسلوں میں ہمیشہ داخل ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ وغیرہ لوگ صحابہ میں تھے۔ اور کئی بادشاہوں کا مسیحی سینٹ بن جانا عیسائیوں کو مسلّم ہے۔ یہود میں داؤدؑ، سلیمانؑ۔ تو بادشاہ ہی تھے۔ اسی طرح مسلمان بادشاہ بھی بہت سے اولیاء اللہ ہوئے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہ صرف استعارہ ہے جو مشکل کے اظہار کے لئے بولا جاتا ہے نہ کہ محال کے معنوں میں۔ اگر محال کے معنوں میں لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ کوئی دولت مند کبھی خدا کا فضل نہیں پا سکتا۔ اور یہ بالبداہت غلط ہے۔

۱۵۸۔ المغضوب علیھم اور ضالّین

صرف یہود اور نصاریٰ ہی مغضوب علیہم اور ضالّین نہیں ہیں بلکہ ان کے مثیل بھی بہت ہیں۔ مَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ میں ہمیشہ غضب کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ جیسے یہودی مولوی۔ خوارج اور آریہ عملاً یہ لوگ بڑے غصہ والے۔ کافر گر۔ جہنمی بنانے والے نجات کو محدود کرنے والے۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑنے والے اور تفتیش کرنے والے تکفیر کے فتویٰ دینے والے اور خدا پر بھی ناراض کہ ہم کو حکومت کیوں نہیں دی۔ اور ہر گناہ پر انسان کو واجب القتل ٹھہرانے والے ہیں۔ ان لوگوں کو نجات میں بہت ناامیدی ہوتی ہے اس لئے وہ کرم اور اعمال میں بہت سخت اور باریک بین ہوتے ہیں۔ ٹخنوں سے نیچا پاجامہ اور لمبی مونچھ تک کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ایک دفعہ گناہ کے بعد تناسخ کے چکر میں ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے ضالّین کے جتنے فرقے ہیں وہ بظاہر نہایت محبت والے نرم دل مداہنہ کرنے والے مثلاً نصاریٰ شیعہ۔ نیچری۔ صوفی ان میں Toleration بھی حد سے زیادہ ہوتی ہے اور آپس میں بھی بہت اتفاق ہوتا ہے یعنی بدین خود اور موسیٰ بدین خود بعض کا مقولہ ہے اور بعض خدا کو محبت ہی کہتے ہیں۔ ضالین کو بیجا امید ہوتی ہے۔ عمل نہیں کرتے۔ مثلاً یہ کہ بیٹا مان لو۔ پھر جو چاہو کرو نجات ہی نجات ہے۔ یا حب علیؓ کافی ہے۔ اعمال کی ضرورت نہیں۔ جاہل صوفی کہتے ہیں کہ بس سب ایک ہی ہیں عمل کیسا۔ نیچری کہتے ہیں کہ اللہ کو مانو اور دنیا کما ؤ اور مزے اڑاؤ۔ مگر منعم علیہم پورے اعمال بجا لاتے ہیں۔ اور پھر خدا کے فضل پر بھی پورا بھروسہ رکھتے ہیں۔ ان میں غضب ہوتا ہے نہ مداہنت اور نہ بیجا خوشامد پسندی۔ وہ دونوں کے درمیان ہوتے ہیں

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ (الفتح ۳۰)

ترجمہ۔ وہ کفار کے خلاف بڑا جوش رکھتے ہیں لیکن آپس میں ایک دوسرے سے بہت ملاطفت کرنے والے ہیں۔

بخت کے قائل نفس کے سائل۔ سچا حق بجانب غضب اور سچی حق بجانب اُمیدان میں ہوتی ہے اور دونوں قسم کے فطری قویٰ کو مناسب اور برمحل موقعوں پر برتتے ہیں۔ ان کا ایمان بھی خوف ورجا کے درمیان ہوتا ہے

۱۵۹۔ ذَالِكَ الْكِتَابُ لَارَيْبَ فِيْهِ

قرآنِ مجید میں کوئی ریب نہیں کوئی شک وشبہ نہیں۔ اول تو اپنے دعوے ایسے صاف بیان کئے ہیں جن میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ پھر دوسرے دلیلیں ایسے محکم کہ شبہ سے خالی۔ پھر جزا اور سزا اور نتائج مشتبہ نہیں۔ پھر عمل کر کے دیکھو تو موعودہ کامیابی میں کوئی شبہ نہیں۔ پہلی کتب میں مثلاً بیان کیا ہے کہ خدا ہے مگر دلائل ندارد۔ ایک خدا ہے مگر توحید کے براہین مفقود۔ رسالت منوائی مگر عقلی دلائل بہت کم۔ سینکڑوں اصول و فروغ بیان کئے مگر تسلی نہیں دی۔ گویا ہر جگہ شبہ کی گنجائش باقی ہے۔ قرآنِ مجید نے یہ کمال کیا۔ کہ کسی بات کو مبہم نہیں رکھا۔ اور کہیں شبہ باقی نہیں چھوڑا۔ حالانکہ بعض کتابوں سے ایک طرف ایک شخص ابن اللہ ثابت ہوتا ہے اور دوسری طرف ابنِ آدم۔ اسی طرح مثلاً فرمایا کہ یہ کتاب ہدایت اور فلاح دیتی ہے۔ ساتھ ہی ایسے صاف الفاظ بیان فرمائے کہ سامع کو شبہ نہیں رہا۔ کہ فلاح و ہدایت کیا چیز ہے۔ ہر ہدایت اور فلاح کو صاف اور واضح بیان کر دیا۔ اشتباہ اور شک باقی نہیں رہا۔ کہ شائد فلاں چیز فلاح ہے یا نہیں۔ پھر جس چیز کو فلاح کہا۔ اس کے فلاح ہونے کی دلیلیں کامل اور واضح دیں۔ ایسا نہیں کہ سننے والا سمجھے کہ فلاں بات بے دلیل رہ گئی۔ پھر جو لوگ اس راہ کے عامل ہوئے۔ ان کو ایسا مفلح بنا کر دکھا دیا۔ کہ خود انہوں نے اور ان کے دیکھنے والوں نے گواہی دی کہ بیشک

یہ مغلوب ہو گئے۔ دنیا میں کامیاب علم، عمل، دولت، رعب، حکومت، عزت، نیکی، نصرت وتائیدِ الٰہی غرض ہر نعمت سے ان کو مالا مال کر دیا۔

خدا کی نسبت، وید میں شُبہ ہے بعض کہتے ہیں کہ اگنی وایو وغیرہ خدا ہیں۔ دوسرے کہتے ہیں نہیں یہ خدا کے صفاتی نام ہیں بذاتِ خود خدا نہیں ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ نہیں۔ یہ تو صرف آگ پانی کے نام ہیں اور کچھ نہیں۔ بعض ان کو اوتاروں کے نام خیال کرتے ہیں۔ عام عیسائی کہتے ہیں کہ انجیل خدا کا بیٹا بتاتی ہے۔ یونیٹیرین عیسائی کہتے ہیں کہ توحید سکھاتی ہے۔ اسی طرح ہر طرف شکوک وشبہات ہی ہیں مگر مسلمانوں کے ہاں ہر مسلمان صرف ایک اللہ کو پیش کرے گا۔ اسی طرح آخرت جنت اور جہنم کا قصہ ہے۔ ہر مذہب کے لوگوں میں خود اصولی فرق اول سے آخر تک موجود ہیں۔ مگر قرآنی مذہب میں کوئی نہیں۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ خدا کلام کرتا ہے۔ اسی طرح ہر مذہب کا مدعی بھی کہتا ہے۔ مگر ثابت اسلام ہی کرتا ہے کہ ہماری ہدایتوں پر عمل کرو گے۔ تو خود تم سے کلام کر کے دکھا دے گا۔ جنت کا ذکر کیا مومن بن کر دیکھو تو ناممکن ہے کہ اس کا ایک نمونہ دنیا میں نہ چکھ لو۔ کُفر کو بُرا کہا ہے۔ کر کے دیکھ لو اس کے نتائج یہیں سے شروع ہو جائیں گے۔ ملائکہ پر ایمان لاؤ۔ ان کی تحریکوں پر عامل بنو تو تم ان سے باتیں کرو گے ایسا نہ ہو تو ہمارا ذمہ رسولوں کی اتباع کرو۔ ویسی ہی نعمتیں تم دیکھ لو گے۔ خدا سے تعلق پیدا ہو جائے گا۔ کرامات صادر ہوں گی قبولیت دُعا ایک دعویٰ ہے اس کی شرائط پر عمل کرو۔ تمہاری دعائیں قبول ہونے لگیں گی۔ غرض دعویٰ دلیل نتیجہ سب میں یقینی ہے۔ صفائی ہے۔ شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اور اس کتاب پڑھنے والے کو یقینی معلوم ہے کہ میرے آگے جنت اور میرے ساتھ خدا ہے نہ کہ جہنم اور ہلاکت۔ یہ بات کسی اور مذہب کو حاصل نہیں۔ کیونکہ وہاں ریب ہے اور یہاں ریب نہیں۔ پھر آخری درجہ ریب نہ رہنے کا یہ ہے کہ یہ کلام بے نظیر ہے اور انسانی

طاقتیں اس جیسا بنانے پر قادر نہیں ہو سکیں۔ اس لئے یہ کسی بالا ہستی کا ہے۔ (مفصل ۲ اپریل ۳۰ء)

۱۶۰۔ محکم اور متشابہ کے نمونے

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے سمیع بصیر۔ علیم وغیرہ اسماء آتے ہیں۔ اس کے ہاتھ۔ آنکھیں۔ وجہ۔ ساق کا ذکر ہے۔ نیز عرش، کرسی۔ استوٰی کے الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ یہ سب آیات خدا تعالیٰ کو بظاہر انسان جیسا ظاہر کرتی ہیں۔ اور سب از قبیل متشابہات ہیں۔ یہ الفاظ بھی ہمیں صرف اسی حد تک بولنے چاہئیں۔ جہاں تک خود اس کے اپنے کلام میں آتے ہیں۔ یہ نہیں کہ آنکھوں کا ذکر ہے۔ تو ہم اپنی طرف سے کان اور ناک اور ہونٹ کا بھی ذکر کریں۔ یا ہاتھ ہیں تو سینہ یا کمر کا بھی اپنی طرف سے دعویٰ کر دیں

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ (النحل ۷۵)

ترجمہ: پس (اے مشرکو! تم) اللہ کے متعلق (اپنے پاس سے) باتیں مت بناؤ

مگر یہ سب باتیں جو متشابہات ہیں۔ ایک محکم آیت کے ماتحت ہیں۔ اور وہ یہ ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (الشوریٰ ۱۲)

یعنی اس کی مثل اور مانند کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ وہ بے مثل ہے۔ اس لئے اس کا سننا اور دیکھنا وغیرہ ہر بات بے مثل ہے۔ اس طرح ساق اور اس کا کشف خدا تعالیٰ کی صفت ہے۔ یعنی اس خدا کی جو لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ہے۔ بس یہ ساق اور اس کا کشف ایسے رنگ میں ہے کہ وہ بھی بے مثل ہوگا کیونکہ ہم اس ذات سے کوئی شابہت نہیں رکھتے۔ وہ اور اس کی سب صفات پاک

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (اعراف ۱۸۱)

ترجمہ: اور اللہ کی بہت سی اچھی صفات ہیں

اور سب بے عیب ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کا وجہ۔ اس کی طاقت، اس کا علم، اس کا وجود۔
اس کا ازلی ابدی ہونا۔ اس کا دیکھنا، سُننا اس کا استویٰ علی العرش ہونا۔ سب کے
سب بے مثل۔ جب اسلام نے خدا کو بے مثل مانا۔ تو لازماً اس کی سب صفات
کو بھی بے مثل مانا۔ اسی طرح انبیاء کو قرآن مجید نے استغفار کرنے والا اور ذنب والا۔
اور ضال بھی کہا ہے مگر محکم آیت یہی ہے کہ

لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُم بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ (الانبیاء: ۲۸)

ترجمہ: وہ خدا کی بات سے ایک لفظ بھی زیادہ نہیں کہتے اور وہ اس کے
حکموں پر عمل کرتے ہیں۔

یعنی وہ بالکل بے عیب اور معصوم ہیں۔ بس ان الفاظ کو متشابہ سمجھنا چاہیئے۔
استغفار کے معنی حفاظت طلب کرنا۔ اور ذنب کے معنے وہ الزام جو دشمن ان پر لگاتے ہیں
اور ضال کے معنے خدا کی تلاش میں سرگرداں کریں گے جو لغوی معنے بھی ہیں۔ اور انبیاء
کی شان کے مناسب بھی ہیں۔ اور محکم آیت کے ماتحت بھی ہیں۔

تیسری مثال سُنیے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے بطور محکم آیت کے کہ اللہ ظالم نہیں۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (النساء: ۴۱)

ترجمہ: اللہ ہرگز ایک ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرے گا۔

نیز فرمایا وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (ق: ۳۰)

ترجمہ: اور نہ میں اپنے بندوں پر کسی قسم کا ظلم کرنے والا ہوں۔
پھر جہاں جہاں اس نے فرمایا کہ میں یوں عذاب دیتا ہوں یوں قوموں کو فنا کرتا ہوں۔ سب
تکالیف میری طرف سے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ محکم آیات کے ماتحت ان سب متعلقات

کی تاویلیں کریں گے اور کہیں گے کہ جیسا کہ اس نے خود ہی فرمایا سب عذاب اور مصائب اور تکالیف اور لعنتیں لوگوں کی اپنی کرتوتوں کے بدلے اور ان کی بدعہدیں۔ بے ایمانیوں اور ناشکریوں کی سزائیں نازل ہوتی ہیں جیسا کہ فرمایا۔

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (النساء، ۱۵۶)

ترجمہ:۔ بلکہ اللہ نے اُن کے کفر کے سبب سے اُن (کے دلوں) پر مہر کردی ہے۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (البقرہ، ۲۷)

ترجمہ:۔ وہ اِس کے ذریعہ سے اُن نافرمانوں کے سوا کسی کو گمراہ قرار نہیں دیتا۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (النحل، ۱۱۹)

ترجمہ:۔ اور ہم نے اُن پر (یہ احکام دے کر) ظلم نہیں کیا تھا بلکہ وہ (اُن احکام کو توڑ کر) اپنی جانوں پر ظلم کیا کرتے تھے۔

چوتھی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل، ۷۲)

یعنی جو اس دُنیا میں اندھا ہوگا۔ وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ یہ آیت متشابہ ہے۔ اسی کو ہم اس آیت کے نیچے لائیں گے۔ جو اس کے معنی کھولتی ہے یعنی۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (الحج، ۴۶)

ترجمہ:۔ کیونکہ اصل بات یہ ہے کہ ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں اندھے ہوتے ہیں۔

یعنی دین کے معاملہ میں اندھے ہونے سے ظاہری آنکھوں کا اندھا ہونا ہرگز مراد نہیں۔ بلکہ دل کا اندھا ہونا یعنی بے ایمان ہونا مراد ہے مجھے سخت حیرت ہوئی۔ یہ کسی

کہ ایک شخص کہتا تھا۔ یہ جو دنیا میں ظاہری نابینا ہیں یہ آخرت میں بھی نابینا ہی اٹھیں گے اور اس آیت کو سند پکڑتا تھا۔

۱۶۱۔ متضاد صفاتِ الٰہیہ

غنی اور ذو رحمۃ۔ غفور اور ذو انتقام علیم اور قہار۔ محیی اور ممیت۔ قابض و باسط خدا تعالیٰ کی صفات بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اول تو ان میں اصل تضاد نہیں۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ کہ ایک صفت اس میں اچھی تو دوسری عین مخالف جو بری ہے۔ وہ بھی اس میں پائی جائے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ سبوح اور قدوس ہے۔ اس لئے عیب کی صفت تو کوئی اس میں ہو ہی نہیں سکتی۔ مثلاً رحیم ہے۔ تو بےرحم نہیں ہو سکتا بلکہ جو تکالیف لوگوں کو پہنچتی ہیں۔ وہ اس کی بے رحمی کا نتیجہ نہیں۔ انصاف یا اوروں پر رحم کرنے کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے اس کی صفات میں اصل تضاد نہیں۔ کیونکہ جو بظاہر بے رحمی معلوم ہوتی ہے۔ وہ یا تو عدل و انصاف ہے۔ یعنی بندہ کے قصور کی سزا مل رہی ہے۔ یا کسی اور پر رحم ہے۔ یا اسی شخص پر رحم ہے۔ جس کی کنہ کو ہم فی الفور نہیں پا سکتے۔ جیسے ڈاکٹر کسی کا پھوڑا چیرے اور مریض کو تکلیف ہو۔ تو اسے بے رحمی نہیں کہتے۔ اسی طرح دنیا کی سزائیں بھی علاج ہوتی ہیں۔ مگر سراسر رحم ہوتی ہیں کیونکہ آخرت کے بڑے عذاب کا بدلہ ہو جاتی ہیں۔ پس اس قسم کا تضاد معیوب نہیں۔ ایک ہی وقت میں سب محکمے کھلے ہوتے ہیں۔ دنیا کے بادشاہ دیکھ لو۔ کہ ایک ہی وقت میں کچھ حصہ رعیت کا ان کے دسترخوان پر ہوتا ہے۔ اور کچھ حصہ جیل خانوں میں باقی جو اختلاف درجوں کا مخلوقات میں نظر آتا ہے۔ یہ کمال حکمت اور وسیع قدرت کا نشان ہے۔ اس میں ربوبیت ہے ظلم نہیں ہے۔ مالکیت کا اظہار ہے اور مصالح پر مبنی ہے۔ خود اپنے جسم کو ہی دیکھ لو۔ ہر عضو کا درجہ الگ ہے جو بلندی دماغ آنکھ کان کو حاصل ہے۔ وہ دوسرے اعضا کو حاصل نہیں۔ جو دل کا مرتبہ

ہے وہ ٹہڑیوں کو حاصل نہیں۔ یہ اختلافات مصلحت پر ہیں۔ ظلم نہیں ہے۔ اسی طرح ایک ملک میں ایک بادشاہ کا ہونا۔ اگر ہر فرد رعیت بادشاہ ہوتا تو بڑا فساد ہوتا۔ یہ اختلاف نظامِ عام کا کام چلانے کیلئے اشد ضروری ہے۔ جو صفاتِ الٰہیہ ایک دوسرے کے متغائر نظر آتی ہیں۔ ان سب کے اپنے الگ الگ دائرے ہیں اور ہر ایک ان میں سے پسندیدہ اور ضروری ہے۔

قاہر کے معنی صاحبِ غلبہ و صاحبِ حکومت۔ نہ کہ ظالم جبّار کے معنے زبردست اور شکستہ کو جوڑنے والا نہ کہ سرکش۔ متکبر کے معنے بڑی عظمت والا۔ نہ کہ اکڑ باز یہ غلطیاں اردو زبان میں اکثر عربی الفاظ کے معنی بدلنے سے پیدا ہو گئی ہیں۔ غرض محکم آیت صفاتِ الٰہی کے لئے یہ ہے۔ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی سب صفات پسندیدہ ہیں۔ اور ان کے کوئی معنے ایسے نہیں لینے چاہئیں۔ جو اس شان اور عظمت اور تقدس کے خلاف ہوں۔

۱۶۲۔ بہت ہنسنے سے نفاق پیدا ہوتا ہے

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا (التوبہ، ۸۲)

پس چاہیئے کہ یہ منافق تھوڑا ہنسا کریں۔ اور زیادہ رویا کریں کیونکہ یہ نفاق کا علاج ہے۔ انسان بہت عاجزی اور گریہ وزاری کو اپنا دستور بنا لے کیونکہ نفاق بہت ہنسنے اور ٹھٹھے مارنے سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ (الفضل ۲۸ اپریل ۱۹۳۸ء)

۱۶۳۔ حج

جو لوگ عالم ہیں ان سے پوچھو کہ حج کا اصل اور مرکزی نقطہ کیا ہے۔ تو وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ ۹ ذی الحجہ کو عصر سے مغرب تک عرفات کے میدان میں جمع ہو کر دُعا کرنا اصل

حج ہے۔ بالکل درست۔ مگر پھر ہم اس آیت کے کیا معنی کریں۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران-۹۷)

ترجمہ:- اور اللہ نے لوگوں پر فرض کیا ہے کہ وہ اس گھر کا حج کریں (یعنی) جو (بھی) اس تک جانے کی توفیق پائے۔

نیز فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ یعنی حج تو بیت اللہ کا ہوتا ہے۔ اور اس کا مرکزی نقطہ کعبہ ہے نہ کہ عرفات۔ بے شک وہ بھی نسک میں داخل ہے۔ جیسے صفا مروہ پر دوڑنا اور دیگر عبادات ادا کرنا مگر حج کے لفظ کی اصل وابستگی کعبہ کے ساتھ ہے۔ بیت اللہ حج کا مرکز اور دل ہے۔ اور باقی تمام مناسک بطور اعضا و جوارح ہیں۔ قرآن کریم سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ گو لوگ کچھ اور کہتے ہیں۔ سورۂ حج میں ایک آیت حج کے بیان میں یہ ہے کہ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (الحج-۳۰)

ترجمہ:- پھر اپنی میل دُور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور پرانے گھر (یعنی خانہ کعبہ) کا طواف کریں۔

جس نے حج کی اصلیت کو واضح کر دیا ہے۔

۱۶۴- طہارت کے مختلف طریق

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (البقرہ-۲۲۳)

ترجمہ:- اللہ ان سے جو اس کی طرف بار بار رجوع کرتے ہیں یقیناً محبت کرتا ہے اور (ظاہری و باطنی) صفائی رکھنے والوں سے (بھی یقیناً) محبت کرتا ہے۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پاکیزگی اور طہارت بہت پسند ہے۔ طہارت اسلام نے تین طرح پر رکھی ہے (۱) پانی سے (۲) مٹی سے (۳) آگ سے۔

پانی سے اسی طرح کہ ظاہری پانی میل کچیل دھو ڈالتا ہے اور روحانی پانی یعنی وحی انسان کی باطنی صفائی کر دیتا ہے۔ وضو غسل اور کپڑے دھونا ظاہری پانی سے ہوتے ہیں اسی طرح وحی الٰہی سے نیک روحوں کو فوراً روحانی صفائی حاصل ہو جاتی ہے۔

مٹی سے برتن مانجے جاتے ہیں۔ زنگ ہو تو رگڑ کر اتارا جاتا ہے۔ کبھی کبھار صابن وغیرہ جو زیادہ میلے کپڑے کو صاف کرتے ہیں۔ یہ بھی مٹی کے ہی اجزاء ہیں۔ اسی طرح ریت کا فلٹر جو پانی کو صاف کرتا ہے۔ مکان میلا ہو تو سفیدی کراتے ہیں اور کوئی مر جائے تو مٹی میں دفن کرتے ہیں۔ پانی مُضر ہو یا موجود نہ ہو۔ تو وضو بھی مٹی سے کرتے ہیں۔ جسے تیمم کہتے ہیں۔

آگ سے وہ چیزیں صاف کی جاتی ہیں جو پانی اور مٹی سے صاف نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً سخت قسم کے زنگ یا کھوٹ جو اندر تک رچی ہوئی ہو۔ چنانچہ سونا چاندی اسی طرح صاف کئے جاتے ہیں۔ گھی اور بعض ناقص پانی اُبال کر صاف کئے جاتے ہیں۔ دھوپ بھی ایک ذریعہ صفائی کا ہے اور بجلی بھی ان سے جراثیم مر جاتے ہیں۔ یہ بھی آگ کی قسمیں ہیں۔ بعض اوقات تین چیزیں ملائی جاتی ہیں۔ مثلاً بہت گندہ کپڑا ہو تو اسے دھو کر سجی لگا کر پھر بھٹی پر چڑھایا جاتا ہے۔ تب صاف ہوتا ہے۔ مومن اسی دنیا میں پانی اور مٹی سے پاک ہو لیتا ہے۔ کیونکہ وہ خود طین سے بنا ہے۔ البتہ اگر انسانیت ترک کرے اور شیطان کی رگِ نار اس میں آ جائے۔ تو پھر اس کی صفائی کے لئے نارِ جہنم ہے۔ جو اسے پاک کرے گی (اللھم احفظنا) اسی واسطے اسلام نے طہارت کے لئے اول پانی رکھا ہے۔ اگر پانی نہ ملے تو پھر مٹی سے تیمم کرے۔ تیسری طہارت پھر کفار کے لئے رکھی ہے۔ ان کو وہاں پانی بھی ملے گا تو کھولتا ہوا۔

مومن روحانی طہارت بھی انہی تین ذرائع سے کر سکتا ہے۔ اول قرآن سے جو وحیٔ الٰہی کا پانی ہے۔ دوم صحبت صالحین سے جو رگڑ رگڑ کر اس کو مانجتے ہیں۔ سوم محبت الٰہی

کی آگ جو ہر میل کو صاف کرنے کا یقینی اور آخری ذریعہ ہے۔

۱۶۵۔ صبح کے برکات

آج کل عموماً نوجوان اہلِ مغرب کے تمدن کی تقلید میں صبح کو دیر سے اُٹھتے ہیں۔ حالانکہ صبح کا وقت دو خاص برکتیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایک تو وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ کے مطابق وہ استغفار کے لئے خاص وقت ہے۔ دوم۔ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ (بنی اسرائیل ۹۱) دوسرے اوقات کے قرآن سے زیادہ بابرکت اور ثواب کا موجب ہے۔ فجر کا وقت پو پھٹنے کے پیچھے اور سحر کا وقت فجر سے پہلے کا ہوتا ہے۔

۱۶۶۔ دُعائے قرب

قرآنِ مجید میں ایک دعا ہے جس کی تاثیر یہ ہے کہ اس کا کثرت سے مانگنا انسان کو مقربین میں داخل کر دیتا ہے حالانکہ وہ دُعا اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے کی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ
تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ○
رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ
صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ اِنَّكَ
اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ وَمَنْ تَقِ
السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

(المومن ۷، ۸، ۹)

ترجمہ:۔ اے ہمارے رب! ہر ایک چیز کا تُو نے اپنی رحمت اور علم سے احاطہ

کیا ہوا ہے پس توبہ کرنے والوں کو اور اپنے راستے کے اوپر چلنے والوں کو
معاف فرما اور ان کو دوزخ کے عذاب سے بچا لے
اے ہمارے رب! اور ان کو اور ان کے باپ دادوں اور ان کی بیویوں
اور ان کی اولاد میں سے جو نیک ہوں ان کو بھی دائمی جنتوں میں داخل کر،
جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہوا ہے تو غالب (اور) بڑی حکمت والا ہے۔
اور تو ان کو تمام تکلیفوں سے بچا۔ اور جس کو تو اس دن تکلیفوں سے
محفوظ رکھے تو یقیناً تو نے اس پر رحم کیا اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

حملہ تبلاؤ تو کیا وجہ ہے۔

۱۹۷۔ قیامت میں سوال و جواب

یہ بھی ایک رحم ہے کہ بغیر تحقیق اور پوری صفائی کے سزا مرتب نہ ہوگی۔ دوسرا اس کے محاسبہ کا ذکر پہلے ایک مضمون میں کر چکا ہوں۔ جو سورۂ مائدہ کے پچھلے دو رکوعوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کی پرسش الگ الگ اس کی فطرت عقل تعلیم لیاقت فہم ملک اور حالات کے مطابق ہوگی۔ مثلاً جو صحابہ اور اولیاء اللہ سے باریک سوالات ہوں گے۔ وہ عام مومنوں سے نہ ہوں گے۔ اور جو ان سے ہوں وہ کفار سے نہ ہوں گے۔ مثلاً جہاں اسلام نہ پہنچا ہوگا۔ وہاں عقائد میں صرف توحید فطرتی کا ہی سوال ہوگا جس کی جیسی سمجھ ہوگی اس کے مطابق حساب ہوگا۔ یہی اعمال کا حال ہے۔ مومنین سے نماز روزہ کا۔ زکوٰۃ پھر اخلاق پھر ترک معاصی کا تا ماتحت عاصیوں سے صرف ان گناہوں کا جو مشہور ہیں۔ یا جن کو فطرت محسوس کرتی ہے۔ مثلاً چور سے چوری کا سوال ہوگا۔ کیونکہ وہ خود چوری کو بُرا جانتا تھا جبھی تو اپنے ساتھیوں کے مال میں سے کبھی چوری نہیں کرتا تھا۔ زانی سے زنا کا کیونکہ اپنی جورو اور بہن اور بیٹی کے لئے وہ بڑی غیرت رکھتا تھا۔ اور ان کے لئے

یہ فعل جائز نہ سمجھتا تھا۔ ڈاکو کا ڈاکہ ہیں کیونکہ اسے اتنی سمجھ تھی۔ کہ بنیئے کی برات پر ڈاکہ مارنا ہے مگر سرکاری خزانہ پر نہیں کہ وہاں مضبوط پہرہ ہے۔ اگر نظر نا مجبور ہوتا تو ہر جگہ ڈاکہ زنی کرتا۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝

(القیامت: ۱۵، ۱۶)

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو خوب دیکھ رہا ہے اور جانتا ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے
خواہ وہ زبان سے کتنی ہی صفائی پیش کرے

۱۶۸۔ نماز باجماعت

نماز باجماعت کا حکم وارکعوا مع الراکعین سے بھی نکلتا ہے۔
(الفضل ۳۰ اپریل ۱۹۲۸ء)

۱۶۹۔ قوم عاد کی حالت

عاد کی قوم بھی طرزِ معون تھی جس میں اس زمانہ کی قوموں کے سب اوصاف جمع تھے۔
اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ (الشعراء: ۱۲۹)

ترجمہ: کیا تم ہر ٹیلے پر فضول کام کرتے ہوئے (یادگار) علامت بناتے ہو۔
یہ اہل ہنود کی عادت ہے۔
وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ (الشعراء: ۱۳۰)
ترجمہ: اور تم بڑے بڑے محل بناتے ہو، تاکہ تم ہمیشہ قائم رہو۔
یہ اہل یورپ کے کمالات ہیں۔ کارخانے اور فیکٹریاں بنانے میں
وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ (الشعراء: ۱۳۱)
(ترجمہ) اور جب تم (کسی کو) پکڑتے ہو تو تم ظالموں کی طرح پکڑتے ہو۔

یہ خالصتہً بہادر کی حکومت ہے

۱۷۰۔ ظالموں کا اعتراض

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (فرقان ۹)

ترجمہ:۔ اور ظالم کہتے ہیں کہ تم تو ایک ایسے آدمی کے پیچھے چل رہے ہو جس پر جادو کیا گیا ہے۔

ظالم کہتے ہیں کہ اس نبی پر تو جادو کیا ہوا ہے۔ یہ پڑھ کر بھی اکثر اہل حدیث قرآن کو رد کر دیتے ہیں اور ایک حدیث کو مقدم کر کے کہتے ہیں کہ واقعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو ہوا۔ اور لبید نے کیا اس کا اثر ایسا سخت تھا۔ کہ آپ مہینوں نعوذ باللہ مبہوت رہے۔ کوئی کام کرتے تھے پھر سمجھتے تھے۔ کہ میں نے نہیں کیا۔ یا نہیں کرتے تھے تو سمجھتے تھے کہ میں نے کر لیا ہے۔ شائد کبھی نماز بھی نہ پڑھتے ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے کہ پڑھ لی ہے۔ یہاں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسحور کہنا بھی کفر ہے نہ یہ کہ اس مسحور ہونے کو بڑی بڑی تفاصیل دے کر بیان کیا جائے اور اس پر ایمان رکھا جائے۔ اسی طرح باوجود واللہ یعصمک من الناس کی پیشگوئی کے یہ لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودی عورت کے زہر کھلا دینے سے فوت ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

۱۷۱۔ حکمت کا ایک نمونہ

قرآن کریم کے لفظ لفظ میں حکمت ہے۔ مثلاً

قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ (المائدہ ۱۸)

ترجمہ۔ تو (اُن سے) کہہ دے۔ اگر اللہ مسیح ابن مریم (کو) اور اس کی ماں (کو) اور (اُن) تمام لوگوں کو جو زمین میں پائے جاتے) ہیں ہلاک کرنا چاہے تو اس کے مقابلہ میں کون کسی بات کی طاقت رکھتا ہے۔

کہ آیت میں اگر "اُمّہ" کا لفظ نہ ہوتا۔ تو یہ مولوی احمدیوں کو کچا کھا جاتے۔ اسی ایک لفظ نے ان کا ناطقہ بند کر دیا۔ ورنہ بس حیاتِ مسیح کا میدان انہوں نے مار ہی لیا تھا۔ اور اگر حفاظت قرآن کا وعدہ خدا کی طرف سے نہ ہوتا تو اس لفظ کو کب کا چاقو سے چھیل چکے ہوتے۔

۱۷۲۔ سائنس کے دقیق مسئلے

قرآن مجید نے بعض جگہ سائنس کے ایسے مسئلے بیان کئے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی تعجب آتا ہے۔ مثلاً

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (الذاریات ۵۰)

ترجمہ۔ اور ہر ایک چیز کے ہم نے نر و مادہ بنائے ہیں تاکہ تم نصیحت حاصل کرو

آج سے ۱۴ سو سال پہلے کہا۔ اور یہ اب ثابت ہوا ہے کہ نہ صرف حیوانات اور نباتات جوڑا جوڑا ہیں بلکہ ذراتِ عالم تک بھی مرکب ہیں۔ اور ان میں ایک مرکزی حصہ ہوتا ہے جس کے گرد بیرونی الیکٹران ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ بجلی جو بظاہر محض طاقت ہے۔ وہ بھی مثبت اور منفی ہوتی ہے۔ یعنی نر اور مادہ ذرات سے مرکب ہے۔ اسی طرح یہ مسئلہ کہ جمادات بلکہ ہر مخلوق میں حیات ہے۔ اسی طرح یہ مسئلہ کہ غذا کا اثر اخلاق پر ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ مسئلہ کہ ظاہر کا اثر باطن اور باطن کا ظاہر پر ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب ایک اور علمی بات آپ کو دکھاتا ہوں۔ اس آخری زمانہ کے متعلق جو مسیح موعود کا زمانہ ہے قرآن مجید نے یہ کہا کہ۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ وَجُمِعَ
الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝ (القیامت : ۷ تا ۹)

یعنی ایسے عذابوں کا آغاز جبکہ آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ وہ زمانہ ہوگا جب چاند کو گرہن لگے گا۔ اور سورج کو گرہن لگے گا۔ یعنی چاند، سورج دونوں کو ایک ہی وقت میں ایک خاص مشہور گرہن لگے گا جس کی پیشگوئی پہلے سے شائع اور متعارف ہوگی۔ یہاں جُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ کے معنے صرف یہ ہیں کہ سورج کو گرہن لگے گا۔ صرف خَسَفَتِ الشَّمْسُ اس لئے نہیں کہا کہ ساتھ ہی ایک سائنس کے مسئلہ کا انکشاف کرکے قرآن مجید کے علمی کتاب ہونے کی دلیل پیدا کی جائے کیونکہ شمس و قمر کے جمع ہونے کے دوسرے معنے کسوف کے ہیں۔ کسوف تبھی ہوتا ہے جب ہماری نظر کے سامنے چاند اور سورج ایک لائن میں جمع ہو جائیں۔ اس بیان سے ایک طرف تو کسوف کا ذکر ہوگیا۔ دوسری طرف اس کے علمی اسباب کو ظاہر کرکے یہ واضح کر دیا۔ کہ یہ کتاب عرب کے امی کی طرف سے نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسی ذات کی طرف سے ہے جو علیم و خبیر ہے۔ اس زمانہ میں بیشک مدرسہ کا بچہ بچہ اس مسئلہ کو جانتا ہے۔ مگر اس زمانہ میں جبکہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ کوئی آسمانی اژدہا ہے جو سورج کو منہ میں لے لیتا ہے یا کسی بڑے شخص کی موت پر آسمان اپنے غم کو اس طرح ظاہر کرتا ہے۔ ایسے علمی انکشاف کا ایک اَن پڑھ اور صحرا کے رہنے والے عرب سے صادر ہونا اگر معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔

۱۷۳۔ قرآنِ مجید میں بکثرت پیشگوئیاں ہیں

یہ دعویٰ خود قرآن مجید نے کیا ہے کہ

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ (التکویر : ۲۵)

یعنی یہ قرآن اظہارِ غیب میں بخیل نہیں۔ بلکہ اس میں بکثرت علم غیب موجود ہے

حالانکہ مسلمان مولوی مرمر کر صرف غلبت الروم کی ایک پیشگوئی اس میں سے نکالتے ہیں اور بس۔ یہ بات حضرت مسیح موعود کی برکات میں سے ہے۔ کہ اب یہی کلام الٰہی پیشگوئیوں سے بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ نمونہ کے طور پر اسی چھوٹی سی سورۃ تکویر کے شروع میں ہی جس کی یہ آیت ہے۔ تیرہ عظیم الشان پیشگوئیاں موجود ہیں جو ہم اپنی آنکھوں سے پوری ہوتی دیکھ چکے ہیں۔ یعنی

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ

ترجمہ: جب نور آفتاب کو لپیٹ دیا جائے گا۔

سے لے کر وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ○

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ○ (التکویر ۱۵،۱۴)

(ترجمہ) اور جب جنت کو قریب کر دیا جائے گا۔

(اس وقت) ہر جان جو کچھ اس نے حاضر کیا ہے جان لے گی۔

فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذَالِكَ

۱۷۴۔ شراب کی حرمت

بعض لوگوں کو یہ دھوکا لگا ہے کہ قرآن نے شراب کو حرام نہیں کیا۔ صرف بُرا کہا ہے۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو حرمت صاف ہے پہلے تو فرمایا۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (البقرہ ۲۱۹)۔

یعنی لوگ جوئے اور شراب کا مسئلہ پوچھتے ہیں ان کو کہہ دو کہ دونوں میں بڑا بھاری اثم ہے اور بعض لوگوں کو فائدہ بھی پہنچتا ہے۔ یہاں سے معلوم ہو گیا۔ کہ شراب بڑا اثم ہے۔ اب سورۂ اعراف میں فرماتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ (الاعراف: ۳۳)

یعنی کہہ دے کہ میرے رب نے ظاہر باطن کی سب بے حیائیوں کو حرام کیا ہے۔ اسی طرح ہر اثم اور بغاوت کو بھی حرام کر دیا ہے۔ اب یہ قضیہ یوں بیٹھا کہ شراب اثم ہے۔ اور ہر اثم حرام ہے۔ لہٰذا شراب حرام ہے۔

۱۷۵۔ اکٹھے مِل کر کھانا

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا (النور: ۶۲)

یعنی مل کر بھی کھاؤ۔ اور الگ الگ بھی کھاؤ کسی طرح ہرج نہیں۔ مگر ہندوؤں کی دیکھا دیکھی اور مغربیت کے اثر کے نیچے مسلمان جو پہلے عموماً مل کر اکٹھا کھایا کرتے تھے۔ اب الگ الگ زیادہ کھاتے ہیں اور مل کر ایک رکابی میں کھانے سے کراہت محسوس کرتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے وہ بے تکلفی اخوت مساوات اور دلی تعلق جو مسلمان کو مسلمان سے ہوا کرتا تھا۔ گم ہو جائے اور کھانا بالکل الگ الگ ہو جانے سے قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى نہ ہو جائیں۔ کیونکہ سوشل لحاظ سے جس قدر مل کر کھانا آپس میں محبت کا تعلق پیدا کرتا ہے سا تنا اور کوئی چیز نہیں کرتی۔ (الفضل ۳ مئی ۱۹۳۰ء)

۱۷۶۔ صفاتِ الٰہیہ بالارادہ ہیں نہ کہ بالاضطرار

خدا تعالیٰ کے وجود کو اکثر دُنیا مانتی ہے۔ بلکہ دہریہ بھی۔ لیکن وہ اور نیچری اور آریہ ایسا خدا مانتے ہیں جس کی صفات اور افعال اضطراری ہوں۔ یعنی اس کی خاصیتیں اس کے ارادہ کے ماتحت نہ ہوں۔ بلکہ مجبوراً چل رہی ہوں۔ گویا وہ خود قانون کے ماتحت ہے۔ مگر قرآن کا خدا قوانین اور مجبوریوں سے جکڑا ہوا نہیں۔ بلکہ اپنی مرضی اور مشیت

کا خدا ہے۔ جو چاہتا ہے۔ کرتا ہے۔ اور ہر صفت کے ظہور کے وقت اس کا ارادہ ساتھ ہوتا ہے۔ وہ پابند نہیں ہے۔ کہ مقررہ قوانین پر ہی چلنے پر مجبور ہو۔

غرض وہ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ اور فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ خدا ہے۔ نہ کہ ایک مشین۔ جو بعض قواعد کے ماتحت چلتی ہو۔ بے شک اس نے قاعدے اور قانون بنائے ہیں مگر وہ خود اُن سے بالاتر ہے۔ اور اپنی مشیت کے جلوے اپنے مقررہ قوانین کو توڑ کر بھی دکھاتا رہتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ ہونے کا ثبوت بھی دے۔ بشک وہ انصاف اور جزا سزا دیتا ہے۔ مگر اس میں مجبور نہیں کہ فلاں نیکی کے عوض ضرور آنا۔ یا اس قسم کا بدلہ دے۔ یا گناہ کی سزا ضرور اتنی اور ایسی دے۔ بلکہ وہ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے یعنی انصاف کے وقت کا بھی پورا مالک ہے چاہے تو اندازہ سے بہت بڑھ کر جزا دیدے۔ چاہے تو گناہ معاف کر دے۔ ہاں نیکی کی جزا ہم کبھی نہیں دے گا۔ کیونکہ یہ ظلم ہے۔ اور انصاف کے مخالف ہے اور تقدس پر داغ ہے اور بے رحمی ہے اور عیب ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ (النساء : ۴۱)

(ترجمہ) اللہ ہرگز ایک ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرے گا۔

اس کی صفت ہے۔ ہاں وہ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ و مختار ہے۔ غرض ہمارا خُدا پورا مالک اور کامل مختار ہے اور ایسے ہی خدا کو انسانی فطرت چاہتی ہے۔ جو خدا کو آزاد، مختار۔ مرضی کا مالک ارادہ والا اور

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ (الانبیاء : ۲۴)

(ترجمہ) جو کچھ وہ کرتا ہے اس کے متعلق وہ کسی کو جواب دہ نہیں ہوتا نہ ہو۔ وہ خدا ہی کیونکر ہوا؟ وہ تو بندہ ہی ہوا۔

۱۷۷ - دُکھ کیوں ہے ؟

پہلے بھی اس پر ایک نوٹ لکھا جا چکا ہے۔ مختصر یہ کہ اگر خدا رؤف رحیم ہے تو دُنیا میں دکھ۔ تکالیف۔ امراض۔ مصائب۔ قحط اور وبا کیوں ہیں ؟

جواب:۔ اس لئے کہ: ۱۔ جو ان تکالیف سے بچے ہوئے ہیں وہ خدا کا شکر کریں۔

۲۔ خدا کی جلالی صفات اپنا تقاضا پورا کریں۔

۳۔ اس کی قدرت ظاہر ہو۔ کہ وہ کیا کیا کر سکتا ہے۔

۴۔ اس کا وجود ثابت ہو۔ اگر ہمیشہ ایک سا کارخانہ رہتا۔ تو خدا کا وجود مشتبہ ہو جاتا۔

۵۔ طبعی قوانین کی نافرمانی کی سزا۔

۶۔ ابتلاء برائے اصطفاء وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ ... الخ (البقرہ ۱۵۶)

(ترجمہ) اور ہم تمہیں کسی قدر خوف اور بھوک (سے اور مال) اور جانوں سے اور پھلوں کی کمی (کے ذریعہ سے ضرور آزمائیں گے۔

۷۔ آئندہ کی اصلاح لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ (الاعراف ۹۵) تاکہ وہ عاجزی کا اظہار کریں۔

۸۔ جو لوگ اعمال نہیں کر سکتے۔ ان کے اعمال کا قائم مقام بیماریاں۔ دُکھ اور تکالیف ہوتی ہیں۔ اگر ان پر صبر کریں گے تو اعمال کرنے والوں کے برابر جزا ملے گی۔

۹۔ علم و حکمت بڑھانے کو۔ تاکہ لوگ وجوہات۔ علاج اور تدابیر تلاش کریں۔

۱۰۔ شرعی گناہوں کی سزا کا وہ حصہ جو اسی دُنیا میں ملتا ہے
لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا (الروم ۴۲)
(ترجمہ) خدا لوگوں کو اُن کے عملوں کے کچھ حصے کی سزا اس دُنیا میں) دے گا

۱۱۔ لوگ سرکش نہ ہو جائیں (لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ) (الشوریٰ ۲۸) وہ ملک میں بہت سرکشی کرنے لگ جاتے ہیں

۱۲۔ دُنیا کا کارخانہ چلے۔ سب تندرست کھاتے پیتے ہوتے۔ تو کام نہ چلتا کیونکہ
دُنیا کا نظام ایک دوسرے کے احتیاج پر مبنی ہے ۔

۱۳۔ لوگوں کو ثواب ملے۔ غریب نہ ہوتا۔ تو امیر کو سخاوت کا ثواب کیونکر ملتا۔ کوئی
قابلِ رحم نہ ہوتا۔ تو رحم کس پر کیا جاتا ۔

۱۴ ۔ اخلاق کا تقاضا پورا کرنے کو جیسے ربوبیت کمزوری کی طالب ہے ۔

۱۵ ۔ یہ ثابت کرنے کو کہ آخرت اصل چیز ہے۔ دُنیا اصل چیز نہیں ہے بلکہ محنت
مشقت اور ابتلا کا مقام ہے۔ اس کا بدلہ آگے چل کر ملے گا۔

۱۶۔ لوگوں کے ظلم ایک دوسرے پر دُکھ کا باعث ہوتے ہیں (مگر مظلوم کو جزاء
آئندہ جہاں میں ملے گی) ۔

۱۷۔ بعض تکالیف مثلاً موت اور بچہ جننے کا دُکھ۔ یہ بعض حکمتوں اور مصالح پر
مبنی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے۔ تو لوگوں کو نقصان زیادہ ہوتا۔ اور سخت حادثات
اور ناگوار باتیں پیش آتیں ۔

۱۸۔ لطف۔ آرام اور راحت کا احساس قائم رکھنے کے لئے کیونکہ بغیر تکلیف
کے کوئی مزا نہیں ۔

۱۹۔ انسان ترقی کرے۔ اور ترقی کے لئے روکیں ضروری ہوتی ہیں۔ انہی روکوں کا
نام مصائب ہے ۔

۲۰ قربانی میں ہمیشہ دُکھ ہوتا ہے۔ جب کوئی چیز کسی دوسرے کی خاطر قربان
ہوگی۔ تو وہ دُکھ درد اُٹھائے گی۔

۲۱۔ موت چونکہ ہر جاندار پر لازمی ہے۔ اس لئے اسے بہت سے مصالح کے
ماتحت دکھوں کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔

آخر میں یہ بات اصولاً یاد رکھنی چاہیئے کہ ہر دکھ کا بدلہ اور انعام ملے گا۔ خواہ

اس دنیا میں خواہ آخرت میں۔

۱۷۸- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا مقابلہ عام انسانوں کے اخلاق سے تو ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو وہ جگہ ہے جہاں دوسرے نبی بھی عاجز ہیں۔ سورۂ یوسف میں آتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس جب بادشاہ کا ایلچی آیا کہ ان کو قید خانہ سے چھڑا کر لے جائے۔ تو آپ نے فرمایا۔

ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ (یوسف ۵۱)

یعنی واپس چلا جا۔ اور بادشاہ سے کہو۔ کہ وہ جو عورتوں کے ہاتھ کاٹنے والا معاملہ ہوا تھا اس کی تفتیش کرو۔ پھر میں یہاں سے نکلوں گا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں یوسف کی جگہ قید خانہ میں ہوتا تو ایلچی کے ساتھ فوراً باہر نکل آتا یعنی اتنا جھگڑا اور تحقیقات نہ کراتا۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ نعوذُ باللہ آپ بے صبر تھے۔ اور یوسفؑ آپ سے زیادہ صبر والے۔ اور آپ سے زیادہ اپنی بریت کرنے والے تھے۔ بلکہ اس سے آپ کے اعلیٰ ترین اخلاق پر روشنی پڑتی ہے۔ یعنی باوجود اس عورت کے قید کرا دینے کے اور کئی سال تک ایذا میں رکھنے کے میں پھر بھی اس کا اتنا احسان یاد رکھتا کہ مزید تحقیقات کرا کر اس کی پردہ دری نہ کراتا۔ اور اس کے راز اور عیوب کو عدالتوں میں افشا نہ کراتا۔ جو کچھ اس نے کیا تھا۔ سو کیا تھا۔ اُسے جانے دیتا اور معاف کر دیتا۔ کیونکہ آخر ایک کمزور عورت تھی اور محسنہ تھی۔ اسی طرح ایک اور مثال لے لیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے تنگ آ کر آخر اپنی قوم پر بد دُعا کی اور ایسی سخت بد دُعا کہ اُسے تباہی کر ڈالا۔ اس کے مقابل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے کبھی اپنی قوم پر ایسی بد دُعا نہیں کی۔ بلکہ اس قدر دُعا ان کی ہدایت کے لئے کی کہ آخر سارا ملک اور ساری قوم مسلمان ہوگئی۔ کس قدر قومی ہمدردی آپ کی حضرت نوحؑ سے زیادہ ثابت ہوتی ہے۔ (الفضل ۲ مئی ۱۹۳۸ء)

۱۷۹۔ قرآن میں کسی کی بدگوئی نہیں ہے

دُشمن اعتراض کرتے ہیں کہ غیر احمدی مسلمان تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن میں بدگوئی ہے۔ مثلاً ابولہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تبا لک کہا (یعنی تو ہلاک ہو جائے) تو فوراً ایک سورۃ نازل ہوگئی جس میں نہ صرف ابولہب کو ان ہی الفاظ سے یاد کیا گیا بلکہ اس کی بیوی کو بھی۔ ہمارے نزدیک یہ بدگوئی نہیں ہے۔ بلکہ ایک عظیم الشان پیشگوئی ہے جو حرف بحرف پوری ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور ابولہب کی ہلاکت پر مہر کر گئی۔ قصہ یوں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد بدر کی لڑائی کے وقت ابولہب نے بھی کفار کو چندہ دیا بلکہ بہت سامال خرچ کر کے اپنی طرف سے لڑنے کے لئے اپنا قائم مقام بھی بھیجا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مال بھی برباد ہوا اور شکست مقدر رہی۔ فتح بدر کے ہفتہ بھر کے بعد اس کے ہاتھ پر پھوڑا نکلا جس کی تکلیف سے وہ چیخ چیخ کر مر گیا اس کا بیٹا کچھ مال تجارت مکہ کو لا رہا تھا کہ راستہ میں ایک نخلستان میں ٹھہرا۔ وہاں ایک شیر نے نکل کر اسے پھاڑ کھایا۔ اور اس کا مال بھی برباد ہوا۔ بیوی جو ابولہب کی تھی وہ ایک دن لکڑیوں کا گٹھا رسی سے باندھ کر پشت پر اُٹھانے لگی تو رسی کا پھندا اتفاقاً پھسل کر گلے میں آگیا۔ اس سے اپنی گردن نہ چھڑا سکی۔ گلا گھٹ گیا اور پھانسی پا کر ختم ہوگئی۔ غرض سارا گھر اور مال و اسباب تباہ ہوگیا۔ گھر والے مر گئے۔ اور اسی طرح جس طرح پیشگوئی کی تھی سب باتیں حرف بحرف پوری ہوئیں۔ سو یہ بدگوئی نہ تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کا ایسا عظیم الشان نشان تھا

کہ اس کا وقت سے پہلے بتانا۔ پھر اس کا بعینہٖ اسی طرح پورا ہونا۔ اور نصرت حق کا اس قہری رنگ میں اُترنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایک زبردست دلیل ہے۔ اور بس۔ اب سورۃ تَبَّتْ یَدَآ ساری پڑھو اور لطف اٹھاؤ۔

۱۸۰۔ شادی کی عمر

وَابْتَلُوا الْيَتَامٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ (النساء : ۷)

(ترجمہ): اور یتیموں کی آزمائش اُس وقت تک کہ وہ شادی (کی عمر) کو پہنچ جائیں کرتے رہو۔ پھر تم اُن میں سمجھ (کے آثار) دیکھو تو اُن کے مال اُنہیں واپس دے دو۔

یعنی نکاح کی عمر وہ ہے جب لوگ اپنے طور پر کاروبار کرنے کے قابل ہو جائیں اور نیک و بد سوچ سمجھ سکیں ورنہ یوں تو بارہ تیرہ سال کا لڑکا بھی شادی کے قابل ہو جاتا ہے۔ مگر اس عمر میں کوئی شخص اس کو مال اور جائداد کا انتظام سپرد نہیں کرتا۔ پس جب کوئی کمانے کے قابل اور مال و جائیداد کی نگہداشت کے لائق ہو جائے اس وقت مرد کا نکاح ہونا چاہیئے۔ مثلاً ایک شخص جو کالج میں تعلیم پاتا ہے۔ اس کی کمائی اور مالی انتظام جب شروع ہوگا جب وہ بی اے پاس ہو جائے گا۔ یا ایم اے بی ٹی یا ایل ایل بی ہو جائے گا۔ سو وہی عمر اس کی کمائی اور مالی انتظام کی ہوگی۔ اور وہی عمر اس کی شادی کی بھی ہوگی۔ زمیندار کی عمر نسبتاً کم ہوگی۔ اسی طرح تاجر کی جب وہ اس عمر کو پہنچ جائے کہ اپنی دکان چلانے کی عقل اس میں آ جائے۔

۱۸۱۔ علم کے ایک معنی

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل ۲۷)

(ترجمہ:) اور (اے مخاطب) جس بات کا تجھے علم نہ ہو اس کی اتباع نہ کیا کر۔

اس جگہ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (ھود ۴۷) کے معنوں کے متعلق لوگوں کو مشکل نظر آتی ہے۔ سو یہاں وہی معنے کرنے چاہئیں جو

وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (العنکبوت ۹)

(ترجمہ:) اور اگر وہ دونوں تجھ سے اس بات میں بحث کریں کہ تو کسی کو میرا شریک قرار دے حالانکہ اس کا تجھے کوئی علم نہیں، تو ان دونوں کی فرمانبرداری نہ کر۔

میں معنے کئے جاتے ہیں۔ یعنی ایسی بات جس پر عقلی ونقلی دلائل نہ ہوں۔ اس کی اتباع نہیں کرنی چاہیئے۔ اس طرح یہاں علم کے معنی دلیل کے ہوگئے۔ یا ثابت شدہ صداقت کے۔ یہ معنی بالکل غلط ہیں کہ جس چیز کا تجھے علم نہ ہو اس کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کر مثلاً اگر تجھے دین کا علم نہیں تو اس کے سیکھنے کی کوشش نہ کر۔ ایسے معنی بالبداہت لغو ہیں۔

۱۸۲۔ ظرف

حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے ایک اصل یہ بھی پیش کیا ہے۔ کہ گو خدا تعالےٰ کے فضل محدود نہیں مگر یہ فضل بھی ظرف کے مطابق نازل ہوتے ہیں۔ اور ہر شخص کا ایک ہی ظرف نہیں ہے بلکہ ظرف مختلف ہوتا ہے ہر ایک کا۔ اس اصل کا استدلال اس آیت سے ہوتا ہے ویؤت کل ذی فضل فضله یعنی اللہ تعالےٰ کے انعامات اس شخص کی وسعتِ ظرف کے مطابق ہوا کرتے ہیں۔ نیز اس آیت سے

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا (الرعد ۱۸)
(ترجمہ)۔ اس نے آسمان سے کچھ پانی اُتارا۔ پھر (اس سے) کئی وادیاں اپنی (اپنی) گنجائش کے مطابق بہ نکلیں۔

اسی طرح لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ ۲۸۶) یعنی اپنی وسعتِ ظرف کے مطابق ہر انسان مکلف ہوتا ہے۔

۱۸۳ - حضرت ذکریا علیہ السلام کی خاموشی

حضرت ذکریا علیہ السلام نے جب اولاد کے لئے دُعا کی تو ان کو بشارت ملی۔ کہ تم کو ایک لڑکا دیا جائے گا۔ انہوں نے عرض کیا۔ کہ اے خداوند کوئی نشانی بتا کہ کب میری بیوی حاملہ ہوگی۔ حکم ہوا کہ اس کی نشانی یہ ہے کہ اس وقت تو تین دن تک لوگوں سے بولے گا نہیں۔ کچھ مدت بعد حضرت ذکریا کو گلے کی خراش ہو کر اُن کی آواز بیٹھ گئی یعنی انہیں وہ تکلیف ہو گئی جسے گلا بیٹھنا کہتے ہیں اور جس کا نام ڈاکٹر SIMPLE LARYNGITIS رکھتے ہیں۔ وہ سمجھ گئے کہ وہ وقت آگیا۔ چنانچہ ان کی بیوی خدا کے فضل سے امیدوار ہو گئیں۔ اور یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ گلا بیٹھنا عام طور پر ایک معمولی شکایت ہے مگر آواز اس میں قریباً بالکل جاتی رہتی ہے اور باقی جسم میں کوئی بیماری نہیں ہوتی اور عموماً اس حالت میں میاں بیوی کے تعلقات صحبت میں کوئی ہرج نہیں ہوتا نیز جیسے کہ ان کے قصہ سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ عموماً تین دن کے بعد گلا کھل جاتا ہے اور گو بیوی کے قابل رہتا ہے مگر ایسا آدمی بسبب آواز کے بیٹھ جانے کے نماز پڑھانے کے قابل نہیں رہتا۔ اسی لئے حجرہ سے نکل کر ان کو اشارہ سے لوگوں کو سمجھانا پڑا۔ کہ تم اپنی جماعت کرا لیا کرو۔ میرا انتظار نہ کرنا میری آواز نہیں نکلتی۔

بظاہر اتنا قصہ ہے۔ قبولیت دُعا کا معجزہ یہ ہے کہ اس عمر میں اور بانجھ بیوی سے بیٹا پیدا ہوا۔ مگر گو بیٹھ جانا اور تین دن رات نماز پڑھانے کے قابل نہ ہونا۔ باقی ہر طرح تندرست رہنا۔ یہ باتیں اس وقت موعود کے پہچاننے کے لئے بطور نشان کے تھیں۔ گو بذاتِ خود یہ معمولی واقعات تھے۔ زکریا حیران کُن امور جیسے کہ لوگوں نے ان کو بنا رکھا ہے۔

(الفضل ۵ مئی ۱۹۳۸ء)

۱۸۴ - انبیاء کے دشمنوں پر عذاب

قومی اور ملکی اور عالمگیر عذاب دُنیا میں کئی طرح کے آئے ہیں۔ یہ عذاب عام قدرتی حوادث سے الگ ہوتے ہیں :-

۱۔ **پانی کے عذاب** :- جیسے طوفانِ نوح - دریاؤں کے سیلاب۔ جن سے علاقے شہر اور دیہات ویران ہو گئے۔ مثلاً مسیسپی۔ گومتی۔ جمنا۔ سندھ اور چین کے بعض دریاؤں کے فلڈ FLOOD۔ سیل العرم جس سے یمن کا ملک تباہ ہوا۔ نیل کی طغیانی کے طوفان جن سے فرعونیوں کے ملک پر عذاب آیا۔ بلکہ پسماندہ سیلاب اور نمی کی وجہ سے مینڈک جوئیں۔ چوہیں۔ خونی بخار وغیرہ نازل ہوئے۔ سمندر کے جوار بھاٹے کا عذاب جس میں فرعون اور اس کا لشکر تباہ ہوئے۔ بادوں۔ برف اور بارشوں کے عذاب جن کی کثرت یا بے وقت نزول نے لوگوں کو ہلاک کیا۔ اور ان کی کھیتیوں کو مثلاً بارش بھی کفار کے لئے باعثِ ہلاکت ہوئی۔ کیونکہ وہ پھسلتے تھے اور سپاہی کہاں لڑ سکتا ہے۔ جب اس کے پیر ہی پھسلتے ہوں۔ اسی طرح دریاؤں کی بار بار طغیانی کی وجہ سے بعض دفعہ علاقہ ریت ہی ریت ہو جاتا ہے۔

۲۔ **ریح یعنی ہوا کے عذاب** :- مثلاً عاد کی تباہی اس بادِ سموم کی آندھی سے ہوئی۔ جو مسلسل ایک ہفتہ چلتی رہی۔ سارے ملک کو اس نے ریگستان بنا دیا اور مدفون کر دیا

ذاہیں۔ عالمگیر وباؤں کو بھی ہوا کہتے ہیں۔ چنانچہ طیریا کے معنی ہی بری ہوا۔ اور انفلوئنزا بھی ہوا کے ذریعہ پھیلا۔ آندھی ہی نے جنگِ احزاب میں تمام عرب کے لشکروں کو پریشان کر دیا۔ جنگِ بدر میں ایسی آندھی کفار پر سامنے کی طرف سے چلی۔ کہ مسلمانوں کے منہ تو اس سے محفوظ رہے۔ مگر کفار کی آنکھوں، ناک اور منہ میں ملک ہی خاک بھر گئی۔ آنکھوں میں خاک پڑ رہی ہو۔ تو سوائے مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے جانے کے وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ یہی حال جنگِ احزاب میں ہوا۔ اور ہوا نے دس ہزار لشکرِ کفار کو تتر بتر کر دیا۔

۳۔ **زلزلہ کا عذاب**:۔ یہ بصورتِ آتش فشانی کے لوط کی بستیوں پر آیا۔ اور بصورتِ زلزلہ کے ثمود پر آیا۔ ہندوستان میں حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی پیشگوئیوں کے مطابق کانگڑہ۔ بہار اور کوئٹہ کے زلازل کی صورت میں آیا۔ جاپان میں آیا۔ اور دیگر بہت سے ممالک میں بطور نشان ظہور مسیح موعود آیا۔ یہ سب سے سخت عذاب ہے۔ کہ نہ اس کے آنے کا وقت معلوم ہے۔ نہ اس سے بچنے کا طریق۔ نہ یہ مہلت دیتا ہے۔ بس قیامت ہے۔ چٹ پٹ صفائی۔

۴۔ **جنگ کا عذاب**:

وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ (الانعام: ۶۶)

(ترجمہ) اور اللہ تم میں سے بعض کی طرف سے بعض کو تکلیف پہنچائے۔

مثلاً گزشتہ جنگ جس میں آسمان سے آگ اور گیسیں برسیں۔ یا مسلمانوں کی جنگیں جن میں دنیا کی پرانی مہذب قوموں کا سب زور ٹوٹ گیا اور نئی تہذیب قائم ہوئی۔ بدر کی جنگ تو عذاب مجسم تھی۔ کہ تین سو تیرہ بے سامان۔ غیر آزمودہ کار غریبوں نے ایک ہزار مسلح اور آراستہ لشکر کو پل بھر میں ستیاناس کر کے رکھ دیا۔

۵۔ **بیماریوں کے عذاب**:۔ یہ انفلوئنزا اور طاعون کی شکل میں نازل ہوئے

اور عالمگیر تھے ۔ اسی طرح اصحاب الفیل کے لشکر میں چیچک پھیل گئی تھی۔ اور جنگِ عظیم میں خندقوں کے سپاہیوں کے جسموں اور وردیوں میں TICKS اور جوؤں نے ایک آفت برپا کر رکھی تھی۔ کہ زندگی تلخ تھی۔ اور اس FRENCH FEVER سے بکثرت فوجی سپاہی ضائع ہوئے۔

۶ ۔ **قحط کا عذاب** مدیہ عموماً عَذَابِ الْاَدْنٰی ہوتا ہے ۔ نہ کہ عَذَابِ الْاَکْبَرِ اور لَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ یعنی بیدار کرنے کو آتا ہے ۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ لوگوں کے دلوں میں جو یہ خیال بیٹھے ہوئے ہیں کہ جب خدا کا عذاب کسی قوم پر آتا ہے تو وہ قوم بالکل بکا تباہ ہو جاتی ہے ۔ یہ غلط ہے ۔ قوم بحیثیت اپنی عظمت اور حکومت اور ترقی کے مر جاتی ہے ۔ یا ان کے سرغنے ہلاک ہو جاتے ہیں ۔ یہ نہیں تھا ۔ کہ عاد و ثمود یا قوم لوط پر جو عذاب آئے ۔ تو ان میں سے کوئی بھی نہ بچا ۔ اگر سانسیوں ۔ چوہڑوں یا بھیل ۔ گونڈ ۔ شودر اور پسماندہ اقوام کی طرح ایک حصہ بچا بھی رہا ۔ تو کس کام کا ۔ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے ۔ وہ تو نمونہ عبرت ہی رہ گیا ۔ سو یہ ضروری نہیں کہ ساری قوم ہی ہلاک ہو جائے ۔ ہلاکت کے معنی قومی اور ملکی ہلاکت کے ہیں ۔ مثلاً موعود عذاب آیا ۔ سرغنے مر گئے باقی پراگندہ ہو گئے اور قوت ٹوٹ گئی ۔ دوسری حکومتوں کے ماتحت ہو گئے شان و شوکت چلی گئی ۔ ذلیل و پست ہو گئے ۔ یہ مراد ہے دَمَّرْنٰاھُمْ تَدْمِیْرًا کی

خدا نے حدیں لگا رکھی ہیں۔ اس محدّد والی صفت کو قرآنِ مجید نے اس آیت میں بیان کیا ہے۔

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (الفرقان ۲)

یعنی اس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ پھر اس کے متعلق اندازے لگا دیئے۔ کہ ان سے باہر نکلنے نہ پائے۔ اسی طرح آیت

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (طلاق ۴)

(ترجمہ) د اللہ نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر چھوڑا ہے

۱۸۶ - دُنیا کی جنت

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ (الرحمٰن ۴۶)

(ترجمہ) ۔ اور جو شخص اپنے رب کی شان سے ڈرتا ہے اس کے لیے دو جنتیں مقرر ہیں (دنیوی بھی اور اُخروی بھی)

اس کے سوا قرآن مجید میں اور بھی کئی جگہ آتا ہے۔ کہ ہم نیکوں کو دُنیا میں بھی ایک جنت دیتے ہیں اور بدکاروں کو بھی اسی دنیا میں ایک عذاب شروع ہو جاتا ہے

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ

(السجدۃ ۲۲)

(ترجمہ) اور اس بڑے آنے والے عذاب سے پہلے ہم (اس دنیا کا) چھوٹا عذاب بھی اُن کو چکھائیں گے۔

یہ باتیں آخرت کی جنت اور جہنم پر دلیل ہیں۔ سو یہ تو ظاہر ہے کہ دُنیا کی جنت وہ جنت نہیں۔ جو آخرت کی ہے۔ یہاں کی جنت یہاں کی مناسبت سے ہے۔ اور

وہاں کی وہاں کے حالات کے مطابق۔ اس دنیا میں جنت یا وصلِ الٰہی یا لقاءِ الٰہی حسبِ ذیل حالات کو کہتے ہیں۔

۱۔ کثرت قبولیت دُعا۔ ۲۔ وحی و الہام و کشوف۔ ۳۔ نشان کا دیا جانا یعنی اجرائے تقدیر خاص۔ ۴۔ تائید و نصرت غیر معمولی اور غلبہ۔ ۵۔ ہلاکتِ اعداء۔ ۶۔ خدا تعالیٰ کی صفات کا اس شخص کے توسط سے اظہار۔ ۷۔ علم و معرفت دینِ الٰہی اور کلامِ الٰہی کی۔ ۸۔ خواہشات اور ضروریات کا خارق عادت طور پر پورا ہونا۔ ۹۔ شفاعت کا اذن۔

۱۰۔ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الاعراف: ۱۸۶)

(ترجمہ)۱۰۔ بادشاہت آسمانوں اور زمین کی۔

اور قدرتِ الٰہی کے باریک رازوں کا دکھایا جانا۔ ۱۱۔ روحانی کیفیات اور لذات۔ ۱۲۔ خوف اور غم سے آزادی۔ ۱۳۔ دل راضی برضائے مولیٰ ہو جاتا ہے اور خوش رہتا ہے ۱۴۔ پسندیدہ اخلاق ۱۵۔ موت کا ڈر نہیں رہتا۔ ۱۶۔ جذبہ عشق و محبت حضرت باری تعالیٰ کے ساتھ۔

ان باتوں کے علاوہ دُنیاوی عزت بھی کچھ ضرور ہوتی ہے۔ ذلت اور رزق کی مار نہیں ہوتی۔ غربت ہو تو ہو۔ (الفضل ۶ مئی ۱۹۲۸ء)

۱۸۷۔ الحاد فی اسماء اللہ

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ (الاعراف: ۱۸۱)

(ترجمہ) اور اللہ کی بہت سی اچھی صفات ہیں۔ پس تم اُن کے ذریعے اُس سے دُعائیں کیا کرو۔ اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کی صفات کے بارہ

میں غلط اور خیالی باتیں کرتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کے اسماء میں اِلحاد اس طرح سے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً جب اس کا نام جبار و قہار ہے۔ تو ضرور ظالم بھی ہوگا۔ یا عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡر ہے تو خودکشی بھی کر سکتا ہے جھوٹ بول سکتا ہے۔ حلول کر سکتا ہے۔ اپنا بیٹا یا جورو بنا سکتا ہے یا اپنے جیسا خدا پیدا کر سکتا ہے۔ یا بے پرواہ ہے اسلئے نیکوں کو تباہ کرے اور بدوں کو غلبہ دے دے۔ یا بندوں پر ظلم کرنا شروع کر دے۔ وعدہ کرکے توڑ دے۔ باوجود توبہ اور عجز کے اپنے وعید پر اڑا رہے۔ غرض سُنت اللہ کے برخلاف یا اپنی عزت علو شان توحید اور صفات کے منافی بھی کام کرتا رہے۔ ایک صورت الحاد کی یہ ہے کہ کوئی کہے کہ میں خدا سے دُعا کیوں کروں۔ کیا اُسے خود دکھائی نہیں دیتا کہ میرا حال کیا ہے۔ یا یہ اعتراض کہ کیوں کسی بے کس پر فقر و فاقہ نازل کیا۔ کیوں فلاں بیوہ کا اکلوتا لڑکا مرگیا۔ اور اگر وہ رحیم تھا تو کیوں کسی کو اندھا پیدا کیا۔ غرض یہ اور اس قسم کی سب باتیں الحاد فی اسماء اللہ ہیں۔

۱۸۸ - عَرَفۡتُ رَبِّیۡ بِفَسۡخِ الۡعَزَائِمِ

کسی بزرگ کا مشہور قول ہے عرفت ربی بفسخ العزائم یعنی میرے نزدیک خدا کے وجود کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ باوجود ہمارے پختہ ارادوں اور درست تجاویز کے پھر بھی وہ سارے ارادے اور تدبیریں دھری رہ جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور متصرف ہستی ہماری سکیموں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ بس وہی خدا ہے۔ انسان کی کوشش کا بیکار ہو جانا اور اس کی خواہشات کا پورا نہ ہونے پانا کسی بالا ہستی کا ثبوت ہیں۔ قرآن مجید میں اس مضمون کی یہ آیت ہے۔

اَمۡ لِلۡاِنۡسَانِ مَا تَمَنّٰی ۝ فَلِلّٰہِ الۡاٰخِرَۃُ وَالۡاُوۡلٰی (نجم ۲۵، ۲۶)

(ترجمہ): کیا انسان جو خواہش کرے اُسے مل جاتی ہے۔ سو یاد رہے کہ آخرت اور دُنیا کی سب نعمتیں اللہ ہی کے قبضہ میں ہیں۔
واقعی انسان کے مخلوق ہونے کا ثبوت یہی ہے کہ اس کی سب خواہشات پوری نہیں ہوتیں۔

۱۸۹۔ لِقاءِ الٰہی کا شوق

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ
اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ (یونس: ۸-۹)

یعنی جو لوگ ہماری ملاقات کا شوق نہیں رکھتے۔ بلکہ دُنیا کی زندگی سے راضی اور مطمئن ہیں اور ہمارے نشانات سے غافل ہیں ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

۱۹۰۔ تدبیر و حکمت مدبّر اور حکیم کے وجود پر دلیل ہیں

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ
اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ (یونس: ۴)

کلام مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ زمانوں میں آسمان و زمین کو پیدا کیا پھر تختِ حکومت پر جلوہ گر ہوگیا اور تدبیر و حکمت سے کام چلاتا ہے۔ ظاہر کام کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ بلکہ ہر کام میں صرف حکمت اور تدبیر ہی نظر آتی ہے۔ یہی ثبوت ہے اس کے وجود کا کیونکہ جب ذرّہ ذرّہ میں حکمت اور تدبیر صاف صاف اور ظاہر ظاہر نظر آتی ہیں تو کوئی حکیم اور مدبّر ان کی پشت پر ضرور ہے۔ (الفضل ۷ رمئی ۱۹۳۸ء)

۱۹۱ - قیامت

قیامت کے متعلق قرآن مجید کے دلائل اور تفصیلات دُنیا کی باقی مذہبی کتابوں سے بہت زیادہ اور واضح ہیں۔ جو دلائل اس نے دیئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے :-

۱۔ فطرتی خیال بعد الموت کا ہر انسان کو لگا ہوا ہے۔ انسان جب ارتقاء کی ابتدائی منازل طے کر رہا تھا۔ اُس وقت بھی باوجود نیم وحشی ہونے کے اس کے اندر یہ خیال موجود تھا کیونکہ لاکھوں سال پرانے مُردوں کو جب اکھیڑا گیا تو ان کے پاس پتھروں کے ہتھیار جو وہ زندگی میں استعمال کرتے تھے پائے گئے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت کا نیم وحشی انسان بھی دُنیا کے بعد ایک دوسرے عالم پر یقین رکھتا تھا۔

۲۔ دنیا میں بعض اعمال کی جزا مل جاتی ہے۔ مگر بعض کی نہیں۔ بلکہ بہت سے اعمال کا بدلہ دُنیا میں ملتا ہی نہیں۔ آخر وہ بھی ایک دن ملنا چاہیئے۔ کیونکہ دُنیا کا تمام کام اور تمام نظام عوض معاوضہ کے اصول پر چل رہا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا
مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ (النحل ۶۲)

یعنی اگر سب بدلے دُنیا میں ہی فوراً اسی وقت ملنے لگتے۔ تو سارے انسان گناہ کرتے ہی فنا ہو جاتے۔ اس لئے خدا تعالیٰ ان کو یہاں ڈھیل دیتا ہے تاکہ نیکیاں بھی کرلیں اور توبہ بھی کرلیں اور آخر اگلے جہان میں سب حساب کتاب ان کا پورا کیا جائے گا اسی طرح یہ آیت ہے۔

اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۚ (یونس ۵)

یعنی اللہ تعالیٰ پہلے خلق کرتا ہے۔ پھر دوبارہ زندہ کرے گا تاکہ مومنوں اور نیکو کاروں کو انصاف کے ساتھ اجر دے۔ کیونکہ دُنیا میں ان کا اجر پورا نہیں ملتا۔

۳۔ انبیاء مبشر اور نذیر ہو کر آتے ہیں۔ اور ان کا زمانہ بھی قیامت کا نمونہ ہوتا ہے اس نمونہ کا اصل بعد موت کے ظاہر ہوگا۔ جیسا کہ وہ بتا جاتے ہیں۔

۴۔ تمام صدیق اور راستباز متفق ہیں قیامت پر

۵۔ عقلی امکان یہ ہے۔ کہ جس نے ایک دفعہ پیدا کیا وہ دوبارہ بھی کر سکتا ہے اور اس میں کیا مشکل ہے

بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ وَذٰلِكَ
عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (التغابن ۸)

(ترجمہ) تو کہہ دے جس طرح تم خیال کرتے ہو ایسا نہیں ہوگا۔ بلکہ مجھ کو اپنے رب کی قسم تم کو زندہ کر کے اٹھایا جائے گا، پھر تم کو تمہارے اعمال سے واقف کیا جائے گا۔ اور یہ بات اللہ پر آسان ہے۔

۶۔ مشاہدہ۔ دُنیا میں ہر چیز فنا ہو جاتی ہے۔ مگر اس کا بیج رہ جاتا ہے۔ وہ پھر پیدا ہوتا ہے۔ یہ نمونہ ہے حشر کا۔

۷۔ انسان کا نفس ہمیشہ بُرا کام کر کے شرمندگی اور خوف محسوس کرتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے لئے آئندہ حساب کتاب ہے۔

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (القیمۃ ۲-۳)

(ترجمہ) میں قیامت کے وقت کی قسم کھاتا ہوں (یعنی اسے شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں) اور میں نفس لوامہ کو بھی شہادت کے طور پیش کرتا ہوں

۸۔ انسان کی بناوٹ اس کی عقل۔ اس کا علم، اس کی لامحدود ترقیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس اہلیت کی مخلوق دُنیا میں جو کام کر رہی ہے۔ وہ بھی کچھ عظیم الشان نہیں ہے۔ اس کی فطرت اس قابل ہے۔ کہ اسے ابدی زندگی ملے۔ اور ابدی اور ہمیشہ ترقی کرنے والا کام۔ پس اس کے قویٰ اور اس کی قابلیتیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اتنی سی

زندگی اس کے لئے کافی نہیں۔ اور اگر یہ فنا ہوگیا۔ تو بس عبث ہی حیوانات کی طرح مرگیا۔ آئندہ لا محدود زندگی اس کے لئے ہونی چاہیئے۔ ورنہ اس کی پیدائش ہی بے فائدہ ہوگی۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (المؤمنون ۱۱۵)

(ترجمہ) کیا تم یہ سمجھے تھے کہ ہم نے تم کو بغیر کسی مقصد کے پیدا کیا ہے؟ اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے۔

۹۔ انبیاء کے مخالفوں کے انجام جو پیشگوئیوں کے ماتحت ہوئے اور قیامت کا نمونہ تھے۔ گواہ ہیں۔ آئندہ قیامت کبریٰ کے وجود پر۔

۱۹۲۔ عجیب خواہش

مُلکِ سبا ایک زمانہ میں بڑا بارونق ملک تھا۔ پھر ایک طغیانی وہاں ایسی آئی کہ برباد ہوگیا۔ اس طغیانی کا نام قرآن میں اور تاریخوں میں سیل العرم مشہور ہے۔ پھر ایک مدت کے بعد اس اجاڑ ملک کی قسمت پلٹی۔ اور گاؤں اور قصبے اتنے پاس پاس آباد ہوگئے کہ آمنے سامنے دکھائی دیتے تھے۔ اور تجارت کا بازار ایسا گرم ہوا کہ دن رات قافلے چلنے لگے۔ اس وقت وہ لوگ دُعائیں مانگا کرتے تھے کہ خداوندا زندگی بے لطف ہوگئی۔ یہ گاؤں دُور دُور ہوتے تو اچھا تھا۔ مطلب یہ کہ اب بستیاں پاس پاس ہونے کی وجہ سے ڈاکہ زنی مشکل ہے۔ ایسے ایسے قافلے اور امیر امیر مسافر یونہی ہاتھ سے نکلے جاتے ہیں۔ صرف اس وجہ سے کہ ہر طرف آبادی ہی آبادی ہے۔ حیرانی ہے خبیث انسان دُعا بھی کرتا ہے تو گناہ اور بدکاری میں کامیاب ہونے کی۔

فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (سبا ۱۹)

(ترجمہ اور مگر بجائے شکریہ ادا کرنے کے) انہوں نے (یہ) کہا کہ اے ہمارے رب!

ہمارے سفروں کو لمبا کر دے (تاکہ سیر و سفر کا مزہ آئے) اور انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا پس ہم نے ان کا نام مٹا دیا اور ان کو قدیم زمانہ کے افسانے بنا دیا۔

۱۹۳۔ پانچ غیب

سورہ لقمان کی آخری آیت میں پانچ غیب کی باتوں کا ذکر ہے۔

إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (لقمان، ۳۵)

یعنی اللہ کو ہی قیامت کا علم ہے اور یہ کہ بارش کب ہوگی۔ رحم مادر میں کیا ہے۔ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ اور یہ کہ کون کہاں مرے گا۔ یہ پانچ باتیں کوئی نہیں جانتا۔ نہ بتا سکتا ہے سوائے علیم و خبیر اللہ کے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں ایک شخص نے خدا کی طرف سے آنے کا دعویٰ کیا۔ اور ہمیں بتایا کہ ایک قیامت کا زلزلہ اور ایک قیامت خیز جنگ آنے والی ہے۔ وہ ہم نے دیکھ لئے۔ پھر ایک دن اس نے کہا کہ آج بارش ہوگی اور ہم نے دیکھا کہ اس دن بارش ہوگئی۔ حالانکہ پہلے ایک ٹکڑا بادل کا آسمان پر نہ تھا۔ پھر اس نے کہا کہ میرے ہاں ایک لڑکا ان ان شمائل و صفات کا پیدا ہوگا۔ ہم نے دیکھا کہ ایسا ہی ہوگیا۔ پھر اس نے کہا کہ چھ سال میں فلاں شخص اس اس طرح مارا جائے گا۔ اور فلاں شخص ابتر رہے گا۔ اور فلاں ملک میں یہ تغیر برپا ہوگا۔ اور دنیا میں آئندہ یہ یہ باتیں ہوں گی۔ وہ باتیں ہم نے دیکھ لیں۔ پھر اس نے کہا میری عمر اڑھائی سال باقی رہ گئی۔ میری وفات لاہور میں ہوگی۔ جنازہ قادیان لایا جائے گا اور ایک قبرستان

میں دفن ہوگا۔ وہاں کی زمین چاندی کی ہوگی۔ جس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ وہ اتنی قیمتی ہو گی۔ کہ لوگ چاندی کے مول اسے حاصل کریں گے۔ اور ایک ایک قبر کے لئے سینکڑوں اور ہزاروں روپیہ تک دینے پڑیں گے۔ تاکہ اس روپیہ سے دین کی اشاعت ہو۔ یہ بات بھی پوری ہوگئی۔ اب بتاؤ۔ ان پانچ غیب کی باتیں بتلانے کے بعد ہم کس طرح اس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے نہ مانیں۔ اور کیونکر اس کا انکار کریں۔ (الفضل ۸ جنوری ۱۹۲۸ء)

۱۹۴۔ تقوےٰ

ایمان اور تقویٰ کبھی انسان کو خسارہ میں نہیں رکھتا۔ نہ دُنیا میں نہ دین میں۔

وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْقُرٰٓی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (الاعراف، ۹۷)

(ترجمہ) اور اگر اُن بستیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور تقویٰ کرتے تو ہم آسمانوں سے اور زمین سے اُن کے لئے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

جھوٹا ہے وہ۔ جو کہتا ہے کہ تقویٰ دُنیا کے کاروبار میں نہیں چلتا۔ اصل بات یہ ہے کہ ایسا انسان جس بات کو تقویٰ سمجھتا ہے۔ وہ صرف ظاہرداری ہے۔ خدا کا حقیقی خوف نہیں ہے۔ جو مومن کے دل پر مستولی ہوجاتا ہے۔

۱۹۵۔ دو خدا

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰـهَيْنِ اثْنَيْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (النحل، ۵۲)

اللہ کا یہ حکم ہے کہ دُو خدا نہ بناؤ۔ وہ اکیلا معبود ہے اور اسی سے ڈرو۔ دو خدا اس طرح جیسے اہرمن اور یزدان۔ یا ایک کہنے کا خدا دوسرا عملی اور اصل خدا۔ مثلاً

برادری سرکار، جورو، اولاد، دولت، عزت، ہوائے نفس۔ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہ نسبت تین یا زیادہ معبودوں کے آج کل دُنیا میں دو خداؤں کے پرستار زیادہ ہیں۔

۱۹۶۔ قرآن کے ٹکڑے

اصل میں قرآن ایک ایسی مستقل مکمل کتاب یعنی One whole چیز ہے جس کا کوئی حصہ بھی الگ کر دیں۔ یا کوئی آیت بھی نکال دیں۔ تو کہیں نہ کہیں۔ اور کہیں نہ کہیں ضرور نقص پیدا ہو جائے گا۔ خواہ اعمال میں۔ خواہ ایمان میں، خواہ عقائد میں، خواہ دلائل میں

كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ

(الحجر ۹۱،۹۰)

(ترجمہ) اس لیے (خدا کہتا ہے کہ ہم نے ان لوگوں) کے لیے (بھی) عذاب مقرر کر چھوڑا ہے جنہوں نے (حضرت کے خلاف منصوبوں میں اپنی) ڈیوٹیاں تقسیم کی ہوئی تھیں (یعنی) وہ لوگ جنہوں نے قرآن کو جھوٹی باتوں کا مجموعہ قرار دیا تھا۔

۱۹۷۔ سورہ انفال اور توبہ

یہ دو سورتیں نہیں ہیں۔ ایک ہی ہے۔ اسی لئے سورۂ توبہ پر بسم اللہ نہیں آئی اور ان کے مضمون بھی یہی ثابت کرتے ہیں۔ شروع میں جنگ بدر کا ذکر ہے جو پہلی اسلامی جنگ تھی۔ آخر میں تبوک کی جنگ کا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری جنگ تھی۔ درمیان میں لڑائی سے جی چرانے والوں۔ اور احکام بعد الفتح کا ذکر ہے۔ گویا کل اسلامی جہادوں۔ اور ان کے متعلقات کو اول سے آخر تک احاطہ کر لیا ہے۔

۱۹۸ ۔ نبی کی پہلی زندگی

لَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ کے مشہور معنے یہ ہیں کہ میری ساری عمر تم میں گزری ہے۔ بھلا میں نے کبھی پہلے جھوٹ بولا ہے۔ اگر نہیں۔ تو کیا اب بڑھاپے میں آکر ہی میں جھوٹ بولنے لگ گیا۔ یہ بھلا کوئی عقل میں آنے والی بات ہے۔

اس آیت کے ایک اور معنی بھی ہیں۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس ۱۰، ۱۷)

(ترجمہ، ۱۰ (اور) تو (انہیں) کہہ کہ اگر اللہ کی (یہی) مشیت ہوتی (کہ اس کی جگہ کوئی اور تعلیم دی جائے) تو میں اُسے تمہارے سامنے پڑھ کر نہ سناتا اور نہ وہ (یہی) تمہیں اس تعلیم سے آگاہ کرتا۔ چنانچہ اس سے پہلے میں ایک عرصہ دراز تم میں گزار چکا ہوں کیا پھر (بھی) تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

یعنی چالیس سال میری زندگی کے تم میں گزرے ہیں۔ کیا کبھی تم نے دیکھا۔ کہ میں نے وحی والہام اور نبوت ورسالت کی کوئی بات یا علامت کبھی تمہارے سامنے ظاہر کی ہے اگر نہیں تو یہ عظیم الشان تغیر پھر میرا اپنا گھڑا ہوا۔ اور میری طبیعت کی افتاد اور دماغی بناوٹ کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ باہر سے آیا ہے۔ ورنہ میں اس زمانہ سے پہلے بھی ہمیشہ خوابوں الہاموں کا تذکرہ۔ یا مذہبی چرچا تمہارے ساتھ کیا کرتا۔

۱۹۹ ۔ زمین وآسمان کی ترتیب

لوگ یہ ترتیب کہ پہلے زمین پیدا ہوئی۔ یا آسمان۔ پھر تکمیل کے مدارج کس کس طرح طے ہوئے۔ بعض آیات سے نکالتے ہیں۔ ان میں ایک آیت یہ بھی ہے کہ والارض بعد

ذالك دخوھا۔ اس بعد ذالک" کے الفاظ سے وہ ترتیب زمانی نکال کر علمی غلطیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ حالانکہ اس آیت میں اگر" بعد ذالك" کے معنے علاوہ ازیں کئے جائیں۔ تو وہ اُن ٹھوکروں میں نہ پڑیں۔ جو اس فقرہ کے عام معنوں سے لگتی ہیں۔ کیونکہ جو ترتیب وہ بیان کرتے ہیں۔ وہ موجودہ زمانہ کی تحقیقات اور عقل کے بھی خلاف ہے۔ پس ترتیب زمانی کو حوالہ بحذا کر کے اس کے ایسے عمدہ معنے ہو سکتے ہیں جو نقلی طور پر بھی صحیح ہیں اور اعتراضات بھی اُٹھ جاتے ہیں۔

۲۰۰۔ لوہے کا نرم ہونا

حضرت داؤد علیہ السلام چونکہ ایسے پہاڑی علاقوں پر بھی قابض تھے۔ جہاں لوہے کی کانیں تھیں۔ اس لئے انہوں نے لوہے کے کارخانے اپنی مملکت میں جاری کرا دیئے تھے۔ اور چونکہ وہ سپہ سالار اور بڑے جنگی آدمی تھے۔ اس لئے ان کارخانوں میں سپاہیوں کے لئے زرہیں تیار ہوتی تھیں۔ زرہیں غالباً انہی کی ایجاد تھیں۔ یہ لوہے کا نرم لباس ہوتا ہے۔ جو لوہے کے چھلّوں سے بنایا جاتا ہے۔ اس کی خاطر کاریگر پہلے لوہے کا تار بناتے تھے۔ پھر اس تار کے ٹکڑے کر کے ان کے چھلے بناتے تھے۔ پھر چھلے میں چھلا پھنسا کر زرہ بنایا کرتے تھے۔ يَاجِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ وَالطَّيْرَ ۔ ۶ وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ (سبا، یعنی پہاڑی لوگ اور اہل علم لوگ حضرت داؤد علیہ السلام کے مطیع ہو گئے۔ اور دونوں مل کر لوہے کے نرم کرنے اور چھلے بنا کر زرہیں بنانے میں ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ اور یہ خدا کا فضل تھا۔ مگر خدا بھلا کرے جو یہ لپسندوں کا جنہوں نے یہ قصہ گھڑا کہ داؤد علیہ السلام جب لوہے کو ہاتھ میں لیتے تھے تو وہ موم بن جاتا تھا۔ اس سے وہ زرہیں بنا لیتے پھر تھانگ کر سخت ہو جاتا تھا۔

۲۰۱۔ محذوف فقرات

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ
أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ (الرعد ۳۲)

ترجمہ: اگر کوئی کلام الٰہی ایسا ہے کہ جس کے زور سے پہاڑ چلائے جاتے اور زمین ٹکڑے ٹکڑے کی جاتی۔ یا جس کے اثر سے مردے بول اٹھتے تو وہ یہی قرآن ہے کیونکہ اس قرآن کو ہاتھ میں لے کر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے واقعی ایسا ہی کرکے دکھا دیا۔ یہ بریکٹ کا فقرہ محذوف ہے۔ عربی میں اس کے ملانے سے آیت کے معنے پورے ہوتے ہیں ورنہ نہیں۔ ایسا حذف قرآن میں کئی جگہ آیا ہے۔ مثلاً

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا
لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ (الزمر ۳)

وہ لوگ جنہوں نے خدا کے سوا معبود بنا رکھے ہیں (ان کا یہ قول ہے کہ) ہم ان کی عبادت فقط تقرب الٰہی کے لئے کرتے ہیں۔ یہاں خط کشیدہ عبارت "یعنی ان کا یہ قول ہے کہ" محذوف ہے۔ اسی طرح آیت

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّقُوا مَا بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ○ وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ
رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ (یٰس ۴۵، ۴۶)

یعنی جب ان لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ تم آگے اور پیچھے آنے والے عذاب سے ڈرو۔ تاکہ تم پر رحم کیا جائے تو وہ اعراض کرتے ہیں" یہ سارا مفہوم یہاں محذوف ہے اسی طرح

وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ

جَمِیْعًا۔ (البقرہ ۱۶۶)

(ترجمہ) ، اور جو لوگ (اس) ظلم کے مرتکب ہوئے (ہیں) اگر (اس گھڑی کو) جب وہ عذاب کو (سامنے) دیکھیں گے (کسی طرح اب) دیکھ لیتے (تو جان لیتے) کہ سب قوت اللہ ہی کی ہے۔

یہاں پہلی آیت پڑھ کر یہ فقرہ حذف معلوم ہوتا ہے۔ "تو وہ کسی کو اللہ کے برابر نہ ٹھہراتے۔" (الفضل ۹ مئی ۱۹۳۸ء)

۲۰۲ ۔ اجرامِ فلکی

اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی۔ (الرعد ۳۰)

اللہ تعالیٰ نے اجرامِ سماوی کو بغیر سہارے کے فضا میں بلند کیا۔ پھر تختِ حکومت پر بیٹھ گیا۔ اور سورج چاند کو کام پر لگا دیا۔ ہر ایک ان میں مقررہ وقت کے مطابق چلتا ہے۔ یہاں سَمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ کا مطلب ہے کہ یہ اجرامِ فلکی جو فضا میں تیر رہے ہیں یہ سب گول اور بے سہارے ہیں۔ آسمان میں جڑے ہوئے نہیں ہیں۔ اور اجلِ مسمّٰی کا مطلب یہ ہے کہ اجرامِ فلکی میں سے ہر ایک کی اپنی گردش کا وقت بھی مقرر ہے جیسے زمین کا ¼ ۳۶۵ دن اور چاند کا ½ ۲۹ دن۔ بلکہ حساب دانوں نے تو یہ اوقاتِ گردش گھنٹوں منٹوں اور سیکنڈوں کی کسروں تک نکالے ہیں۔

۲۰۳۔ ہُود نے مجھے بڈھا کر دیا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے۔ کہ شیبتنی ھود۔ یعنی سورۂ ہود نے مجھے بڈھا کر دیا۔ یعنی اس سے اتنا رنج اور فکر ہوا کہ اس نے میری صحت اور جوانی پر اثر کیا۔ واقعی فکر و غم ایسا ہی کر دیتے ہیں۔ ایک رات کے سخت غم میں بعض لوگوں کی داڑھی سفید ہو جانی ثابت ہے۔ اور عذاب یا قیامت کے اثر سے بچوں کا بڈھا ہو جانا خود قرآنِ مجید میں مذکور ہے۔

یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا (المزمل ۱۸)

(ترجمہ)۔ دن جو جوانوں کو بڈھا بنا دیتا ہے تو تم کس طرح (عذاب) سے محفوظ رہو گے

لیکن ہود میں کیا خصوصیت ہے جس کا اثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا محسوس کیا۔ بعض بزرگ فرماتے ہیں کہ آیت

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ (ہود ۱۱۳)

نے آپ کو بڈھا کر دیا میرا اس کی نسبت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی روایت ہوئی کہ مجھے فلاں آیت نے بڈھا کر دیا۔ پوری سورت کے نام لینے کی کیا ضرورت تھی۔ دوسرے یہ کہ

وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ (الشوریٰ ۱۵)

ترجمہ:۔ اور تو اس طرح (دین پر) استقلال سے قائم رہ جس طرح تجھے کہا گیا ہے۔

کا فقرہ سورہ شوریٰ میں بھی موجود ہے۔ میرے نزدیک زیادہ واضح توجیہہ یہ ہے کہ سارۂ سورت نے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غم میں ڈالا۔ اور خصوصیت اس سورت کی یہ ہے کہ اس میں تمام امم سابقہ کے عذابوں کا ذکر جمع کر دیا گیا ہے۔ مزید براں ایک پیغمبر

یعنی نوحؑ کے بیٹے اور دوسرے پیغمبر یعنی لوطؑ کی بیوی کے عذاب کا بھی ذکر اس میں ہے اور یہ باتیں اس امت کے ساتھ بھی پیش آنے والی تھیں۔ پھر زیادہ باعثِ رنج یہ بات ہے کہ پہلی ہر قوم میں کوئی خاص خاص برائی نمایاں تھی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح یہ امت خیر الامم ہے۔ اسی طرح اس امت میں سب برائیاں بھی اگلی امتوں اور اگلے لوگوں کی جمع ہو جائیں گی۔ غرض قرآن مجید میں اس سورۃ سے زیادہ امم سابقہ پر عذاب کا ذکر کسی اور سورۃ میں نہیں ہے۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سب سے زیادہ اس نے غم پہنچایا۔

۲۰۴ - اسلام بدی کی جڑ کو اکھیڑتا ہے

دوسرے مذاہب میں بدیوں اور گناہوں کی سزائیں تو ہیں۔ مگر بدی کے سرچشمہ کو بند کرنے کا کوئی سامان نہیں ہے۔ جس سے گناہ سے بچاؤ ہے۔ قرآن مجید نے علاوہ اس کے کہ تقویٰ پر خاص زور دیا ہے بعض احکام ایسے دیئے ہیں۔ جن سے بدی پیدا ہونے سے رک جاتی ہے۔ مثلاً غضِ بصر

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (النور ۳۱)

(ترجمہ) تو مومنوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھا کریں۔

اس سے وہ شہوانی بدیوں میں پڑنے کا ہی نہیں۔ اسی طرح پردہ۔ جب عورتیں پردہ میں رہیں گی تو ایسے فساد کا خود بخود سد باب ہو جائے گا۔

قرض اور معاملات میں کتابت۔ اس کی وجہ سے لوگ بدعہدی اور بے ایمانی کے گناہ سے بچے رہیں گے۔ (تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا) (البقرہ ۲۸۳)

ترجمہ: خواہ چھوٹا (یعنی دین) ہو یا بڑا ہو تم اسے اس کی میعاد سمیت لکھنے میں سستی نہ کیا کرو

سُود کی ممانعت :۔ اس کی وجہ سے مخلوق کی بدخواہی اور حرص اور مال لوٹ مار اور بہت سے مقدمات سے امن رہے گا (وحرم الربوا)

تعدد ازدواج ۔ اس سے اکثر حصہ امراء اور جوان لوگوں کا زناکاری سے بچ جائے گا۔ نیز دُنیا کی محبت ان پر سرد ہو جائے گی۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (النساء/۱)

ترجمہ :۔ یعنی جو (صرف) تمہیں پسند ہو (کرو غیر یتیم) عورتوں میں سے دو دو (سے) اور تین تین (سے) اور چار چار سے نکاح کرو۔

سوال کا منع ہونا ۔ اس سے قناعت پیدا ہوگی ۔ اور چوری ۔ رشوت ۔ حرام خوری کا راستہ بند ہوگا ۔ (لا یسئلون الناس الحافا) لوگوں کے اموال اور زمینوں اور حیثیتوں کو بنظر غائر دیکھنے کی ممانعت ۔ اس سے حسد دُنیا طلبی اور لالچ کا سدباب ہوتا ہے۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (الحجر/۸۹)

ترجمہ :۔ اور جو ہم نے اُن میں سے کئی گروہوں کو (عارضی نفع) کا سامان دیا ہے ۔ اس کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہ دیکھو۔

اور ہزاروں ناجائز حیلوں اور فسادات سے انسان بچ جائے گا ۔ اسی طرح اور ہدایات ہیں ۔ مثلاً روزہ ، زکوٰۃ ۔ نماز وغیرہ اعمال فحشا ۔ منکر اور اکل بالباطل کی جڑ کاٹتے ہیں ۔ یہاں تیجہ دُنیا سے بے رغبتی کرنے کا ہے کہ اس کا ترک خدا کی طرف سے توجہی کو دُور کر دیتا ہے ۔

غرض اسلام کے بعض احکام نے گناہوں کی جڑ پر کلہاڑا مارا ہے اور وہ صرف بدی کو نہیں ۔ بلکہ بدی کی جڑ کو کاٹتا ہے ۔ نیز یہ آیت بھی پڑھو ۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ

كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ (حم سجدہ : ۳۵)

یعنی کسی کی بدی کا جواب بدی سے نہیں بلکہ احسان سے دیا کرو۔ اس سے نہ صرف عداوت دُور ہوگی۔ بلکہ تیرا وہ دشمن دوست بن جائے گا اس طرح عداوت کی جڑ ہی کٹ جائے گی۔

۲۰۵ ۔ وضو کا حکم

سورۂ مائدہ میں وضو کا حکم ان الفاظ میں ہے۔ منہ دھونا، کہنیوں تک ہاتھ دھونے۔ سر کا مسح کرنا۔ ٹخنوں تک پیروں کو دھونا۔

مُنہ دھونے میں کُلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا۔ اور داڑھی کا خلال اس لئے شامل ہیں کہ یہ چیزیں منہ میں ہی داخل ہیں۔ اور سر کے مسح کے ساتھ جو کانوں کا اور گردن کا مسح کیا جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ کان اور گردن کا پچھلا حصہ سر میں ہی داخل ہیں۔ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس موقعہ پر اختصار بیان میں یہ کمال کیا ہے۔ کہ نماز کا ذکر وضو کا حکم۔ وضو کے سب ارکان، جنبی کے لئے غُسل کا حکم اور اس کی دیگر شرائط تیمم اور اس کے کرنے کی ترکیب۔ اور ان سب اعمال کے فوائد یہ ساری کی ساری باتیں صرف ایک آیت کے اندر بیان کر دی گئی ہیں۔ یہ آیت نمونہ ہے اختصار بیان کا۔

۲۰۶ ۔ مُنہ کے بل چلنا

اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ
سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (الملک ۲۲)

ترجمہ ۔ کیا وہ شخص جو اپنے مُنہ کے بل اوندھا چلتا ہے ہدایت میں اس کے برابر ہو سکتا ہے جو سیدھا چلتا ہے؟ اور ہے بھی سیدھے راستے پر

یہاں مُنہ کے بل چلنے سے مراد جانوروں کی طرح چلنا ہے۔ یعنی منہ نیچے کرکے اس طرح کہ توجہ زمین کی طرف رہے۔ یہ مراد نہیں ہے کہ بجائے لاتوں کے منہ سے چلتا ہے۔ یہ معنے مضحکہ خیز ہیں۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ ایسا شخص حیوان ہے اور اس کی نظر دُور نہیں جاسکتی۔ (الفضل ۱۳ مئی ۳۸ء ۱۹)

۲۰۷ - قرآنِ مجید انسائیکلوپیڈیا ہے

قرآن مجید کے کمالات میں سے ایک کمال یہ ہے کہ وہ روحانیت میں ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اگر آپ مذہب کے کسی شعبہ کے متعلق کوئی مضمون باترتیب مثلِ اعلیٰ درجہ کا معلوم کرنا یا لکھنا چاہتے ہوں تو کلام اللہ میں اس کے سب حوالے دیکھ لیں۔ اور ان کو ایک جگہ جمع کریں۔ بس وہ اتنا مسالہ ہوگا۔ کہ خواہ آپ کتنا سوچتے رہیں۔ اتنا مسالہ اپنی عقل سے خود نہ نکال سکیں گے۔ اس میں دعوٰی بھی ہوگا۔ دلائل بھی ہوں گے۔ فوائد بھی ہوں گے۔ نتائج بھی ہوں گے۔ غرض آپ کی آنکھیں کُھل جائیں گی۔ گویا ایک خزانہ دستیاب ہوگیا ہے۔ بلکہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حوالے جمع کرنے کے لئے بھی نہ صرف نجوم القرآن اور لغت وغیرہ کی حاجت ہے مگر کثرتِ تلاوت ذاتی مناسبت اور تدبّر کی بھی ضرورت ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (بنی اسرائیل ۹۰)

ترجمہ: اور ہم نے اس قرآن میں یقیناً ہر ایک ضروری بات کو مختلف پیرایوں سے بیان کیا ہے۔

۲۰۸ - مجنُون نہ ہونے کی ایک دلیل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جو اعتراض مجنون ہونے کا کیا گیا تھا۔ اُس کی تردید قرآنِ حکیم نے مختلف طریق سے کی ہے۔ ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ تو مجنون نہیں

ہوسکتا کیونکہ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ (القلم ۴) تیرا اجر غیر منقطع ہے چنانچہ تیرہ سو سال سے لوگ آپ پر درود پڑھ رہے ہیں۔ اور آپ کی اتباع کر رہے ہیں۔ مجنون ایک دن دو دن لوگوں کو دھوکہ میں رکھ سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ بے انتہا زمانہ تک اس کا دھوکا چلتا رہے۔

۲۰۹ ۔ وہ عورت جس نے اپنی عزّت کو محفوظ رکھا

دنیا میں ہر زمانہ میں بے تعداد عورتیں ہوئیں۔ جو پاک دامن تھیں۔ اور اب بھی ہیں ایسی عورتیں نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ غیرمسلموں میں سے بھی ہوئیں۔ اور ہیں۔ عورت فطرتاً عفت پسند، بدنامی سے بچنے والی اور پاکدامن ہوتی ہے اور غیرمسلم لوگوں میں بھی ایسی عورتوں کی کمی نہیں۔ اس لئے

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (التحریم ۱۳)

ترجمہ۔ اور پھر اللہ مومنوں کی حالت مریم کی طرح بیان کرتا ہے، جو عمران کی بیٹی تھی۔ جس نے اپنے ناموس کی حفاظت کی اور ہم نے اس میں اپنا کلام ڈال دیا تھا۔

کی آیت کا کیا مطلب ہوا۔ کہ عمران کی بیٹی مریم نے پاکدامنی اختیار کی۔ تو ہم نے اسے یہ انعام دیا۔ کہ مسیح جیسی مقدس روح اُسے عطا فرمائی۔ اگر پاکدامنی کا ایک عظیم الشان اجر ہے تو کروڑوں خدا کی بندیاں ہیں جنہوں نے بدکاری نہیں کی۔ بلکہ بہت ساریوں نے ساری عمر بیوگی یا تجرّد میں ہی گزار دی اور پاکدامن رہیں۔ ان کو یہ انعام کیوں نہیں ملا؟ سو حقیقت اس پاکدامنی کی یہ ہے کہ دُنیا میں ملکوں اور قوموں اور حکومتوں کے نظام کے لحاظ سے عورتیں عموماً کسی نہ کسی حفاظت کے ماتحت ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کی پاکدامنی بہت

حد تک اس حفاظت کی وجہ سے ہے جو والدین، رشتہ دار، برادری اور رسم ورواج عائد کرتے ہیں۔ انسانی اخلاق بھی اس کا محافظ ہے۔ اور بالآخر تقوےٰ یا خدا کا خوف۔ ان میں سے آخری بات یعنی باوجود تمام مواقع اور آزادیوں کے موجود ہونے کے جو عورت محض خدا کے خوف سے اپنی پاکدامنی کو قائم رکھے۔ خدا کے ہاں اس کو عظیم الشان اجر ملتا ہے۔ دوسروں کی عفت رواجی ہے۔ اس عورت کی عفت علیٰ وجہ البصیرت اور ایمان اور تقویٰ کی وجہ سے ہے۔

رواجی عفیفہ کی بابت ہمیں کیا معلوم کہ اگر حالات بدل جاتے۔ تو اس کی عفت کا کیا حال ہوتا۔ اس کی عفت کا ثواب گورنمنٹ اور سوسائٹی کو ملنا چاہیئے۔ مگر وہ عورت ایک دُرِّ بے بہا ہے۔ جو اللہ کے خوف اور محض اُس کے تقویٰ کی وجہ سے اپنی پاکدامنی کو قائم رکھے اور پھر ان میں سے وہ عورت تو دُرِّ شاہوار ہے جو باوجود مخالف حالات اور ہر طرف سے بدکاروں کی یورش اور باوجود ہیکل میں مَردوں کے درمیان اکیلے رہنے۔ اور ان کے ماتحت زندگی بسر کرنے کے اور باوجود نہایت حسین وجمیل ہونے کے پھر بھی اکیلی شیطان کے لشکر سے جنگ کرتی رہے اور اپنی عصمت کو برقرار رکھے سو مریم صدیقہ چونکہ ایسی ہی تھی۔ اس لئے اس کو بسبب خاص امتیاز کے یہ اجر ملا۔ دوسری عورتوں کی عصمت کی حفاظت اور لوگ کرتے ہیں مگر مریم نے اپنی عصمت کو خود بچایا۔ ذرا تصوّر تو کرو ان حالات کا۔ کہ ایک نوجوان بھولی بھالی لڑکی بیت المقدس میں بطور نذر چڑھائی گئی ہو وہ وہیں ان خداوندانِ نعمت کے ماتحت پلی ہو۔ چاروں طرف ان فقیہی فریسیوں کے حجرے اور خلوت خانے ہوں۔ جو اسی کی قوم کے معزز ترین لوگ ہوں۔ وہی اس جگہ کے مالک اور ابناء اللہ کہلاتے ہوں۔ اور کر ان کی بدکاریوں کی وجہ سے خدا اس سلسلہ کو ہی تباہ کرنے پر تُلا ہوا ہو۔ اور مقدسوں کی یہ حالت ہو۔ کہ جب ایک زانیہ کو سنگسار کرنے کے وقت ان سے کہا جائے کہ جس نے خود یہ فعل نہ کیا ہو وہی

اس سنگساری میں حصہ لے۔ تو یہ سُن کر خاموشی کے ساتھ وہ سارے کا سارا گروہ وہاں سے چل دیتا ہو۔ گویا وہ سب از خود بدکار ہوں۔ کیا ایسے لوگوں کی بابت کبھی یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ ایک جوان خوبصورت بے یار و مددگار لڑکی کو اکیلی اپنی ہیکل میں کمزور اور گوشہ گزین دیکھ کر انہوں نے اس پر کیا کیا ڈورے نہ ڈالے ہوں گے۔ اور کیسا کیسا اُسے تنگ نہ کیا ہوگا۔ اشاروں کنایوں عشقیہ اشعار۔ وعدوں۔ وعیدوں پیغاموں بلکہ بعض دفعہ اپنی چیرہ دستیوں اور رستے روک کر کھڑے ہو جانے سے اس معصوم صدیقہ کی زندگی نہ تلخ کر دی ہوگی۔ کوئی کہتا ہوگا کہ تو ہیکل کی نذر ہے اور ہم ہیکل کے مالک ہیں۔ کوئی کسی بہانہ سے بات کرتا ہوگا۔ کوئی کسی بہانہ سے۔ غرض میں تو لرز جاتا ہوں۔ کہ اس پاکباز عفیفہ نے اپنی جوانی کے دن اس آگ میں کیونکر گزارے ہوں گے یہاں تک کہ آخر اس کو یہ زندگی ان بھیڑیوں کے درمیان موت سے بدتر معلوم ہونے لگی اور تنگ آکر باوجود نذرِ ہیکل ہونے کے وہ ان لوگوں سے بھاگی اور مَكَانًا شَرْقِيًا میں پناہ لی۔ اور ان سے چھپ کر پردے میں بیٹھ گئی۔

فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا (مریم ۱۸)

ترجمہ: اور اس نے اور ان (یعنی رشتہ داروں) کے درمیان پردہ ڈال دیا۔

اس وقت رحمتِ خداوندی جوش میں آئی۔ اور اس سخت ترین ابتلاء میں کامیاب پر پھر اللہ تعالیٰ نے اسے حقیقی پاکدامنی کا سرٹیفکیٹ دیا۔ اپنا فرشتہ اس پر نازل کیا اور اپنی طرف سے اُسے ایک نور بخشا۔ جس کا نام مسیح تھا۔ یہی حالات تو تھے جن کا علم ہونے پر مسیح جیسا حلیم شخص بھی ایسے درندوں کے خلاف اتنا جوش میں تھا۔ کہ ان کو اسے حرام کارو، اے بدکارو، اے سانپو اور سانپ کے بچو۔ اور لے طعنوں کے نام سے مخاطب کیا کرتا تھا۔ کہ ان بدذاتوں نے میری ماں کے ساتھ کیا کیا سلوک کیا۔ پس مریم کا انعام عام پاکدامنی کا انعام نہ تھا بلکہ اس لئے تھا کہ اس نے اپنے گوہرِ عصمت

کر باوجود ہر طرف کے خوفناک حملوں کے محفوظ رکھا اور محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے تقویٰ کے لئے اُسے بچایا نہ کہ رواج کی پابندی سے۔ اللہ تعالیٰ اس پر بڑے بڑے فضل کرے۔ اور ہماری عورتوں کو اس کی اتباع کی توفیق بخشے۔ آمین۔

٢١٠۔ تقول اور ہلاکت

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴿٤٠﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ
قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ ﴿٤١﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَا
تَذَكَّرُونَ ﴿٤٢﴾ تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٣﴾ وَلَوْ تَقَوَّلَ
عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ﴿٤٤﴾ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ﴿٤٥﴾
ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ﴿٤٦﴾ (الحاقہ، ۴۱ تا ۴۷)

ترجمہ: یہ قرآن ایک عزت والے رسول کا کلام ہے اور کسی شاعر کا کلام نہیں۔ مگر افسوس ہے کہ تم ایمان نہیں لاتے اور نہ یہ کسی ہاذی پنڈت کی باتیں ہیں مگر تم بالکل نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ یہ رب العالمین خدا کی طرف سے اُتارا گیا ہے اور اگر یہ شخص ہماری طرف جھوٹا الہام منسوب کر دیتا خواہ ایک ہی ہوتا تو ہم یقیناً اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے اور اس کی رگ گردن کاٹ دیتے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تقول زمین کی سزا کے لئے حسب ذیل شرائط ہیں۔
وہ شخص وحیٔ رسالت کا مدعی ہو۔ شعر یا ادبی و علمی دلچسپی کے طور پر۔ یا بغیر دعویٰ نبوت کے الہام پیش نہ کرتا ہو۔ مثلاً یہ کہ مجھے الہام تو ہوتا ہے مگر میں نبی نہیں ہوں۔ الہام تو شاعر اور کاہن کو بھی ہوتا ہے۔ مگر نفسانی اور شیطانی۔ سو یہ دعویٰ ضروری ہے کہ میں شاعر نہیں ہوں۔ نہ کاہن ہوں۔ بلکہ نبی ہوں اور یہ کلام نفلی طور پر الٰہی کلام ہے

اور خدا تعالیٰ نے مجھے یہ وحی کی ہے۔ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ فرشتہ نے مجھے کہا یا یہ ندائے سروش ہے۔ ایسے مبہم الفاظ نہ ہوں۔ بلکہ رَبُّ الْعَالَمِیْن کا اپنا کلام ہونے کا دعویٰ ہو۔ غرض رسالت کا مدعی ہو۔ شاعری کہانت سے انکار ہو۔ مجنون نہ ہو۔ خدا کے اپنے الفاظ پیش کرے۔ پھر اگر وہ الفاظ خود اس نے جان بوجھ کر جھوٹے بنائے ہوں۔ تو قطع وتین میں دیر نہیں لگتی۔ ہمارے زمانہ میں باب اپنے اشعار کو معجزہ کی تحدی کے ساتھ کلام الٰہی بتا کر پیش کیا کرتا تھا۔ وہ قتل ہوگیا۔ وحی نبوت کے غلط دعوے کے متعلق تو خدا کو اتنی غیرت ہے کہ مدعی تو الگ رہا۔ اس کے ایجنٹ کو بھی زندہ نہیں چھوڑتا۔ (الفضل ۱۵ رمئی ۱۹۴۸ء)

۲۱۱ - غیبِ حاضر اور غیبِ غائب

اللہ تعالیٰ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ (التوبہ:۹۴) یعنی غیب کو بھی جانتا ہے اور حاضر کو بھی۔ حاضر کو تو سب ہی جانتے ہیں پھر اس کا خاص طور پر ذکر کرنا چہ معنی دارد۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیب اور شہادت دونوں الفاظ غیب کی ہی دو قسمیں ہیں۔ جن میں سے ایک کا نام آپ غیبِ غائب رکھ سکتے ہیں یا غیبِ مستقبل۔ دوسرے یعنی الشہادۃ کا نام۔ غیبِ حاضر رکھنا مناسب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ غیبِ حاضر اور غیبِ مستقبل دونوں جانتا ہے۔ اور دوسری جگہ فرمایا لَا یَعْلَمُ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی اللہ کے سوا کوئی بھی غیبِ مستقبل کو نہیں جانتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان غیبِ حاضر کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ غیبِ حاضر وہ باتیں ہیں جن کا وجود دنیا میں موجود ہے گو انسان کی نظر سے اوجھل ہوں۔ پس انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی کی جیب گھڑی کا وقت بتا دے۔ یا یہ بتا دے کہ کوئی گم شدہ چیز کہاں پڑی ہے۔ یا دوسرے کے بعض خیالات کو بوجھ لے۔ یا بند خط میں سے مضمون کا کچھ پتہ لگا لے۔ یہ باتیں مسمریزم کا

ایک معمول یا سلف ہپنا ٹزم Self Hypnotism کرنے والا بتا سکتا ہے۔ اور اس عمل کو وہ روشن ضمیری کہتے ہیں۔ لیکن غیبِ مستقبل کو کوئی نہیں بتا سکتا۔ اور یہی انبیاء اور رسل کی خصوصیت ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے غیبِ حاضر کا نام ہی الشہادہ رکھ دیا ہے۔ تاکہ کوئی غیب دانی کا دعویٰ نہ کر سکے۔ اسے حقیقی غیب تسلیم ہی نہیں کیا۔ وہ تو صرف آنکھ اوجھل چیز ہے۔ اور بس۔ پس یاد رکھو کہ وہ غیب جس کی انبیاء تحدّی کرتے ہیں وہ غیبِ غائب یعنی مستقبل کا غائب ہوتا ہے۔ نہ کہ الشہادہ یعنی غیبِ حاضر۔

۲۱۲ - ازلی ابدی

یہ دونوں لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے بہت رائج ہیں۔ اور حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے الہامات میں بھی آتے ہیں۔ مگر قرآن میں ان کو اور الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے یعنی الاوّل اور الآخِر۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ کے معانی یہ بیان فرمائے ہیں کہ الاول اسے کہتے ہیں جس سے پہلے کوئی اور نہ ہو اور الآخر کے معنی یہ ہیں کہ اس کے بعد کوئی اور نہ ہو۔ یہی مطلب ازلی ابدی کا ہے۔

۲۱۳ - قدور راسیات

قدور راسیات یعنی ایک جگہ جمی ہوئی اور گاڑی ہوئی دیگیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنوائی تھیں تاکہ یک وقت بہت سا کھانا پک سکے۔ جو بعض لوگوں نے حضرت سلیمانؑ کے زمانہ کی ہر بات کو معجزہ بنا رکھا ہے اور ان کی بابت عجیب عجیب تصورات قائم کر رکھے ہیں۔ ہندوستان میں اس وقت بھی ان قدور راسیات کا نمونہ موجود ہے جو دیکھنا چاہے اجمیر میں جا کر دیکھ لے۔

۲۱۴ - شہوات کا علاج

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا (النور، ۳۳)

اگر نکاح میسر نہ ہو۔ تو اس کا علاج یہ ہے کہ استعفاف اختیار کرو۔ یہ ایسے لوگوں کو حکم ہے۔ جو مجبوراً نکاح نہ کرسکتے ہوں۔ مثلاً مفلس لوگ اور طالب علم۔ استعفاف کے معنی عفت اختیار کرنا اور اپنے تئیں روکے رکھنا۔ نکاح نہ ہونے کی حالت میں جو عفت ہے وہ علاوہ تقویٰ اور خوفِ الٰہی کے بعض ترکیبوں سے بھی حاصل ہوسکتی ہے مثلاً ایسی مجلسوں اور ایسی کتابوں اور رسالوں سے بچنا۔ جہاں عورتوں کا ذکر ہوتا ہو۔ یا ان میں عشقیہ اشعار یا قصے ہوں۔ اسی طرح بعض فوٹو۔ گانا بجانا۔ گرامو فون، ریڈیو۔ امرد لڑکوں کی صحبت سے الگ رہنا۔ غذا کم کر دینا۔ روزے رکھنے تیز مرچ مصالحہ گوشت انڈے مچھلی پلاؤ۔ مرغ کا ترک یا کمی۔ سخت ورزش، ٹھنڈے پانی سے نہانا۔ سخت فرش پر سونا۔ دین کی کتابوں کا مطالعہ۔ نیکوں کی صحبت۔ دُعا۔ بیکاری سے بچنا۔ اور کام میں دل لگا کر مصروف رہنا۔ کافور یا برومائڈ کا استعمال اور کوئی Hobby لگا لینا۔ پبلک گیمز بھی اس کے لئے بہت مفید علاج ہے۔ اگلے زمانہ میں جو لوگ استعفاف اختیار کرنا چاہتے تھے وہ اکھاڑے میں پہلوانی کیا کرتے تھے۔ کیونکہ پہلوانی کا پہلا اصول ہی یہ ہے کہ یہ فن وہی سیکھ سکتا ہے جو "لنگوٹ بند" ہو۔ یعنی اپنی عفت کو مضبوط رکھتا ہو۔

۲۱۵ - حضرت ابراہیمؑ اور اُن کے چار پرندے

قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ..... (البقرہ، ۲۶۱)

ترجمہ: فرمایا۔ اچھا! تُو چار پرندے لے اور اُن کو اپنے ساتھ سدھا لے

اس کا ذکر تورات میں بھی ہے۔ جہاں خدا وند اور حضرت ابراہیم علیہ السلام میں

یہ باتیں ہوئیں ۔

" اور اس نے اس سے کہا ۔ کہ میں خداوند ہوں ۔ جو تجھے کسدیوں کے اُر سے نکال لایا کہ تجھ کو یہ ملک میراث میں دوں ۔ اور اس نے کہا ۔ کہ اے خداوند خدا میں کیونکر جانوں کہ میں اس کا وارث ہوں گا ۔ اس نے اس سے کہا ۔ کہ میرے لئے تین برس کی ایک بچھیا ۔ اور تین برس کی ایک بکری اور تین برس کا ایک مینڈھا اور ایک قمری اور ایک کبوتر کا بچہ لے ۔ اُس نے ان سبھوں کو لیا ۔ اور ان کو بیچ سے دو ٹکڑے کیا ۔ اور ہر ٹکڑے کو اس کے ساتھ کے دوسرے ٹکڑے کے مقابل رکھا ۔ مگر پرندوں کے ٹکڑے نہ کئے ۔ تب شکاری پرندے ان ٹکڑوں پر جھپٹنے لگے ۔ پر ابرآم ان کو ہنکاتا رہا ۔ سورج ڈھلتے وقت ابرآم پر گہری نیند غالب ہوئی ۔ اور دیکھو ایک بڑی ہولناک تاریکی اس پر چھا گئی ۔ اور اس نے ابرآم سے کہا کہ یقین جان کہ تیری نسل کے لوگ ایسے ملک میں جو ان کا نہیں پردیسی ہوں گے اور وہاں کے لوگوں کی غلامی کریں گے (یعنی مصر) اور وہ چار سو برس تک ان کو دُکھ دیں گے لیکن میں اس قوم کی عدالت کروں گا جس کی وہ غلامی کریں گے ۔ اور بعد میں وہ بڑی دولت لے کر وہاں سے نکل آئیں گے اور تو صحیح سلامت اپنے باپ دادا سے جا ملے گا اور نہایت پیری میں دفن ہوگا ۔ اور وہ چوتھی پشت میں یہاں لوٹ آئیں گے کیونکہ اموریوں کے گناہ اب تک پورے نہیں ہوئے ۔ اور جب سورج ڈوبا اور اندھیرا چھا گیا ۔ تو ایک تنور جس میں سے دھواں اُٹھتا تھا دکھائی دیا ۔ اور ایک جلتی مشعل ان ٹکڑوں کے بیچ میں سے ہو کر گزری (یعنی قربانی قبول ہوگئی) اسی روز خداوند نے ابرآم سے عہد کیا ۔ اور فرمایا ۔ کہ یہ ملک دریائے مصر

سے لے کر اس بڑے دریا یعنی فرات تک قینیوں، قینزیوں اور قدمونیوں
اور حتیوں اور فرزیوں اور رفائیوں اور اموریوں اور کنعانیوں اور
جرجاسیوں اور یبوسیوں سمیت میں نے تیری اولاد کو دیا ہے۔
(پیدائش باب ۱۵)

یہاں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو ملک عظیم دینے کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی تفصیل پوچھی

رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (البقرہ ، ۲۶۱)

ترجمہ: اے میرے رب مجھے بتا کہ تو مردے کس طرح زندہ کرتا ہے

یعنی کس طرح ملے گا۔ تو اس کی تفصیل بتلانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قربانی طلب کی۔ وہ حضرت ابراہیم نے پیش کی۔ خدا نے اس قربانی کو قبول کر لیا۔ اور پھر بتایا کہ یہ ارض مقدس میں اتنے عرصہ میں تیری اولاد کے زیر نگیں کر دوں گا۔ رہی یہ بات کہ ان جانوروں سے کیا مطلب ہے۔ سو بچھیا سے مراد خود حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور بکری سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ اور مینڈھے کی تعبیر حضرت مسیح ناصری علیہ السلام۔ اور قمری سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور کبوتر کے بچہ سے مراد حضرت مسیح موعود ہیں۔ پس مطلب یہ ہوا کہ یہ ملک حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تب ملے گا۔ جب وہ خدا کے حضور اپنی اور اپنے ان چار فرزندوں کی قربانی گزاریں گے۔ یہاں پہلے تین پیمبروں کے ٹکڑے کرنے سے مراد یہ ہے کہ بالآخر ان کی نبوت اور شریعت منسوخ ہو جائے گی۔ لیکن پچھلے دو کی تعلیم ہمیشہ برقرار رہے گی۔

رہ گئی یہ بات کہ قرآن نے سب کو طیر کہا ہے۔ اور تورات میں بعض پرندے ہیں اور بعض چارپائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ روحانی اصلیت اور استعارہ کے لحاظ سے یہ سب پیمبر طیر ہیں۔ گو مادی لحاظ سے پرندے نہ ہوں۔ تورات نے تو صرف قربانی

کے جانوروں کا ذکر کیا ہے۔ مگر قرآن نے اس جگہ اصل روحانی مقصد کی طرف اشارہ کیا ہے جن کے لئے یہ قربانی کی گئی تھی۔ (الفضل ۱۸ مئی ۱۹۳۸ء)

۲۱۶ - یوسف علیہ السلام معصوم تھا

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا ۚ لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۚ (یوسف: ۲۵)

اس کے معنے لوگ یہ کرتے ہیں۔ کہ زلیخا نے یوسف سے بدکاری کا قصد کیا اور یوسف نے بھی زلیخا کے ساتھ بدکاری کا قصد کیا۔ اگر نہ ہوتی یہ بات کہ اپنے رب کی دلیل اس نے دیکھی۔ یعنی اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھتا۔ تو وہ ضرور بدکاری کے لئے آمادہ تھا۔ مگر خدا نے بچا لیا۔ اگر خدا تعالیٰ خاص دلیل سے یا معجزانہ طور پر اُسے نہ بچا لیتا تو وہ تو اپنی طرف سے سب تیاری کر چکا تھا۔ نعوذ باللہ۔ یہ عزم زنا کا ایک صدیق نبی کے متعلق کتنا اسلام کے مخالف اور عصمتِ انبیاء کے مسئلہ کے برخلاف ہے اور اس کے ثبوت میں بڑے بڑے خطرناک جھوٹے قصے گھڑے گئے ہیں۔ جنہیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اس آیت کا یہ ترجمہ بالکل سادہ ہے اور حضرت یوسفؑ پر کوئی اعتراض نہیں پڑتا اس لئے یہی صحیح ہے۔ یعنی اُس عورت نے یوسف سے بُری بات کا ارادہ کیا۔ اور یوسف بھی ایسا ارادہ کر لیتا۔ اگر وہ خدا کی صفات اور اُس کی معرفت کا عالم نہ ہوتا۔ یعنی یوسف اگر الٰہیات سے واقف نہ ہوتا۔ تو وہ بھی ایسا ارادہ کر لیتا۔ مگر چونکہ وہ خدا تعالیٰ کی معرفت رکھتا تھا۔ اس لئے اس سے ارادہ بھی ظہور میں نہیں آیا۔ کیونکہ عزم اور پختہ ارادہ بدی کا بھی گناہ ہوتا ہے۔

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (البقرہ: ۲۲۶)

ترجمہ: ہاں جو گناہ تمہارے دلوں نے (بالارادہ) کیا اُس پر تم سے مواخذہ

کرے گا۔

یہ بات بالکل سچ ہے کہ خدا کا فضل اور اس کی معرفت نہ ہو تو انسان گناہ کو پہچان ہی کہاں سکتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا معاملہ بعینہٖ ایسا ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت فرمایا کہ

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل ۷۵)

یعنی اگر خدا تعالیٰ تجھے مضبوط نہ کرتا۔ تو تو بھی ان کافروں کی طرف مزید کچھ مائل ہو جاتا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مائل ہو گئے تھے۔ بلکہ یہ ذکر ہے کہ خدا کا کرم اور مہربانی نہ ہو۔ تو کوئی بھی گناہ سے نہیں بچ سکتا۔

۲۱۷ ۔ ہیرے اور لعل و یاقوت

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ (فاطر ۲۸)

یعنی ان ہی پہاڑوں میں سے ہیرے اور مختلف قسم کے سرخ جواہرات مثل لعل و یاقوت کے اور Black Diamonds جیسی قیمتی اشیاء نکلتی ہیں۔ اس آیت سے معمولی کالے اور سرخ اور سفید رنگ کے پتھر مراد لینے بدذاقی ہے۔

۲۱۸ ۔ نیکی کا بدلہ مزید نیکی کی توفیق

یہ ایک سچا مقولہ ہے کہ ایک نیکی دوسری نیکی کی محرک ہوتی ہے۔ اس کا حوالہ قرآن مجید میں اس طرح سے ہے

مَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا (شوریٰ ۲۴)

یعنی جو کوئی نیکی کرے گا۔ ہم اس کو زیادہ نیکیوں کی توفیق دیں گے۔ اس مضمون کی اور بھی کئی آیات ہیں۔

۲۱۹ - سوختنی قربانی

اِنَّ اللّٰہَ عَہِدَ اِلَیۡنَاۤ اَلَّا نُؤۡمِنَ لِرَسُوۡلٍ حَتّٰی یَاۡتِیَنَا بِقُرۡبَانٍ تَاۡکُلُہُ النَّارُ ؕ (آل عمران، ۱۸۴)

ترجمہ۔ اللہ نے ہمیں یقیناً تاکیدی حکم دیا ہے کہ ہم (اس وقت تک) کسی رسول کی بات نہ مانیں جب تک وہ ایسی قربانی (کا حکم) نہ لائے جسے آگ کھا جاتی ہو۔

یہ بھی ایک بات عجوبہ پسندوں نے مشہور کر رکھی ہے کہ اگلے زمانہ میں جب یہود اپنی قربانیاں خدا کے حضور پیش کرتے تھے۔ مثلاً اناج، پھل، چربی اور مویشی وغیرہ تو آسمان سے ایک آگ اُترتی تھی جو قربانی کی چیزوں کو جلا دیتی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ قربانی منظور ہو گئی ورنہ نہیں۔ حالانکہ صدیوں تک ہمیشہ ایسا معجزہ ظاہر ہوتے رہنا خود معجزہ کے مفہوم کے خلاف ہے۔ بات صرف یہ تھی۔ کہ ان لوگوں کو حکم تھا کہ اپنی قربانیاں جمع کر کے انہیں آگ لگا دیا کریں۔ تاکہ لوگ صدقات و نذور کا مال خود نہ کھایا کریں۔ یہی حکم بعض قسم کے مالِ غنیمت کے بارہ میں بھی تھا۔ وہ بھی خود کھانا ناجائز تھا۔ جلا دیا جاتا تھا۔ جب اسلام نے قربانیوں اور غنیمت کے متعلق زیادہ مفید احکام صادر کئے تو یہودی اعتراض کرنے لگے کہ اگلے پیمبر تو سوختنی قربانیاں کیا کرتے تھے۔ اے محمدؐ آپ کیسے پیغمبر ہیں کہ اُن کے خلاف چلتے ہیں اس پر ان کو جواب ملا کہ جو پیغمبر سوختنی قربانیاں کرتے تھے۔ تم خود ان کے خلاف کیوں رہا کرتے تھے۔ یہ تو تمہارا بہانہ ہے۔ نیز اس سے یہ ثابت ہوا۔ کہ اگر واقعی آسمان سے ہی آگ نازل ہوا کرتی تھی تو پھر ان پیغمبروں کی مخالفت کی کوئی

وجہ ہی نہ تھی۔ آگ کا آسمان سے نازل ہونا ان کی صداقت کا کافی ثبوت تھا۔ مگر چونکہ بنی اسرائیل اس کے باوجود بھی ان پیغمبروں کی مخالفت کرتے اور ان کو ستاتے رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ آگ آسمانی نہ تھی۔ آسمانی ہوتی۔ تو کوئی دشمن سے دشمن بھی دم نہ مار سکتا۔ اصل یہی ہے کہ وہ آگ خود لگائی جاتی تھی۔ اب آپ پوچھیں گے۔ کہ پھر یہ بات مشہور کیونکر ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شروع میں تو یہ قربانیاں سب کے سامنے جلائی جاتی تھیں۔ مگر جب ہیکل تیار ہو گئی۔ تو اس میں اندر ایسی جگہ بنائی گئی۔ جہاں سوختنی قربانیوں کے لئے بھی انتظام جلانے کا کیا گیا۔ مگر اس جگہ اندر عام لوگوں کا جانا منع بلکہ حرام تھا۔ صرف کاہن ہی وہاں جا سکتے تھے۔ آگ اُوپر سے ڈالی جاتی تھی۔ مرد، عورت بچے باہر کھڑے تماشا دیکھتے تھے اور دیکھتے تھے کہ آگ چھت کی طرف سے گری ہے اور جب چربی وغیرہ جل کر خاص قسم کے شعلے نکلتے تھے اور آگ خاص طور پر بھڑکتی تھی تو اس کو قبولیت کی علامت سمجھتے تھے اور اس طرح جل جانے کے بعد مبارک مبارک کا شور ہوتا تھا۔ یعنی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہ قربانی خدا تک پہنچ گئی۔ اس سے بعض ناواقف جاہل یہ سمجھنے لگے کہ آگ آسمان سے آتی ہے۔ اور بھڑک کر جل جانا گویا قبولیت کا نشان ہے یہی باتیں پھر مسلمانوں میں مشہور ہو گئیں۔ ورنہ اس میں نہ کوئی معجزہ تھا نہ کرامت۔

مَیں نے اس مضمون میں اکثر جگہ اس قسم کی معجزہ پسندیوں کی تردید کی ہے اور بعض خاص واقعات کو اس طرح ظاہر کیا ہے۔ کہ وہ عام اور نیچر کے معمولی واقعات تھے۔ میری غرض اس سے یہ نہیں کہ معجزات نَعُوذُ بِاللّٰہ نہیں ہوتے بلکہ یہ ہے کہ علاوہ اصل معجزات کے مزید اور غلط زیادتیاں جو لوگوں نے انبیائے سابقین اور ان کی جماعتوں کی بابت پیدا کر دی ہیں۔ ان کی حقیقت معلوم ہو جائے۔ کیونکہ یہ حال ہو گیا تھا کہ بنی اسرائیل میں کوئی چھینک بھی لے تو معجزہ۔ ان کا چلنا، پھرنا، سونا، کھانا، اٹھنا بیٹھنا، شکار کرنا۔ سب معجزہ اور کرامت۔ مگر اُمّتِ محمدیہ ان باتوں سے بالکل خالی۔ اس ذہنیت کا یہ اثر

ہوا کہ مسلمان عیسائی ہو گئے۔ اور جب خود ان میں نبی آیا۔ تو انہوں نے اس لئے نہ مانا کہ وہ بسبب اُن فرضی معجزات کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کی نظروں میں نہ جچا۔ اگلے لوگوں میں تو کوّے اور مچھلیاں اور بچے اور چڑیاں تک کرامتیں دکھاتی تھیں۔ مگر خیر اُمّت میں معاملہ صفر ہے۔ اسی بات نے اکثر لوگوں کو ہلاک کر دیا۔

پس ضروری تھا۔ کہ حقیقت بے نقاب کی جائے اور دکھایا جائے کہ جیسے معجزات پہلے لوگوں کے تھے وہ اور ان سے بڑھ کر اُمّتِ محمدیہ کے بزرگوں نے دکھلائے ہیں اور جو مجوبہ پسندیاں ان کی ظاہر کی جاتی ہیں وہ عام واقعات ہیں۔ جو پہلے بھی ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً قندیل کے زمانہ میں بھی کوا زمین کھود کر کھانے پینے کی چیز چھپا دیتا تھا۔ اور اب بھی اس نے کوئی لاش نہیں دبائی تھی بلکہ صرف روٹی یا کسی کھانے کی چیز کا ایک ٹکڑا دبایا تھا۔ اُسے دیکھ کر قندیل نے اس کی نقل کر لی۔ اور جانی کی لاش کو دبانے کا خیال آگیا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔ مچھلیاں سبت کے دن اس لئے آتی تھیں کہ سب شکار والے جانور اسی طرح خطرہ اور بے خطرہ کے دنوں اور وقت کو اپنے تجربہ سے پہچان گئے ہیں۔ مسلمانوں کے زمانۂ حکومت میں لوگ جمعرات کی شام کو شکار کو جایا کرتے تھے۔ کیونکہ دوسرے دن جمعہ کو تعطیل ہوتی تھی۔ برسوں کے تجربہ کے بعد شکار یعنی ہرن وغیرہ نے معلوم کر لیا کہ جمعرات کے دن انسان سے چھپنا بہتر ہے۔ ورنہ اس دن ہمارے گلے میں سے ایک دو ضرور غائب ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھر شکاریوں میں بھی مشہور ہو گیا کہ جمعرات کو شکار نہیں ملتا۔ یہی حال اب انگریزی حکومت میں ہفتہ اور اتوار کے شکار کا ہو گیا ہے کہ آگے پیچھے کے دنوں میں تو شکار دستیاب ہو جاتا ہے مگر ہفتہ اتوار کو نہیں ملتا۔ کیونکہ ان کا سبت اتوار ہے اور انہی دنوں میں لوگ شکار کو نکلتے ہیں۔ اگر اس دن شکار ملتا بھی ہے۔ تو ڈرتا بہت ہے اور مارا نہیں جاتا۔ یا مشکل سے مارا جاتا ہے بس یہی ساری کرامت ہے۔ (الفضل ۲۲ر اپریل ۱۹۳۸ء)

۲۲۰ ۔ کثرت قبولیت دُعا بھی انبیاء کا نشان ہے

حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے فرمایا ہے کہ منجملہ دیگر نشانات کے خدا تعالیٰ نے مجھے ایک نشان قبولیت دُعا کا بھی دیا ہے۔ یعنی میری دُعائیں بکثرت قبول ہوتی ہیں۔ قرآنِ مجید میں بھی یہی بات حضرت زکریاؑ نے پیش کی ہے۔ یعنی

وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا (مریم ۵)

اے رب میں نے جب بھی تجھے پکارا ہے۔ تو نے میری دُعا سُنی ہے اور مجھے قبولیت سے محروم نہیں رکھا۔

۲۲۱ ۔ ملکِ سلیمان

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ

(ص ۳۶)

جو حضرت سلیمانؑ کی دُعا ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ بنی اسرائیل میں میرے برابر کا اب کوئی بادشاہ نہ ہو۔ ورنہ مسلمان بادشاہوں اور آج کل کی انگریزی یا روسی سلطنتوں کی وسعت کے آگے سلیمانی ملک کی وسعت کچھ بھی نہ تھی۔ صرف عراق شام یا کچھ حصہ عرب کا اس میں داخل تھا اور بس ۔

۲۲۲ ۔ خبیث کا مطلب

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ (النور ۲۷)

ترجمہ : خبیث باتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں اور خبیث مرد خبیث باتوں کے لئے ہیں۔

حضرت عائشہؓ کے الگ پر اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ایک دلیل ان کی پاکیزگی اور طہارت کی دی ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ہیں۔ ہم نبیوں کا تعلق پاک عورتوں سے ہی کراتے ہیں اور مقدس لوگوں کو پاک دامن عورتیں ہی دی جاتی ہیں۔ اس پر بعض لوگ سوال کرتے ہیں۔ کہ حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کا ذکر تو خود قرآن میں موجود ہے۔ جب وہ خبیث تھیں۔ تو ان کا تعلق نوح اور لوط علیہما السلام سے کیونکر ہوا۔ سو واضح ہو کہ خبیثات سے اس آیت میں بدکار عورتیں مراد ہیں نہ کہ کافر۔ بے شک خدا تعالیٰ نے ان دونوں کو کافر کہا ہے مگر کیا کافر عورتیں پاک دامن نہیں ہوتیں۔ حاشا وکلا جو وہ بدکار ہوں۔ ہاں بے شک وہ کافر تھیں۔ مگر کفر اور چیز ہے اور بدچلنی اور چیز۔ لوطؑ اور نوحؑ کی بیویاں بھی دیگر انبیاء کی ازواج مطہرات کی طرح نہایت باعصمت اور پاک دامن تھیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ وہ ایمان نہیں لائی تھیں۔ مگر اس آیت کا اصل مطلب تو یہ ہے کہ بدمعاش لوگ گندی باتیں کرتے ہیں اور فحش باتوں کے وہی اہل ہیں پاک لوگ اچھی باتیں کہتے ہیں اور نیک ظنی کی باتیں پاکیزہ لوگوں کا ہی شیوہ ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ گندے لوگ ہی ناپاک الزام لگاتے ہیں اور گندے ہی لوگ ان الزامات کو سنتے بھی ہیں۔ (الفضل ۲۵ مئی ۱۹۳۸ء)

۲۲۳ - اصحابِ کہف اور سُورج

اصحابِ کہف کے مقام کے متعلق یہ بیان کہ جب سُورج چڑھتا تھا۔ تو ان کے دائیں طرف سے گزر جاتا تھا۔ اور جب ڈھلتا تھا تو بائیں طرف سے کترا جاتا تھا اس طرح کہ وہ اپنے غار کے سامنے والے کھلے میدان میں بھی ہوتے تو دُھوپ سے تکلیف نہ ہوتی تھی۔

اس آیت کو بھی معجزہ اور عجوبہ کا رنگ دے کر بڑی بڑی موشگافیاں کی گئی ہیں۔

حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ وہ غار کسی پہاڑی کے دامن میں تھا۔ اور اس کا رُخ شمال کی طرف تھا۔ خطِ استوا کے شمال میں جتنے ملک ہیں۔ ان سب میں سورج ہمیشہ جنوب کی جانب جھکا رہتا ہے۔ اس لئے جو مکان شمال رویہ ہو۔ نہ اس کے اندر دُھوپ آتی ہے۔ نہ اس کے صحن کے ایک حصّہ میں۔ اور سورج جُھکا جُھکا کترا کر نکل جاتا ہے یہ کہف اُمل میں واقع ہیں۔ اور وہ خطِ استوا سے بہت فاصلہ پر ہے۔ اس لئے وہاں ہمیشہ شمال رویہ مکانات ہیں اور ان کے سامنے صحن میں دھوپ نہیں آسکتی۔ اس میں نہ تجوبہ کی ضرورت ہے نہ کسی خاص معجزہ کی۔ صرف ان کے مکان کا رُخ بتایا گیا ہے۔ اور بس۔

۲۲۴ ۔ بنی اسرائیل کا راستہ سمندر میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے مظالم سے بچانے کے لئے بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے بھاگے اور ارضِ مقدسہ کی طرف روانہ ہوئے اور خاکنائے سویز کے اس حصہ میں سے گزرے جہاں متعدد جھیلیں ہیں۔ یہ جھیلیں سمندر کے قریب ہیں۔ جوار بھاٹے کے چڑھاؤ کے وقت سمندر اور جھیلیں ایک ہو جاتی تھیں اور جب وہ اُتر جاتا تو سمندر الگ ہو جاتا۔ اور جھیلیں الگ اور بیچ میں مسافروں کے لئے راستہ نکل آتا۔ مصر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر یونہی مُنہ اٹھا کر نہیں چل دیئے تھے۔ بلکہ وہ پہلے بھی دو دفعہ پیدل اس راستہ سے سفر کر چکے تھے۔ ایک اس وقت جب قبطی کے خون کے بعد وہ مدین کی طرف بھاگ گئے تھے۔ دوسری دفعہ جب وہ مامور ہو کر وہاں سے واپس مصر میں آئے تھے۔ دونوں دفعہ اس راستہ کے چپّہ چپّہ سے وہ آگاہ ہو گئے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ لوگ کس وقت کس راستہ سے خشک اور پایاب پہنچ سکتے ہیں اور کون سا وقت خطرہ سے خالی ہوتا ہے کیونکہ جوار

جانا یا مدوجزر ایک ایسی مشہور چیز ہے۔ اور اس کے وقت چاند کی تاریخوں کے لحاظ سے ایسے مقرر ہیں کہ اس علاقہ کے واقف لوگ فوراً بتا دیتے ہیں کہ آج پانی کہاں تک اونچا چڑھے گا۔ اور کس وقت چڑھے گا اور کب اُترے گا۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے تجربہ اور علم کی بناء پر بنی اسرائیل کو اُسی راستے سے گئے جس کے وہ خود واقف تھے اور خدا تعالیٰ کے فضل سے ان کو ایسے وقت میں نکال کر لے گئے جب پانی جزر میں تھا۔ جب فرعون کا لشکر وہاں پہنچا۔ تو پانی کو اُترا ہوا دیکھ کر وہ بھی انہی راستوں سے گزرنے لگا مگر وقت مد کا آگیا تھا۔ آخر درمیان میں آکر رستے سب پانی سے ڈھک گئے۔ اور وہ سرگردان ہو کر غرق ہو گئے۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نکل چکے تھے۔ عصا کا مارنا ایک نشان تھا لوگوں کی تسلی کے لئے۔ اصل معجزہ یہ پیشگوئی تھی

أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ
يَبَسًا لَّا تَخَافُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى (طٰہٰ ۷۸)

ترجمہ: کہ میرے بندوں (یعنی اپنی قوم) کو رات کے اندھیرے میں نکال کر لے جا، پھر اُن کو سمندر میں ایک راستہ بتا جو خشک ہو۔ نہ تم کو یہ ڈر ہو گا کہ کوئی (شخص) آکر پیچھے سے پکڑ لے اور نہ تم (سمندر کی تباہی) سے ڈرو گے (اس پر موسیٰ اپنی قوم کو لے کر سمندر کی طرف گئے)

اس کے بعد نصرت الٰہی ایسی ہوئی کہ دونوں لشکر آگے پیچھے ایسے اوقات میں اور ایسے وقفہ سے گزرے کہ ایک جزر کے وقت نکل گیا اور دوسرا مد کے وقت ڈوب گیا۔ مگر راستہ اور مد و جزر کے اوقات سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دیکھے ہوئے تھے اور خدائی نصرت میں یہ بات بھی داخل تھی کہ اس نے ان کو پہلے دو دفعہ اس راستہ کی واقفیت اچھی طرح کرا دی تھی۔ تاکہ وہ علم ان کا اس موقعہ پر کام آئے۔

پس یہ نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یونہی ناک کی سیدھ مصر سے

نکل کھڑے ہوئے۔ آگے اتفاقاً سمندر آگیا۔ سونٹا مارا سمندر پھٹ گیا اور وہ پار نکل گئے پھر فرعون آیا تو وہ پھٹا ہوا سمندر مل گیا۔ اور سب غرق ہو گئے۔ بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو اپنے دیکھے بھالے ایک ایسے راستہ سے لائے جس کا ان کو علم تھا۔ اور معلوم تھا کہ کس وقت وہ کھل جاتا ہے۔ اور کس وقت بند ہو جاتا ہے۔ وہاں آکر کنارے ٹھہرے رہے۔ جب جزر کا وقت آیا تو دعا کی۔ اور بحکم الٰہی سونٹا مارا۔ اور سب کو یقین دلایا کہ خدا کا وعدہ ہے اور پیشگوئی ہے کہ ہم نجات پا جائیں گے تم میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ یہ وقت گزرنے کے لئے مقرر ہے۔ وہ نکل گئے۔ وہ راستہ چھوٹا سا نہ تھا۔ بلکہ جھیلوں کے کناروں کے ساتھ ساتھ پیچ در پیچ تھا۔ اور میلوں لمبا تھا۔ جب بنی اسرائیل خطرہ والے حصہ سے نکل آئے۔ تو فرعون مع لشکر اس میں داخل ہوا جب بحث اندسیل پھر اندر آگیا تو مد شروع ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ سب غرق ہوتے چلے گئے۔ کیونکہ راستوں سے جھیلوں میں جا پڑے۔ غرض یہ سارا معاملہ معجزہ ہے پیشگوئی ہے۔ تائید و نصرت ہے مگر ایسا عجوبہ نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آسکے۔

۲۲۵۔ بچپن میں کلام

حضرت مسیح علیہ السلام کی بابت آیا ہے۔ کہ اُن کی والدہ رومی بادشاہ کے خوف سے جو ان کے موعود بچہ کے قتل کی تاک میں تھا۔ مصر کو چلی گئیں۔ جب وہ بادشاہ مر چکا تو کئی سال کے بعد آئیں۔ بلکہ انجیل سے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ بیت المقدس میں آکر جب انہوں نے پہلی دفعہ وہاں کے فقیہوں اور فریسیوں سے بہت عاقلانہ کلام کیا تو اس وقت ان کی عمر بارہ سال کی تھی۔ اس عمر کو خدا کے کلام نے بچپن کی عمر کہا ہے کیونکہ تھوڑے لڑکے ایسے ہوتے ہیں۔ کہ اس عمر میں سمجھ کی باتیں کر سکیں۔ اس لئے علمائے یہود پہلی دفعہ ان کی شکل اور عمر دیکھ کر یہ کہا۔

كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا (مریم، ۳۰)

یعنی یہ تو کل کا بچہ ہے۔ ہم جو بزرگ اور عالم ہیں اس سے کیا بات کریں۔ مگر حضرت عیسیٰؑ اس عمر میں ہی ایسے سمجھدار تھے کہ ان مولویوں کو پریشان کر دیا جیسے اب بھی بعض احمدی لڑکے مولویوں کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں۔

یہ بچہ ہونے کا لفظ حضرت یحییٰؑ کے لئے بھی آیا ہے۔ یعنی

وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (مریم، ۱۳)

یعنی ہم نے بچپن ہی میں اسے پختہ باتیں کرنی سکھا دی تھیں۔ پس یہ وہ بات تھی جو حضرت عیسیٰؑ سے ہی مخصوص نہ تھی۔ اور عیسیٰ کے معنی صرف نوعمری کا بچپن ہے۔ نہ کہ دُودھ پیتا بچہ۔ ہماری زبان میں بھی کہہ دیتے ہیں۔ کہ میاں تم تو ابھی بچے ہو حالانکہ مُنہ پر لمبی داڑھی ہوتی ہے۔ بلکہ غیر مبائع تو حضرت خلیفۃ المسیح ثانی کو کل کا بچہ ہی کہتے تھے۔ اور اب تک بھی کہتے ہیں۔ آئندہ زمانہ کا کوئی شخص یہ الفاظ پڑھ کر واقعی ان کو ایک سال کا بچہ ہی سمجھنے لگے۔ تو غلطی کرے گا۔ اسی طرح اب تک عام مسلمان جو ناواقف ہیں۔ امام حسینؓ کو بھی آنحضرتؐ کا نواسا کہلانے کے باعث بچہ ہی خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ ساٹھ سال کے بزرگ تھے جب شہید ہوئے۔ یہ باتیں زبان کے مشہور محاورات ہیں۔ مگر واہ رے مجوبہ پسندی کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

(الفضل ۹ مئی ۱۹۳۸ء)

۲۲۶۔ جُوتی اتارو

إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (طٰہٰ، ۱۳)

اُس پاک وادی طوٰی میں ہے۔ (طٰہٰ ۱۳)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوتیاں اُتارنے کا جو حکم ہوا۔ وہ اس لئے کہ وہ جگہ مقدس تھی۔ یعنی بطورِ تعظیم جوتی اتروائی گئی نہ کسی اور وجہ سے۔ اور اس زمانہ میں آج کل کے مشرقی ممالک کی طرح بڑے لوگوں یا عزت کی جگہوں میں جوتی اُتار کر جانے کا رواج تھا۔ جس طرح مغربی ممالک میں آج کل ایسی تعظیم ٹوپی اتار کر کی جاتی ہے۔ اگر ایسے مکالمہ کا فرض کسی مغربی نبی کو مغربی رسم و رواج کے ماتحت ہوتا تو شاید اسے بجائے فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ کے یہ کہا جاتا کہ TAKE OFF YOUR HAT سو یہ ان ممالک کی تہذیب اور قواعد کے موافق اظہارِ تکریم کرایا گیا اور یہی ضروری تھا۔ ہمارے نزدیک جوتی اُتارنا زیادہ انکسار اور ادب رکھتا ہے۔ اور مسجد لنڈن میں جو یورپین لوگ نماز پڑھتے ہیں وہ بوٹ اتار کر ہی پڑھتے ہیں۔

۲۲۷۔ حضرت یونس علیہ السلام اور مچھلی

فَالْتَقَمَهُ الْحُوتُ وَهُوَ مُلِيمٌ ○ (الصافات ۱۴۲)

پس لقمہ بنایا یونس کو مچھلی نے۔ اور وہ اپنے تئیں ملامت کرتا تھا۔ یہ قصہ کہ کوئی مچھلی پورے انسان کو ثابت نگل گئی۔ اور وہ تین دن اندر زندہ رہا۔ بلکہ مچھلی کے معدہ میں دوڑتا بھاگتا رہا۔ حتیٰ کہ گھبرا کر اس نے سمندر کے کنارہ پر آ کر اُسے قے کر دیا۔ یہ سب قصے ہی قصے ہیں۔ قرآنی الفاظ اور واقعاتِ قدرت سے یہ درست نہیں معلوم ہوتا۔

بڑی بڑی مچھلیاں تو یا وہیل کی قسم کی ہیں۔ یا شارک کی قسم کی۔ وہیل مچھلی کا گلا اتنا تنگ ہوتا ہے کہ صرف نہایت ہی چھوٹی چیزیں اس کے حلق میں سے گزر سکتی ہیں۔ اور شارک بھی مگرمچھ کی طرح نوچ نوچ کر انسان کو کھاتا ہے۔ نہ یہ کہ ثابت نگل جائے۔

نہ معدہ کے اندر کوئی انسان بغیر ہوا کے زندہ رہ سکتا ہے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کو جب کشتی پر سے پھینکا گیا۔ تو مچھلی نے ان کو پکڑ لیا اور زخمی کر دیا مگر خدا نے انہیں بچا لیا۔ ورنہ وہ انہیں بالکل کھا جاتی۔ غالباً کوئی جزیرہ نزدیک تھا۔ یا کسی دوسری کشتی والے مدد کو پہنچ گئے۔ بہر حال فضلِ خداوندی سے جان بچ گئی۔

حضرت خلیفۃ المسیح اول (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) فرمایا کرتے تھے کہ بعض تفاسیر سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی مچھلی نے ان کی ایڑی کو منہ میں لیا۔ یعنی لقمہ بنایا۔

بعض لوگوں نے تو یہاں تک مبالغہ کر دیا ہے کہ گویا مچھلی کے معدہ کے اندر جا کر حضرت یونس علیہ السلام نے جانماز بچھا کر باقاعدہ تسبیح اور نماز شروع کر دی تھی۔ مچھلی کا معدہ کیا ہوا۔ ایک حجرہ ہی بن گیا اور یہ کہنا کہ

لَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿ۚ﴾ (الصافات: ۱۴۵)

ترجمہ: تو اس مچھلی کے پیٹ میں قیامت کے دن تک پڑا رہتا (یعنی مر جاتا)

سے ضرور پیٹ کے اندر جانا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات ضروری نہیں۔ مطلب صرف یہ ہے کہ اگر وہ خدا کی تسبیح نہ کرتا۔ تو مچھلیاں اُسے کھا جاتیں۔ اور وہ ان سے بچ نہ سکتا۔ مگر وہ اندر گیا ہی نہیں صرف زخمی ہو گیا جس طرح مسیح جو مثیل یونس تھا صلیب پر صرف زخمی ہو گیا تھا مگر زندہ اُتر آیا تھا۔

۲۲۸۔ کوہ طُور اور کیرا پہاڑ

وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِیْثَاقِهِمْ (النساء: ۱۵۵)

ترجمہ: اور ہم نے اُن سے (پختہ) عہد لیتے ہوئے اُن پر طور کو بلند کیا۔

اور وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهٗ

وَّ ظَنُّوۡۤا اَنَّہٗ وَاقِعٌۢ بِہِمۡ (الاعراف ۱۷۱)

ترجمہ :- اور ہم نے پہاڑ کو اُن کے اُوپر اُٹھایا گویا کہ وہ ایک سائبان تھا اور اُنھوں نے خیال کیا کہ وہ اُن کے اُوپر گرنے ہی والا ہے ۔

ــــ جو لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ یہ حالت تو ایسی ہے ۔ جیسے کوئی چیز اٹھا کر چھتری کی طرح سر کے اوپر معلق کر دی جائے ۔ انہوں نے غالباً کیرا پہاڑ نہیں دیکھا ۔ جو ڈلہوزی کے راستہ میں ہے اس کے دامن میں سڑک پر کوئی شخص کھڑا ہو جائے ۔ تو بس کوہِ طور کا ایک قسم کا نظارہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے ۔ اور اوپر سے کڑک بجلی بارش یا زلزلہ آ جائے ۔ پھر تو بعینہ وہی حالت قائم ہو جاتی ہے ۔ اس آیت کی تفسیر زبانی کرنے سے بات اس طرح سمجھ میں نہیں آتی جس طرح اس مقام پر جا کر پہاڑ کے نیچے تھوڑی دیر کھڑے ہونے سے ۔ اور اگر اس وقت زور کی بارش آ جائے تو دہشت کے مارے بنی اسرائیل کی مانند ایک بے ایمان شخص بھی ایمان لانے پر مجبور ہو جائے گا ۔ کیونکہ بعض جگہ تو وہ پہاڑ OVER HANGING ہے اور سر پر ہی ہوتا ہے اور بارش کے وقت اس کے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر اس طرح گرتے ہیں کہ

اَنَّہٗ وَاقِعٌۢ بِہِمۡ (الاعراف ۱۷۱) عملی طور پر پورا ہو جاتا ہے ۔

۲۲۹ ۔ قابیل کا اُستاد کوّا

فَبَعَثَ اللّٰہُ غُرَابًا یَّبۡحَثُ فِی الۡاَرۡضِ لِیُرِیَہٗ کَیۡفَ
یُوَارِیۡ سَوۡءَۃَ اَخِیۡہِ ؕ قَالَ یٰوَیۡلَتٰۤی اَعَجَزۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ
مِثۡلَ ہٰذَا الۡغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوۡءَۃَ اَخِیۡ ۚ فَاَصۡبَحَ
مِنَ النّٰدِمِیۡنَ ۞ (المائدہ ۳۱)

ترجمہ۔ تب اللہ نے ایک کوّے کو جو زمین کو کریدتا تھا اُس لئے بھیجا کہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کس طرح چھپائے۔ اُس نے کہا اے میری ہلاکت! (علیدآ) کیا مجھ سے (اتنا بھی) نہ ہو سکا کہ میں اُس کوّے کی طرح ہو جاؤں اور اپنے بھائی کی لاش کو ڈھانپ دوں۔ تب وہ پشیمانوں میں سے ہو گیا۔

جب قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف قتل سے ہی نہیں بلکہ کسی قدرتی طور سے بھی آدم کا کوئی بیٹا اُس وقت تک نہیں مرا تھا۔ ورنہ اُسے دفن کرنے کا علم ہوتا۔ ہاں جانوروں کو مرتے دیکھا ہوگا۔ مگر ان کو دفن نہیں کیا جاتا تھا۔ غرض وہ اسی فکر میں تھا کہ لاش کو کیا کروں۔ کہ اتنے میں ایک کوّے کو دیکھا کہ ایک ٹکڑا روٹی کا۔ یا ایسی ہی کوئی کھانے کی چیز زمین کرید کر دبا رہا ہے۔ جب کوّا اُس چیز کو دبا کر اُڑ گیا تو قابیل کو یہ بات سوجھ گئی کہ میں بھی ہابیل کی لاش کو اسی طرح مٹی کے نیچے چھپا دوں۔ کوّے اور کتے اور بعض دیگر حیوانات میں یہ قدرتی عادت ہوتی ہے۔ کہ کھا کر بچا کھچا زمین میں دبا دیتے ہیں۔ اور پھر ضرورت کے وقت آکر نکال لیتے ہیں۔ یہ مراد نہیں کہ کوّے نے دوسرے کوّے کی لاش کو دبایا تھا۔ کیونکہ کوّے تو دوسرے کوّے کی لاش کو دیکھ کر غل مچاتے ہیں اور ڈرتے ہیں اور دُور دُور رہتے ہیں۔ نہ یہ کہ پاس آئیں اور اس کی تجہیز و تکفین کریں۔ اگر کوّا دوسرے کوّے کو دفن کرتا۔ تو یہ ایک خلاف مشاہدہ اور خلاف فطرت بات ہوتی۔ اس وقت تو قابیل شکر کرتا کہ مجھے سکھانے کو خدا نے بطور معجزہ یہ کوّا بھیجا ہے نہ کہ نادم ہوتا۔ کہ میں انسان ہو کر یہ بات بھی نہ سوچ سکا اور

فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ (المائدہ ، ۳۲)

ترجمہ۔ تب وہ پشیمانوں میں سے ہو گیا۔

کی جگہ اَصْبَحَ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ہوتا۔

غرض سادے قصہ کا اتنا مطلب ہے کہ کوّے کی وجہ سے قابیل دفن کے طریقہ کو سمجھ گیا۔ باقی یہ کہنا کہ کوّے ایک دوسرے کو دفن کرتے ہیں۔ تبھی تو کسی کوّے کی لاش نہیں دیکھی جاتی۔ یہ غلط ہے کیونکہ ہم نے بیسیوں کوّوں کی لاشیں دیکھی ہیں اور وہ مدتوں پڑی بھی رہیں۔ کبھی دوسرے کوّے ان کو دفن کرنے نہیں آئے۔

دُنیا میں انسان کو بہت سی باتوں کا علم اسی طرح آتا ہے۔ نیوٹن نے صرف ایک سیب کو زمین پر گرتے دیکھا تھا۔ اور گو ہمیشہ سے لوگ ایسے نظارے دیکھتے آتے تھے۔ مگر اس وقت مقام اس کے دل میں یہ بات پڑ گئی کہ یہ زمین کی کشش ہے جو ہر چیز کو کھینچتی ہے۔ اب یہ کہنا کہ جس وقت وہ سیب زمین پر گرا۔ وہ چیختا جاتا تھا۔ کہ اے نیوٹن مجھے بچاؤ۔ مجھے زمین اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ لغو بات ہوگی۔ انسان ذراسی بات سے اپنے مفید مطلب نتیجہ نکال لیتا ہے۔ اسی طرح قابیل نے نکال لیا۔

(الفضل یکم جون ۱۹۲۸ء)

۲۳۰۔ اسلام کی تبلیغ ہر ملک اور ہر زمانہ کے لئے ہے۔

اسلام کی تبلیغ عالمگیر اور ہر زمانہ اور ہر شخص کے لئے ہے۔

وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (انعام ۲۰)

یعنی یہ قرآن اس لئے مجھ پر وحی کیا گیا ہے کہ تم کو خبردار کروں اور ہر اس شخص کو بھی جس کے پاس یہ پہنچے۔ خواہ کوئی ملک ہو یا کوئی زمانہ۔

۲۳۲۔ خدائی تقدیر کو مخلوق نہیں ٹال سکتی

لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰهِ (انعام ۳۵) بعض لوگ یہ معنی سمجھتے ہیں کہ خدا کی تقدیر نہیں ٹل سکتی۔ اس کے ہرگز یہ معنی نہیں۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ کوئی اور خدا تعالیٰ کی تقدیر یا فیصلہ کو ٹالنے والا نہیں۔ سو یہ واقعی سچ ہے۔ کہ خدا کے کئے ہوئے کو کون

ٹال سکے۔ لیکن وہ خود تو ٹال سکتا ہے بلکہ ٹالتا رہتا ہے

يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (آل عمران ۱۰۴)

ترجمہ: اللہ ایسا ہی (قادر) ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ (المائدہ ۶۵۰)

قادر ہے وہ بارگاہ ٹوٹا کام بنا دے

بنا بنایا توڑ دے کوئی اس کا بھید نہ پا دے

۲۲۲ - السلام علیکم ورحمۃ اللہ

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام ۵۵)

ترجمہ: اور جب تیرے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں تو تو (انہیں) کہہ تم پر ہمیشہ سلامتی ہو۔ تمہارے رب نے اپنے آپ پر (تمہارے لیے) رحمت کو فرض کر لیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کو السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا کریں۔ یہ آیت ہے جس میں سے مروجہ سلام لیا گیا ہے۔

۲۲۳ - حضرت ابراہیم کا مباحثہ

اس بات کا ثبوت کہ ستاروں۔ چاند۔ اور سورج کا ذکر جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا۔ اور لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (ترجمہ: میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا) کہا یہ محض ایک مباحثہ اور سمجھانے کا رنگ تھا۔ یہ ہے کہ اس سے معاً پہلے یہ آیت ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (انعام: ۷۵)

ترجمہ: اور ہم ابراہیم کو اس طرح آسمانوں اور زمینوں پر (اپنی) بادشاہت دکھاتے تھے۔

یعنی ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا علم دیا۔ اس کے بعد اس نے یہ باتیں کیں۔ بھلا علم کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ سورج میرا رب ہے۔ یا ستارے ہمارے رب ہیں۔ اسی طرح متّصلاً بعد فرماتا ہے کہ:

وَحَاجَّهٗ قَوْمُهٗ ۭ قَالَ اَتُحَاۗجُّوْۗنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ

(الانعام: ۸۱)

ترجمہ: اور اس کی قوم نے اس سے بحث کر کے جیتنا چاہا (تو) اس نے کہا کہ کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں بحث کرتے ہو۔ حالانکہ اس نے خود ہدایت دی ہے۔

اور ذرا آگے چل کر فرمایا کہ

تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰي قَوْمِهٖ (الانعام: ۸۴)

ترجمہ: یہ ہماری طرف سے دی ہوئی ایک دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے خلاف سکھائی تھی۔

پس یہ ساری علمی بحث ہی تھی۔ ہرگز یہ نہ تھا کہ پہلے حضرت ابراہیمؑ نے ان کو اپنا رب تسلیم کیا۔ پھر کچھ مدت ناتمام تجربہ کر کے انہیں سے ارتداد اختیار کیا۔ بلکہ مباحثہ کی خاطر ان کو فرضی طور پر رب تسلیم کر کے پھر ان کی حادث اور محتاجی اور نقص کی وجہ سے ان کی الوہیت کا رد کیا۔

۲۲۴ ۔ ساحروں کے سانپ اور عصائے موسیٰ

فرعون کے ساحروں نے لاٹھیاں اور رسیاں لے کر ان پر توجہ شروع کی۔ تو اثر یہ ہوا کہ وہ کچھ حرکت کرنے لگیں۔ جیسا کہ زبردست مسمرائزر کر سکتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ اب تو اپنا عصا ان کے درمیان پھینک دے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ساحروں کی توجہ ٹوٹ گئی۔ اور پھر وہ نبی کی قوتِ قدسی اور فرشتوں کے اثرِ روحانی کی وجہ سے اپنی توجہ بالکل نہ جما سکے۔ بہتیری کوشش کی مگر ناکام رہے اور وہ حالت رُعب کی ان پر طاری ہو گئی۔ کہ ان کا عمل بے کار ہو گیا۔ اور انہوں نے محسوس کر لیا۔ کہ گویا ہماری سیٹیم نکل گئی۔ یہ احساس تھا جس نے ان کو موسیٰ علیہ السلام کی قوتِ قدسی کا قائل کرایا گویا وہ مغلوب ہو گئے تھے۔ عصا کا سانپوں کو کھا جانا ایک استعارہ ہے کہ گویا ان کا دم نکل گیا۔ یا عصا کے آگے وہ چیزیں نابود ہو گئیں۔ لغوی طور پہ تَلْقَفُ کے معنی ہیں جلدی سے پکڑ لیا۔ یعنی جو تماشہ وہ کر رہے تھے۔ اس میں ان کو ایسا پکڑا کہ وہ بے کار ہو گئے۔ یاد رکھیں کہ مسمرائزر بھی ناظرین پر توجہ کرتا ہے اور اس کا نام سحر ہے۔ خدا بھی اپنے بندوں پر توجہ کرتا ہے۔ اس کا نام معجزہ ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی توجہ سب سے زبردست ہوتی ہے۔ اسی لئے نبی کا معجزہ ساحروں کی توجہ پر غالب آجاتا ہے۔ اسی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ ساحر یعنی مسمرائزر اپنی مرضی کے مطابق لوگوں میں تخیل پیدا کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی یہی کرتا ہے۔ اس وقت اس کا نام کشف ہوتا ہے۔

۲۲۵ ۔ مریم کا رزق

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا
رِزْقًا ۚ قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ

عِنۡدِ اللّٰہِ ؕ (آل عمران ، ۳۸)

جب زکریا علیہ السلام مریم کے پاس حجرہ میں جایا کرتے۔ تو ان کے پاس کھانے کی اشیاء پاتے پوچھتے۔ اے مریم یہ کہاں سے آیا۔ وہ کہتیں۔ کہ اللہ نے دیا ہے۔ اس کے معنی تو صاف ہیں۔ اور ہم لوگ آپس میں بھی ایسا کلام کرتے رہتے ہیں۔ جب کوئی نعمت ملتی ہے۔ تو اُسے خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور یہ پیچ ہے کہ وُہی دیتا ہے اور مریم کو تو بسبب بچہ ہونے کے اور نند ہیکل ہونے کے لوگ بھی ضرور کبھی نہ کبھی مٹھائی اور پھل وغیرہ لاکر دیا کرتے ہوں گے۔ غرض اس میں کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ چھوٹی سی عمر میں وہ لڑکی خدا تعالیٰ کی شناخت رکھتی تھی۔ لیکن لوگوں نے اس رزق کی بابت عجیب عجیب حاشیے چڑھائے ہیں۔ مثلاً یہ کہ فرشتے اس کے حجرے میں پھل وغیرہ چھپا کر رکھ دیتے تھے۔ اور یہ کہ وہ پھل جنت سے آیا کرتے تھے۔ اور بے موسم۔ اور بے فصل کے ہوا کرتے تھے۔

(الفضل ، جون ۳۸ ۱۹ء)

۲۳۶ ۔ دیدارِ الٰہی

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب شوق ظاہر کیا کہ

رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡكَ (الاعراف ، ۱۴۴)

یعنی اے رب میں تیرا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔ تو اُن کو جواب مل گیا کہ لن ترانی تو مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔ یعنی اس دُنیا کی آنکھیں اور جسم دیدار الٰہی کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس لئے یہ ممکن نہیں۔ لیکن دُنیا میں الٰہی تجلی کا ایک نمونہ ہے۔ وہ کہ بجلی ایک نہایت مخفی طاقت ہے مگر جب وہ ظاہر ہوتی ہے۔ اور جسمانی طور پر متشکل ہو کر اپنی قوت کے ساتھ اپنا اظہار کرتی ہے۔ تو پہاڑوں تک کو توڑ کر گرا دیتی ہے۔ پس گو بجلی ہر جگہ موجود ہوتی ہے اسی طرح خدا بھی ہر جگہ موجود ہے۔ لیکن اس کا مظاہرہ چاہو تو تجلی اور اظہار

وجود کے وقت وہی بجلی جو پہلے بے معلوم تھی۔ ایسی کڑک کر اپنے وجود کا اظہار کرتی ہے کہ انسان تو کیا پہاڑ کے بھی ٹکڑے اُڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی تجلی بھی ایسی ہیبت ناک ہوتی ہے کہ اس کو انسان کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے حضرت موسیٰ کو کہا کہ اگرچہ تو مجھ کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔ لیکن میں اپنی ایک مخلوق اور محکوم طاقت کی تجلی تجھے دکھاتا ہوں اگر تو اسے برداشت کر لے۔ تو پھر میری رویت کا سوال کیجیو۔ اور اگر یہی برداشت نہ ہو سکی۔ تو پھر میری تجلی کی تو کہاں برداشت کر سکتا ہے۔ چنانچہ صاعقہ کا ایک کڑکا دیکھ کر ہی حضرت موسیٰؑ بے ہوش ہو گئے اور ہوش میں آنے پر پھر توبہ کی۔ ویسا ہی سوال بنی اسرائیل کے بعض آدمیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا۔

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً
فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (البقرہ ۵۰)

یعنی اے بنی اسرائیل تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک تو ہمیں خدا کو نہ دکھا دے۔ اس سوال پر تمہارے ساتھ یہ سلوک ہوا کہ تم پر بجلی گری اور تم دیکھ رہے تھے پھر ہم تم کو موت کے بعد ہوش میں لائے تاکہ تم شکر کرو۔

یہاں بھی بجائے تجلی الٰہی کے اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ایک طاقت کی تجلی ہوئی جس سے وہ لوگ بے ہوش ہو گئے۔ بلکہ تعجب نہیں کہ بعض مر بھی گئے ہوں۔ اور باقی بعد میں ہوش میں آ گئے۔ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل دونوں میں صرف یہ فرق ہے۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوئی نقصان بجلی سے نہیں پہنچا۔ وہ صرف دہشت اور چمک اور کڑک کی تاب نہ لا کر ہیبت سے بے ہوش ہو گئے۔ اور بنی اسرائیل میں سے بسبب گستاخی اور بے ادبی کے بعض مر بھی گئے اور بعض بچ گئے۔

ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (البقرہ ۵۱)

ترجمہ: پھر ہم نے تمہاری ہلاکت کے بعد تمہیں اس لیے اٹھایا کہ تم شکرگزار ہو

اور بجلی ان پر براہ راست گری۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح زمانہ یعنی دہر خدا نہیں ہے۔ مگر خدا کا ایک ایسا آلہ ہے جس سے براہ راست وہ اس عالم میں کام لیتا ہے۔ اور تغیرات پیدا کرتا ہے۔ اسی لئے اس کے بارے میں ارشاد ہے کہ

لا تسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر

اسی طرح صاعقہ گو خدا تعالیٰ کی ایک لطیف مخلوق ہے لیکن بسبب ایک لطیف اور عالمگیر اور طاقت ور اثر کار ہونے کے وہ بھی ایک مظہر الٰہی ہے کہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے الہام میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انی انا الصاعقہ یعنی میں ہی صاعقہ ہوں۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت فرمایا تھا کہ میں ہی زمانہ ہوں۔ صرف نمونہ کے طور پر صاعقہ کی تجلی خدا تعالیٰ کی تجلی کا ایک مظاہرہ ہے۔ لیکن بجلی سے زیادہ وراء الوراء اور پرے جو مخلوقات ہیں ان کو انسان نہیں دیکھ سکتا چہ جائیکہ

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (الانعام ۱۰۴)

ترجمہ: نظریں اس تک نہیں پہنچ سکتیں

اور اللطیف غیر محدود اور لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ ۱۲) خدا کو اس کمزور اور محدود جسم کی طاقتوں سے دیکھ سکے۔ اور جب خدا نے خود ہی لَنْ تَرَانِيْ کہہ دیا۔ تو پھر کس دلیل سے اس جہان میں لوگ دیدار الٰہی کے قائل ہیں۔ یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ موسیٰ کو دیدار نصیب ہو گیا تھا۔ (الفضل ۱۵ جون ۱۹۳۸ء)

۲۳۷ - غلط شہرت

ایک بات بہت مشہور ہے مگر بالکل غلط ہے۔ وہ یہ کہ سوائے سنی مسلمان کے قرآن کسی کو حفظ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہاں تک مشہور ہے کہ سوائے سُنّی کے شیعہ حافظ قرآن کہیں نظر نہیں آئے گا۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ میں پانی پت میں رہا ہوں جہاں سینکڑوں حافظ ہیں اور وہاں حفظِ قرآن کا رواج بہت ہے۔ شیعہ بھی وہاں کثرت سے ہیں۔ اور ان میں سے کئی حافظ قرآن ہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ شیعہ صاحبان چونکہ دل میں اس قرآن کو مصحف عثمانی سمجھتے ہیں۔ اس لئے حفظ کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ ورنہ قرآن مجید کا حافظ ہونا یا نہ ہونا کسی شخص یا قوم کی خصوصیت نہیں۔ قرآن مجید کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ اسے انسان آسانی سے حفظ کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ محنت اور توجہ کرے۔

۲۳۸ - بعض الفاظ کے معنی قرآن خود کرتا ہے

حنیف جس کے لغوی معنے یک رخہ یا یک طرفہ کے ہیں۔ یعنی ایک طرف سے ہٹ کر دوسری طرف اپنا رُخ پھیرنے والا۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے کئی جگہ آیا ہے۔ اور اس لفظ کے معنی خود قرآن مجید نے بھی کر دیے ہیں۔ جیسا کہ اس کی طرز ہے کہ کئی جگہ الفاظ کے معنی خود کر کے بتاتا ہے۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا ۖ وَلَمْ يَكُ
مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (النحل : ۱۲۱)

ترجمہ: ابراہیم یقیناً ہر (ایک) خیر کا جامع اللہ کے لیے تذلل اختیار کرنے والا (اور) ہمیشہ خدا کی کامل فرمانبرداری کرنے والا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔

یہاں حنیف کے معنی قَانِتًا لِلّٰہِ اور وَلَمْ یَکُ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ کے
کئے ہیں۔ یعنی وہ جو خدا کا فرمانبردار ہو اور شرک سے بیزار ہو۔

۲۲۹ - تانبے کے چشمے

وَاَسَلْنَا لَہٗ عَیْنَ الْقِطْرِ (سبا : ۱۲) یعنی ہم نے سلیمان کے لئے
گلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہایا۔ اس کے یہ معنی سمجھنے کہ پگھلے ہوئے تانبے کے قدرتی چشمے
حضرت سلیمان علیہ السلام کے ملک میں بہتے تھے۔ بالکل غلط ہیں۔ مطلب صرف یہ ہے
کہ جیسے داؤد کے زمانے میں لوہے کے کارخانے انہوں نے جاری کئے تھے۔ اسی طرح
حضرت سلیمانؑ نے تانبے کے کارخانے جاری کئے۔ جہاں تانبا پگھلایا جاتا تھا۔ اور اس
سے مختلف اشیاء تیار کی جاتی تھیں۔ چونکہ تانبا ان کارخانوں میں بکثرت ڈھلتا تھا۔ اس
لئے کثرت سے ڈھلنے کا نام چشمہ بہانا رکھا گیا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ پراچین زمانہ میں
ہندوستان میں دودھ اور گھی کی نہریں بہتی تھیں۔ ایسے الفاظ محاورہ زبان کے طور پر
استعمال ہوتے ہیں اور ان کے لفظی معنی نہیں لئے جاتے۔ بلکہ جو ایسے معنی لے وہ بیوقوف
ہے۔ اس قسم کے زبان کے محاوروں سے قرآن شریف بھرا پڑا ہے۔

۲۳۰ - چور کا ہاتھ کاٹو

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا (المائدہ : ۳۹)

ترجمہ : اور جو مرد چور ہو اور جو عورت چور ہو اُن دونوں کے ہاتھ اس (جرم)
کے بدلہ میں جس کے وہ مرتکب ہوئے ہیں کاٹ دو۔

لوگ کہتے ہیں کہ ہاتھ کاٹنا نہایت سخت سزا ہے۔ مگر یہ وہی لوگ ہیں جن کے
اپنے ہاں کبھی چوری نہیں ہوئی۔ اگر عمر بھر کا اندوختہ چور لے جائے اور گھر میں جھاڑو

دے جائے پھر پتہ لگے کہ یہ سزا نرم ہے یا سخت۔ جن کے ہاں چوریاں ہوتے دیکھی ہیں ان کو تو صبح ہی سکتے سُنا۔ کہ خدا کرے چور کا کچھ نہ رہے۔ یعنی جان، مال۔ رشتہ دار سب فنا ہو جائیں۔ اس کے مقابل پر ہاتھ کاٹنا بھلا کیا چیز ہے۔ یہ کہنا کہ چوری کی صورت تھوڑی ہے یعنی چند آنہ پر ہاتھ کاٹا جاتا لکھا ہے۔

اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ چور جب چوری کو نکلتا ہے۔ تو اس کا ارادہ تو یہ نہیں ہوتا کہ میں صرف چھ آنہ کی چوری کروں گا۔ اس کا اپنا مقصد تو یہی ہوتا ہے کہ اگر لاکھ روپیہ ملے۔ تو وُہ بھی مالِ غنیمت ہے پس وہ دل میں پوری صفائی کرنے نکلتا ہے اور جتنا زیادہ ملے۔ اتنا ہی زیادہ خوش ہوتا ہے۔ پس ایسے کے لئے بہترین عبرت یہ ہے کہ آئندہ کے لئے اُسے بے کار کر دیا جائے اور ایسی نمایاں سزا دی جائے کہ لوگوں کے لئے باعثِ عبرت ہو۔ نیز یاد رکھو کہ مال کیا ہے۔ مال مادی نتیجہ ہے۔ انسان کی تمام دماغی اور جسمانی محنتوں اور کوششوں کا۔ اور اس مال کے ذریعہ انسان پھر دُنیا کی ہر نعمت خرید سکتا ہے۔ سو یہ ہے مال کی اہمیت اور ایسی اہم چیز پر ہاتھ ڈالنے والا قاتل کے دوسرے درجہ پر ہے۔ کیونکہ جان اور اعضاء سے نیچے مال کا درجہ باقی ہر چیز سے اونچا ہے۔ یہ جو حدودِ الہٰی میں رافت کا سوال آپڑتا ہے اس کی وجہ سے قیامِ حدود مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اکثر مجرم قانونی شکنجہ سے بچ کر نکل جاتے ہیں اور جرائم کی کثرت ہو جاتی ہے۔ (الفضل ۱۰ جون ۱۹۳۸ء)

۲۴۱ - ذبحِ عظیم

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (الصافات: ۱۰۸)

ترجمہ: اور ہم نے اس (یعنی اسمٰعیل) کا فدیہ ایک بڑی قربانی کے ذریعہ سے دے دیا۔

مشہور ہے اور تفاسیر میں بھی لکھتی ہیں اس سے مُراد جنت کا ایک مینڈھا تھا جو بطور فدیہ اسماعیل کی جگہ ذبح کیا گیا۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ صرف ایک کہانی ہے کیا یہ ذبح عظیم کم ہے۔ کہ چار ہزار سال سے ہر سال ہزاروں بلکہ لاکھوں جانور اسی قربانی کی یادگار میں ذبح کئے جاتے ہیں۔ اور قیامت تک کئے جائیں گے۔

۲۴۲۔ تین پردے

يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ (زمر ۱۰)

تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں خدا تم کو بناتا ہے۔ اور بڑھاتا ہے تین اندھیروں کے اندر۔ یہ تین اندھیرے۔ یا تین پردے دو طرح کے ہیں۔ ایک تو پیٹ۔ اس کے اندر رحم۔ اس کے اندر جھلیوں کا تھیلا جس کے اندر بچہ رہتا ہے۔ دوسرے خود یہ جھلیاں بھی تین ہوتی ہیں۔ جن میں ایک CLORION دوسری AMNION اور تیسری ALLANTOIS کہلاتی ہے۔

۲۴۳۔ گناہ کی پہچان

انسان کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے نیکی اور بدی کی ایک میزان رکھی ہوئی ہے۔ بغیر سوچے سمجھے۔ یا کسی کے بتائے کے بُری بات فوراً اس کے دل میں ایک کھٹکا پیدا کرتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ الاثم ماحاك فی صدرك یعنی گناہ کی پہچان یہ ہے۔ کہ وہ تیرے دل میں کھٹکتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا منبع یہ آیت ہے

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (الشمس ۹)

یعنی بُرائی اور نیکی کی حس خدا تعالیٰ نے اپنے الہام سے ہر انسان کی فطرت کے اندر مرکوز

کر دی ہے۔ ہاں بعد میں بُری صحبت اور بُری تعلیم اور بُرے اعمال سے وہ اس فطرتِ حسن کو بھی تباہ کر دیتا ہے اور

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس: ۱۰)

ترجمہ: اور جس نے اِسے (مٹی میں) گاڑ دیا (سمجھو کہ) وہ نامراد ہو گیا۔

کا مورد بن جاتا ہے

۲۲۴ ۔ زنیم

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ○ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ
مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ○ عُتُلٍّۢ بَعْدَ ذٰلِكَ
زَنِيْمٍ ○ (القلم: ۱۱ تا ۱۴)

ترجمہ: اور تو کسی کی بات کبھی نہ مان جو قسمیں کھاتا ہے (لیکن خدا کی طرف سے مدد نہ ملنے کے باعث) وہ ذلیل (کا ذلیل ہی) رہتا ہے جس کو (نیکوں پر) طعنہ کرنے اور (ان کی) چغلیاں کرنے کی عادت ہے جو لوگوں کو نیکیوں سے روکنے والا، حد سے تجاوز کرنے والا اور گناہ گار ہے وہ بدکلام بھی ہے اور خدا کا بندہ ہو کر شیطان سے تعلق رکھنے والا بھی۔

حقیقتاً غور کر کے دیکھو۔ تو انبیاء کے مقابل پر ایسے ہی لوگ لیڈر بن کر کھڑے ہوتے ہیں۔ انبیاء کے متعلق ہم نے دیکھا ہے کہ جو بھی نمایاں شرارتیں کرنے والا۔ سخت مقابلہ کرنے والا۔ اور فتنوں اور مخالفتوں کی آگ بھڑکانے والا لیڈر بنا۔ وہ تفتیش پر زنیم ہی نکلا۔ ہاں جو لوگ غلط فہمی سے اختلاف رائے رکھتے۔ یا شرافت کے ساتھ مخالفت کرتے یا دلائل سے مقابلہ کرتے ہیں وہ الگ ہیں۔ اُن کا یہاں ذکر نہیں۔

۲۴۵ ۔ شہابِ ثاقب

فَمَنْ يَسْتَمِعِ الْآنَ يَجِدْ لَهُ شِهَابًا رَّصَدًا (الجن ۱۰)

ترجمہ ۔ لیکن اب جو کوئی (آسمانی باتیں) سننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ ایک (مہلک) شعلہ زن ستارے کو اپنی گھات میں پاتا ہے ۔

قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ شہاب ثاقب ان شیاطین کے لئے سزا ہے ۔ جو ملاءِ اعلیٰ میں فرشتوں کی باتوں اور کلام الٰہی کا سرقہ کرنے جاتے ہیں ۔ اور چونکہ کلام الٰہی انبیاءؑ کے زمانہ میں بہت نازل ہوتا ہے ۔ اس لئے اسی زمانہ میں شہاب ثاقب کا بھی زور ہوتا ہے ۔ خصوصاً نبی کے تعین کے وقت ۔

حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے لکھا ہے کہ جتنے بڑے بڑے اجرام فلکی ہیں ۔ مثلاً سورج ۔ چاند ستارے ، سیارے اور زمین سب کے لئے فرشتے بطور رُوح کے ہیں ۔ مثلاً سورج کی رُوح جبرائیل فرشتہ ہے ۔ اور زمین کی روح میکائیل فرشتہ ہے ۔ کیونکہ اتنے بڑے متحرک اجسام جن میں عظیم الشان طاقتیں اور تاثیرات ہیں ۔ بغیر رُوح کے محض مُردہ نہیں ہو سکتے ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خلا میں جو ہزاروں لاکھوں بڑے بڑے اجرام سماوی کے ساتھ اربوں کھربوں چھوٹے چھوٹے اجرام جنہیں میٹیرز METEORS کہتے ہیں اور وہ بھی چکر لگا رہے ہیں ۔ ان کے لئے غالباً شیاطین یا جنات بطور ارواح کے ہوں گے جیسے بڑے اجرام کے لئے ملائکہ ۔ جب یہ چھوٹے اجرام چکر لگاتے ہوئے بڑے اجرام کے حلقۂ کشش میں آ جاتے ہیں ۔ یعنی دوسرے لفظوں میں شیاطین کسی فرشتے کے حلقہ میں آ نکلتے ہیں ۔ تو وہ بڑا جرم چھوٹے جرم کو اپنی کشش کی وجہ سے کھینچ لیتا ہے ۔ اور پھر نزدیک پہنچ کر وہ چھوٹا جرم بسبب کرۂ ہوائی کی رگڑ کے جل کر راکھ ہو جاتا ہے ۔ اس طرح اس شیطان کا جسم اس سے الگ ہو جاتا ہے ۔ یعنی اس پر موت وارد ہو جاتی ہے

جس طرح انسان کا جسم جب اُس کی رُوح سے الگ ہو جائے تو اُسے مردہ کہا جاتا ہے۔ پس چھوٹے اجرام سماوی کا اس طرح جل جانا۔ اور شہابِ ثاقب بن جانا گویا اس کے متعلقہ شیطان کے لئے موت کا حکم رکھتا ہے اور یہ موت چونکہ کسی بڑے جرم کے قرب کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے۔ کہ فرشتے کے اثر سے یا اس کے انگارہ پھینکنے سے کسی شیطان کو سزا دی گئی ہے۔

۲۴۶ ۔ قرآنی قِصّے آئندہ کی پیشگوئیاں ہیں

قرآن مجید میں جو قِصّے گزشتہ انبیاء کی جماعتوں کے وارد ہوئے ہیں۔ وہ اپنی اصلی صورت میں تو واقعی پہلے گزر چکے ہیں۔ لیکن ہر قصّہ آئندہ اس اُمّت میں بھی پیش آنے والا ہے۔ گو بعینہٖ اسی طرح نہ ہو۔ صرف بڑی بڑی باتوں میں مماثلت کافی ہے اس کے لئے یہ آیات بطورِ جواز کے ہیں۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ (یوسف: ۲۳)

یعنی جو لوگ اس درجہ کے محسن بن جائیں گے اُن پر بھی ہم ایسے ہی حالات وارد کریں گے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (الانبیاء: ۱۱)

ہم نے تم پر یہ قرآن اُتارا۔ اس میں گزشتہ قِصّے نہیں ہیں بلکہ یہ سب تمہارا ہی اپنا ذکر ہے۔ جو تم سے پہلے آنے والا ہے (کیا تم عقل نہیں کرتے)۔

لَقَدْ كَانَ فِىْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ (یوسف: ۱۱۲)

ان گزشتہ قِصّوں میں عقلمندوں کے لئے عبرت ہے۔ یعنی ظاہر میں یہ پہلوں کے قصّے ہیں۔ مگر اصل میں ان کا اشارہ پچھلوں کے لئے ہے۔ عبرت کہتے ہیں۔ ایک بات سے دوسری بات کی طرف ذہن اور مطلب کا عبور کرنا۔ (الفضل یکم جولائی ۱۹۲۸ء)

۲۴۷۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں ڈالا جانا

یہ قصہ بھی اختلافِ خیالات کا موجب ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ بعض لوگ خدا تعالیٰ کی قدرتوں کو اتنا محدود سمجھتے ہیں۔ کہ اُن کے نزدیک خدا صرف اُسے بچا سکتا ہے جو زیادہ خطرہ میں نہ ہو۔ مثلاً آگ میں جلانے کی تجویز ہوئی۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے ہی وہاں سے بھاگ گئے۔ تو گویا خدا نے بچا لیا۔ لیکن اگر آگ بھڑکائی اور کام تیار ہو گیا۔ تو پھر عین وقت پر خدا نہیں بچا سکتا۔ حالانکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈال دینے کے بعد اور حضرت یونس علیہ السلام کو دریا میں غوطے کھانے کے بعد اور حضرت مسیح علیہ السلام کو کیلیں ٹھونک دینے کے بعد۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سونتی ہوئی ننگی تلوار کے نیچے لیٹے رہنے کے بعد خدا نے بچا لیا۔ ہزاروں انسان زلزلوں میں دب جاتے ہیں۔ پھر خدا ان کو بچا لیتا ہے۔ ریلیں ٹکر کھا جاتی ہیں۔ پھر کئی لوگ بچ نکلتے ہیں۔ پانی میں غرق ہو کر پھر زندہ ہو جاتے ہیں۔ استثناء تو صرف اللہ تعالیٰ نے ایک بات کا ہی رکھا ہے۔ یعنی جو مر جائے اس کی روح واپس نہیں آسکتی۔ مرنے سے پہلے پہلے ہر قسم کے مصائب سے لوگ اس کے فضل سے بچ جاتے ہیں۔ خواہ وہ پانی ہو یا آگ ہو۔ زلزلہ ہو۔ یا بیماری ہو۔ چوٹ ہو یا زخم۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ قرآن میں آتا ہے

فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ (الصافات ۹۹)

ترجمہ۔ اور انھوں نے اُس سے ایک چالاکی کرنی چاہی مگر ہم نے ان کو نہایت رسوا کر دیا۔

یعنی مخالفین نے صرف ارادہ آگ میں ڈالنے کا کیا تھا۔ پوری تیاری نہ کی تھی۔ یہ بھی غلط دلیل ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ آتا ہے کہ۔

قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ (عنکبوت ۲۵)

یعنی دشمنوں نے کہا کہ ابراہیمؑ کو قتل کر دو۔ یا جلا دو۔ تو خدا نے اس کو آگ سے نجات دی۔ یہاں آگ سے نجات کا ذکر ہے۔ قتل سے نجات کا ذکر نہیں۔ کیونکہ قتل کا سامان ہوا ہی نہ تھا۔

تیسری جگہ اللہ تعالیٰ نے خود آگ کو ہی مخاطب کر کے فرمایا ہے۔

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (الانبیاء ۷۰)

یعنی اے آگ تو ابراہیم کے لئے ٹھنڈی ہو جا اور اسے نقصان نہ پہنچا۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے تو اس مسئلہ کو بالکل ہی صاف کر دیا ہے۔ میرے خیال میں انکار کی وجہ یہ ہوئی کہ لوگوں میں مشہور ہو گیا۔ کہ انگارے پھول بن گئے اور آگ گلزار ہو گئی۔ بے شک یہ بے ثبوت اور فضول بات ہے۔ کیونکہ جس خدا نے آگ بنائی۔ اسی نے اس کے بجھانے کے لئے پانی بھی بنایا۔ اور اس کا پانی ہر جگہ پہنچ سکتا ہے۔ دشمنوں نے جب آگ جلائی۔ اور ایک جگہ بنا کر بکثرت لکڑیاں جمع کیں اور انہیں بھڑکایا۔ اور تیار ہوئے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اس میں ڈالیں کہ اتنے میں بادل آیا۔ اور ایک زور کا چھینٹا پڑنے کی دیر تھی کہ پانچ منٹ میں آگ کا نام و نشان نہیں رہا۔ ابراہیمؑ کو گھر کے اندر لے جا کر کسی تندور میں ڈالنا تو تھا ہی نہیں۔ بلکہ پبلک سزا شارع عام پر سارے شہر کے سامنے دینی تجویز کی گئی تھی۔ اس طرح بادل برس کر آگ کا بجھ جانا بذاتِ خود معجزہ نہیں۔ معجزہ یہ ہے کہ ایسے وقت آگ بجھی کہ ابراہیمؑ اس سے بچ گیا اور سارے شہر والے اور وہ بادشاہ جسے نمرود کہتے تھے حیران رہ گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عین وقت پر بچ جانا اُن کی کرامت ہے۔ ورنہ آگیں تو اس طرح دُنیا میں بجھتی ہی رہتی ہیں۔

جب یہ واقعہ ہوا۔ تو چونکہ وہ قوم ستارہ پرست تھی۔ اور بارش کو ستاروں کی تاثیر کا نتیجہ مانتی تھی اس لئے وہ ڈر گئی۔ اور پھر تعرض نہ کیا۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام

نے وہاں رہنا مناسب نہ سمجھا اور

اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ۔ (الصافات: ۱۰۰)

ترجمہ: اور ابراہیم نے کہا، میں اپنے رب کی طرف جاؤں گا۔ وہ مجھے ضرور کامیابی کا رستہ دکھائے گا۔

کر کر وہاں سے ہجرت کرلی۔ خدا تعالیٰ کے معجزات ضرورت کے مطابق نازل ہوتے ہیں۔ جب اس آگ کے سر پر قدرتی پانی کا ذخیرہ پہنچ سکتا تھا جس سے وہ قانونِ قدرت کے مطابق بجھ سکتی تھی۔ تو انگاروں کو گلزار بنانے کی ضرورت کیا تھی۔ ہاں اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایسی جگہ لے جا کر جلانے کا سامان کیا جاتا۔ جہاں یہ پانی نہ پہنچ سکتا۔ تو پھر اس معجزہ کی کوئی اور صورت ہو جاتی۔

اسی طرح لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ وہ نمرود جس نے یہ سارا فساد کھڑا کیا تھا۔ اس کی ناک میں مچھر گھس گیا۔ اور دماغ کو کاٹتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ یہ بالکل درست ہو گا کہ نمرود مچھر سے مر گیا۔ مگر اس کے لئے بھی کسی مچھر کی۔ یعنی ناک میں گھسنے کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان میں ہر سال لاکھوں آدمی ملیریا مچھر کے کاٹنے سے مر جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ مردود بھی ہلاک ہو گیا ہو گا۔ عزرائیل کے ایجنٹ مچھر کو ناک میں داخل ہونے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ جب باہر سے ہی وہ اس کا کام تمام کر سکتا تھا۔ (نوٹ: الحمدللہ کہ حضرت خلیفۃ المسیح نے بھی ایک خطبہ جمعہ میں اس مضمون کی تصدیق کر دی۔ یہ سلسلۂ مضامین اس خطبہ سے پہلے کا لکھا ہوا ہے)

۲۴۸ ۔ پہلے اور پچھلے منافق ایک سے ہی ہیں

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔ (الاحزاب: ۳۳)

ترجمہ:۔ پس چبا کر (یعنی ناز نخرے کے ساتھ) بات نہ کیا کرو۔ تا ایسا نہ ہو کہ جس کے دل میں مرض ہے وہ تمھارے متعلق کوئی بدارادہ کرے اور ہمیشہ لوگوں کو نیک باتیں کہا کرو۔

میں جب یہ آیت پڑھتا تھا۔ تو حیران ہوتا تھا۔ کہ کیا نبی کی بیبیوں پر بھی کوئی مسلمان بُرا نظر ڈال سکتا ہے۔ مگر اس زمانہ میں ثابت ہو گیا کہ منافقین سے سب کچھ ممکن ہے اور قرآنی آیت کی صداقت پر اس زمانہ کے بعض منافقین نے مہر لگا دی ہے۔

۲۴۹۔ منگنی

چند دن ہوئے میاں مبارک احمد صاحب کی منگنی ہوئی۔ اور لڑکی کو انگوٹھی پہنانے چند مستورات لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی والوں کے ہاں گئیں۔ اس پر ایک دوست نے مجھ سے پوچھا۔ کہ کیا یہ جائز ہے۔ کیا یہ ایک رسم نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا قرآنِ مجید سے منگنی ثابت ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ (البقرہ ۲۳۶)

ترجمہ:۔ اور عورتوں سے نکاح کی درخواست کے متعلق جو بات تم اشارۃً (اُن سے) کہو یا اپنے دلوں میں رکھو، اس پر تمہیں کوئی گناہ نہیں

کہنے لگے کہ اگر ہے تو بس اتنا کافی ہے کہ فریقین ایک دوسرے سے سمجھوتہ کریں۔

میں نے کہا۔ اس سمجھوتے کا نام قرآن نے خطبہ نہیں رکھا بلکہ وعدہ سِر رکھا ہے۔

وَلٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا (البقرہ ۲۳۶)

ترجمہ:۔ لیکن تم ان سے خفیہ طور پر (کوئی) معاہدہ نہ کرو

سو وہ وعدۂ سِر تو پہلے ہو چکا تھا۔ جیسا کہ آپ چاہتے تھے۔ مگر اب خطبہ یعنی ظاہر منگنی کا وقت آپہنچا تھا۔ تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ فلاں لڑکی منسوب ہو چکی

ہے۔ اب وہاں کوئی دوسرا آدمی رشتہ نہ بھیجے۔ کہنے لگے کہ انگوٹھی پہنانا کیا مطلب رکھتا ہے۔ میں نے کہا قرآن نے منگنی کا نام لیا ہے۔ اب جو باتیں رواجاً منگنی کہلاتی ہیں۔ ان میں سے سب ایسی رسوم جائز ہیں جو اسلام اور اس کی سپرٹ کے مخالف نہیں۔ اگر شرک یا فساد یا گناہ کی کوئی بات نہ ہو تو اس طرح جانا یا انگوٹھی پہنانی یا مٹھائی بانٹنی یا ٹی پارٹی کرنی یہ سب جائز ہوں گی اور اس میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

(الفضل ۶ جولائی ۱۹۳۰ء)

۲۵۰ - ہر مسلمان پر تلاوتِ قرآن فرض ہے

وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ (النمل: ۹۲)

ترجمہ :- اور یہ بھی کہ میں قرآن پڑھ کر سناؤں

ایک دن ایک دوست فرمانے لگے۔ ہمیں تو قرآن کی زبان نہیں آتی۔ نہ ترجمہ کا کچھ علم ہے۔ اس لئے یونہی بے سمجھے بوجھے ناظرہ قرآن پڑھنا فضول ہی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا استدلال شاید درست ہو۔ مگر خود قرآن نے بطور نص صریح یہ حکم دیا ہے کہ آپ قرآن ضرور پڑھا کریں۔ اب اس حکم کی جو بھی خلاف ورزی کرے گا وہ گنہگار ہے۔ خواہ اسے ترجمہ آتا ہو یا نہ آتا ہو۔ اور اس زمانہ میں تو یہ عذر بھی سخت نامعقول ہے کیونکہ بین السطور مترجم قرآن کئی قسم کے بازاروں سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ آدمی پہلے ایک رکوع قرآن کا پڑھ لیا کرے۔ اس کے بعد پھر اس کا اردو ترجمہ پڑھ لیا کرے۔ اسی طرح کرتا رہے۔ تو سارے قرآنی مطالب سے واقف ہو سکتا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں کہ صرف نحو یا لغت کے ڈر کے مارے کلام اللہ سے بے اعتنائی کرے۔

ترجمہ ان تینوں باتوں سے مستغنی کر دیتا ہے۔ کیونکہ ہر ترجمہ واقف کار۔ اور عالم کا کیا ہوا ہوتا ہے۔ عوام کے لئے ہر طرح آسانی ہے اور یوں

"خوئے بد را بہانہ بسیار"

کا کوئی علاج نہیں۔ ورنہ قرآن مجید نے تو حسبِ ذیل آیت میں تلاوتِ قرآن کو علیحدہ ممتاز کیا ہے۔ کہ کسی اور عمل کا نام لینا بھی اس کے مقابل پر کچھ حقیقت نہیں سمجھا۔

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَ
لَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ
تُفِيضُونَ فِيهِ (یونس ۶۲)

ترجمہ:۔ اور تو نہ (کبھی) کسی کام میں (مشغول) ہوتا ہے۔ اور نہ تو اس (کتاب) میں سے کوئی حصّہ قرآن پڑھتا ہے اور نہ (ہی) تم (سب لوگ) کوئی (اور) کام کرتے ہو مگر (ان سب صورتوں میں) جب تم (اپنے کام میں پوری) توجہ سے مشغول ہوتے ہو۔

یعنی تو کسی حال میں ہو۔ خواہ قرآن پڑھتا ہو یا کوئی اور عمل کرتا ہو۔ مگر اس وقت ہماری نظر تجھ پر ہوتی ہے۔

۲۵۱۔ مچھلی کا گم ہو جانا

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ
سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا (کہف ۶۲)

ترجمہ:۔ پس جب وہ (دونوں) (اُن دونوں) سمندروں کے باہم ملنے کی جگہ پر (یعنی قربِ زمانہ نبوی تک) پہنچے تو وہ اپنی مچھلی (وہاں) بھول گئے جس پر اُس (مچھلی) نے تیزی سے بھاگتے ہوئے سمندر میں اپنی راہ لی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے قصّہ میں یہ ذکر ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور ان کا ساتھی حضرت خضر کی تلاش میں نکلے تو اُن کو حکم ہوا کہ مجمع البحرین یعنی جہاں دریائے نیل کی دونوں شاخیں ملتی ہیں۔ اس کے قریب تم کو ایک شخص ملے گا جو

تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام روانہ ہوئے اور اپنے ساتھی سے یہ کہا کہ میں نے تو مجمع البحرین کے پاس پہنچنا ہے خواہ مجھے کتنا ہی سفر کرنا پڑے۔ جب دونوں وہاں پہنچ گئے تو اپنے ناشتہ کی پکی ہوئی مچھلی وہاں بھول گئے۔ اور وہ مچھلی لڑھک کر دریا میں جا پڑی۔ جب آگے چلے۔ تو حضرت موسیٰؑ نے اپنے ہمراہی سے کہا۔ کہ کچھ ناشتہ نکالو۔ ہم تو اس سفر سے بہت تھک گئے ہیں۔ اس وقت ہمراہی نے جواب دیا کہ جب ہم پچھلے پڑاؤ پر پتھر کے پاس ٹھہرے تھے تو میں نے بھول کر وہاں پتھر پر مچھلی رکھ دی۔ حالانکہ وہ پھسلنی جگہ تھی۔ اور شیطان نے مجھے بھلا دیا کہ میں اُسے اُٹھا کر محفوظ جگہ رکھ دوں اور عجیب بات یہ ہوئی کہ لڑھکتے لڑھکتے پانی میں جا پڑی۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ ہم بھی تو یہی چاہتے تھے۔ چلو اسی جگہ واپس چلو جب وہاں آئے تو خضر کو موجود پایا۔ اب اس ذکر میں نہ تو زندہ مچھلی کا ذکر ہے۔ کیونکہ زندہ ہوتی تو اُسے غذا یا ناشتہ کیوں کہا جاتا۔ نہ مچھلی کے ساتھ کوئی خاص بات وابستہ تھی۔ بلکہ حضرت موسیٰؑ کو حضرت خضر کا یہ نشان دیا گیا تھا کہ تم سیدھے سفر کرتے چلے جاؤ۔ جب تمہاری کوئی چیز گم ہو جائے تو سمجھ لینا کہ منزل مقصود آ گئی۔ ناشتہ کی مچھلی ہمراہ تھی۔ غفلت اور بے احتیاطی سے وہ ایک پڑاؤ پر گر کر پانی میں جا پڑی۔ جب حضرت موسیٰؑ کو معلوم ہوا۔ کہ یہ نقصان ہو گیا۔ تو سمجھ گئے کہ یہی نشان اس کے ملنے کی جگہ کا تھا۔ چلو واپس چلیں۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کو ایک سفر میں الہام ہوا تھا کہ اس سفر میں تمہارا یا تمہارے رفیق کا کچھ نقصان ہو گا۔ پس اصل مقصود اور ذکر مچھلی نہ تھی۔ بلکہ یہ کہ جب تمہارا اس سفر میں کچھ نقصان ہو جائے تو سمجھ لینا کہ ہم منزل مقصود کو پہنچ گئے۔ خواہ اس وقت اُن کی کوئی شئی گم ہو جاتی۔ یا لوٹا یا بستر۔ بہرحال ناشتہ کی پوٹلی گم ہو گئی۔ اور گوہر مقصود ہاتھ آ گیا۔ معجزہ یہ تھا کہ پیشگوئی کے طور پر جو ہدایت کی گئی تھی۔ وہ پوری ہوئی اور خضر مل گئے۔ یہ معجزہ نہ تھا کہ مچھلی زندہ ہو گئی۔ اور وہ ڑتی

ہوئی دریا میں چلی گئی۔ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ ہمراہی اسی وقت غل مچاتا۔ کہ یہ کیا اچنبھے کی بات ہو رہی ہے۔ بلکہ وہ واقعہ ایسا ہی معمولی تھا کہ نسیان کی وجہ سے اس رات کو یاد آیا۔ نہ صبح کو۔ نہ دوسرے دن ناشتے کے وقت تک۔ ایک رومال میں بھنی ہوئی مچھلی کا ٹکڑا بندھا تھا۔ جو بے موقعہ جگہ سے لڑھک کر پانی میں ضائع ہو گیا تھا اور بس۔ (الفضل ۱۳ جولائی ۱۹۳۸ء)

۲۵۲۔ حضرت موسیٰؑ کے کپڑے لے کر پتھر کا بھاگنا

یَاۤ اَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ اٰذَوۡا مُوۡسٰی فَبَرَّاَہُ اللّٰہُ مِمَّا قَالُوۡا ؕ وَ کَانَ عِنۡدَ اللّٰہِ وَجِیۡہًا (احزاب: ۷۰)

یعنی اے مسلمانو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ۔ جنہوں نے موسیٰ کو ایذا دی تھی تو خدا تعالیٰ نے ان کے الزام سے موسیٰؑ کو بری کیا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت دار تھا۔ قرآنِ مجید میں اس ایذا اور بریت کی تفصیل نہیں دی۔ مگر چونکہ سورہ احزاب میں یہ واقعہ درج ہے اس لئے قرینِ قیاس یہی ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وہ ناپاک الزام تھا۔ جس میں کئی لوگ شامل ہو گئے تھے۔ بلکہ بعض اُن کے اپنے عزیز بھی ملوث تھے۔ کیونکہ سورہ احزاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضور کے خاندان پر اعتراضات کا بہت ذکر ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور قصہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق مشہور ہے اور اس کا احادیث میں بھی ذکر آتا ہے۔ وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ بسبب حیا کے لوگوں کے سامنے ننگے نہیں نہاتے تھے اس لئے لوگوں نے مشہور کر دیا کہ اس کو فتق کا عارضہ ہے۔ اس لئے ہم سے چھپ چھپ کر نہاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بیچارے اس طوفان پر صبر کرتے رہے۔ ایک دن دریا کے کنارے کسی پتھر پر کپڑے رکھ کر جو نہانے لگے تو کسی وجہ سے وہ پتھر لڑھک کر بمعہ کپڑوں کے نیچے

کو چلا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جلدی میں اپنے کپڑے بچانے کو پانی میں سے نکل کر باہر بھاگے۔ اور اس طرح باہر ننگے آگئے۔ اتفاقاً چند آدمی بنی اسرائیل کے کہیں پاس سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے بھی حضرت موسیٰؑ کو دیکھ لیا۔ کپڑے تو پکڑ گئے۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا احوال لوگوں پر منکشف ہوگیا۔ ان لوگوں نے ساری قوم میں جاکر مشہور کر دیا کہ وہ بات فتق والی غلط ہے۔ ہم نے آج اتفاقاً حضرت موسیٰ کو برہنہ دیکھ لیا۔ اُسے ایسی کوئی بیماری نہیں۔ باقی یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر غصّے کے مارے پتھر پر کوڑے برسائے۔ اور ان کے نشان آج تک اس پتھر پر موجود ہیں۔ اور وہ بجائے نیچے کی طرف لڑھکنے کے انسانوں کی طرح بھاگنے لگا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے پیچھے دوڑے۔ یہاں تک کہ وہ پتھر میل دو میل چل کر بنی اسرائیل کے کیمپ میں جا آیا اور ہر مرد و زن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو برہنہ دیکھ لیا۔ اور جب تک ایک آدمی بھی باقی رہا۔ تب تک وہ پتھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی طرح لئے پھرا۔ تب جا کر ان کی خلاصی ہوئی۔ یہ سب باتیں الحاقی ہیں۔ اصل اتنا ہی معلوم ہوتا ہے جو پہلے بیان ہوا۔ (الفضل ۱۵ جولائی ۱۹۳۸ء)

۲۵۲۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کے شیاطین

وَالشَّيَاطِينَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ۙ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ (ص، ۳۸، ۳۹)

ترجمہ: اسی طرح ہم نے سرکش شیطانوں کو یعنی ان میں سے تمام انجنیئروں اور معماروں کو اسی طرح غوطہ خوروں کو اس کی خدمت پر لگا دیا تھا اور کچھ اور لوگوں کو بھی جو زنجیروں میں بندھے رہتے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے سب باغی مفسدوں کو گرفتار کر کے بعض کو کام پر

لگا دیا۔ اور بعض جو زیادہ خطرناک تھے۔ ان کو قید میں ڈال دیا۔

کیسی بادشاہ اس طرح کیا کرتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ و نصرت تھی جو انبیاء کو حاصل ہوتی ہے۔ ان کے سارے دشمن مغلوب اور مقہور ہو گئے اور ان سے وہ خوب کام لیتے تھے۔ وہ سب شیاطین انسان ہی تھے۔ مگر باغی ہونے کی وجہ سے شیاطین کہلائے۔

۲۵۴ ۔ سامری کا قصہ

سامری حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا خارجی تھا۔ جس کی ساری کوشش یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معزول کر کے خود ان کی جگہ بنی اسرائیل کا حاکم بن جائے۔ اس بات کا اس نے خود اقرار کیا۔ ذات کا وہ سنار تھا۔ ذلت سے مراد یہاں قدیم پیشہ ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر تشریف لے گئے اور بنی اسرائیل کو حضرت ہارون کے سپرد کر گئے۔ تو سامری کو اپنی تجاویز کے چلانے کا موقع مل گیا پہلے تو اس نے یہ تجویز پیش کی۔ کہ یہ جو تم لوگ قبطیوں کے اتنے زیور مانگ لائے ہو۔ ان کا رکھنا اور لادنا اور اُٹھانا بہت مشکل ہے۔ آج کل فراغت کے دن ہیں۔ آؤ سب کو گلا کر خالص سونا بنالیں۔ اور کھوٹ نکال کر ان کو مختصر کر لیں تاکہ نقل و حمل میں آسانی ہو۔ یہ استنباط جلنا کے لفظ سے ہوتا ہے۔ یعنی یہ مفت کا بوجھ بھی، اُٹھانا پڑا ہے۔ ہم خوشی سے اسے نہیں اُٹھاتے۔ اور سنار اس لئے اُسے کہا کہ وہ سونے کو گلانا اور پھر ڈھال اور سانچہ وغیرہ بنانا بلکہ آواز نکالنے کی ترکیب بھی جانتا تھا۔ غالباً وہ دھونکنی سے پھونک مار کر آواز نکالتا ہوگا۔ غرض یہ کہ نہ صرف وہ معمولی سنار تھا بلکہ MASTER GOLDSMITH اور بسبب سنار ہونے کے اس کا ارادہ یہ بھی ضرور ہوگا کہ پگھلانے میں کچھ سونا اڑا بھی لے۔ کیونکہ زیورات جو ساری قوم کے زیرِ نظر

اور گنے ہوئے تھے۔ ان میں سے چوری کرنا مشکل تھا۔ خیر بھٹی قائم کی گئی۔ جس میں سارا زیور ڈالا گیا۔ اور سامری نے اسے پگھلا کر خالص سونا بنایا۔ پھر بجائے اینٹیں وغیرہ بنانے کے اس نے ایک سانچہ بچھڑے کا تیار کیا۔ تاکہ جب اس میں پگھلا ہوا سونا پڑے تو بچھڑا اس میں سے نکل آئے۔ اس طرح جب بچھڑا تیار ہو گیا۔ تو اسے خوب پالش کر کے اس میں اس نے دھونکنی یا کسی اور طریقہ سے یہ خاصیت رکھ دی۔ کہ اس میں سے اسی طرح آواز نکلے۔ جس طرح آج کل سنکھ یا بگل وغیرہ میں نکلتی ہے۔ غالباً وہ خود پیچھے سے بذریعہ نلکی پھونکتا ہوگا اور بچھڑے کے منہ کی طرف سے آواز نکلتی ہوگی۔ غرض کوئی حکمت ایسی ہی ہوگی۔ جس میں اس کا اپنا تعلق اور دخل ضرور ہو۔ یہ نہیں کہ بچھڑا آپ ہی آپ بولتا تھا۔ اس طرح وہ بچھڑا تو خدا بن گیا۔ کیونکہ بوقت عبادت وہ آواز نکالتا تھا۔ اور سامری اس کا مہنت یا پجاری یا کاہن یا رسول بن بیٹھا جس کی وساطت سے عبادت ہو سکے۔

پھر اس نے بنی اسرائیل کو ورغلایا۔ وہ پہلے ہی صدیوں ایک گائے پرست قوم کے ماتحت رہ کر ان خیالات سے متأثر تھے۔ ہزاروں نے اس کی آواز پر لبیک کہی اور یہ مشہور کر دیا کہ موسیٰ غلطی سے خدا کو ڈھونڈنے پہاڑ پر گیا۔ خدا نے تو ہمیں بنی اسرائیل کے پاس اس بچھڑے میں حلول کر لیا ہے۔ اور جب عبادت کرو تو خوش ہو کر آواز بھی نکالتا ہے۔ هٰذَآ اِلٰـهُـكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى ۵ (طٰهٰ : ۸۹)

سے فائدہ اٹھا کر سامری نے اپنی قوت اور جماعت اور بڑھالی۔ اور اس طرح پہلا وار یہ کیا۔ کہ ہارون کو عملاً معزول کر دیا۔ یہ معزولی ہی تو ہے کہ ان لوگوں نے کہہ دیا کہ

لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى (طٰهٰ ۹۲)

ترجمہ: جب تک موسیٰ ہماری طرف واپس نہ آئے ہم برابر اس کی عبادت میں مشغول رہیں گے۔

گویا حضرت موسیٰ کی واپسی تک آپ معزول ہیں اور یہ گوسالہ پرست سامری ہمارا امیر ہے۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو معزول کرنے کی تبلیغ اور دیشہ دوانی جاری رکھی خیر جب موسیٰ علیہ السلام چالیس دن کے بعد آئے تو یہ تماشا دیکھ کر بہت ناراض ہوئے۔ بعض تائید الٰہی تھی کہ سب بنی اسرائیل ان کو دیکھتے ہی ان کے طرفدار ہو گئے۔ سامری کا جتھہ ٹوٹ گیا۔ اور وہ بے یار و مددگار رہ گیا۔ خیر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو خدا تعالیٰ کے احسان یاد دلائے۔ اور گزشتہ تائید و نصرت کا ذکر کیا۔ اور یہ دلیل دی کہ اگر یہ خدا ہے تو کیا وجہ کہ کلام نہیں کرتا۔ بجائیں بجائیں کے سوا اور کوئی آواز اس کے منہ سے نہیں نکلتی۔ نہ کوئی ہدایت یا شریعت تم کو بتاتا ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نہ صرف کلام کرتا ہے بلکہ دعاؤں کا جواب دیتا ہے۔ اور انسان کو ہدایت کے راستے بتاتا ہے۔ خیر جب سحر سامری ٹوٹ چکا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے پوچھا کہ بتا اصل بات کیا تھی۔ اس نے نہایت مختصر الفاظ میں یہ جواب دیا کہ

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ (طٰهٰ: ۹۷)

ترجمہ: اس نے کہا، میں نے وہ کچھ دیکھا جو ان لوگوں نے نہیں دیکھا تھا اور میں نے اس رسول (یعنی موسیٰ) کی باتوں میں سے کچھ اختیار کریں (اور کچھ اختیار نہ کیں) پھر (جب موقعہ آیا تو) میں نے ان (اختیار کی

ہوئی باتوں کو بھی پھینک دیا اور میرے دل نے یہی چیز مجھے اچھی کر کے دکھلائی تھی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے ایک بات ایسی سوجھی جس کا دوسروں کو خیال بھی نہ تھا۔ وہ یہ کہ تمہارا سارا کام ایک وہ کا نذاری ہی ہے۔ اسی طرح میں بھی ایک خدا بناؤں جو کچھ آواز نکالتا ہو۔ اور خود اس کا رسول بن کر اس قوم پر حکومت کروں۔ تو میں بھی تمہارے جیسا بن سکتا ہوں۔ اس لئے میں نے بھی یہ مذہب اور الوہیت اور رسالت کا ایک ڈھونگ رچایا۔ اور سلسلۂ نبوت کی کچھ نقل اُتار لی مگر قسمت نے مجھے نامراد رکھا۔ اس لئے اب میں اسے چھوڑتا ہوں اور ان خیالات کو ترک کرتا ہوں۔

یہ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ

ترجمہ اور میں نے اس رسول (یعنی موسیٰ) کی باتوں میں سے کچھ اختیار کر لیں (اور کچھ اختیار نہ کیں)

والی نقال ہمیشہ سچے سلسلوں کے قیام کے وقت ہوا کرتی ہے۔ جیسے مسیلمہ اور اسود عنسی نے کیا۔ بلکہ اس زمانہ میں پنڈت اگنی ہوتری صاحب نے بھی ایک سلسلہ چلایا اور پنڈت دیانند صاحب نے بھی عناصر کو رسول بنایا۔ خدا کے ۱۲ نام رکھے۔ توحید کی صورت بنائی۔ غرض اسلام کے ڈھانچہ پر ہندو ازم کو ڈھال کر اس کا نام آریہ دھرم رکھا۔

وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ۔

ترجمہ: اور میرے دل نے یہی چیز مجھے اچھی کر کے دکھائی۔ جس طرح تیرا دل ان کا حاکم اور بڑا بننے کو چاہتا ہے۔ اسی طرح میرا جی بھی چاہتا تھا کہ میں بھی اس قوم کا بادشاہ بن جاؤں۔ اس لئے یہ فعل میں نے کیا۔ آخر اس اقرار کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو سزا اسے دی وہ مشہور ہے۔ یعنی اس کو جماعت سے خارج کر دیا اور کہہ دیا کہ اس سے سلام کلام پیام منع ہے اور یہ بنی اسرائیل کی جماعت کے گھروں سے باہر

الگ ایک جگہ رہا کرے۔ گویا اخراج اور مقاطعہ کی سزا دی۔ تو اس نے تو یہ تجویز کر رکھی تھی۔ کہ موسیٰ کو بھی ہارون کی طرح آتے ہی معزول کر دیا جائے۔ اگر سب بنی اسرائیل اس سے مل جاتے تو وہ حضرت موسیٰ سے یہی کہتا کہ بس تم میرے ماتحت ہو جاؤ۔ میں اس خدا کا رسول ہوں جس نے اس بچھڑے میں حلول کیا ہے۔ مانتے ہو تو خیر ورنہ تمہیں قتل کر دیتا ہوں۔ مگر بیچ خدا کے اس جلالی نبی کے آگے وہ کس طرح ٹھہر سکتا تھا۔ آپ ہی ذلیل ہو گیا۔

اس قصہ کے لئے آپ سورۂ طٰہٰ پڑھیں وہاں برخلاف تورات کے قرآن مجید نے ہارون کو بے قصور قرار دیا ہے اور ساری ذمہ داری سامری پر ڈالی ہے چنانچہ واپسی سے پہلے طور پر ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کی طرف سے اطلاع مل گئی تھی کہ

اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ (طٰہٰ: ۸۶)

یعنی سامری نے بنی اسرائیل کو گمراہ کر دیا ہے (الفضل ۱۵ جولائی ۱۹۳۸ء)

۲۵۵۔ خدا کے شیر

حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے ایک صداقت یہ بھی پیش فرمائی ہے کہ دُنیا سے الگ رہ کر خدا کو یاد کرنا۔ بہت ادنیٰ درجہ ہے۔ انبیاء اور اولیائے کرام کی شان یہ ہے کہ وہ دُنیا میں داخل ہو کر پھر بھی ایک لمحہ خدا تعالیٰ کو نہیں بھولتے اور ان کا معاملہ دست باکار دل بایار والا معاملہ ہوتا ہے۔ ایک شخص جو بیوی بچے، کاروبار یا تجارت اور اسی طرح کے کاموں میں داخل ہو کر پھر دل خدا سے لگائے رکھتا ہے۔ اس کا بہت بلند درجہ ہے۔ بہ نسبت ظاہری تارک الدنیا کے اس مضمون کی آیت قرآن مجید میں یہ ہے۔

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ
وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ
فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ (النور: ۳۸)

ترجمہ از تفسیر صغیر: (یہ ذکر کرنے والے) ایسے کچھ مرد ہیں جن کو اللہ کے ذکر سے اور نماز کے قائم کرنے سے اور زکوٰۃ کے دینے سے نہ تجارت اور نہ سودا بیچنا غافل کرتا ہے وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اُلٹ جائیں اور آنکھیں پلٹ جائیں گی ۔

یعنی وہ ایسے ہیں کہ تجارت یا خرید و فروخت ان کو اللہ کے ذکر نماز سے اور زکوٰۃ سے غافل نہیں کر سکتی ۔ یہاں رِجَالٌ کے معنے نہ صرف مرد کے ہیں ۔ بلکہ جوانمرد اور شیر مرد کے ہیں ۔

۲۵۶ ۔عورت گھر میں رہے

وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا (الاحزاب ۳۴)

ترجمہ: اور اپنے گھروں میں بیٹھی رہا کرو اور پرانے زمانے کی جاہلیت (کے طریقوں) کی طرح اپنی زینت (غیر لوگوں پر) ظاہر نہ کیا کرو اور نماز کو (باشرائط) ادا کیا کرو اور زکوٰۃ دیا کرو ۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کیا کرو ۔ اے اہل بیت ! اللہ تم میں سے ہر قسم کی گندگی دور کرنا اور تم کو کامل طور پر پاک کرنا چاہتا ہے ۔

قرآن مجید کی آیات اگلی اور پچھلی آیتوں کے ساتھ مل کر بھی معنے دیتی ہیں اور الگ الگ بطور خود بھی ہر آیت اپنے معانی رکھتی ہے ۔ مذکورہ بالا آیت لندا النبیؐ کے متعلق

ہے۔ لیکن اس حصّہ سے عام طور پر یہ بھی استدلال ہوتا ہے کہ اگر دوسری مومن عورتیں بھی عموماً گھروں میں رہیں اور زیب و زینت، بناؤ سنگار کرکے اسے لوگوں کو دکھاتی نہ پھریں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ اے اس طرح گھروں میں رہنے والیو! اگر تم ان ہدایتوں پر عمل کروگی۔ تو خدا تم کو بُرائیوں سے بچائے گا اور تمہارے دلوں کو بُرے خیالات سے پاک کردے گا۔ اور اس میں کیا شک ہے۔ کہ جو ہدایات ازواج النبی کے لئے ہیں۔ ان پر دوسری مومن عورتیں عمل کریں۔ تو سراسر فائدہ ہی ہے اور اہل البیت سے مراد اس صورت میں وہ مومنات ہوں گی جو گھروں میں جم کر رہتی ہیں اور عقلاً بھی یہ ثابت ہے کہ جو عورتیں گھروں سے باہر نہ نکلیں گی اور سیر سپاٹے، نظارے اور گھر گھر پھرنے کی عادت نہ رکھتی ہوں گی۔ اور جاہلیت والی زینت لوگوں کو نہ دکھاتی پھریں گی۔ تو ایسی اہل البیت ضرور دُنیا کی شرارتوں، بدخیالات اور بداعمالیوں سے محفوظ رہیں گی۔ کیونکہ وہ پُرشر دنیا سے الگ اور فتنہ و فساد کے منظروں سے علیحدہ رہتی ہیں۔ ہاں غریب غربا جو کام کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ مجبوری کی وجہ سے معذور ہیں۔ لیکن وہ دنیا کے فتنوں اور فسادوں سے اس طرح پاک و صاف نہیں رہ سکتیں۔ جتنا وہ عورتیں جو زیادہ تر گھروں میں محصور رہتی ہیں۔

(الفضل ۱۹ جولائی ۱۹۳۸ء)

۲۵۷۔ عورتیں مردوں کے ماتحت ہیں

كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ (التحریم: ۱۱)

ترجمہ: وہ دونوں ہمارے نیک بندوں کے نکاح میں تھیں

سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت اپنے خاوند کے ماتحت ہوتی ہے اور وہ مشہور مثال کہ مرد، عورت دو بیلوں کی طرح ہیں جو دُنیا کی گاڑی میں جوتے ہوئے ہیں۔ اور اُسے چلا رہے ہیں۔ غلط ہے۔ بلکہ مساوات کا ذکر ہی اس ضمن میں فضول ہے۔ کلام الٰہی

نے تو عورت کو مرد کے ماتحت بنایا ہے نہ کہ برابر کا۔

۲۵۸۔ طلاق کا تعلق عدت سے ہے

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ (الطلاق ۲۰۱)

اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو۔ تو ان کو ان کی عدت کے لئے طلاق دو۔ اور عدت کو شمار کرتے رہو۔ یہاں لِعِدَّتِهِنَّ کے معنی میں دقت پڑتی ہے۔ اس لئے اس کے معنی عام طور پر یہی کئے جاتے ہیں۔ کہ عدت کے شروع میں طلاق دیا کرو۔ حالانکہ طلاق عدت کا باعث ہوتی ہے۔ نہ کہ عدت طلاق کا۔ جب طلاق دو گے تبھی سے عدت شروع ہو جائے گی۔ اور اگر ناجائز وقت میں طلاق دی گئی ہے۔ تو نہ عدت شروع ہوگی۔ نہ طلاق ہوگی۔ اس لئے ؎۱ کے یہ معنی بہتر ہوں گے۔ کہ اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو۔ تو عدت پوری کرنے کی نیت سے طلاق دو۔ یعنی تمہارا مطلب طلاق سے صرف جُدائی کرنا نہ ہو۔ بلکہ عدت کی تمام شرائط کا پورا کرنا بھی ہو۔ تاکہ تم عدت کے فوائد حاصل کر سکو۔ اور اس کی شرائط کو بھی پورا کر سکو۔ کیونکہ عدت طلاق کے لئے بطور لگام اور روک تھام کے ہے۔ اگر اسے ہٹا دیا جائے تو طلاق ایک بے لگام اور غیر منضبط چیز رہ جاتی ہے اور بالکل بے برکت چیز ہو جاتی ہے۔ پس طلاق اگر دو تو ایسی ہو جس کے بعد عدت کا خیال رکھا جائے۔ اور اس عدت کی سب شرائط کو پورا کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ اس طُہر میں دی جائے جس میں صحبت نہ کی گئی ہو۔ اور حیض کے دنوں میں نہ ہو۔ اور ہر طُہر میں تین طلاقیں الگ الگ کر کے دی جائیں۔ مطلقہ کو عدت بھر گھر سے نہ نکالا جائے۔ ہر وقت رجوع کا خیال رکھا جائے۔ نیکی کا سلوک اور نیکی سے رخصت کیا جائے۔ جو انہیں دے چکے ہو۔ وہ واپس نہ

دیا جائے۔ طلاق مخفی نہ ہو۔ بلکہ اس کے گواہ ہوں۔

غرض صرف طلاق منع ہے۔ اور وہ طلاق جائز ہے۔ جو طلاق مع عدت کے ہو۔ اور طلاق صرف طلاق کی غرض سے نہ دی جائے۔ بلکہ عدت کی شرائط کی تکمیل بھی اسی طرح مدنظر ہو۔

۲۵۹ ۔ مایوس الحیض کی عدت

وَالّٰئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُھُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشْھُرٍ (طلاق : ۵)

جن عورتوں کو حیض سے ناامیدی ہو چکی ہے۔ اگر تم کو شبہ ہو۔ تو ان کی عدت تین ماہ ہے۔ یہاں ارْتَبْتُمْ (اگر تم کو شبہ ہو) کے الفاظ کا کیا مطلب ہے۔ جب حیض سے ناامیدی ہو گئی اور وہ بند ہو گیا۔ تو پھر اِنِ ارْتَبْتُمْ والے فقرہ سے کیا مراد ہے۔ سو واضح ہو۔ کہ بوڑھی ہو کر عورتوں کو عموماً حیض یکدم بند نہیں ہوتا بلکہ بند ہونے سے چند سال پہلے بے قاعدہ اور کم ہو جاتا ہے۔ کبھی آ گیا۔ کبھی نہ آیا۔ کبھی دو تین ماہ کا وقفہ پڑ گیا کبھی کوئی نشان ظاہر ہو گیا۔ اس طرح آخر بالکل بند ہو جاتا ہے پس یہ زمانہ شبہ والا ہے۔ جس میں بظاہر سمجھا جاتا ہے کہ حیض موقوف ہو گیا۔ لیکن کئی ماہ بعد ایک دھبہ خون کا آ گیا۔ پس ایسی مشکوک اور مشتبہ حالت میں حکم ان عورتوں پر بھی تین ماہ کا لگے گا۔ نہ کہ تین طہر کا اور ایسی عورتیں بھی مایوس الحیض سمجھی جائیں گی نہ کہ حیض والی۔ کیونکہ ایسی حالت میں تین طہر کی مدت ایک سال یا دو سال بھی بن سکتی ہے۔ اس لئے ان کی عدت بجائے تین طہر کے تین ماہ ہوگی تا کہ مدت بے حساب نہ ہو جائے۔

۲۶۰ - صرف مستند کتابیں بنیادِ مباحثہ ہوں

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (العنکبوت، ۴۷)

ترجمہ:۔ اور اہل کتب سے کبھی بحث نہ کرو مگر اعلیٰ اور مضبوط دلیل کے ساتھ

اسی طرح ایک دوسرا اصول مباحثات کے لئے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے یہ پیش کیا کہ فریقین اپنی اپنی مستند اور بہترین اور قابلِ اعتماد کتابوں کے نام چھاپ دیں۔ اور دوسرا فریق ان کتابوں سے باہر نہ جائے۔ خود بھی انہی کو مستند ملنے اور انہی میں سے دلائل پیش کرے اور دوسرے فریق کو بھی اختیار نہ ہوگا۔ کہ بے اعتبار اور غلط کتابیں سے لے کر اپنے مقابل مذہب پر اعتراض شروع کر دے۔ اس کا حوالہ شروع میں لکھا گیا ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتب سے انہی کتابوں کی رُو سے بحث کیا کرو جو اس فریق کے نزدیک احسن اور نہایت قابل اعتماد اور قابلِ مستند ہیں نہ یہ کہ وہ فریق تو ان کو صحیح مانتا نہیں نہ ان کتابوں کی اس کے نزدیک کوئی وقعت ہے۔ مگر زبردستی ان کی بناء پر فریقِ مخالف اعتراض شروع کر دے۔

۲۶۱ - شرکِ خفی

نیچریوں۔ فلسفیوں اور سائنسدانوں کا شرک نہایت باریک اور آخری درجہ کا شرک ہوتا ہے۔ وہ اسباب کو مؤثر حقیقی سمجھتے ہیں۔ اور خالق الاسباب یا مسبب الاسباب کا قدم بیچ میں سے نکال دیتے ہیں۔ حالانکہ تمام تاثیریں اور خواص اسباب کے ایک قیوم نے ان کے اندر قائم کر رکھے ہیں۔ اس کی مرضی اور ارادہ شامل حال نہ ہو تو نہ وہ ماشیاء ہیں نہ اسباب نہ ان کے خواص۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت مسیح موعود نے

کسی معاملہ میں مجھے کہا کہ میاں خدا کا ایک نام مسبب الاسباب بھی ہے یہ نام لے کر اس سے دُعائیں کیا کرو۔ (الفضل ۲۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

۲۶۲۔ آیت لَا تَقْنَطُوْا کے متعلق غلط فہمی

سورۂ زمر میں ایک نہایت مشہور آیت لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (الزمر: ۵۴) ہے جو ہر مسلمان کی زبان پر ہے۔ مگر میرے خیال میں اس آیت کے متعلق ایک غلط فہمی ہے اور وہ ایسی ہے جیسے صرف كُلُوْا وَاشْرَبُوْا کہہ دیا مگر لَا تُسْرِفُوْا نہ پڑھا۔ یا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ کے بعد وَاَنْتُمْ سُكٰرٰی (النساء: ۴۴) کی شرط کو ظاہر نہ کرنا۔ اس آیت کے ساتھ بھی اس سے اگلی آیت بطور شرط کے گئی ہے۔ اور صاف کہا ہے کہ اگر وہ شرط پوری نہ ہوگی تو بجائے مغفرت کے عذاب نازل ہوگا مگر ادھر کسی کا خیال جاتا ہی نہیں کیونکہ اس شرط کو پورا کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ اب پورا مضمون سُنو

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا
مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ
هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝
وَاَنِيْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ
يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ (الزمر: ۵۴۔ ۵۵)

اے رسول تو کہہ دے کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ اللہ تعالیٰ تو سب گناہ معاف کر دیتا ہے۔ (اب شرط اس بخشش کی شروع ہوتی ہے) اور اپنے رب کی طرف جھکو اور اس کے کامل فرمانبردار ہو جاؤ۔ پیشتر اس کے کہ تم پر عذاب نازل ہو۔ کیونکہ اس وقت تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا یہاں سے صاف ظاہر ہے کہ اگر بغیر انابت اور تسلیم کامل کے بھی سب گناہ بخشے جا سکتے

ہیں۔ تو پھر عذاب اور بے کسی کی دعید کیوں ہے۔ معلوم ہوا یہ شرط ہے گناہوں کے عفو کی اور رحمت وکرم کی۔ پس ہمیشہ بغیر شرط کے ظاہر کئے اور عمل کئے آدھی بات کو بار بار پیش کرنا اور اس پر یقین تمام کر لینا اور جو شرط ہے اُسے نظر انداز کر دینا کہاں کی عقل مندی ہے بلکہ ایک بڑا دھوکہ ہے جو انسان کو تباہی کی طرف لے جا سکتا ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ رجوع بھی تو نہ ہو اور نہ فرمانبرداری کے آثار ظاہر کرے بلکہ یہ آیت پڑھ کر سمجھ لے کہ بس اب میرے سارے گناہ بخشے گئے۔

٢٦٣۔ صرف اپنی خوبیاں پیش کرو

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (النحل: ١٢٦)

ترجمہ: رب کی راہ کی طرف بلا، اور اس طریق سے جو سب سے اچھا ہو۔

ایک اصول حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے یہ قائم کیا ہے کہ بہتر ہو کہ تمام مذہبی مباحثات کرنے والے ہمیشہ اپنے مذہب کی خوبیاں ہی پیش کیا کریں۔ نہ کہ دوسروں کے عیب اور نقائص۔ اس اصول کا حوالہ یہ آیت ہے۔ یعنی ان لوگوں سے مباحثہ کرو اس چیز کے ساتھ جو خوبی اور حُسن والی ہو۔ یعنی اہل مذاہب کے مقابلہ پر عیب چینی اور اعتراض نہ ہوں۔ بلکہ وہ چیز پیش کی جائے جو اس مذہب کی خوبی اور کمال ہو

٢٦٤۔ سب معانی کا بیک وقت مفہوم

بعض جگہ کسی آیت میں ایک لفظ کے کئی کئی معنے ہوتے ہیں۔ اور وہ سب معنی وہاں چسپاں ہو جاتے ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ سب کا مجموعہ ایک وقت میں چسپاں ہو کر آیت کے مفہوم کو نہایت شاندار بنا دیتا ہے۔ نمونہ کے طور پر

اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ

طَاغُوْنَ (الطور، ۳۳)

ترجمہ: کیا اُن کو اُن کی عقلیں یہی بات سکھاتی ہیں، یا وہ سرکش قوم ہیں۔
اَحْلَامُهُمْ کے تین معنی ہیں۔ ۱۔ ان کی اپنی عقلیں۔ ۲۔ اُن کے عقل مند لوگ۔ ۳۔ اُن کے رویاء و خواب۔ ان میں سے ہر ایک معنی الگ الگ بھی لگ سکتے ہیں۔ مگر اکٹھے ہو کر وہ آیت کے آخری حصہ کو بہت واضح کر دیتے ہیں۔ یعنی کیا ان کی اپنی عقلوں یا ان کے دانا لوگوں یا اُن کے خوابوں نے ان کو ایسی باتیں کرنے کا حکم دیا ہے۔ یا یہ خود ہی سرکش ہیں۔ کیونکہ سرکش وہی تو ہوتا ہے۔ جو نہ اپنی عقل کا کہنا مانتا ہے۔ نہ دوسرے عقلمندوں کی سنتا ہے۔ نہ ان ہدایات پر چلتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کو بذریعہ رویاء کے بتائی جاتی ہیں۔ جن کے پاس ان تین باتوں میں سے ایک کی بھی سند نہ ہو۔ اس سے بڑھ کر سرکش اور حد سے نکل جانے والا اور کون ہو سکتا ہے۔

۲۶۵۔ سورۃ تین کی قسمیں

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (التین، ۱ تا ۶)

انجیر اور زیتون گواہ ہیں اور طور سینین گواہ ہے۔ اور یہ شہر گواہ ہے اس بات پر کہ ہم نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا۔ پھر ہم نے اس کو ادنیٰ درجوں سے (بھی) بدتر درجہ کی طرف لوٹا دیا۔ یہ تینوں مقامات اس بات کے بھی گواہ ہیں کہ انسان اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ میں گرا ہوا ہے۔ تین یعنی انجیر سے مراد انجیل والا انجیر ہے۔ جس پر حضرت مسیح نے لعنت کی تھی کہ تو اب پھل نہیں لائے گا۔ یہ وہ لعنت ہے جو

لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ
وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ؕ (المائدہ ۹۱)

ترجمہ: بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے اُن پر داؤد اور عیسیٰ
بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی تھی۔

والی لعنت تھی۔ اور زیتون وہ پہاڑی یا MOUNT OF OLIVE ہے جہاں حضرت مسیحؑ نے اپنی اخلاقی تعلیم کا ایک عظیم الشان وعظ کیا تھا۔ تو معنے ان قسموں کے یہ ہوئے کہ انجیر اور زیتون کی پہاڑی والا مسیح اور طورِ سینین والا موسیٰ اور اس بلد امین یعنی مکہ کا بانی ابراہیم تینوں اس بات کے گواہ ہیں کہ انسان کو ہم نے احسنِ تقویم میں پیدا کیا۔ اور اس میں نہایت اعلیٰ لیاقتیں اور قابلیتیں رکھیں۔ کیونکہ ان تینوں نے اپنے اعمال سے خود اپنا احسن تقویم میں ہونا ثابت کر دیا۔ لیکن انجام دیکھو کہ اسی مسیح کے متبعین آخر بدترین شرک میں گرفتار ہو گئے۔ اور طورِ سینین والے لوگوں کی پچھلی نسلیں ابدی ملعون ہو گئیں۔ اور ابراہیم کی اولاد یہ ابوجہل، ابولہب اور کفار قریش موجود ہی ہیں۔ یہ تینوں قومیں اب اس بات کی زندہ گواہ ہیں۔ کہ جب انسان احسن تقویم کے درجہ سے گرتا ہے۔ تو پھر کہاں اسفل السافلین میں جا کر پہنچتا ہے۔ غرض موافق اور مخالف دونوں گواہیاں ایک ہی گواہ سے لے لی گئیں جس نے انسان کے کمالات کی حد کو بھی ثابت کر دیا۔ اور اس کے تنزل اور ذلت کی انتہا کو بھی واضح کر دیا۔

۲۶۶ ۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دُعا

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ وَاَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّهٖ جَسَدًا
ثُمَّ اَنَابَ ○ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا

يَنۢبَغِىۡ لِاَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِىۡ‌ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ ○

(ص ۰ ۳۵ - ۳۶)

ترجمہ :- اور ہم نے سلیمان کی آزمائش کی اور اس کے تخت پر ایک بے جان جسم کو بٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ (پھر جب یہ نظارہ اس نے کشف میں دیکھا) تو وہ اپنے رب کی طرف جھکا اور اس (سلیمان نے اپنے بیٹے کی حقیقت خدا سے معلوم کر کے) کہا کہ اے میرے رب میرے عیبوں کو ڈھانک دے اور مجھ کو ایسی بادشاہت عطا کر جو میرے بعد آنے والی اولاد کو ورثہ میں نہ ملے تو یقیناً بڑا بخشنہار ہے۔

جب سلیمان نے دیکھا کہ بیٹا نالائق ہے اور بنی اسرائیل میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ اب یہ قوم فاتح نہیں ہو سکتی۔ اور انہیں حضرت داؤد علیہ السلام کی بد دُعا کی لعنت کا ظہور ہونے لگا ہے۔ تو خیال ہوا کہ گو اب آئندہ ان کی سلطنت کی ترقی بند ہے۔ مگر میرے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور فضل کے وعدے ہیں۔ اس لئے بہتر ہو گا کہ میں اپنے نام سے جس قدر بھی ہو سکے۔ خدا تعالیٰ سے یہودی سلطنت کی توسیع کرا لوں۔ جتنی بڑی سلطنت ہو جائے گی۔ اتنی دیر تک اس کا قیام بھی رہے گا۔ اگر میں نے ہی ترقی نہ دی کرو گے تو زوال ہی زوال ہے۔ جانشین نالائق ہے اور قوم ملعون ہو چکی ہے۔ اس لئے یہ دُعا کی۔ کہ اے رب جو سلطنت بڑی سے بڑی تو نے بنی اسرائیل کے سلسلہ کو دینی ہے۔ وہ مجھے دیدے۔ تاکہ میں اسے ایک نظام کے ماتحت تو کر دوں۔ آئندہ آنے والے اگر فاتح نہیں ہیں اور قابل نہیں ہیں تو کم از کم میری چلائی ہوئی مشینری اور میرے بنائے ہوئے نظام کو تو چلاتے رہیں گے۔ جس طرح حضرت عمرؓ یا فضل عمر نے ایک نظام اسی طرح کا تیار کر دیا کہ آئندہ اگر کوئی ایسا لائق نہ ہو۔ تو بھی کم سے کم یہ تو ہو گا کہ بنے بنائے نظام کو تو چلائے

یہ وجہ تھی جس لئے یہ دُعا کی تھی۔ لوگ اس دُعا پر حیران ہوتے ہیں کہ کیوں کی گئی۔ سو اس کی وجہ یہ ہے جو بیان کی گئی۔ اور مِنْۢ بَعْدِیْ سے مراد صرف بنی اسرائیل کی سلطنت ہے۔ نہ یہ کہ دُنیا کی ہر آئندہ سلطنت کیونکہ یہ معنی بالبداہت غلط ہیں۔ (الفضل ۳۰ جولائی ۱۹۳۸ء)

۲۶۷۔ قرآنی آیات ثمراتِ جنت ہوں گی

قرآنِ مجید میں جو لفظ مُتَشَابِہٌ کا آتا ہے۔ یہ بھی بڑا معرکۃ الآرا لفظ ہے اور ہمیشہ زیرِ بحث رہتا رہا ہے۔ یہ لفظ پانچ جگہ آیا ہے۔

مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ اور مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ (انعام ۱۰۰) دُنیا کے پھلوں کے لئے اور اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (البقرہ ۲۶) جنت کے پھلوں کے لئے اور اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (آل عمران ۸) قرآنی آیات کے لئے اور كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ ..... (الزمر ۲۴) قرآن کی سورتوں اور آیات کے لئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی آیات اور ثمرات کو آپس میں بہت مشابہت ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح یہاں کا ایمان آخرت میں درختوں کا وجود اختیار کرے گا اور یہاں کے اعمالِ صالحہ وہاں نہروں کی شکل میں متمثل ہوں گے۔ اسی طرح قرآن مجید کی آیات اور سورتیں وہاں ثمرات کی صورتوں میں متمثل ہوں گی۔ اور ہر شخص وہاں وہ پھل کھائے گا جن

۲۶۸۔ درشتی گائے اور قتل کی تحقیق

سورۂ بقرہ میں جو گائے کا ذکر ہے اور اس کے متصل بعد وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا (البقرہ ۷۲) والا واقعہ ہے۔ اس کو ہمارے لوگ دو الگ واقعات بیان کرتے ہیں۔ اگرچہ پہلے مفسرین ان دونوں کا آپس میں تعلق سمجھتے ہیں۔ توارت میں اس گائے کے متعلق جو ذکر ہے۔ اس کے متعلق ہمارے بزرگ لکھتے ہیں کہ وہ گنتی باب ۱۹ میں ہے۔ بے شک یہ درست ہے کہ ایک درشتی گائے کا وہاں بھی ذکر ہے۔ لیکن اس کے سوا ایک اور جگہ بھی ایسی درشتی گائے کا ذکر ہے اور ساتھ ہی مقتولوں اور ان کے قتل میں اگر شبہ ہو تو اس کے تصفیہ کا ذکر بھی ہے۔ اس لئے یہ جگہ توارت کی قرآن والے ذکر کے عین مطابق اور اس کی حقیقت کو واضح کرتی ہے۔ اس کے لئے دیکھیں استثناء باب ۲۱ جہاں یہ لکھا ہے۔

"اگر اس ملک میں جسے خداوند تمہارا خدا تم کو قبضہ کرنے کو دیتا ہے کسی مقتول کی لاش میدان میں پڑی ہوئی ملے اور یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا قاتل کون ہے۔ تو تمہارے بزرگ اور قاضی نکل کر اس مقتول کے گرداگرد کے شہروں کے فاصلہ کو ناپیں۔ اور جو شہر اس مقتول کے سب سے نزدیک ہو۔ اس شہر کے بزرگ ایک بچھیا لیں جس سے کبھی کوئی کام نہ لیا گیا ہو۔ اور نہ وہ جوئے میں جوتی گئی ہو۔ اور شہر کے بزرگ اس بچھیا کو بہتے پانی کی وادی میں جس میں نہ ہل چلا ہو (اور نہ اس میں چلا ہو)۔ اور نہ اس میں کچھ بویا گیا ہو لے جائیں۔ اور وہاں اس وادی میں اس بچھیا کی گردن توڑیں۔ تب بنی لاوی جو کاہن ہیں نزدیک آئیں۔ کیونکہ خداوند تمہارے خدا نے اُن کو چن لیا ہے۔ کہ خداوند کی خدمت کریں اور اس کے نام سے برکت دیا کریں اور انہی کے کہنے کے مطابق ہر جھگڑے اور مارپیٹ کے

مقدمہ کا فیصلہ ہوا کرے۔ پھر اس شہر کے سب بزرگ جو اس مقتول کے
سب سے نزدیک رہنے والے ہوں اس بچھیا کے اُوپر جس کی
گردن اس وادی میں توڑی گئی اپنے اپنے ہاتھ دھوئیں اور یوں کہیں کہ
ہمارے ہاتھ سے یہ خون نہیں ہوا۔ اور نہ ہی ہماری آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے۔
سوائے خداوند اپنی قوم اسرائیل کو جسے تو نے چھڑایا ہے معاف کر اور
بے گناہ کے خون کو اپنی قوم اسرائیل کے ذمہ نہ لگا۔ تب وہ خون ان کا معاف
کر دیا جائے گا۔ یوں تم اس کام کو کر کے جو خداوند کے نزدیک درست
ہے بے گناہ کے خون کی جوابدہی کو اپنے اُوپر سے دُور دفع کرنا۔

(استثنا، باب ۲۱ آیت ۱ تا ۹)

اب اس حکم اور قرآن مجید کے قصّہ کو جو کہ "وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا (البقرہ)" کو ملاؤ تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شرعی حکم کے بعد کوئی ایسا واقعہ ہوا۔ اور اس حکم پر عمل کیا گیا اور عمل کرنے سے مجرموں کا پتہ لگ گیا اور اُن کے راز کا انکشاف ہو گیا۔ ان سے معصوموں کی مانند ہاتھ نہ دھوئے جا سکے اور وہ پکڑے گئے اور قصاص لیا گیا۔ پس قرآن مجید اور تورات دونوں کی عبارت ملا کر تمام دقّت حل ہو جاتی ہے۔ تورات میں تو ایک حکم بیان کیا گیا ہے کہ مشتبہ کے قتل سے بریت اور اس کی تفتیش اس طرح کیا کرو۔ اور اس پر عمل اس طرح کیا جائے۔ اور قرآن میں اس حکم کے بعد کا ایک واقعہ درج ہے جس میں جب مشتبہ لوگوں کو بلایا گیا تو چونکہ وہ خود ہی قاتل تھے اس لئے پہلے تو انہوں نے ایسی کاروائی کرنے میں حیل و حجت اور پس و پیش کیا۔ پھر مجبوراً ہوئے تو مجرم ہونے کی وجہ سے ان سے قسم کھاتے وقت اور ہاتھ اٹھاتے اور دھوتے وقت ایسا اضطراب ظاہر ہوا کہ افشائے راز ہو گیا غرض انہوں نے مان لیا۔ اور ان سے قصاص لیا گیا۔ اس طرح اس زمانہ میں اس حکم کا مفید ہونا ثابت ہو گیا۔

جو درحقیقت حلف کی ایک مؤثر قسم تھی۔ بس یہ واقعہ ہے جو قرآن مجید میں بیان ہوا۔ اور اس قدر مشکل سمجھا جاتا تھا۔

۲۶۹۔ محبت الٰہی کس طرح حاصل ہوتی ہے

میں نے بہت سے احمدی احباب سے یہ سوال سُنا ہے کہ وہ کیا باتیں ہیں جن سے خدا کی محبت حاصل ہوتی ہے۔ اگر ان سے کہا جائے کہ کوئی خاص بات نہیں صرف ایمان لانا اور اعمالِ صالحہ کرنا کافی ہے وہ اس کے ماننے سے جھجکتے ہیں اور یقین نہیں کرتے بلکہ کوئی خاص عمل اور خاص وظیفہ اور خاص طریقہ ڈھونڈتے ہیں حالانکہ وہ غلطی پر ہیں۔ جو بھی ایمان لائے گا اور صحیح عمل کرے گا۔ وہ خدا کی محبت کو پالے گا اگر نہ پا سکے تو پھر یہ نہ سمجھے کہ کسی خاص بات کی ضرورت ہے۔ بلکہ یہ سمجھے کہ میرے ایمان یا اعمال میں نقص ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو صاف فرما دیا ہے کہ

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا (مریم ۹۶)

یعنی جو لوگ ایمان لائے۔ اور انہوں نے اعمالِ صالحہ کئے ضرور رحمان خدا ان سے محبت کرے گا۔ اب ان واضح الفاظ کے بعد اور کسی ثبوت کی کیا ضرورت ہے۔

۲۷۰۔ اقامة الصلوٰة

يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ کا فقرہ قرآن کے شروع میں ہی آگیا ہے اور اس کے علاوہ سارا قرآن اس مطلب سے بھرا پڑا ہے۔ لفظی معنے اس کے نماز کو کھڑا کرنے کے ہیں اور مطلب اس کا کئی طور پر ہے۔ ۱۔ کھڑے ہو کر نماز پڑھنا۔ ۲۔ باجماعت نماز پڑھنا۔ ۳۔ باقاعدہ نماز پڑھنا۔ یہ نہیں کہ کبھی پڑھ لی اور کبھی چھوڑ دی۔ یا کوئی پڑھ لی

اور کوئی غائب بلکہ تمام عمر بلا ناغہ سب نمازیں ادا کرنا ۲۔ سنوار کر نماز پڑھنا یعنی عمدہ طور سے دل لگا کر تعدیلِ ارکان کے ساتھ مقررہ اوقات پر۔

۲۷۱۔ وحی

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ .... (الشوریٰ ۵۲)

ترجمہ:۔ اور کسی آدمی کی یہ حیثیت نہیں کہ اللہ اس سے وحی کے سوا یا پردے کے پیچھے بولنے کے سوا کسی اور صورت سے کلام کرے

کلامِ الٰہی تین طرح انسان پر نازل ہوتا ہے۔ بذریعہ ۱۔ وحی ۲۔ بذریعہ رویاء وکشوف۔ ۳۔ بذریعہ تنزل ملائکہ۔ اس میں تیسری قسم سب سے زیادہ عظیم الشان ہے اور قرآن مجید اور تیسری قسم کے کلام کا مجموعہ ہے کبھی وہ بذریعہ وحی کے نازل ہوتا تھا کبھی بذریعہ فرشتہ کے۔ وحی کے معنی ہیں براہِ راست بندہ کے کسی حواس پر خُدا کے کلام کا نازل ہونا۔ اس وحی سے پہلے تو ربُودگی ایک قسم کی ضروری ہے۔ یعنی دُنیا کے تعلقات سے انقطاع۔ اور وہ کئی طرح ہوتا ہے کبھی تو غفلت یا غنودگی ہو جاتی ہے کبھی ہوش باقی رہتا ہے۔ مگر سب سامنے کی چیزیں کالعدم ہو جاتی ہیں۔ کبھی صرف آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ غرض حواس کا تعلق دُنیا کی اشیاء سے پورا قائم نہیں رہتا۔ اس انقطاع کے بعد پھر وہ کلام یا تو زبان پر جاری ہو جاتا ہے یا کانوں کو سُنائی دیتا ہے یا لکھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یا دل میں گرتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور دل سے زبان پر آجاتا ہے۔ یعنی مطلب اور مفہوم دل پر نازل ہوتا ہے اور وہاں سے زبان اسے اپنے الفاظ میں خود ادا کر دیتی ہے۔ جو کلام زبان پر جاری ہوتا ہے وہ یا تو سوتے میں جاری ہوتا ہے اور بندہ اس کی آواز سے بیدار ہو جاتا ہے۔ اور اُسے محفوظ کر لیتا ہے یا سمجھ لیتا ہے۔ یا جاگتا ہو۔ تو ایک دم ربُودگی ہو کر زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ہوش بھی آ جاتا

ہے۔ یا بعض دفعہ انسان اپنے کسی خیال میں محو ہوتا ہے تو وہ کلام اس کی زبان پر بے اختیار جاری ہو جاتا ہے۔ لیکن بندہ اپنے اسی خیال میں محو رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بار بار زبان پر آتا ہے۔ تو وہ چونک کر پھر اُدھر متوجہ ہوتا ہے اور اس کلام کو سن کر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب سمجھ لیتا ہے تو پھر اس کی بار بار تکرار بند ہو جاتی ہے اور اس وقت معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کوئی بیرونی کلام تھا۔ جو میری زبان پر میری محویت یا اپنے خیال کے عالم میں جاری تھا۔ اور دیر تک میں اسے سمجھا ہی نہیں۔ پھر اِدھر خیال آیا تو معلوم ہوا کہ وہ کلام خدا کی طرف سے ہے۔ جب اسے محفوظ کر لیا۔ تو وہ نزول بند ہو گیا۔ گویا بندہ کی توجہ دوسری طرف ہوتی ہے۔ مگر کلام اس کی زبان پر گرامو فون کی طرح جاری ہوتا ہے حتّٰی کہ وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور پھر معلوم کرتا ہے کہ اس کی زبان اس وقت کسی بیرونی اثر کے ماتحت چل رہی تھی۔

تمام وہ کلمات جو زبان پر الہامی طور سے جاری ہوتے ہیں۔ ایک قسم کے نہیں ہوتے۔ وہ کبھی آہستہ کبھی درمیانی آواز کبھی بلند آواز سے نکلتے ہیں۔ مگر ہر الٰہی وحی کے ساتھ اس کا اثر دل پر ضرور ہوتا ہے اور ہر وحی حسب ذیل کمال رکھتی ہے ورنہ اس کے الہام ہونے میں شک و شبہ ہے۔

۱۔ اس میں کوئی نیا علم اس ملہم کے لئے ہوتا ہے۔ ۲۔ پیشگوئی یا غیب ہوتا ہے۔ ۳۔ قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ ۴۔ حکم ہوتا ہے۔ ۵۔ بشارت یا انذار ہوتا ہے سب سے زیادہ عام وقت الہام کا تہجد اور صبح کے درمیان ہے۔ لیکن دوسرے اوقات میں بھی ہوتا ہے۔ علاوہ کان، زبان اور تحریر کے باقی حواس پر بھی وحی نازل ہوتی ہے۔ مگر بطور وحیٔ خفی کے نہ کہ لفظی کلام۔ مثلاً حضرت یعقوبؑ کا یوسف علیہ السلام کی قمیض سے ان کی خوشبو سونگھ لینا۔ یا کسی سے مصافحہ کرتے وقت اس کے اندرونہ کا احساس ہو جانا یا کسی شخص کے پاس بیٹھ کر یا نماز میں اس کے ساتھ کھڑے ہو کر اس کی

اندرونی کیفیت کا ایک حد تک محسوس کر لینا یہ سب الہام ہی کی قسمیں ہیں اور جس طرح وحی متلو کے وقت انسان پر ایک کیفیت ایسی طاری ہو جاتی ہے جس کا ذکر احادیث میں آتا ہے کہ حضور پر علاوہ ربودگی کے گرمی اور پھر پسینہ اور چہرہ کا سُرخ ہو جانا وغیرہ نمایاں ہو جاتا تھا۔ اسی طرح الہام کے وقت کچھ نہ کچھ ایسی صورت ضرور پیدا ہو جاتی ہے اور وحی خفی یعنی نزولِ معرفت کے وقت بھی یہ کیفیت کسی قدر ضرور پیدا ہوتی ہے۔ چہرہ گرم اور سُرخ ہو جاتا ہے۔ آواز میں خاص جوش ہوتا ہے۔ اور الفاظ بے تکان و بے تکلف نکلتے چلے جاتے ہیں۔ اور پیچھے سے علم کا دریا امڈتا چلا آتا ہے۔ چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح کے خاص خاص خطبات میں جب یہ حالت شروع ہوتی ہے تو میں فوراً اُسے پہچان لیتا ہوں اور جب ختم ہو جاتی ہے تو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ گویا وہ CURRENT SWITCH OFF ہو گئی ہے۔ یہی حال حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کا دیکھا تھا۔ تقریر فرماتے تھے تو بعض اوقات آدھ گھنٹہ اپنے علم اور زبان کے زور پر چلتے تھے۔ پھر یکدم معلوم ہوتا تھا۔ کہ اب اوپر سے ایک نئی برقی رو سے کنکشن ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ معارف اور علوم کا دریا بہنے لگتا۔ تقریر میں نہایت درجہ روانی آ جاتی۔ چہرہ سُرخ ہو جاتا۔ آواز بلند ہو جاتی اور آنکھیں بند۔ پھر کچھ دیر کے بعد یکدم وہ تقریر ختم ہو جاتی اور ایک BREAK کی کیفیت سُننے والے کو محسوس ہوتی۔ بس پھر خاموش ہو جاتے۔ یہ نمونہ ہے معرفت یا وحی خفی کی رَو کا۔

تحریری وحی علاوہ کسی تحریر کے دکھائے جانے کے خود اپنی تحریک کے دوران میں بھی کبھی شروع ہو جاتی ہے اور انسان لکھتے لکھتے یکدم اپنے ارادہ سے باہر ہو جاتا ہے اور تحریر حسبِ منشاءِ الٰہی جاری رہتی ہے۔ یہاں تک کہ صفحہ دو صفحہ کر کے وہ کیفیت باقی رہتی ہے۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصّہ میرے ارادہ اور میرے منشاء سے نہیں لکھا گیا۔ بلکہ بیرونی الٰہی طاقت نے مجھ سے لکھایا ہے۔ (الفضل ۱۰ اگست ۱۹۳۸ء)

۲۷۲ - مسیح موعود رسول اللہ

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ (البقرہ ۱۳۰)

ترجمہ :- اے ہمارے رب (ہماری یہ بھی التجا ہے کہ تو) انہی میں سے ایسا رسول مبعوث فرما جو اُنھیں تیری آیات پڑھ کر سُنائے اور اُنھیں کتاب اور حکمت سکھائے اور انھیں پاک کرے۔

اے ہمارے رب ان لوگوں میں ایک ایسا رسول مبعوث فرما۔ ۱۔ جو تیرے نشانات ان پر ظاہر کرے ۲۔ ان کو کتاب سکھائے ۳۔ حکمت بتلائے اور ۴۔ ان کو پاک کرے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ انبیاءؑ کے یہ چار کام ہیں جنہیں کرنے کے لئے وہ دنیا میں مبعوث ہوتے ہیں۔ اب اس آیت کے معیار پر ہی پرکھ کر دیکھ لو۔ کہ آیا حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) خدا کے رسول تھے یا نہیں ؟

۱۔ حضور نے دُنیا کے سامنے سینکڑوں تازہ بتازہ نشانات خدا تعالیٰ کے وجود اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی صداقت پر پیش کئے جو حضور کی تمام کُتب خصوصاً حقیقۃ الوحی میں مندرج ہیں۔

۲۔ اسی طرح حضور کی تحریریں اور تقریریں۔ قرآن مجید کی اکثر آیات کی تفسیر سے بھری پڑی ہیں۔ اور حضور نے ایسے ایسے معانی سکھائے ہیں جو دنیا میں ابھی تک نازل نہ ہوئے تھے

۳۔ حکمت اور اسرارِ شریعت اور وجوہاتِ احکام اور کلام اللہ کی باریکیاں اور اسلام کے کمالات عقلی طور سے اس طرح کثرت سے بیان کئے کہ اسلام کی ایک بالکل نئی شان ظاہر ہونے لگی

۴۔ ایک ایسی پاک جماعت تیار کی جو تزکیۂ نفوس میں دُنیا کی ہر جماعت سے ممتاز ہے۔

جن کے عقائد پاک جن کے اعمال پاکیزہ جن کے دل طہارت اور تقدس سے بھرے ہوئے جن کے سینے خدا اور رسولؐ کی محبت سے معمور۔ غرض جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح ان چار باتوں کو اس زمانہ میں نئے طور پر پورا کر کے حضور نے اپنی رسالت پر مہر لگا دی۔ دشمن سے دشمن بھی اعتراف کرے گا کہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے بکثرت نشانات پیش کئے ہیں۔ اور قرآن مجید کے خوب معانی کھولے ہیں۔ اور حکمتِ احکام اور فلسفۂ مسائلِ اسلام کو سب سے بڑھ کر بیان کیا ہے۔ اور ایک عجیب جماعت تیار کی ہے جو دوسرے جملہ اہل مذاہب سے ممتاز ہے۔ تزکیہ کے لحاظ سے گویا خود تسلیم کر لیا کہ وہ نبی اور رسول تھے۔

۲۷۲ ۔ قرآنِ مجید کی قسمیں

وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝
وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۝ (الفجر ۲ تا ۵)

ترجمہ: میں شہادت کے طور پر ایک آنے والی فجر کو پیش کرتا ہوں اور دس راتوں کو بھی اور ایک جفت کو اور ایک وتر کو اور (مذکورہ بالا دس راتوں کے بعد آنے والی) رات کو جب وہ چل پڑے۔

قرآنِ مجید جن چیزوں کی قسمیں کھاتا ہے۔ ان کو بطور شہادت اس صداقت کے پیش کرتا ہے۔ جسے قسموں کے بعد بیان کیا جاتا ہے بعض قسموں میں گزشتہ واقعات کا اشارہ ہوتا ہے اور وہ واقعات نبی یا مذہب یا قوم کی صداقت پر گواہ ہوتے ہیں اور بعض قسموں میں آئندہ کے واقعات کی پیشگوئی ہوتی ہے۔ تا وہ پیشگوئی پوری ہو کر اس زمانہ میں حضور کی صداقت پر گواہ ہو۔ اس قسم میں جو اوپر کی آیات میں ہے۔ دونوں طرح کے معنی موجود ہیں۔

۱۔ اول آئندہ کے لئے پیشگوئی کرنا تا کہ اس پیشگوئی کی صداقت کو دیکھ کر لوگ قرآن پر

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائیں۔ اس صورت میں اس کے معنی یوں ہوں گے۔ فجر سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہے جیسا کہ احادیث میں کسی صحابی کا شعر آتا ہے ؎

وفینا رسول اللہ یتلوا کتابہٗ
اذا انشق معروفٌ من الفجر ساطع

اس کے بعد دس راتیں یعنی دس صدیاں گزریں گی جو شوکت اسلام کی صدیاں ہوں گی۔ پھر دو اور ایک یعنی تین صدیاں اسلام کے تنزل کے زمانہ کی گزریں گی۔ پھر ان تیرہ صدیوں کے بعد ایک عظیم الشان لیلۃ القدر کا زمانہ آئے گا جو مسیح موعود کا زمانہ ہوگا۔ اور یہ سب باتیں پوری ہو کر گواہ ہوں گی۔ اس صداقت کی جو اس سورۃ کی اگلی آیات میں بیان کی گئی ہے۔

۲۔ دوسرا مطلب اس قسم کا گزشتہ واقعات کو بطور شہادت پیش کرنا ہے۔ تاکہ اس سے اگلی آیتوں کے لئے شہادت پیدا ہو سکے۔ پس معنے یوں ہوئے۔ اس فجر کے وقت کو میں بطور گواہ کے پیش کرتا ہوں۔ جس فجر میں کہ ثمود پر عذاب آیا تھا۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ (الحجر: ۸۴)

ترجمہ:۔ اور (وعید کے مطابق) صبح ہوتے (ہی) اس (موعود) عذاب نے انہیں پکڑ لیا۔

اور عاشورہ کی ان دس راتوں کو بطورِ گواہ کے پیش کرتا ہوں۔ جن میں موسیٰ اور بنی اسرائیل نے فرعون سے نجات حاصل کی اور بھاگ کر مصر سے نکل گئے۔ جبکہ فرعون غرق ہوگیا۔ اور جفت اور طاق کی قسم کھاتا ہوں یعنی ان آٹھ راتوں اور سات دنوں کی (سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ (الحاقہ: ۸) جن میں عاد کی قوم تباہ ہوئی۔ اور ہر مذہب و مصائب کی رات کو گواہ پیش کرتا ہوں جس رات میں دنیا میں خدا کا عذاب کسی رنگ میں بھی نازل ہوا۔ اب یہ قرینہ

کہ ان قسموں سے ثمود اور عاد اور فرعون کے عذابوں کے اوقات مراد ہیں۔ اس وجہ سے درست ہے کہ اگلی آیات اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ چنانچہ ۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ (الفجر:۷)

ترجمہ (کیا تجھے معلوم ہے کہ تیرے رب نے عاد سے کیا معاملہ کیا)

اور وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ وَفِرْعَوْنَ ذِى الْاَوْتَادِ

اور کیا ثمود کے متعلق بھی تجھے معلومات ہیں) جو وادیوں میں کھود کر (اپنے مکان) بناتے تھے۔ اور فرعون (کے متعلق بھی تجھے کچھ پتہ ہے) جو پہاڑوں کا مالک تھا

ساری حقیقت کھل گئی۔ باقی وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ (الفجر:۵)

سے عمومی طور پر ہر قسم کے عذاب اور مصائب مراد لے لو۔ کیونکہ عذاب اور آفات ظلمت شب سے مشابہ ہیں اور نافرمانیوں اور بدکرداریوں کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں اور عموماً رات کو ہی نازل ہوتے ہیں۔ جب لوگ غفلتوں میں سرشار اور بدمست پڑے ہوتے ہیں۔ جیسے کوئٹہ کا زلزلہ یا جنگ احزاب کی تیز آندھی یا لوط کی قوم کا عذاب۔ (الفضل ۲۱ اگست ۱۹۳۸ء)

۲۷۴ ۔ بعض تعریفیں صرف بریت کے لئے ہیں

قرآن مجید میں بعض انبیاء کی خاص تعریفیں کی گئی ہیں۔ وہ اس لئے نہیں کہ دوسرے نبی ایسے نہ تھے بلکہ اس لئے کہ لوگ ان کے ذمہ بعض بُرے الزام اور بہتان لگاتے تھے۔ اس لئے ان کی بریت کی گئی۔ دوسروں پر چونکہ ایسے الزام تھے ہی نہیں۔ اس لئے ان کی بریت کی کوئی ضرورت پیش نہ آئی۔ سو یہ باتیں فضیلت کے لئے نہیں بلکہ بریت کے لئے ہیں۔ مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کو کہا گیا اس نے کفر نہیں کیا۔ یہ اس لئے کہ ان کے دشمن یہودیوں

نے ان پر یہ الزام لگایا تھا کہ انہوں نے ملکہ سبا کو اپنے گھر میں بت پرستی کی اجازت دے رکھی تھی۔ بلکہ وہ خود بھی اس شرک میں شریک تھے۔ اسی طرح مسیح علیہ السلام کو کہا کہ خدا تعالیٰ نے ان کا رفع اپنی طرف کیا۔ یہ اس لئے کہ یہود ان کو مصلوب اور ملعون اور خدا کی رحمت سے دُور مانتے تھے۔ اس لئے بریت کی گئی۔ حضرت ابراہیم کو صدیق کہا گیا۔ اس لئے کہ لوگ ان کو جھوٹ بولنے والا کہتے تھے۔ ورنہ یوں تو سبھی انبیاء صدیق ہوتے ہیں۔ مریم کو اس لئے صدیقہ کہا گیا اور اسے اور اس کے بیٹے کو اس لئے مسِ شیطان سے پاک بیان کیا گیا اور ان کو اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا کا سرٹیفیکیٹ دیا گیا۔ کہ اُن پر بدکاری اور ناجائز ولادت کا الزام تھا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور موت کے دن کو سلامتی کا دن اس لئے کہا گیا تاکہ کوئی شخص ایک بڈھے پھونس کے ہاں بیٹا ہونا کسی مشتبہ امر کا نتیجہ نہ سمجھے۔ اور ان کا جوانی ہی قتل ہو جانا اس کی ناکامی کی دلیل نہ بنالے۔ اسی لئے داؤد کو اواب (یعنی ہر وقت خدا کی طرف متوجہ) کہا گیا۔ کیونکہ ان پر غیر کی بیوی کی طرف توجہ کرنے کا الزام تھا۔

۲۷۵ - ایمان کا حصّہ اور انتظام کا حصّہ

جنگِ بدر کے بعد حق تعالیٰ نے جہاد کے متعلق ایک عجیب تفصیل بتائی۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ
عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ
يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ
اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ فَاِنْ يَّكُنْ
مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ
اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ

(الانفال: ۶۶،۶۵)

یعنی اے نبی مومنوں کو جنگ کے لئے آمادہ کرو ۔ اگر تم میں سے بیس صابر آدمی ہوں
گے تو دو سو پر غالب آ جائیں گے ۔ اور اگر سو ہوں گے تو ہزار کافروں پر غالب ہوں گے ۔ یہ
اس لئے کہ کافر بے عقل لوگ ہیں ۔ لیکن اب بتدریج خرد ع میں تم پر تخفیف کی جاتی ہے کیونکہ
تم کمزور ہو ۔ اس لئے اگر سو صابر مومن ہوں گے تو وہ دو سو کافروں پر غالب ہوں گے اور اگر
ایک ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب ہوں گے اور اللہ ان صابرین کے
ساتھ ہے ۔ مطلب یہ کہ آگے چل کر جب ضعف جاتا رہے گا ۔ تو سو مومن ہزار کافر پر غالب
ہوا کریں گے ۔ مگر اب جبکہ تم کمزور ہو تو سو مومن دو سو کافروں پر غالب ہوں گے ۔ یہاں
ضعف کے معنی ضعفِ ایمان کے ہرگز نہیں ہو سکتے ۔ کیونکہ اس زمانہ میں جو ایمان تھا ویسا
پختہ ایمان پھر کبھی دُنیا نے نہیں دیکھا ۔ وہ والسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (التوبہ : ۱۰۰) کا وقت تھا اور
بہترین مخلص ہر طرح جانثار مہاجرین اور انصار اس وقت موجود تھے ۔ پس ایمان کے ضعف
کا سوال نہیں بلکہ یہاں ضعف اور کمزوری سے مراد انتظام اور ORGANIZATION
اور ہتھیاروں ، روپیہ ، تجربہ ، رسد رسانی اور فوجی تیاری کا ضعف مراد ہے ۔ نتیجہ یہ ہے
کہ اگر صرف ایمان ہی ایمان ہو ۔ اور آرگنائزیشن وغیرہ نہ ہو تو ایک مومن دو کافر پر غالب ہے
اور اگر ایمان اور آرگنائزیشن دونوں ہوں تو ایک مومن دس کافروں پر غالب ہے ۔ پس معلوم
ہوا کہ جنگ میں ایمان کی نسبت انتظام اور آرگنائزیشن کا پلہ بہت زیادہ بھاری ہے ۔ یہی
وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جہاد منع کر دیا گیا ۔ کیونکہ یاجوج ماجوج کی فوجی قوت اور آتشیں
ہتھیار اور انتظام یہ سب مل کر ایمانی قوت سے بہت بھاری ہیں ۔ جن کے ساتھ کوئی
فوجی انتظام ان کی برابری کا نہ ہو ۔ غرض اس حساب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جنگ میں ایمان
کا غلبہ اگر ایک گنا ہے تو فوجی انتظام تجربہ لیاقت مل ہتھیار وغیرہ کا درجہ اس کے مقابل
چار گنا ہے ..... پس جو لوگ تنظیم کو وقعت نہیں دیتے اور صرف ایمان کو ہی کافی سمجھ

لیتے ہیں وہ غور کریں یہاں سے بھی خلافت کے نظام کی ایک عظیم الشان اہمیت ثابت ہوتی ہے۔

۲۷۹ - گانا بجانا - اور مزامیر

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ
لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (لقمان ۷)

ترجمہ: اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو (اپنا روپیہ ضائع کرکے) کھیل تماشہ کی باتیں لیتے رہتے ہیں تاکہ بغیر علم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے راستہ سے روکیں اور اس (یعنی اللہ کے راستہ) کو ہنسی کے قابل چیز بنا لیتے ہیں ان لوگوں کے لئے ذلت والا عذاب ہوگا۔

یعنی بعض آدمی لہو و لعب والی بات کو خریدتے ہیں اور وہ لاعلمی میں اوروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ اور اُسے معمولی چیز سمجھتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں وہ اپنی ہی توہین کرائیں گے یہاں لہو الحدیث یا لہو و لعب والی بات سے بزرگوں نے گانا بجانا وغیرہ باتیں مراد لی ہیں۔ اور جب ایک آدمی ایسی بات کرتا ہے تو محلہ والے یار دوست ضرور رونق دیکھ کر اس کے ہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کو بھی گناہگار کرتا ہے۔ آج کل یہ چیزیں گرامو فون اور ریڈیو کے لباس میں ظاہر ہوئی ہیں۔ اور سا گ بلیسے کی سُریلی آوازوں کا چسکا نیشن کے دلدادہ نوجوانوں کو اس میں گرفتار کر دیتا ہے۔ میں ایک قصبہ میں رہتا ہوں۔ وہاں دو درجن ریڈیو اور بیسیوں گرامو فون ہیں جو وقت بے وقت خصوصاً رات کو عشاء کے وقت بجتے ہیں۔ آس پاس کے لوگ بھی جمع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح لہو و لعب کی مجلسیں لگتی ہیں۔ اور اخلاق پر یقیناً ان کا بُرا اثر پڑتا

ہے۔ گانا خود مضر اخلاق۔ اور شہوانی جذبات کو اُبھارتا ہے۔ اُوپر سے یہ غضب کہ ہر روز ایک نئی ننگی ریڈیو میں اپنا کمال دکھاتی ہے اور بہانہ یہ کہ خبریں اور علمی مضمون سُنے جاتے ہیں۔ غرض یہ سینما کی ایک شاخ ہے۔

نابر لوگ تو نرخ کے فقدان سے گھولتے ہیں۔ اور بجائے روزانہ تار منگوانے کے یہ بہت سستا طریقہ ہے نرخ معلوم کرنے کا۔ مگر کیا ہی افسوس ہے ان لوگوں پر جو نماز کے اوقات میں صرف لہو ولعب کے طور پر ان ناجائز مزامیر الشیطان کو کھولتے ہیں۔ اور اس آیت کے آخری حصّہ کو پورا کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی نہیں بلکہ سلسلہ کے تقدس کی توہین کرتے ہیں۔ اور جو غیر لوگ اُن کے یہ تماشے دیکھ کر سلسلہ سے بدظن ہوتے ہیں ان کا گناہ بھی سمیٹتے ہیں۔ کیونکہ پبلک گناہ کا سوسائٹی پر بہ نسبت پرائیویٹ گناہ کے بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ (الفضل ۲۷ اگست ۱۹۳۸ء)

۲۷۷۔ معرفت اور وحی خفی

یہ ایک مشہور بات ہے کہ جب انسان کا اللہ تعالیٰ سے اصل تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ تو بیرونی علم کے سوا اسے معرفت بھی عطا ہوتی ہے جس سے وہ صحیح راستہ اور ہدایت حاصل کرتا رہتا ہے۔ اس معرفت کا کتابوں اور علوم مروجہ سے تعلق نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ خدا اور اس کے دل کے درمیان براہِ راست ایک تار ہوتی ہے جس سے روحانی تحریکیں اور اوامر و نواہی اس کے قلب پر وارد ہوتی ہیں۔ اور یہی معرفت یا علم لدنی ہے اس کے لئے پڑھو اس آیت کو

وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (تغابن ۱۲)

یعنی جو بھی اللہ تعالیٰ پر سچا ایمان لاتا ہے۔ تو خدا تعالیٰ بھی اس کے دل کو براہِ راست ہدایت کرتا رہتا ہے خود بخود ہدایت کی باتیں اس کی سمجھ میں آتی رہتی ہیں۔ اور یہ نتیجہ ہے

خدائے علیم سے تعلق ہو جانے کا۔

۲۷۸ - بنی اسرائیل مصر میں کیوں لائے گئے

حضرت ابراہیم کی اولاد سے اللہ تعالیٰ نے فلسطین کا ملک دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد اُن کو وہ ملک ملا۔ یہ چند صدیاں ان کو مصر میں رکھنے اور وہاں مصائب اور بیگار وغیرہ میں مبتلا کرنے۔ اور پھر جنگلوں میں پھیرتے رہنے کی کیا مصلحت تھی۔ کیوں نہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں ہی وہ وعدہ پورا کر دیا۔ سو واضح ہو کہ اول تو خدا تعالیٰ کسی امن والے ملک میں اُن کا خاندان آباد کر کے اور ان کی نسل کو تعدادی ترقی دے کر ایک بڑی قوم بنانا چاہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ان کو ایک مہذب اور متمدن ملک میں رکھ کر سوسائٹی اور حکومت اور تہذیب کی باریکیوں سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ پھر آخر میں چونکہ جنگ بھی پیش آنے تھے اس لئے جنگلوں میں رکھ کر سخت زندگی اور جرأت و شجاعت ان کو سکھائی۔ غرض امن دے کر چند صدیوں میں ان کو لاکھوں بنا دیا۔ پھر بہترین حکومت اور تہذیب و تمدن سے ان کو واقف کر دیا پھر ان کو جنگی ٹریننگ دی۔ اس کے بعد کہا۔ کہ اب تم قابل ہو گئے ہو۔ یہ ملک سنبھالو۔ اور اس پر حکومت کرو۔ یہ درمیانی تکالیف سب ایک مطلب کے لئے۔ اور ان کے آئندہ فائدہ کے لئے تھیں۔ نہ کہ خواہ مخواہ کی ایذا رسانی کے لئے۔

۲۷۹ - ستّر ہاتھ کی زنجیر

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ○ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ○ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ (الحاقۃ ۳۱ تا ۳۳)

یعنی قیامت میں جب مجرم حاضر کئے جائیں گے تو حکم ہوگا کہ ان کو پکڑ کر طوق

ان کی گردن میں ڈال کر پھر جہنم میں جھونک دو۔ اور ستر ہاتھ کی ایک زنجیر سے انہیں جکڑ دو۔ اس آیت کے حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے بھی ایک معنی بیان فرمائے ہیں۔

لیکن ایک اور معنی بھی جدید تحقیقات علمی کی رُو سے نئے نکلے ہیں۔ وہ یہ کہ انسانی نطفہ میں جو کیڑا ہوتا ہے خواہ مرد کا ہو یا عورت کا۔ اس کے مرکزی حصّہ میں ستر دانے ہوتے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک دانہ کسی عضو کی بناوٹ یا اخلاقی خصوصیت یا ذہنی قابلیت کا حامل اور اس کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ اور یہ ورثہ کے باپ یا ماں کی طرف سے آتا ہے۔ جب حمل ٹھہرتا ہے تو دونوں کیڑے مدغم ہو کر ایک جان ہو جاتے ہیں اور آپس میں اس طرح ۱۴۰ دانے ہو جاتے ہیں۔ جو ددھیال اور ننھیال کی تمام خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد پھر وہ کیڑا دو ٹکڑے ہو جاتا ہے اور ہر ایک ٹکڑے میں ملے جُلے ستر ستر دانے ہوتے ہیں۔ ان دو میں سے صرف ایک ٹکڑے سے بچہ بنتا ہے۔ اور دوسرا ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اب اگر بچہ بننے والے حصّہ کے ان ستر دانوں میں سے چالیس دانے باپ کے ہیں اور تیس ماں کے تو بچہ باپ کی چالیس خصوصیات کا وارث ہوگا۔ اور ماں کی تیس خصوصیات کا۔ اگر ساٹھ دانے ماں کے ہیں۔ اور دس باپ کے تو علیٰ ہذا القیاس ساٹھ باتوں میں ماں سے مماثلت رکھے گا اور صرف دس میں باپ سے۔ یہ ستر کا عدد نسل انسانی کے لئے مخصوص ہے۔ دیگر مخلوقات کے نطفوں کے دانوں میں عدد کا فرق ہے کسی کے مثلاً پچاس ہوتے ہیں۔ کسی کے بیس۔ اور یہی دانے بنیادی اینٹیں انسانی خصوصیات اور اخلاق اور قابلیت کی ہیں۔ اسی لئے جہنمی ان باتوں کے خراب کرنے اور بد استعمال کی وجہ سے جہنم میں ستر ہاتھ کی زنجیر میں جکڑے جائیں گے اور وہاں یہی باریک دانے ستر ہاتھ کی ایک زنجیر کی شکل میں متشکل ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہی انسانی فطرت کی بنیادی کڑیاں یا حلقے ہیں۔ اور ان کی اصلاح کے سوا انسان جنت میں جانے کے قابل نہیں ہوتا۔

۲۸۰ ۔ خدا تعالیٰ کی ہستی پر ایک زبردست دلیل

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (البقرہ : ۱۸۷)

یعنی جو لوگ تجھ سے میری ذات کا ثبوت طلب کریں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں بہت ہی قریب ہوں۔ میرے ملنے اور پالینے میں بہت دیر نہیں لگتی۔ ثبوت یہ ہے کہ مجھ سے دُعا مانگو۔ تو میں اس کا جواب بھی دیتا ہوں اور اُسے قبول بھی کرتا ہوں۔ پس یہ بات یقین کرکے تم اس کی آزمائش کر لو۔ اور مجھ سے مانگ کر دیکھ لو۔ اگر تمہیں یہ دو باتیں حاصل نہ ہوں تو بے شک انکار کر دینا۔ ورنہ ماننے کے سوا چارہ نہیں ۔

کیا کوئی فقیر جب ایک کھڑکی کے آگے کھڑا ہو کر خیرات مانگے اور اس جگہ سے اُسے یا تو خیرات مِل جایا کرے۔ یا اُس کے متعلق کوئی جواب مل جایا کرے۔ تو کون عقل کا اندھا ہوگا کہ پھر وہ یہ کہے کہ اس کھڑکی کے اندر کوئی شخص موجود نہیں ہے۔ پس اگر خدا کے وجود کو فرضی طور پر بھی مان لو۔ اور پھر اس سے دُعا کرو کہ اے وہ جسے لوگ خدا کہتے ہیں۔ اگر تُو ہے۔ تو مجھے اپنی طرف ہدایت دے میں تیرا طالب ہو کر تیرے دروازہ پر آیا ہوں۔ سو اگر قلبی تڑپ سے کوئی بھی یہ دُعا کرے گا تو ہرگز اللہ تعالیٰ اُسے ہدایت سے محروم نہیں رکھے گا ۔ اور انشاء اللہ ایسے نشانات ظاہر کرے گا جس سے اُسے یقین ہو جائے گا۔ کہ کوئی خدا ہے۔ اور وہ اپنے بندوں کی پکار کو سنتا ہے۔ اور ان کو سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ یہ عہد بھی کرے۔ کہ اس طرح نشان دیکھنے کے بعد میں پھر بے ایمانی اور سستی کی طرف سے لاپرواہی نہیں کروں گا ۔ ماننے کی نیت ہو تو یہ راستہ خدا کو پالینے کا بہت آسان ہے ۔ (الفضل ۲ر ستمبر ۱۹۲۸ء)

۲۸۱ ۔ منافق

منافق کے لفظ کا مادّہ نفق ہے۔ جس کے معنے سُرنگ کے ہیں یا چوہے کے سوراخ کے کہ ایک طرف سے آیا اور دوسری طرف سے نکل گیا۔ اور گو منافق کا لفظ عموماً اُن لوگوں پر بولا جاتا ہے۔ جو ظاہر میں مومن اور اندر سے کافر ہوں۔ مگر منافق اُسے بھی کہتے ہیں جس کا ایمان کمزور ہو۔ اور اس میں سرنگ یا سوراخ ہو چکا ہو۔ خواہ ظاہر و باطن اس کا یکساں ہوتا ہے چنانچہ ایک ایسا آدمی ہوتا ہے جو خود دین اور سلسلہ پر ہمیشہ اعتراض کرتا رہتا ہے اور بے دھڑک کہتا ہے کہ ہم منافق تھوڑا ہی ہیں کہ ظاہر میں کچھ کہیں اور باطن میں کچھ رکھیں حالانکہ یہ خود نفاق کی علامت ہے۔ ہر منافق کے لئے ضروری نہیں کہ ضرور اس کا ظاہر و باطن مختلف ہو۔ بلکہ بعض ایسے ہوتے ہیں اور بعض صرف کمزور ایمان شکوک شبہات میں مبتلا اور ہر وقت معترض رہنے والے۔

۲۸۲۔ استعارۂ زبان

• قرآن مجید میں بعض ایسے مقامات ہیں۔ جہاں لفظی ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بلکہ وہاں زبان کا محاورہ یا استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی لفظی ترجمہ کرے۔ تو مطلب ہی نہیں بنتا۔ مثلاً الَّذِیْ بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ (البقرہ: ۲۳۸) جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے حالانکہ نہ نکاح میں کوئی گرہ ہوتی ہے۔ نہ وہ کسی کے ہاتھ میں دی جاتی ہے اسی طرح بکثرت محاورات اور زبان کی بندشیں ہیں۔ جن کا لفظی ترجمہ مان کر لوگ غلطیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ نمونہ کے طور پر دیکھو حسب ذیل آیات

فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ (الاعراف: ۱۴۶)

ترجمہ: ان احکام کو مضبوطی سے پکڑ لے

فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ (آل عمران، ۱۸۸)

ترجمہ: مگر باوجود اس کے اُنھوں نے اسے اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا۔

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ (البقرہ، ۱۶۹)

ترجمہ: اور شیطان کے قدم بقدم نہ چلو

اَفَلَا یَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ (الانبیاء، ۴۵)

ترجمہ: پس کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم اُن کے ملک کی طرف بڑھ رہے ہیں اور کناروں کی طرف سے اس کو چھوٹا کرتے جا رہے ہیں۔

اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ (الصّٰفّٰت، ۲۹)

ترجمہ: تم ہمیشہ ہماری دائیں طرف سے آتے تھے۔

فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ (الاحزاب، ۳۳) وغیرہ

تذکرۃ الاولیاء میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک مرید اپنے پیر کے حجرہ میں داخل ہوا۔ تو پیر نے اس سے ذکر کیا۔ کہ ایک شخص میرے پاس آیا تھا۔ میں نے اُسے شرم و حیا کے بارہ میں خوب وعظ کیا۔ یہاں تک وہ پانی پانی ہو گیا۔ مرید صاحب ذرا مرفوع العقل کے تھے۔ انہوں نے کہیں حجرے کے کونے میں اس وقت وضو کا پانی بھی گرا ہوا دیکھ لیا۔ باہر آکر یہ مشہور کر دیا کہ ایک آدمی آج پیر جی کے پاس آیا تھا حضور نے اسے حیا کی بات ایسا لیکچر دیا۔ کہ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے پانی ہو گیا۔ اور میں نے خود پانی حجرے کے کونہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا جس پر کیا تھا۔ سادہ طبع لوگ اس کرامت کو لے دوڑے۔ اور زبان کے ایک لطیف استعارہ کو برباد کر کے ایک غلط کرامت بنا لی گئی۔

ایسے ہی استعارہ اَسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (الاعراف، ۵۵)

ترجمہ: پھر (اس کے بعد) وہ (حکومت کے) تخت پر مضبوطی سے قائم ہو گیا۔

اور كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (ہود ۸:۱)
ترجمہ: اس کا عرش پانی پر ہے۔
اور يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ (القلم ۴۳)
ترجمہ: جس دن مصیبت کا وقت آ جائے گا۔
اور أُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ (البقرہ ۹۳:۱)
ترجمہ: ان کے کفر کے سبب سے ان کے دلوں میں بچھڑا (یعنی اس کی محبت کا جذبہ) گھر کر گیا۔

۔ میں موجود تھے۔ مگر واہ رے لفظ پرستی کہ کتابوں میں یہاں تک لکھ دیا گیا۔ کہ بچھڑے کو پانی میں گھول کر بنی اسرائیل کو پلا دیا گیا۔

۲۸۳ ۔ نیک ظنی کی حدود

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ (الحجرات ۱۳)

اے مومنو! بہت بدگمانی سے بچو کیونکہ بعض بدظنی گناہ ہے۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ نیک ظنی کا ہی حکم نہیں ہے۔ بلکہ ہمیشہ اور ہر موقعہ کی بدظنی سے منع کیا گیا ہے اور بعض بدظنیوں کو گناہ بتایا گیا ہے۔ نہ کہ سب کو تفصیل اس اجمال کی یہ ہے۔ کہ اگر ہر شخص کی بابت ہر حالت میں نیک ظنی کو ہی مسلک بنایا جائے۔ تو بڑا نقصان ہوا کرے۔ شیاطین ٹھگ اور چالاک لوگ دھوکے دیا کریں۔ اور طرح طرح کے فساد کھڑے کر دیا کریں۔

حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی خدمت میں بھی یہ مسئلہ پیش ہو چکا ہے حضور نے یہی فرمایا کہ عادتاً بدظنی کو منع کیا گیا ہے۔ اگر کوئی نیک آدمی پچھلی رات کو گلی میں جا رہا ہو تو اس پر ہم کو یہی نیک ظنی کرنی چاہیئے۔ کہ تہجد کے لئے اٹھا ہوگا۔ لیکن اگر کوئی بدمعاش ہو

اس وقت دکھائی دے۔ اور ہم اس پر بدظنی کرکے اس کا تعاقب نہ کریں۔ تو وہ ضرور نقب لگا کر کہیں نقصان پہنچائے گا۔ اگر پولیس ہر ایک مجرم پر حسن ظنی کرے۔ تو کوئی بھی نہ پکڑا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جرم کی واردات پر وہ سب بدمعاشوں کو اکٹھا کرکے پوچھ گچھ کرتے ہیں۔ اور اس طرح اصلی مجرم کا پتہ لگ جاتا ہے۔ غرض جن لوگوں کی نسبت ثابت ہے کہ وہ بُرے اور شریر مشہور ہیں ان پر حسن ظنی کرنا اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنا ہے۔ ہاں جو لوگ ایسے نہیں ان پر حتیٰ الوسع نیک ظنی ہی رہنا چاہیئے۔ ورنہ حسن ظنی پر بے حد زور دے کر انسان تو شیطان اور شیطانی لوگوں پر بھی حسن ظن کرے گا۔ اور ہلاکت میں گرفتار ہوگا۔ کیونکہ شیطان عدو اللہ ہے۔ اور اس پر نیک ظنی کرنی کسی صورت میں جائز نہیں۔

۲۸۴۔ نشوں کی ممانعت

سوال کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں شراب کے سوا اور نشوں کی ممانعت کہاں ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ علاوہ آیت

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (المؤمنون: ۴)

ترجمہ: اور جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔

کے جس میں غیر مفید اور لغو اشیاء کی ممانعت کی گئی ہے۔ جو وہ کھانے پینے کے متعلق جو مشہور آیت كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا کی ہے۔ اس میں وَلَا تُسْرِفُوْا کے معنی یہ بھی ہیں کہ ایسی اشیاء نہ کھاؤ اور نہ پیو جو اسراف میں داخل ہیں۔ اور ان کے کھانے پینے کی ضرورت بحیثیت غذا اور اکل و شرب کے ہم کو نہیں ہے۔ بلکہ محض زیادتی کے طور پر لوگ ان کو لگا لیتے ہیں اور جن کا خرچ ضروری اخراجات میں داخل نہیں ہے۔ بلکہ محض اسراف کے طور پر کیا جاتا ہے۔ روٹی سالن، پھل، ترکاریاں وغیرہ سب غذا ہیں اس لئے كُلُوْا کے ماتحت آتے ہیں۔ دودھ، شربت پانی۔ یہ سب طیب اور زندگی کے لئے ضروری یا مفید ہیں۔ لیکن افیم۔ تمباکو، چرس اور

بھنگ یہ جسم انسانی کے لئے غیر ضروری۔ بلکہ مضر ہیں۔ اور ان کو روپیہ خرچ کرکے استعمال کرنا صریح اسراف ہے۔ پس لَا تُسْرِفُوْا کے ماتحت ان کی عادت منع ہے۔ اور وہ سب ناجائز ہیں۔ ہاں کسی بیماری کے ماتحت کوئی منشی چیز استعمال کرنی پڑے تو وہ علاج میں داخل ہے۔ نہ کہ اسراف میں۔ (الفضل ۹ ستمبر ۱۹۳۸ء)

۲۸۵۔ خلیفہ راشد

بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ خلیفہ کے معنی تو ہیں جانشین کے۔ مگر خلفائے راشدین کا لفظ مسلمانوں میں بہت مستعمل ہے۔ اس کا کیا مطلب ہوا اور راشد خلیفہ کیسا خلیفہ ہوتا ہے۔ اس کی کیا تعریف ہے۔ سوال کا جواب قرآنِ مجید نے اس طرح دیا ہے۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ (الحجرات ۸)

یعنی راشد وہ شخص ہے جس کو ایمان سے نہ صرف محبت ہو۔ بلکہ اس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے نورِ ایمان سے آراستہ کیا ہو۔ اور کفر اور فسق اور گناہ سے اُسے سخت نفرت ہو۔ پس جو بھی خلیفہ راشد ہوگا۔ اس میں یہ صفات ضرور ہوں گی۔

۲۸۶۔ ہم عصری بھی ایک مصیبت ہے

اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا (الفرقان ۴۲)

ترجمہ: کیا اللہ نے اس شخص کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔

انسان اپنے جیسے انسان کی بات ماننے۔ اور اس پر ایمان لانے میں اپنی بڑی ذلت محسوس کرتا ہے۔ ہم جنس ہونا۔ ہمعصر ہونا۔ ہم وطن ہونا۔ ہم قوم ہونا۔ یہ سب

باتیں نیکی اور ایمان کے راستہ میں روک بن جاتی ہیں۔ اس سلسلہ کے مخالفین یہ بھی تو یہی کہتے ہیں۔ کہ مکہ مدینہ میں مسیح موعود کیوں نہیں آیا۔ پنجاب میں کیوں آیا۔ بنی اسرائیل والا مسیح ناصری کیوں نہیں آیا۔ اُمّتِ محمدیہ میں سے کیوں آیا۔ سادات میں سے مہدیؑ کیوں نہیں آیا۔ مغلوں میں سے کیوں آیا۔ ایک زمینی انسان کیونکر ہم پر مبعوث ہوگیا۔ حالانکہ ہم پر تو وہ آنا چاہیئے تھا۔ جو دو ہزار سال آسمان پر رہ کر آسمانی بن چکا ہوتا۔ لیکن جب یہ زمانہ گزر جائے گا تو پنجاب شریف اور قادیان دارالامان اور متبرک بنو فارس اور بابرکت چودھویں صدی کے الفاظ بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ جائیں گے۔ اور حضور کے روضہ مبارک کی زیارت کو لوگ پاپیادہ جوق جوق ملک کے مختلف گوشوں سے آیا کریں گے۔ سچ ہے ؎

امروز قوم من نشناسد مقام من
روزے بگریہ یاد کند وقت خوشترم

۲۸۷۔ سُنّت

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی نسبت اس کا معلّم زیادہ ضروری اور مقدم ہے۔ غلط کہتے ہیں۔ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ بس کتاب الہٰی کافی ہے معلّم کی ضرورت نہیں۔ بلکہ معلّم کی ضرورت ہر زمانہ میں ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ عملی حصہ کتاب کا سوائے معلّم کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اسی لئے دین کے خاص عملی حصہ کی تفصیل قرآن مجید نے نہیں دی۔ اور اگر اتنی تفصیل بھی ہوتی۔ کہ موجودہ قرآن سے سوگنا قرآن بن جاتا۔ تب بھی عملی تفاصیل بغیر نمونہ کے کبھی سیکھی نہ جاسکتیں اور یہ بات صرف دین کے محکمہ میں ہی نہیں ہے بلکہ دُنیا کے ہر علم اور ہر محکمہ کا یہی حال ہے۔ یہی حکمت ہے۔ کہ کتاب الہٰی نے نماز کے ارکان اور کیفیت اور حج اور ذبح اور حرام حلال وغیرہ کی تفصیل بیان نہیں فرمائی۔ اسی بات کا نام سنّت ہے۔ اور یہ سُنّت قرآن اور حدیث دونوں سے بالکل الگ چیز ہے۔

چکڑالوی جو قرآن کو کافی سمجھتے ہیں ان کو بھی مجبوراً اپنے اکثر اعمال میں سُنّت کی پیروی کرنی پڑتی ہے۔ گو وہ مُنہ سے اقرار نہ کریں۔ فرض کرو کہ قرآن مجید کا ایک ترجمہ اسکیمو زبان میں کر کے کوئی چکڑالوی ایک اسکیمو کے ہاتھ میں دے کر چلا آئے اور یہ امید رکھے کہ وہ شخص اس کتاب کو پڑھ کر مسلمان ہو گیا ہوگا۔ اور پھر دین کے تمام مسائل پر صحیح طور سے عامل بھی ہو گیا ہوگا۔ اور نماز، روزے، حج، زکوٰۃ، نوافل اخلاق باتیں۔ اور عملی صورت اور سیرت اس کی مسلمانوں کی طرح ہو گئی ہوگی تو یہ بات ایک تمسخر اور خیالِ خام سے بڑھ کر وقعت نہیں رکھے گی۔ ہاں اگر کوئی احمدی وہاں جاتا۔ اور اس کو تعلیم قرآن دیتا۔ اور ہر مرحلہ پر اسے دین کے عقائد اور اعمال سکھاتا۔ اور خود نمونہ بنتا۔ اور اس کی تربیت کرتا۔ تب یہ باتیں ممکن تھیں۔ پس یہ ہے معلم کی ضرورت۔ اور یہی ہے مجدد کی ضرورت اور یہی ہے نبی کی ضرورت۔ کتاب کی ضرورت الگ ہے۔ اور معلم کی الگ۔

۲۸۸ - اعتدال بہترین طریقہ ہے

حقیقی اسلامی تعلیم یہی ہے۔ کہ جائز اور حلال اشیاء میں بھی اعتدال ہو یعنی نہ بالکل ایسی چیزیں اپنے پر حرام کر لی جائیں۔ نہ حلال اور طیب کی آڑ میں اتنی کثرت اور شدت ہو کہ روحانیت پر مُردنی آ جائے۔ اس لئے تو فرمایا گیا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (المائدہ ۸۸)

اے مومنو نہ تو پاکیزہ چیزوں کو اپنے پر حرام کر لو۔ اور نہ کثرت حلال کی وجہ سے دوسری طرف حد سے زیادہ بڑھ جاؤ۔ خدا تعالیٰ حد سے بڑھ جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

۲۸۹ - انبیا کی اجتہادی غلطی

لوگ اِس کے لئے عموماً

إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ (الحج، ۵۳)

ترجمہ ۔ جب بھی اس نے کوئی خواہش کی شیطان نے اس کی خواہش کے رستہ میں مشکلات ڈال دیں ۔

والی آیت پیش کیا کرتے ہیں ۔ ایک اور حوالہ بھی اس بارہ میں ہے ۔ وہ آیت یہ ہے ۔

قُلْ إِن ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي ۖ وَإِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوحِي إِلَيَّ رَبِّي (سبا: ۵۱)

یعنی اگر کبھی مجھ سے بھول چوک ہو جاتی ہے ۔ تو یہ میری بشری کمزوری یا میرے نفس یعنی میرے اپنے اجتہاد کی وجہ سے ہے اور جو بات صحیح اور درست ہوتی ہے ۔ وہ میری الہامی یعنی وحی والی بات ہوتی ہے

۲۹۰ ۔ سب قصور معاف کر کے سویا کرو

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (النور، ۲۳)

پس چاہیئے کہ وہ معاف کریں ۔ اور درگزر کریں ۔ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تم کو بخش دے ۔ اللہ تو بخشنے والا مہربان ہے ۔ اگر انسان لوگوں کو معاف کرنے اور درگزر کرنے کی عادت ڈال لے ۔ تو یوں بھی اس کا دل خوش رہتا ہے ۔ اور خدا کے ہاں سے بخشش کا وعدہ ہے ۔ علاوہ برآں سب سے آسان طریقہ اس عمل کا یہ ہے ۔ کہ جب رات کو سونے لگے تو زبان سے یہ الفاظ واضح طور پر بلکہ آواز سے کہے کہ " اے اللہ مجھے کسی بھائی سے ملت

نہیں ہے اور اگر کسی نے میرا کسی قسم کا قصور بھی کیا ہے۔ تو وہ میری طرف سے معاف ہے تو بھی اسے معاف کر۔ اور مجھے اپنے فضل سے بخش دے۔"

میرا تو یہ سال ہا سال کا مجرب عمل ہے۔ اور کبھی میں نے کسی شخص کی بابت اپنے دل میں عداوت اور کینہ نہیں محسوس کیا۔ اور کبھی میں کسی کا بغض اپنے دل میں لے کر نہیں سویا۔

(الفضل ۱۴ ستمبر ۱۹۳۸ء)

۲۹۱ ۔ بچوں کو ذبح کرنا

يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ (البقرہ:۵۰)

یعنی فرعونی لوگ تمہارے لڑکوں کو ذبح کر دیا کرتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔ عام لوگ بنی اسرائیل کے متعلق یہی سمجھتے ہیں کہ ان کے لڑکے بکروں کی طرح چھری سے ذبح کئے جاتے تھے۔ حالانکہ یہ طریق ایسا مکروہ ہے کہ ظالم سے ظالم بھی بکروں کی طرح باقاعدہ ایک قوم کے بچوں کو اس طرح ہلاک نہیں کر سکتا۔ ذبح کے معنی بموجب قرآن محض قتل کے بھی ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ سورہ اعراف: ۱۴۲ میں يُقَتِّلُونَ أَبْنَاءَكُمْ فرمایا۔ اور لغت کی رُو سے ذبح گلا گھونٹنے کو بھی کہتے ہیں۔ قرین قیاس یہی ہے کہ یا تو دائیاں پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتی ہوں گی۔ جیسا کہ دختر کشی کے زمانہ میں اس ملک میں بھی رواج تھا کہ لڑکیوں کا گلا گھونٹ دیا جاتا تھا۔ یا جیسا کہ عموماً ولد الحرام بچوں کے مارنے کا دستور ہے۔ کسی نالی یا تالاب کے کنارے جا کر ان کو پانی میں پھینک دیا جاتا تھا۔ تورات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے جہاں لکھا ہے کہ

"فرعون نے اپنی قوم کے سب لوگوں کو تاکید اً کہا کہ ان میں جو بیٹا پیدا ہو۔ تم اسے دریا میں ڈال دینا۔ اور جو بیٹی ہو۔ اُسے جیتی چھوڑنا۔"

(خروج باب ۱)

کیونکہ روز روز چھری لے کر بچوں کو بھیڑ بکری کی طرح ذبح کرتے پھرنا ایک ناقابل

برداشت فعل ہے۔ مگر دریا میں پھینک دینا یا گلا گھونٹ دینا ایسا فعل ہے جو بچوں سے ہیش کیا جاتا ہے اور نسبتاً قابلِ برداشت ہے۔

۲۹۲۔ کثرتِ غیب کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (الجن ۲۷،۲۶)

ترجمہ: اور وہ اپنے غیب پر کسی کو غالب نہیں کرتا سوائے ایسے رسول کے جس کو وہ اس کام کے لیے پسند کرلیتا ہے۔

یں اظہار علی الغیب کے معنی اکثر جگہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے یہ کئے ہیں کہ وہ غیب کیفیت اور کمیت دونوں لحاظ سے ممتاز ہو۔ ان الفاظ کو عام لوگ بعض دفعہ نہیں سمجھتے۔ سو کیفیت کی زیادتی یہ ہے۔ کہ غیب ایک ہی قسم کا نہ ہو۔ بلکہ طرح طرح کا اور مختلف ہو۔ مثلاً کبھی اولاد کے متعلق پیشگوئی کبھی دوستوں کے متعلق کبھی دشمنوں کے متعلق کبھی مختلف ملکوں کی نسبت، کبھی حکومت کی نسبت، کبھی علمی رنگ کی، کبھی اقتداری، کبھی مہری، کبھی قہری، کبھی زلزلوں کی کبھی موسموں کی۔ غرض دنیا کے ہر محکمہ کی بابت پیشگوئی ہو اور کمیت یہ کہ تعداد میں کثرت ہو۔ یہ نہیں۔ کہ دو چار پیشگوئیاں کر دیں۔ بلکہ اس کثرت سے یہ پیشگوئیاں ہیں کہ ایک ایک آدمی اور ایک ایک جماعت اور ایک ایک اینٹ قادیان کی۔ اور ایک ایک خط جو ڈاک خانہ میں آتا اور جاتا ہے۔ اور ایک ایک دانہ رزق کا جو سلسلہ کے لئے نازل ہوتا ہے۔ اور ایک ایک نکتہ علم کا جو نازل ہوتا ہے۔ اور ایک ایک ذلت جو کسی دشمن کے حصہ میں آتی ہے۔ اور نصرت جو جماعت کو عطا ہوئی۔ سب پیشگوئیوں کے ماتحت ہیں اور یوں بھی سینکڑوں غیبی خبریں ہیں جو حضور کی زندگی میں اور وفات کے بعد پوری ہوئیں۔ اور ان کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔

۲۹۳ - ظاہر سے باطن کی طرف

قرآن مجید ظاہری معنوں یعنی جسمانی باتوں سے باطن یعنی روحانی معانی کی طرف لے جاتا ہے۔ مثلاً دانہ، نباتات کے دوبارہ اُگنے سے حشرِ اجساد کی طرف۔ ظاہری سورج سے نبی کی ضرورت کی طرف۔ ظاہری بارش سے وحی الٰہی کے پانی کی طرف۔ اندھیروں اور ظلمتوں سے کفر اور شرک کی طرف۔ مالکوں اور بادشاہوں سے اصلی مالک اور بادشاہ کی طرف۔ تمام قرآن ان اشارات اور استعارات سے بھرا پڑا ہے۔ مثلاً لیلۃ القدر سے شب قدر بھی مراد ہے۔ اور مجدد کا زمانہ بھی۔ یا آنکھ سے ظاہری آنکھ کے علاوہ اندرونی آنکھ یعنی بصیرت وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ سے ظاہری اور ساتھ ہی باطنی گندگی سے بچنے کا حکم ہے۔ عذاب جہنم سے علاوہ آگ کے عذاب کے دلوں کی سوزش اور جی جلنا۔ اور کڑھنا بھی مراد لیا ہے اسی طرح

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ (النسآء ، ۳۵)

ترجمہ ، اور جن کی نافرمانی کا تمہیں خوف ہو (تم) اُنھیں نصیحت کرو اور اُنھیں خواب گاہوں میں اکیلا چھوڑ دو اور اُنھیں مارو

سے شرارت کرنے والی عورتیں ظاہری طور پر مُراد ہیں۔ مگر اپنے شریر نفس بھی مراد ہیں۔ اگر وہ سیدھے نہ ہوں۔ تو پہلے ان کو دلائل کے ساتھ نشیب و فراز سمجھاؤ۔ پھر نہ مانیں۔ تو ان کو تہجد کے لئے اپنے بستروں سے الگ کرو۔ پھر بھی کوتاہی کریں۔ تو نفس کشی کے جائز طریقے اختیار کرو۔ مثلاً روزے رکھنا۔ یا انہیں بعض نعمتوں سے محروم کر دینا وغیرہ۔ اسی طرح لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (واقعہ ، ۸۰) کے یہ معنی بھی ہیں کہ جنبی اور حائضہ اور ناپاک اُسے ہاتھ نہ لگائیں۔ اور یہ بھی کہ سوائے پاکباز انسانوں کے اور لوگ اس کتاب سے کچھ مَس ہی نہیں رکھتے۔

۲۹۴ ۔ شیطان کس طرح اعمال کو زینت دیتا ہے

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ (نحل : ۶۳)

ترجمہ :۔ اللہ کی قسم ہم نے تجھ سے پہلے کی تمام اُمتوں کی طرف رسول بھیجے تھے پھر اُنہیں شیطان نے ان کے (بد) اعمال خوبصورت کر کے دکھائے ۔

شیطان کبھی تو بدی کراتا ہے کبھی نیکی سے روکتا ہے اور کبھی نیکی کی تعریف کر کے اس نیک کو ہلاک کر دیتا ہے۔ پس جب بھی کوئی اپنی نیکی تم کو فخر و تکبر میں مبتلا کرے ۔ یا یہ خیال آئے ۔ کہ یہ جو فلاں شخص نے مجھے نیکی کی تحریک کی ہے ۔ میں اس سے بڑھ کر فلاں نیکی پہلے ہی سے کر رہا ہوں ۔ اس لئے مجھے اس کی ضرورت نہیں ۔ یہ شیطانی وسوسہ ہے ۔ بہت سے بظاہر پابند شریعت لوگ اس سلسلہ حقہ سے اسی لئے محروم رہ گئے کہ شیطان نے ان کو کہا کہ آپ لوگ تو پہلے ہی بڑے نیک نمازی پرہیزگار اور بزرگ ہیں آپ کو نیا سلسلہ ماننے کی کیا ضرورت ہے ۔

۲۹۵ ۔ حِلٌّ

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ (البلد : ۲،۱)

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر (مکہ) کی اور تو حِلٌّ ہے ۔ اس شہر میں یعنی تو اس شہر میں اُترا ہوا ہے ۔ اور تیرے قیام کی وجہ سے ۔ یہ شہر اتنا معزز اور مکرم ہے کہ خدا تعالیٰ اس کی قسم کھاتا ہے ۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ تیرا خون اس شہر میں حلال سمجھا گیا ہے ۔ حالانکہ باقی سب مخلوق کے خون یہاں حرام سمجھے جاتے ہیں اور تیسرے معنے یہ ہیں کہ تو اس شہر میں حلال ہونے والا ہے ۔ یعنی تیرے لئے اس شہر کی حرمت توڑ دی جائے گی ۔ یہ پیشگوئی

ہے کہ باوجود ہمیشہ سے محرم خدا ذمی ہونے کے جب تو اُسے فتح کرے گا۔ تو ایک دن کی چند ساعتوں کے لئے وہ حرمت دُور کردی جائے گی۔ (الفضل ۱۹ ستمبر ۱۹۳۸ء)

۲۹۶۔ خدا کی رحمت سے ناامیدی

قرآن مجید کی ایک نہایت مشہور آیت ہے کہ

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (الزمر: ۵۴)

یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کبھی نااُمید نہ ہو۔ اس کا مطلب سمجھنے اور خصوصاً اسے چسپاں کرنے میں لوگ کئی دفعہ غلطی کھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں اپنا ہی کئی بار کا تجربہ بیان کرتا ہوں۔ ایک آدمی بیمار میرے پاس لایا گیا۔ آخری درجہ دق کا۔ کمزور، لاغر اور قریب المرگ۔ موت چہرے پر نمایاں۔ میں نے اُسے دیکھا اور اپنے گھر واپس بھیج دیا۔ اس کا کوئی عزیز مولوی اسے گھر پہنچا کر پھر واپس شفاخانہ آیا۔ اب اس سے گفتگو شروع ہوئی۔

مَیں۔ مولوی صاحب دق کا آخری درجہ ہے۔ انتڑیاں گل گئی ہیں پھیپھڑے بھی خراب ہیں شفا کی کوئی امید نہیں۔

مولوی صاحب۔ حضرت یوں نہ فرمائیے لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ہم تو آخری سانس تک ناامید نہیں ہوسکتے۔ حدیث میں بھی ہے کل داء دواء ہم تو امید شعار رہیں گے اور ہر مرض کی دوا ہے۔ آپ ہمیں ناامید کیوں کرتے ہیں۔

مَیں۔ مولوی صاحب بیمار کی تسلّی کے لئے تو مَیں آپ کو کوئی نہ کوئی دوا دے دوں گا۔ لیکن آپ نے آیت اور حدیث دونوں کے معنی غلط سمجھے ہیں۔ حدیث لکل داء دواءٌ کا دوسرا فقرہ آپ کھا گئے ہیں یعنی الا الموت۔ واقعی ہر بیماری ایک خاص درجہ تک بیماری کہلاتی ہے اور اس کا علاج ہے۔ مگر اس درجہ سے آگے اُسے بیماری نہیں کہتے بلکہ موت کہتے ہیں۔ اس لئے شارع نے پہلے ہی اس کا استثنا کر دیا ہے۔ موت سے مراد واقعی

مرجانا نہیں۔ بلکہ ہر بیماری کی وہ حالت بھی موت ہی کہلاتی ہے۔ جب وہ جسم کو اتنا کھا چکی ہو کر بچنا محال ہو۔ سو اکثر بیمار اس موت کے درجہ میں علاج کرانا چاہتے ہیں اور سند لکلِ داءٍ دواءٌ کی پیش کرتے ہیں۔

مولوی صاحب :۔ لیکن لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ تو قرآن میں موجود ہے۔ اور ایک دوسری آیت میں رحمت سے نا امید کا نام کافر رکھا گیا ہے۔

میں :۔ یہ درست ہے۔ میں نے بیمار کے متعلق یہ تو نہیں کہا۔ کہ وہ میرے نزدیک خدا کی رحمت سے نا امید ہے۔ میں نے تو اس کی شفاء سے نا امیدی ظاہر کی ہے نہ کہ رحمتِ خداوندی سے۔ رحمت تو جینے والے اور مرنے والے دونوں پر ہوتی ہے۔ اور بعض دفعہ موت بھی رحمت ہے۔ اور تکلیف غربت اور ایذا بھی گناہ کا کفارہ ہو کر رحمت میں داخل ہوتی ہے۔ پس شفا بھی رحمت ہے اور موت بھی لَا تَقْنَطُوْا مِنَ الشِّفَاءِ نہیں بلکہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ہے یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ کس شخص کے لئے کیا چیز رحمت ہے۔ پس رحمت صرف اسی چیز کو سمجھنا جو ہمارے مطلب کی ہو۔ اور ہمارے خیال میں رحمت ہو غلط ہے۔ حضرت خضر نے جس لڑکے کو مارا تھا وہ خدا کے نزدیک تو رحمت تھی۔ مگر اس کے ماں باپ کے نزدیک مصیبت تھی۔

مولوی صاحب :۔ آپ شاید اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کو بھی نہیں مانتے۔ کیا وہ ایسے بیمار کو شفا نہیں بخش سکتا۔

میں :۔ بے شک شفا بخش سکتا ہے۔ مگر اسے آپ کی خاص خوشامد اور خاطرداری منظور نہیں معلوم ہوتی۔ وہ خود چاہے تو قادر ہے۔ لیکن اگر آپ کی خواہش پوری کرے تو قادر کہلائے ورنہ نہیں۔ یہ بات غلط ہے۔ خدا میں قدرت ہونا اور بات ہے اور آپ کی مرضی کے مطابق اس قدرت کا ظاہر کرنا اور بات ہے۔ اب تو اس کی مشیت یہ نظر آتی ہے کہ اس بیمار کو دوسرے عالم میں لے جا کر شفا بخشے نہ کہ اس عالم میں۔ باقی ہمارا علم

سو وہ بھی کچھ چیز نہیں۔ تاہم وہ آپ کے غلط استنباط سے تو باطل نہیں ہو جاتا۔ لہٰذا یہ نسخہ لیجئے۔ اور اپنی اور بیمار کی تسلی کیجئے۔

۲۹۷ - یہ تزکیہ بڑے ہمت والے کا کام ہے

وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ (النور ۲۹)

یعنی جب تم کسی سے ملنے جاؤ اور وہ کہلا بھیجے کہ میں اس وقت نہیں مل سکتا۔ آپ تشریف لے جائیے یا پھر کبھی آیئے۔ تو تم واپس چلے آؤ۔ یہ بہت پاکیزہ بات ہے لیکن دیکھا جائے تو اس پر عمل بڑی ہمت اور مجاہدہ کا کام ہے۔ خاص کر بڑے آدمیوں کے لئے تو گھر کے اندر سے ایسا جواب آنا موت ہے۔ گویا کسی نے ان کو سخت بے عزت کر دیا حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات تزکیہ نفس کا ایک ذریعہ ہے۔ بعض لوگ تو کسی کی غیر حاضری میں اس کے گھر جائیں۔ اور وہ وہاں نہ مل سکے۔ تو اس بیچارے پر احسان رکھتے ہیں کہ میں آپ کے گھر گیا تھا مگر آپ وہاں نہ تھے۔ اس پر وہ گھر والا افسوس کرتا ہے اور معذرت کرتا ہے۔ مگر ان کو پھر بھی ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم گئے اور یہ کیوں وہاں موجود نہ تھا۔ بھلا ایسے آدمی کو کوئی کہہ تو دیکھے۔ کہ گھر والا کہتا ہے میں کچھ مصروف ہوں آپ پھر آیئے۔ شاید اس کے اس فعل سے ساری عمر کے لئے وہ اس سے قطع تعلق کرے گا۔ اور ہمیشہ اس کی شکایت کرتا رہے گا۔

۲۹۸ - وہ کون ہے ؟

سورہ نحل آیت نمبر ۷۷ میں ہے

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ

يَخَيْرٍ ۟ (النحل ۷۶)

ترجمہ. اور اللہ دو اور شخصوں کی حالت (بھی) بیان کرتا ہے جن میں سے ایک
(تو) گونگا ہو جو کسی بات کی طاقت نہ رکھتا ہو اور وہ اپنے مالک پر
بے فائدہ بوجھ ہو جدھر بھی (اس کا آقا) اُسے بھیجے (وہ) کوئی بھلائی
(کما کر) نہ لائے۔

میرے مطالعہ کے قرآن میں جہاں یہ آیت چھپی ہوئی لکھی ہے۔ وہیں اس کے ساتھ حاشیہ پر میری قلم سے یہ لکھا ہوا ہے هُوَ اَنَا فَاغْفِرْ لِیْ

۲۹۹ - قرآن میں اور لوگوں کا کلام

قرآن مجید میں بہت سے اقوال دوسرے لوگوں کے بھی نقل کئے گئے ہیں۔ مثلاً انبیاء کے یا کفار کے یا شیطان کے یا فرعون کے۔ ان اقوال میں سے بہت سی باتیں صرف مفہوماً صحیح ہیں اور الفاظ خدائی ہیں اور بہت سی باتیں زبانِ حال سے بیان کی ہوئی ہیں۔ اصل میں واقعہ نہیں ہوئیں۔ مثلاً فرعون کی باتیں جو نقل کی ہیں۔ وہ اول تو زبان ہی دوسری تھی اس لئے عربی میں ان کا ترجمہ ہے۔ اصل نہیں ہو سکتیں۔ پھر وہ کہاں اس فصاحت و بلاغت سے اپنا مضمون ادا کر سکتا تھا۔ جس طرح قرآن مجید نے ادا کیا ہے۔ اس لئے نتیجہ یہی ہے کہ اس کے مفہوم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ ورنہ کہاں ایک کافر اور کہاں اس کے کلام کا کلام الٰہی کے اندر اس طرح کھپ جانا کہ وہ بھی نہایت اعلیٰ اور اُنچ الفاظ میں معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ابلیس کا کلام جو درج ہے۔ وہ بہت سا زبانِ حال کا کلام ہے نہ کہ اصل۔ اسی طرح

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوْا بَلٰى ۛ (الاعراف ۱۷۲)

ترجمہ۔ کیا میں تمہارا رب نہیں؟ اُنھوں نے کہا، ہاں! ہاں!

انسانی فطرت کا کلام زبانِ حال سے ہے نہ کہ زبانِ قال سے۔ انبیاء کا کلام اور آلِ فرعون میں سے۔ رَجُلٌ مومن کا وعظ یہ بھی خدا کا کلام اور انسانی مفہوم کا ترجمہ ہیں۔ بعینہٖ ان لوگوں کا کلام نہیں ہیں۔ کیونکہ ایک تو عربی میں ہے اور ان لوگوں کی زبان عربی نہ تھی۔ دوسرے متصل قرآنی آیات کے وزن پر ہے۔ تیسرے اس میں وہی شان ہے جو الٰہی کلام میں ہوتی ہے۔ پس یہ تمام اقوال لفظی کوٹیشن QUOTATION نہیں ہیں۔ بلکہ صرف ان کا مفہوم نقل کیا گیا ہے۔ اور بعض جگہ مفہوم بھی نہیں۔ صرف زبانِ حال کو زبانِ قال میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ (الفضل ۳۰ ستمبر ۱۹۳۸ء)

۳۰۰ - ملائکہ کا سجدہ آدم کے لئے

ملائکہ کے سجدہ یعنی اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کو حسبِ ذیل آیت حل کرتی ہے کہ وہ کس قسم کا سجدہ تھا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ (الحج : ۱۹)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ کو سجدہ کرتا ہے ہر ایک جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور سورج۔ چاند ستارے پہاڑ۔ درخت اور جانور اور بہت سے انسان۔ یہاں جانور۔ درخت سورج چاند کے سجدہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ سجدہ عبادت کا نہیں ہے بلکہ فطرتی قویٰ کی اطاعت کا ہے۔ کیونکہ عبادت کے سمجھنے کی اہلیت یہ چیزیں نہیں رکھتیں۔ اس سجدہ میں سب مخلوقات داخل ہے اور بہت سے آدمی بھی اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جس خدمت کے لئے جس چیز کو پیدا کیا۔۔ اس خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ہاں انسانوں میں سے ایک جماعت یہ سجدہ بھی نہیں کرتی۔ بلکہ فطرت کے برخلاف چلتی ہے۔ اسی قسم کا سجدہ

فرشتوں کو آدم کے لئے تھا کہ تم آدم کے متعلق اپنی اپنی ڈیوٹی بطرزِ احسن بجا لاؤ۔ آدم کی عبادت کرو۔

۳۰۱۔ تسبیح کا مطلب

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى (اعلیٰ ۲) اور بکثرت آیات میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرنے یعنی اس کو نقائص کمزوریوں اور عیوب سے پاک کہنے پر زور دیا گیا ہے۔ پس دریافت طلب امر یہ ہوا کہ تسبیح اور پاکی کس طرح بیان کی جائے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی تسبیح پانچ طریقوں سے بیان کی جا سکتی ہے۔

۱۔ خدا تعالیٰ کے ذاتی نام اللہ کی تسبیح کی جائے مثلاً سُبْحَانَ اللّٰهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ وغیرہ فقرے بطورِ ذکر اور وظیفہ کے بکثرت پڑھے جائیں۔ تاکہ دل میں اعتقاد اور یقین اللہ تعالیٰ کی سبوحیت کا جم جائے۔ (سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى)

۲۔ دوسری قسم تسبیح کی یہ ہے کہ اس کی صفات کا ذکر کیا جائے۔ اس کو حمد کہتے ہیں۔ اور حمد کی وجہ سے تسبیح اس طرح ہوتی ہے کہ جب ہم اللہ کو سخی یا کریم کہتے ہیں تو گویا بخل سے اُسے پاک سمجھتے ہیں۔ جب رَحِيْم کہتے ہیں تو ظلم سے اُسے پاک قرار دیتے ہیں۔ جب قادرِ مطلق کہتے ہیں تو ہر کمزوری اور لاچاری سے اُسے بالا ٹھہراتے ہیں۔ اسی طرح جو بھی صفت اس کی بطور حمد کے ہم بیان کرتے ہیں۔ اس صفت کے بالمقابل جو نقص ہوگا اس سے خود بخود اللہ تعالیٰ پاک سمجھا جائے گا اور وہ حمد اور تعریف ہماری تسبیح محسوب ہوگی۔ پس اس اصل کے ماتحت بکثرت صفاتِ الٰہی اور افعالِ الٰہی اور اسمائے الٰہی کا ذکر کیا جائے۔ (وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ)

۳۔ تیسرے وہ تسبیح جو آیت سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (المؤمنون ۹۲) میں بیان کی گئی ہے یعنی جو اعتراض غیر مذاہب کے لوگ اور دیگر معترضین خدا پر کرتے رہتے ہیں۔ ان سے

پاک ثابت کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ خدا ظالم ہے یا گمراہ کرتا ہے۔ یا استہزا کرتا ہے یا مکار ہے یا وہ آنکھوں، ہاتھوں انگلیوں۔ ساق وغیرہ کا محتاج ہے۔ یا یہ کہ اُس کے بیٹھنے کے لئے کسی تخت اور کُرسی کی ضرورت ہے۔ یا یہ کہ وہ رُوح و مادہ بنانے پر قادر نہیں اور گناہ معاف نہیں کرسکتا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تسبیح غیر مذاہب کے جواب میں ہوتی ہے۔ اور تحریروں تقریروں۔ مباحثات کے وقت کی جاتی ہے۔

۴۔ چوتھے وہ تسبیح جو سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (الطور، ۴۴) کے ماتحت شرک دُور کرنے کی خاطر کی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ اللہ ہی خالق ہے اور کوئی خلق نہیں کرسکتا۔ اللہ ہی عبادت کے لائق ہے اور کوئی عبادت کا حق نہیں رکھتا۔ یا اللہ ہی علم غیب رکھتا ہے اور کوئی اس کے سوا یہ علم نہیں رکھتا۔ یا اللہ ہی گناہ معاف کرسکتا ہے اور کوئی گناہ معاف نہیں کرسکتا۔ یا اللہ ہی زندہ کرتا ہے۔ اور کوئی زندگی نہیں دے سکتا۔ غرض یہ تسبیح خدا تعالیٰ کو باطل معبودوں کے مقابل پر کامل علم والا اور کامل قدرتوں والا ثابت کرتی ہے اور خدا کے مقابل پر ان کو محتاج۔ ذلیل اور حقیر مخلوق ثابت کرتی ہے۔

۵۔ پانچویں تسبیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے خواہ بیٹا ہو یا بیٹی
مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ (مریم، ۳۶)
ترجمہ:۔ خدا کی شان کے یہ خلاف ہے کہ وہ کوئی بیٹا بنائے۔ وہ اس بات سے پاک ہے۔

اس تسبیح کا اکثر حصہ ردِّ عیسائیت پر مبنی ہے۔ اور باقی کچھ حصہ عام طور پر خدا تعالیٰ کو اولاد سے بے نیاز ثابت کرنے پر۔

پس قرآنِ مجید سے یہ پانچ قسم کی تسبیح ثابت ہے جو انسان خدا تعالیٰ کے لئے کرتا ہے۔ بعض زبانی ذکر ہیں۔ ۲۔ بعض اظہارِ محامد و صفات ہیں۔ ۳۔ بعض خاص اعتراضات دُور کرنے کے لئے ہیں۔ ۴۔ بعض شرک کے رد میں ہیں۔ ۵۔ اور بعض اولاد کی تردید میں

ہیں اور بس۔

انشاء اللہ کبھی موقعہ ہوا۔ تو ان کا تفصیلی ذکر بھی آئے گا۔ فی الحال تسبیح کے متعلق یہ مجمل تبویب یاد رکھنی چاہیئے۔

۳۰۲۔ قرآن کے معنی

وَأَنْ أَتْلُوَا الْقُرْآنَ ؕ (النمل ۹۳) یعنی مجھے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن کی تلاوت کیا کروں۔ یہ حکم ہم سب کو بھی ہے۔ اور قرآن کی تلاوت ہم پر فرض کی گئی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ شاید ۱۹۱۷ء کا ذکر ہے کہ میں نے خواب میں ایک شخص کو دیکھا کہ وہ مجھ سے پوچھتا ہے۔ کہ قرآن کا نام قرآن کیوں ہے۔ میں اُسے جواب دیتا ہوں۔

"یہی ایک کتاب ہے۔ جو دُنیا کی سب کتابوں سے زیادہ پڑھی گئی ہے۔"

یعنی اور مذہبی کتابیں ممکن ہے کہ اس سے زیادہ لکھی گئی ہوں۔ یا اس سے زیادہ چھپی ہوں۔ یا اس سے زیادہ شائع ہوئی ہوں۔ یا اس سے زیادہ ان کے ترجمے ہوئے ہوں۔ مگر جتنا قرآن پڑھا گیا۔ پڑھا جاتا ہے اور پڑھا جائے گا۔ یہ بات اور کسی کتاب کو حاصل نہیں۔ قرآن کے نام میں پیشگوئی بھی ہے اور حکم بھی۔ ان ساڑھے تیرہ سو سال میں دنیا ایک منٹ ایک سیکنڈ بھی اس کے پڑھے جانے سے خالی نہیں رہی۔ نمازوں میں نوافل میں تلاوت میں تہجد میں غرض کوئی وقت روئے زمین پر ایسا نہیں آتا کہ کہیں نہ کہیں قرآن نہ پڑھا جا رہا ہو۔

مومن قرآن کو بہت بہت پڑھے۔ جتنا زیادہ پڑھے گا۔ اتنے زیادہ اس کے معانی کھلیں گے۔ انشاء اللہ۔ (الفضل ۳۰ ستمبر ۱۹۲۸ء)

۲۰۳۔ جہنم کیوں وسیع ہے؟

يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِن مَّزِيدٍ (قٓ ۳۰)

ترجمہ: اس دن ہم جہنم سے کہیں گے، کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی، کہ کیا کچھ اور بھی ہے؟

جو گورنمنٹیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ وہ زیادہ قیدیوں کا انتظام بسبب جیل خانوں میں کافی جگہ اور پورا سامان نہ ہونے کے نہیں کر سکتیں۔ اس لئے وہ مجرموں کو تنگی جگہ کی وجہ سے بھی چھوڑتی رہتی ہیں۔ مگر خدائی گورنمنٹ رحم کی وجہ سے تو چھوڑ دیتی ہے لیکن یہ نہیں کہ دوزخ میں کافی جگہ اور کافی انتظام نہ ہونے کی وجہ سے لاچار ہو کر چھوڑ دے۔ وہاں تو اتنا وسیع پیمانہ پر انتظام ہے۔ کہ ہر وقت هَلْ مِن مَّزِيدٍ کا مطالبہ دوزخ کی طرف سے جاری رہتا ہے۔

۲۰۴۔ مشترکہ معیارِ رسالت

قُلْ مَا كُنتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ (الاحقاف ۱۰) یعنی میں کوئی انوکھا دعویٔ نبوت نہیں ہوں۔ جو معیار سب پیغمبروں کے مشترکہ ہیں۔ انہی سے مجھے بھی پرکھ لو۔ بعض لوگ غلط فہمی سے کہتے ہیں کہ فلاں بات ہو تو ہم مانیں گے۔ اور فلاں معجزہ ہو تو ایمان لائیں گے۔ یہ سب غلط ہے۔ ہر نبی کا اپنے حالات کے مطابق نئے رنگ کا معجزہ ہوتا تھا۔ مگر معیار نبوت جو عام اور بقدر مشترک سب انبیاء میں ہیں وہ قرآن مجید نے یہ بیان کئے ہیں۔ اور یہ سب رسولوں میں موجود رہوں گے۔

۱۔ کسی پہلی الہٰی کتاب کی ظاہر اور استعارہ والی پیشگوئیوں کا مورد ہونا۔

وَاِذْ اَخَذَ اللهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ
حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ
لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ (اٰل عمران، ۸۲)

یعنی اس نبی کو ماننا فرض ہے جس پر پہلی کتابوں کی پیشگوئیاں صادق آتی ہوں۔ خواہ وہ ظاہر ہوں۔ یا استعارۃً ۔ مِنْ كِتَابٍ وَّ حِكْمَةٍ

۲۔ دوسرے اس کو وحی اور کلام الہیٰ کا دعویٰ ہو۔ اور خدا کے نقلی کلام کو وہ پیش کرتا ہو۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ
بَعْدِهٖ ...... وَكَلَّمَ اللهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۔ (النساء ۱۶۴، ۱۶۵)

۳۔ تیسرے یہ کہ اس کلام میں اظہار علی الغیب ہو ۔

وَمَا كَانَ اللهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ (اٰل عمران ۱۸۰)

ترجمہ: اور اللہ تمہیں غیب پر ہرگز آگاہ نہیں کر سکتا تھا۔

اور آیت اور فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ
(الجن، ۲۷)

ترجمہ: اور وہ اپنے غیب پر کسی کو غالب نہیں کرتا سوائے ایسے رسول کے جس کو وہ اس کام کے لئے پسند کر لیتا ہے۔

۴ چوتھے اس کے ساتھ دلائل و نشانات ہوں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ
بِالْبَيِّنٰتِ (الروم، ۴۸)

ترجمہ: اور ہم نے تجھ سے پہلے کئی رسول ان کی قوموں کی طرف بھیجے تھے پس وہ اُن کے پاس کھلے کھلے نشان لے کر آئے۔

۵۔ پانچویں نصرت و تائیدالٰہی ان کو عطا ہو۔ یکسان کے سچے متبعین بھی غالب رہیں۔
وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ○ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ○ وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (صافات، ۱۷۱ تا ۱۷۳)
ترجمہ:۔ اور ہمارا فیصلہ ہمارے بندوں یعنی رسولوں کے لئے پہلے گذر چکا ہے (جو یہ ہے) کہ ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر (یعنی مومنوں کا گروہ) ہی غالب رہے گا۔

۶۔ چھٹے مخالف و دشمن ہلاک ہوں۔
كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ۔ (ق، ۱۴)
ترجمہ:۔ ہمارے رسولوں کو جھٹلا دیا تھا۔ آخر میرے عذاب کا وعدہ پورا ہو کر رہا۔
اور فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ (الروم، ۴۷)
ترجمہ:۔ اور ہم نے مجرموں سے مناسب بدلہ لیا۔

۷۔ ساتویں یہ کہ وہ بشیر اور نذیر ہوں یعنی خوشخبریاں پیش کرتے ہوں اور خطرات سے آگاہ کرتے ہوں۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (النساء، ۱۶۵) اور یہ بشارتیں اور انذار دونوں فریقوں پر پورے ہوتے ہوں۔

۸۔ آٹھویں یہ کہ اس کی تعلیم جسمانی، اخلاقی اور عملی پاکیزگیوں سے پُر ہو۔ اور وہ خود بھی نیک اور پاک ہوں۔
يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا۔ (المؤمنون، ۵۲)
ترجمہ:۔ (اور ہم نے کہا) اے رسولو! پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور مناسب حال عمل کرو۔

۹۔ نویں یہ کہ وہ اور ان کا سلسلہ تباہ نہ ہو۔ بلکہ ترقی کرے۔ اور رائج ہو جائے۔
وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ (الصّٰفّٰت، ۱۸۲)

ترجمہ :۔ اور رسولوں پر ہمیشہ سلامتی نازل ہوتی رہے گی ۔

۳۰۵ ۔ کپڑے پاک رکھو

اس زمانہ میں توفیشن اور صفائی پسندی ہی لوگوں کو

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (المدثر : ۵)

ترجمہ :۔ اور اپنے پاس رہنے والے لوگوں کو پاک کر

کے حکم پر عمل کراتی رہتی ہے مگر پھر بھی بعض ناسمجھ بچے اور لاپروا نوجوان پیشاب کی چھینٹوں سے نہیں بچتے ۔ اور پیشاب کرتے وقت یہ احتیاط نہیں رکھتے کہ ایسی نجاست نہ صرف دُنیا میں بُری ہے ۔ بلکہ نماز بھی گندے کپڑوں میں مقبول نہیں ہوتی ۔ اور عذاب قبر مزید برآں جیسا کہ احادیث میں آتا ہے ۔ بعض لڑکے تو پیشاب کرکے طہارت یا ڈھیلا بھی نہیں کرتے ۔ بعض دن کو تو کر لیتے ہیں ۔ رات کو سونے سے اٹھ کر پیشاب کریں تو یونہی پاجامہ باندھ لیتے ہیں اور بعض بے احتیاطی سے پیشاب کرتے وقت شلوار یا پائجامہ کے پائنچوں پر چھینٹیں پڑنے دیتے ہیں اور خیال نہیں رکھتے کہ پیشاب کی چھینٹ دُور دُور تک پہنچتی ہے ۔ یہ وہ گندگی ہے کہ ظاہر میں چھوٹا معلوم ہوتا ہے ۔ مگر سزا اس کی آخرت میں زیادہ ہے ۔

۳۰۶ ۔ رجم اور تازیانہ

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (النور : ۳)

قرآن مجید میں زانی اور زانیہ کی سزا سَو سَو تازیانے ہیں جو سختی سے لگنے چاہئیں اور لوگوں کے سامنے یہ سزا ہونی چاہیئے ۔ تاکہ عبرت کا موجب ہو ۔

کئی مولوی صاحبان اصرار کرتے ہیں کہ یہ کنواروں کا ذکر ہے۔ اگر بیاہے ہوئے ہوں تو رجم کی سزا ہے۔ جب پوچھا جائے کہ قرآن نے جب ایک حد بیان کی دوسری کیوں نہ کی۔ تو فرماتے ہیں کہ ایک آیت نازل ہوئی تھی۔ مگر وہ منسوخ التلاوت ہو گئی۔ اگرچہ حکم اس کا چلتا ہے۔ حکم منسوخ نہیں ہوا۔ صرف اس کا پڑھنا بند ہو گیا ہے وہ یہ آیت ہے۔

الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما نکالاً من اللّٰہ

یہ آیت میں نے اکثر سُنی ہے اور بعض کتابوں میں پڑھی بھی ہے مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ اگرچہ میں عربی دان نہیں ہوں۔ تاہم اتنا پھر بھی مجھے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ خدا کا کلام تو کیا کسی فصیح بلیغ انسان کا کلام بھی نہیں۔ اگر میرا اعتبار نہ ہو تو خود اپنے دل سے پوچھ لیں۔ مجھے تو یہ فقرہ ایسا بھدا دکھائی دیتا ہے کہ شاید الفیل ما الفیل وما ادراک ما الفیل کے بعد یہ دوسرے نمبر پر رکھا جانے کے قابل ہے۔ قرآن مجید کی عبارت الگ لیکن حدیثوں کی لڑی معلوم ہوتی ہے۔ بھلا الشیخ والشیخۃ کا اس کے ساتھ کیا مقابلہ! واللہ یہ فقرہ پڑھ کر گھِن آتی ہے۔ چہ جائیکہ یہ قرآن کا حصہ یا کلامِ الٰہی محسوس ہو۔ الشیخ اور الشیخۃ کے الفاظ تو ناقابلِ برداشت تھے ہی مگر ساتھ بعد زنیا تثنیہ کا ایک صیغہ ایسا عجیب آیا ہے کہ اس نے فصاحت بلاغت اور لطافتِ کلام کا خون کر کے رکھ دیا۔ خیر یہ تو اپنی اپنی رائے ہے۔ لیکن رجم کے متعلق یہ عرض ہے۔ کہ وہ ہوا اور ضرور ہوا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے حکم سے ہوا۔ اس لئے کہ آپ بھی شارع تھے۔ جیسے اور بادشاہ محل و مقام کے لحاظ سے سزاؤں میں تغیر و تبدل کر سکتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو اختیارات حاصل تھے۔ عرب کی بدکاری کو روکنے کے لئے اس وقت حضورؐ نے یہی مصلحت دیکھی۔ کہ بعض کو رجم کیا جائے۔ مگر قرآن کی حد ہر زمانہ میں قائم ہے اور حضورؐ والی حد ضرورت اور محل کے لحاظ سے حکامِ وقت اختیار کر سکتے ہیں۔ رہا بعض کا یہ اعتراض کہ لونڈیوں پر جب نصف حد جاری ہوگی تو پھر رجم کا نصف کیا ہوگا۔ چونکہ وہ

ناممکن ہے۔ اس لئے رجم کی حد ہی غلط ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ جب مختلف الملک اور مختلف الزمان حالات میں کوئی حکومت رجم کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی میں ضروری سمجھے۔ تو وہاں رجم کا نصف سو درّے ہوں گے۔ اور سو درّوں کا نصف پچاس درّے ہوں گے۔ آخر عقل اور تفقہ بھی تو استعمال کرنا ضروری ہے۔

یہ رجم اور سو تازیانوں کی حد اسی طرح ہیں جس طرح کہ

وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ (النساء ۱۷)

ترجمہ: اور تم میں سے جو دو مرد ناپسندیدہ فعل کے قریب جائیں تو تم انہیں دُکھ پہنچاؤ۔

میں یہ حکم ہے کہ دو مرد فعل بد کریں۔ تو مناسب حال سزا دے دیا کرو۔

لیکن جب یہی بدکاری لوط کی بستیوں میں بکثرت ہو گئی۔ تو خدا تعالیٰ نے وہ بستیاں ہی غرق کر دیں اور سب کو رجم کر دیا۔ سو عام سزا تو زنا کی سو تازیانے ہی ہے لیکن جب کسی مُلک یا قوم میں یہ بدکاری بڑھ جائے۔ اور اس کو خاص سختی سے روکنا مصلحت ہو۔ تو پھر حکومت کو اختیار ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم والی سزا کچھ مدّت کے لئے جاری کر دے۔ کیونکہ یہ بھی تو حکم ہے۔ کہ جو باتیں رسول اللہؐ تجویز کریں وہ بھی عمل کے لئے ہوتی ہیں مثلاً شراب کہ قرآن مجید میں حرام تو کی گئی۔ مگر حد اس کی کوئی نہیں بیان کی گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو شرابیوں کو مار پیٹ کر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ لیکن لوگوں نے اس سزا کو نرم سمجھا۔ تو پہلے چالیس درّے خلفاء کے زمانے میں مقرر ہوئے۔ مگر بعض لوگ پھر بھی شراب نہیں چھوڑتے تھے۔ حتیٰ کہ اسّی درّے پر بات آ ٹھہری۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف رجم ہی کیا۔ بلکہ کنواروں کو سو تازیانوں کے علاوہ ایک سال کے لئے جلا وطن بھی کیا۔ حالانکہ یہ زیادتی بھی قرآن میں مذکور نہیں ہے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ مزید سختیاں صرف زمانی۔ اور مقامی حالات کی وجہ سے تھیں۔ ورنہ عام سزا وہی ہے۔ جو قرآن میں بیان کی گئی ہے۔

اب ایک اور پہلو اس مسئلہ کا لیتا ہوں۔ ایک صاحب فرمانے لگے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے رجم کیا۔ تو ضرور کہیں نہ کہیں قرآن میں سے ہی استنباط کیا ہوگا۔ میں نے عرض کیا۔ کہ اگرچہ مجھے خود پورا انشراح نہیں۔ تاہم ایک آیت ایسی ہے جس سے آپ ایسا استنباط کر سکتے ہیں۔ کہنے لگے جلدی بتاؤ۔ میں نے عرض کیا۔ کہ

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ
اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ
حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا

(النساء ۱۶)

یعنی تم میں سے بیاہی ہوئی عورتیں اگر بدکاری کریں۔ تو اُن پر چار گواہ مہیا کرو۔ اگر وہ گواہی دیدیں۔ تو ان کو اپنے گھروں میں قید رکھو۔ جب تک کہ موت ان پر وارد نہ ہو جائے۔ یعنی قاضی یا عدالت فیصلہ صادر کرکے ان کو موت کی سزا نہ دیدے۔ یا یہ قصور پاکران کو بری نہ کردے۔ اس آیت میں چار شہادتوں کا ہونا اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ آیت زنا کے لئے ہے۔ معمولی فحشاء کے لئے نہیں ہے۔ ورنہ دو گواہ ہی کافی ہوتے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

لیکن یہ جو آئے دن طالب علم مسئلہ رجم اور مسئلہ تازیانہ پر بحث کرتے رہتے ہیں۔ یہ ان دنوں میں بے فائدہ بحث ہے کیونکہ دونوں سزاؤں میں سے وہ ایک کو بھی جاری نہیں کرا سکتے۔ جب وقت آئے گا۔ اس وقت دیکھا جائے گا۔ اس وقت لیجسلیٹو اسمبلی خود اس بحث کو طے کرے گی۔ اور نصف عذاب کے متعلق بھی شکوک فضول ہیں۔ کیونکہ غلامی کا رواج آج کل دُنیا میں نہیں رہا۔ (الفضل ۲؍اکتوبر ۱۹۳۸ء)

۳۰۷ ۔ بقدرِ ضرورت انکشاف

قرآنِ مجید ایک مقفل خزانہ ہے جس کی باریکیاں کچھ قرونِ اولیٰ میں ظاہر ہوئیں اور کچھ بقدرِ ضرورت درمیانی زمانہ میں مجددین اور اولیاء اللہ پر منکشف ہوتی رہیں۔ بالآخر ایک نیا علم موجودہ دجالیت اور دہریت کے زمانہ میں حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کو دیا گیا۔ صرف یہی نہیں ہے کہ قرآن مطہر لوگوں کو دیا جاتا ہے۔ بلکہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ زمانہ کی ضروریات کے مطابق اس کے خزائن باہر نکالے جاتے ہیں۔ اگر کسی زمانہ میں کسی خاص مسئلہ کی حکمت اور معرفت کی ضرورت پیش نہ آئے۔ تو خواہ کتنے ہی مطہر لوگ اس وقت موجود ہوں۔ وہ خزانہ پھر بھی پوشیدہ رہتا ہے۔ جب تک کہ اس کا وقت نہ آجائے۔ پس لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (الواقعہ: ۸۰) کے ساتھ ساتھ یہ آیت بھی یاد رکھنی چاہیے کہ

وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ (الحجر: ۲۲)

یعنی ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس موجود تو ہیں۔ مگر ہم ان کو وقت اور ضرورت کے مطابق ہی نازل فرمایا کرتے ہیں۔

۳۰۸ ۔ تکرارِ آیات

پسندیدہ کلام کی مختلف قسموں میں سے ایک مشہور قسم یہ بھی ہے کہ چند فقروں کے بعد ایک فقرہ بار بار دُہرایا جاتا ہے۔ شاعروں کے ہاں تو یہ مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ قرآنِ مجید میں بھی یہ طرزِ کلام موجود ہے۔ چنانچہ سورۃ رحمٰن میں فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ کی آیت ہر ایک دو آیات کے بعد آتی ہے اور ساری سورت میں یہ آیت اکتیس دفعہ دُہرائی گئی ہے۔ اسی طرح وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ کی آیت سورۃ

میں دس دفعہ آئی ہے۔ ان کے علاوہ بھی چند جگہ اسی طرح کا کلام موجود ہے مثلاً۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ (القمر ۱۸)

نیز وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ (الصّٰفّٰت ۷۹)

إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ (الصّٰفّٰت ۸۱) وغیرہ۔ مگر یہ تکرارات نہ ہوتے تو کلام بے لطف ہو جاتا۔ تکرار کی وجہ سے اس کی شان اس کے معانی اور اس کا اثر بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ بلکہ بعض جگہ تو ان آیات کی وجہ سے ماسبق آیتوں کے معانی اور مفہوم میں ایک نئی بات پیدا ہو گئی ہے جو بغیر ان کے نہ ہوتی۔ مثلاً جہاں جنت کا ذکر آتا ہے وہاں تو فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ منوں ہی ہے۔ لیکن جہاں عذاب جہنم کا ذکر ہے کہ

هَٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ ○ يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ آنٍ (الرحمٰن ۴۳، ۴۴)

ترجمہ: یہ وہ جہنم ہے جس کا مجرم انکار کرتے ہیں (جب اس میں داخل ہونے کا دن آئے گا) وہ اس (دوزخ) کے درمیان اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان گھوم رہے ہوں گے۔

کے معاً بعد فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ لایا گیا ہے۔ کیا جہنم بھی نعمت اللہ ہے؟ ہاں۔ یہاں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مجرموں اور کفار کے لئے جہنم واقعی نعمت ہے۔ کہ اگر وہ نہ ہوتا تو یہ لوگ کبھی بھی جنت میں داخل نہ ہو سکتے۔ یہ وہ نعمت ہے۔ جہاں جا کر ان کے دلوں کی مہریں ٹوٹیں گی۔ اور ان کے کان اور آنکھیں شفایاب ہوں گے۔ اور ان کی میل اور گند کی جلائی جائے گی۔ اور ان کی روحانی بیماریاں دور کی جائیں گی۔ یہاں تک کہ وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ جنت میں رہنے۔ اس کے مزے چکھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہوں۔ ورنہ اگر بغیر شفا پانے کے بیماری ہی کی حالت میں براہ راست جنت میں داخل کر دیئے جاتے

تو وہاں کا خوشگوار پانی انہیں کڑوا لگتا۔ اور میوے نزلہ پیدا کر دیتے۔ اور وہاں کے مذاق اور پُرلطف صحبتیں اُن کو تکلیف دیتیں۔ کیونکہ وہ بیمار داخل ہوئے تھے۔ اس لئے جنت کی لذّات حاصل کرنے کے قابل بنانے کے لئے ضرور تھا کہ ایسے مریضوں کا شفاخانہ میں پہلے علاج کیا جائے تاکہ وہ نعمائے جنّت سے لطف اُٹھانے کے قابل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے بیماروں کے لئے جہنم بھی خدا کی نعمت ہے۔ جیسا کہ مذکورہ آیت سے ظاہر ہے۔ (الفضل ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۸ء)

۳۰۹۔ مَن وسلویٰ

اَنْزَلْنَا عَلَیْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی (الاعراف ۱۶۱)

ہم نے بنی اسرائیل پر مَنّ اور سلویٰ نازل کیا۔ مَن میں نے بھی دیکھا اور کھایا ہے۔ ڈیرہ غازیخان کا جنوب مغربی علاقہ جہاں بلوچ لوگ رہتے ہیں۔ اور جنگلی اور پہاڑی زمین ہے۔ وہاں قدرتی جھاڑیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی ٹہنیوں پر چنے کے برابر دانے شیریں اور کچھ گوند کے مزے کے سرخی سفیدی مائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس علاقہ میں بھی ان کو مَن ہی کہا جاتا ہے۔ اور غرباء بطور مٹھائی کے کھاتے ہیں۔ وہ پھل نہیں ہوتا بلکہ گوند کی طرح اس جھاڑی کا رس نکل کر باہر جم جاتا ہے۔ اگر کسی کو شوق ہو تو ڈیرہ غازیخان یا راجن پور کی جماعت کی معرفت نمونہ منگا کر دیکھ سکتے ہیں۔ سو یہ کوئی آسمان سے نازل ہونے والی نئی چیز نہ تھی بلکہ قدرتاً جنگلی اور پہاڑی علاقوں میں ملتی ہے۔ اور جہاں بنی اسرائیل مصر سے نکل کر ٹھہرے تھے۔ اس علاقہ میں خصوصاً بکثرت پیدا ہوتی تھی۔

رہا سلویٰ۔ اس سے مراد بٹیر یا تلیر یا جیسٹ تیتر کی قسم کے جانور ہیں۔ جو موسم کے تغیر پر ایک مُلک سے سفر کر کے دوسرے ملک کی طرف لاکھوں کی تعداد میں اُڑ کر جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی بٹیروں اور تلیروں کا ایک موسم آتا ہے۔ اور پھر چند سال

کے بعد کسی خاص سال میں تو یہ جانور اس کثرت سے آجاتے ہیں کہ بازاروں میں پیسے پیسے بکنے لگتے ہیں۔ اسی طرح بنی اسرائیل کے علاقہ میں ایک دفعہ یہ کثرت آگئے۔ اور انہوں نے شکار کرکے ایک ماہ تک انہیں خوب کھایا۔ حتیٰ کہ کثرت کی وجہ سے ان میں وبا پیدا ہوگئی۔

۳۱۰۔ خلیفہ پر فساد اور قتل کا الزام

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ
وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۚ (البقرہ ۳۱)

ترجمہ: انھوں نے کہا کہ کیا تو اس میں (ایسے شخص بھی) پیدا کرے گا جو اس میں فساد کریں گے اور خون بہائیں گے اور ہم (تو وہ ہیں جو) تیری حمد کے ساتھ (ساتھ) تیری تسبیح (بھی) کرتے ہیں اور تجھ میں سب برائیوں کے پائے جانے کا اقرار کرتے ہیں۔

خلیفۃ اللہ پر فساد اور قتل کا الزام لگانا بھی پرانی سُنت ہے۔ اور آدم کے وقت سے آج تک چلی آئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تو یہ الزام مشہور رہا ہے۔ خود حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے خلاف بھی لیکھرام کے مروا دینے کا رونا آج تک رویا جاتا ہے۔ اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے خلاف تو جو دشمن اٹھتا ہے۔ وہ شروع ہی سے یہ آیت پڑھتا اٹھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بدچلنی کا الزام بھی کنایۃً مذکور ہے ورنہ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ کا دعویٰ کیوں کرتے مگر اللہ تعالیٰ نے اس کا دو طرح سے جواب دیا۔ ایک تو یہ کہ ہمیں معلوم ہے کیوں وہ خلیفہ ہونے کا اہل ہے۔ دوسرے ان سے مقابلہ بھی کرا دیا اور اس میں یہ بتایا۔ کہ علم اصل چیز ہے اور خلیفہ میں علم سب سے زیادہ ہے اس لئے وہ دوسروں سے افضل ہے اور حقیقی علم کے ساتھ خشیۃ اللہ لازم

مزہم ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ خلیفہ متقی بھی ہو۔

۳۱۱ ۔ مقربین عبادتیں ترک نہیں کرتے

وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ

(انبیاء ، ۲۰)

یعنی جو خدا کے مقرب بن جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں کہتے۔ کہ اب ہم بڑے ہوگئے ہیں۔ ہم عبادتوں سے آزاد ہیں۔ نہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ساری عمر عبادت کرتے کرتے تھک گئے ہیں۔ اب ہمارے آرام کرنے کا وقت ہے۔ بلکہ مقربین ہمیشہ اپنی عبادات پر دوام کرتے ہیں۔ جو پیر فقیر خود آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ اور مریدوں کو عبادات کی تاکید کرتے ہیں وہ جھوٹے ہیں۔

۳۱۲ ۔ راکع اور ساجد

يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ (آل عمران ، ۴۴)

ترجمہ : اے مریم! تو اپنے رب کی فرماں بردار بن اور سجدہ کر اور صف موحدانہ پرستش کرنے والوں کے ساتھ مل کر موحدانہ پرستش کر

کی آیت سے سجدہ و رکوع کے ایک اور معنی بھی استنباط ہوتے ہیں۔ یعنی سجدہ سے مراد اکیلی نماز ہے اور رکوع سے مراد نماز باجماعت۔

۳۱۳ ۔ ہجرت کی پیشگوئی

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَايْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا۔ (الکہف : ۲۴)

ترجمہ: اور تو کسی بات کے متعلق (دعویٰ سے) ہرگز نہ کہہ (کر) میں کل یہ (کام) ضرور کروں گا۔

سورۂ کہف میں اصحابِ کہف کے قصہ کے معاً بعد یہ آیت آتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ کل تو بھی ان اصحابِ کہف کی طرح ہجرت کرنے والا اور ایک غار میں پناہ لینے والا ہوگا۔ مگر ان کفارِ مکہ کو یہ بات کھول کر بتانا ہو نہیں۔

اصحابِ کہف کے ذکر کے بعد معاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشگوئی اپنے متعلق فرمادی۔ مگر کس طرح کہ کفار پر واضح بھی نہ ہو۔ اور جب پوری ہو جائے۔ تو کوئی شک بھی نہ کر سکے۔ اور اگلی آیت میں

عَسَىٰٓ اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا (الکہف ۲۵)

ترجمہ: امید ہے مجھے اس راستہ پر چلنے کا جو ہدایت پانے کے لحاظ سے (میرے تجویز کردہ راستے سے بھی تکمیل کے) زیادہ قریب ہوگا۔

فرما کر یہ بھی بتا دیا۔ کہ مجھے اصحابِ کہف کی نسبت بہت زیادہ جلد خلاصی اور کامیابی نصیب ہوگی۔

(الفضل ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۸ء)

۱۴۲۔ اِنَّا لِلّٰهِ

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرہ ۱۵۷)

اور صابروں کو خوشخبری دے۔ کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہتے ہیں۔ یہ مقولہ ہمارے ملک کے مسلمانوں میں بھی بہت رائج ہے۔ اور ہر غم، آفت اور موت کے وقت پڑھا جاتا ہے۔ مگر یہاں میں اس کے متعلق دو باتیں لکھتا ہوں۔

پہلی یہ کہ جب یہ پورے جوش اور درد دل سے نکلے۔ تو یا تو گم شدہ چیز مل جاتی ہے۔ یا اگر فوت ہو گئی ہو۔ تو اس کا نعم البدل۔

دوسرے یہ کہ لوگ عموماً دنیاوی نقصانوں کے وقت اسے پڑھتے ہیں بہت شاذ ہوتا ہے کہ یہ روحانی آفات اور مصائب کے وقت اُسے پڑھا جاتا ہو۔ حالانکہ ہماری اصلی مصائب روحانی مصائب ہی ہوتی ہیں۔ اگر جیب میں سے پانچ روپیہ کا نوٹ گر پڑا۔ تو بے اختیار اِنَّا لِلّٰہِ مُنہ سے نِکلتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اخلاقی یا روحانی نقص وارد ہو گیا یا ایمان میں سقم آگیا۔ تو اس وقت یہ کلمہ کہتے بہت کم لوگوں کو سُنا ہے۔ حالانکہ اس نقصان کی تلافی اور جبر دُنیاوی نقصانوں سے زیادہ ضروری اور لازمی ہے۔ پس جس طرح مالی اور جانی نقصانات کے وقت اس کے پڑھنے کا خیال خود بخود آجاتا ہے۔ بلکہ بے اختیار یہ کلمہ مُنہ سے نکلتا ہے۔ اسی طرح نماز کے فوت ہو جانے، روزہ کے رہ جانے، کسی نیکی سے محروم ہو جانے یا کسی اخلاقی کمزوری کے صادر ہو جانے پر فوراً اس کو ہمارے مُنہ سے نکلنا چاہیئے۔ پھر جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں امید ہے کہ اس کی تلافی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو جائے گی۔ انشاء اللہ۔

۳۱۵ - معروف

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ (الاعراف ۲۰۰)

ترجمہ (اے نبی ہمیشہ) درگذر سے کام لے اور مطابقِ فطرت باتوں کا حکم دیا کر۔

اور فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ (النساء ۷)

میں عرف اور معروف کے معنی ہیں۔

جانے۔ شرع نے کئی جگہ بجائے ظاہر او تفصیلی حکم دینے کے صرف عُرف یا معروف کے مطابق کام کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو شرع سے استثنا کر کے جو موزوں اور پسندیدہ بات ہو۔ اس کے مطابق کرو۔ یا عمدہ رواج کے مطابق کرو۔ یا اس طرح کرو جس میں نیکی اور احسان کا پہلو پایا جائے۔ اگر اس طرح نہ کیا جاتا تو دنیا میں لاکھوں اعمال ہیں۔ ہر ایک کی تفصیل شریعت کو دینی پڑتی۔ شریعت نے اس کی جگہ ایک اصل بتا دی۔ اس اصل کو ہاتھ میں لے کر پھر ہر کام اچھی طرح طے ہو سکتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے۔ کہ جتنے اچھے رواج اسلام سے قبل موجود تھے وہ بھی گذشتہ انبیاء کے قائم کردہ تھے۔ اس لئے جہاں اسلام نے خود کوئی نیا حکم نہیں دیا۔ وہاں پرانی شریعتوں کے قائم کردہ رواجوں کو اختیار کر لینے کی اجازت دے دی اور انہی کا نام عُرف ہے۔ کیونکہ ہر نیکی دراصل نبوت کے سرچشمہ سے ہی آئی ہے۔

۳۱۶ ۔ انسان کا اپنے دل پر کوئی اختیار نہیں

یٰا عْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ (انفال ۲۵)

آدمی صرف اپنی کوشش سے تو اپنے دل کو بھی سمجھا نہیں سکتا اور سب دلائل سن کر یہی کہتا رہتا ہے۔ کہ تسلی نہیں ہوئی دل نہیں مانتا۔ پس خدا ہی ہے جو سمجھ اور اطمینان اور ایمان دیتا ہے۔ اس لئے کبھی اپنی عقل پر بھروسہ نہ کرو۔ بلکہ دُعا مانگو اور اس کے فضل پر اعتماد کرو تب دل کو اطمینان ملے گا۔ ورنہ ہر وقت کے شکوک و شبہات تو انسان کو بعض دفعہ ہلاک کر دیتے ہیں

۳۱۷ - جنین کا الگ ذبح کرنا بے فائدہ ہے

أَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ أَرْحَامُ الْأُنْثَيَيْنِ (انعام، ۱۴۵)

یعنی حلال جانوروں کے پیٹ سے جو بچے نکلیں۔ وہ بھی کھانے حلال ہیں۔ بعض لوگ گھن کی وجہ سے ایسے بچوں کو جو بکری یا گائے کے پیٹ سے بعد ذبح نکلیں۔ نہیں کھاتے۔ خیر کھانا نہ کھانا تو اپنے اپنے مذاق پر ہے۔ لیکن وہ جنین حلال ہے۔ اور اگر ماں حلال کی گئی ہے تو بچہ جو مرا ہوا بعد میں نکالا جاتا ہے اُسے بغیر ذبح کے کھانا جائز ہے۔ کیونکہ ماں اور بچے کا خون ایام حمل میں ایک ہی ہوتا ہے۔ اور جب ذبح کرنے پر ماں کا خون نکل جاتا ہے۔ تو بچہ کا سب خون بھی اُسی راستہ سے نکل جاتا ہے۔ پس وجہ حرمت کوئی نہ رہی۔ کیونکہ وہ ماں کا ایسا ہی حصہ تھا۔ جیسے اُس کی اپنی کلیجی یا دِل وغیرہ۔

۳۱۸ - دُلدُل

وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا (انعام، ۱۳۹)

یعنی لوگوں نے بعض جانوروں کی سواری بھی حرام کر رکھی ہے۔ لاہور میں شیعہ صاحبان کا ایک دُلدُل ہے۔ اس پر کوئی سواری نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ حضرت امام حسینؓ کی نذر ہے۔ صرف لگام پکڑ کر اُسے باہر نکالتے ہیں۔ حالانکہ امام حسینؓ کے گھوڑے کو تو لگام دینی یا کھینچ کر باہر نکالنا بھی معیوب ہونا چاہیے۔ قرآن ان سب باتوں کو ناجائز ٹھہراتا ہے۔

۳۱۹ - عصا اور چٹان میں سے پانی نکالنا

فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا (البقرہ، ۶۱)

ترجمہ۔ ہم نے (اُسے) کہا کہ اپنا سونٹا فلاں پتھر پر مار۔ اس پر اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔

تورات میں ہے کہ جب ایک میدان میں بنی اسرائیل پہنچے اور وہاں پانی نہ ملا تو خدا نے موسیٰؑ کو کہا۔ آگے حورب کی ایک چٹان ہے۔ اس پر لاٹھی مار اس کے نیچے پانی تھا۔ غرض پانی کی نشاندہی خدا کی طرف سے ہوئی تھی۔ باقی چشمے وغیرہ ان لوگوں نے خود بموجب اپنے قبائل کی تعداد کے کھود لئے۔ معجزہ صرف اتنا تھا کہ پانی کی بابت علم غیب موسیٰؑ پر نازل ہوا۔

۳۲۰ ۔ اصحابِ فیل کا قصہ

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝ (الفیل)

اصحابِ فیل کا واقعہ تاریخی واقعہ ہے۔ اور اس سال کا ہے جس سال حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پیدا ہوئے۔ نیز اس قدر مشہور تھا۔ اور اس سورۃ کے نزول کے وقت بعض اس کے دیکھنے والے بھی زندہ تھے۔ کہ اس سورۃ کو اَلَمْ تَرَ سے شروع کیا ہے۔ یعنی کیا تو نے نہیں دیکھا۔ کہ اصحابِ فیل سے تیرے رب نے کیسا سلوک کیا۔ اس نے ان کی ساری کوشش اکارت کر دی۔ اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے جو انہیں کنکریوں کی طرح کے سنگریزوں سے مارتے تھے حتیٰ کہ ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔ اس پر عجیب عجیب خلاف واقعہ اور خلاف عقل رنگ چڑھایا گیا ہے۔ اور کہ سکتے کہ یہ کہا گیا ہے کہ پرندے جھنڈ کے جھنڈ آتے تھے۔ اور ان کے پنجوں اور چونچوں میں کنکریاں ہوتی تھیں۔ ہر کنکری پر کسی لشکری کا نام ہوتا تھا۔ اور انہیں ایسا تک کر مارتے تھے۔ کہ وہ سپاہی وہیں ڈھیر ہو جاتا

تھا۔ حالانکہ اصل بات یہ تھی کہ حبشیوں کا لشکر مکہ کا محاصرہ کئے پڑا تھا۔ کہ یکدم موسم متغیر ہوا۔ ایسے وقت میں بعض قسم کے خاص پرندے بلکہ وہ پرندے جو ہماری زبان میں بھی ابابیل کہلاتے ہیں بکثرت نکل آیا کرتے ہیں۔ آسمان پر اڑنے لگے۔ بارش شروع ہوئی۔ اور اس قدر اولا پڑا گویا آسمان سے سنگریزوں کی بارش ہوئی یہی حجارۃ مّن سجّیل تھے۔ نیز بہت کچھ نقصان جان اس وجہ سے بھی ہوا۔ کہ فوج ایک کھلی وادی میں تھی۔ اور بارش کی کثرت سے سیلاب آگیا تھا۔ اس کے بعد منشائے الٰہی سے جیسا کہ حبشیوں کی نسل کو چیچک کی بیماری سے خاص الخاص مناسبت ہے۔ یہ وبا اس لشکر میں پھوٹ نکلی اور اس قدر مہلک ثابت ہوئی کہ اکثر کا صفایا ہو گیا (بقول ابن ہشام ساٹھ ہزار کا) اور پس ماندگان واقعی کھائے ہوئے بھس کی طرح ہو گئے۔ اس صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو عذاب ان پر آئے۔ ایک ژالہ باری اور بارش کے طوفان کا جس سے فوری ہلاکت واقع ہوئی۔ دوسرا چیچک کی وبا کا چونکہ اول بارش اور طوفان سے پہلے ابابیل بہت کثرت سے آسمان پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہی نظر آتا تھا۔ کہ گویا ان عذاب کے اولوں کو یہ جھنڈ پرندوں کے اپنے ساتھ لائے تھے۔ پھر ساتھ اس کے ساتھ چیچک نے تباہی ڈال دی۔ یہ دونوں ایسی باتیں ہیں۔ کہ ان کے لئے کسی خاص عجوبہ سازی کی جیسی کہ تفسیروں میں مذکور ہے ضرورت نہیں پڑتی۔ عذاب الٰہی جس شکل میں خدا نے چاہا اُسے نازل کیا۔ اسے غیر معمولی سنگریزے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی جب وہ معمولی سنگریزے آسمان سے برسا کر ان پر عذاب بھیج سکتا تھا۔ اور حبشیوں کے جسموں پر کنکریوں کے نشان ڈالنے کی کیا حاجت تھی۔ جب اس کے خزانہ میں چیچک کے داغ ڈالنے والی بیماری کے کیڑوں کی فوج موجود تھی۔ اور پرندے تو صرف آنے والے طوفان کا نشان تھے۔

۲۔ ایک اور معنے بھی اس صورت کے ایسے ہو سکتے ہیں جس میں صحیح واقعہ بغیر فرضی مبالغوں کے آجاتا ہے وہ یہ کہ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ یعنی ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ تو جھنڈ کے جھنڈ مردار خوار پرندے مثلاً گدھ کوّے وغیرہ ان مردوں کے کھانے

کے لئے وہاں بھیج دیئے۔ اس سورۃ میں اَلَمْ تَرَ کہہ کر آنحضرتؐ یا ہر مسلمان کو بصیغہ واحد حاضر مخاطب کیا گیا ہے۔ صیغہ واحد حاضر کا تنمیمی شہر میں پھیر لا گیا ہے۔ یعنی اے محمدؐ یا اے مسلمان یہ تو تو ہر سال حج کے دنوں میں منیٰ میں جا کر رمی جمار کرتا ہے۔ یہاں اصحاب الفیل ہی کو تو کنکریاں مارتا ہے یعنی حج کے موسم میں جو کنکریاں تین شیطانوں کو ماری جاتی ہیں جس کو رمی جمار کہتے ہیں۔ وہ شیطانوں کو کیا دراصل اصحاب الفیل کو ہی بطور یادگار کے ماری جاتی ہیں کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اصحاب فیل کا لشکر مزدلفہ اور منا کے درمیان مقام محسر یا محصر میں اُترا تھا اور حاجی لوگ بھی اسی جگہ جا کر کنکریاں مارتے ہیں۔ پس مطلب ساری سورت کا یہ ہوا کہ اے محمدؐ یا اے مسلمان کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ کیا اس نے ان کی جنگی تدابیر کو ملیامیٹ نہیں کر دیا اور ان کو وبائے چیچک سے ہلاک کر کے ان پر مردار خوار پرندے مسلط نہیں کر دیئے؟ یہ وہی جگہ تو ہے جہاں تو ان کو کنکریاں مارتا ہے اور تیرے رب نے ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔ (یہاں فَ کے معنی پس کی بجائے اور کے کرنے ہوں گے)۔

حاجی جو بطور شکریہ اور تحدیث بالنعمۃ کے اس جگہ کنکریاں مارتا ہے۔ تو اس لئے تاکہ ایک طرف خدا تعالیٰ کے اس فضل کو جو کعبہ پر ہوا یاد رکھے۔

دوسرے ہر اس قوم یا دشمن سے لڑنے کو مستعد ہے جو کبھی بیت اللہ پر حملہ آور ہو۔

تیسرے اصحاب فیل پر بسبب ان کے خانۂ خدا پر حملہ آور ہونے کے عملی نفرت اور لعنت کے جذبہ کا اظہار کرتا ہے۔ جس طرح ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی قربانی اور طواف اور ہاجرہؑ کے صفا و مروہ پر دوڑنے کی نقل وہ عبادت اور ثواب سمجھ کر کرتا ہے۔

بہر حال سنگریزوں سے یا تو ژالہ باری مراد ہے جو بارش کے ساتھ ہوئی۔ یا وہ سنگریزے مراد ہیں جو حاجی لوگ حج کے دنوں میں منیٰ میں جا کر رمی جمار کے طور پر اصحاب فیل کی یادگار کو مارتے ہیں۔ یہ معنی کہ مردار خوار پرندے ان کا گوشت ٹھونگیں پتھر مار کر کھاتے تھے اور یہی معنی

تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ کے ہیں مجھے ماننے میں اس وجہ سے تأمل ہے کہ ہم نے بکثرت گِدھوں چیلوں کوّوں کو مُردار کھاتے دیکھا ہے۔ مگر کبھی یہ بات نہ دیکھی نہ سُنی کہ یہ جانور گوشت کو پتھروں پر مار مار کر کھایا کرتے ہیں۔ پس جب تک کوئی شہادت اس بات کی مہیا نہ ہو۔ یا کوئی دوست اپنا چشم دید واقعہ نہ بیان کریں، تب تک یہ معنے نہیں کئے جا سکتے۔

اب دیکھو یہ حوالہ جات :۔

۱۔ اُوپر سے بارش ہوئی۔ اور اس وادی میں سیلاب آیا۔ بہت سارے لشکری ہلاک ہو گئے ۔» (حال اصحاب الفیل۔ نورالدین بجواب ترک اسلام)

۲۔ " جس مقام پر یہ لشکر ہلاک ہوا۔ وہ مزدلفہ اور منا کے درمیان کی جگہ ہے۔ اب بھی حاجی لوگ رمی جمار کے لئے اسی میدان سے کنکریاں چُن کر ساتھ لے آتے اور ان سے رمی جمار کرتے ہیں ۔» (تفسیر سورۃ فیل۔ نوٹ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل)

(الفضل ۱۰؍ اکتوبر ۱۹۲۸ء)

۲۲۱ ۔ نَاقَةُ اللهِ

یہ جو حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی تھی۔ یہ اسی طرح تھی جس طرح اگلے زمانہ کے راجہ یا بادشاہ اپنا ایک گھوڑا یا اُونٹ چھوڑ دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جہاں جہاں یہ پھرے گا وہ ہمارا ملک ہے۔ جسے اس بات سے انکار ہو وہ اس جانور کو چھیڑ کر دیکھ لے جو راجہ یا بادشاہ اس کی بڑائی کو تسلیم نہیں کرتا تھا وہ اس گھوڑے یا اُونٹ کو پکڑ لیتا تھا۔ یا ذبح کر دیتا تھا۔ اس پر دونوں میں جنگ ہو کر بڑائی اور چھوٹائی کا فیصلہ ہوا کرتا تھا۔ اگر دوسرا کوئی راجہ اُسے نہ چھیڑتا تو سمجھا جاتا کہ گھوڑے والا راجہ واقعی اس سے بڑا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے صالح نبی کی معرفت ایک اونٹنی چھڑوا دی اور بادشاہوں کی طرح یہ

فرمادیا کہ

فَذَرُوْهَا تَأْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ (الاعراف، ۷۳)

ترجمہ، پس اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرے۔

اسے ہم نے خدا کی بادشاہت کا نشان بنایا ہے اس لیے اسے آزاد چھوڑ دو جو ہاتھ لگائے گا مارا جائے گا۔ کیونکہ اس نے ہماری بادشاہت کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ہم سے جنگ کی۔

اور تاکہ معلوم ہو کہ کون مخالف سلسلہ ہے اور کون موافق۔ تمام قرآن میں کہیں پہاڑ میں سے پتھر کی اونٹنی بننے اور اس میں جان ڈالنے کا ذکر نہیں بلکہ وہ ایک عام اونٹنی تھی۔ غالباً چونکہ ثمود بہت مشہور سنگ تراش قوم تھی

تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا (اعراف، ۷۵)

ترجمہ، پہاڑوں کو کھود کر گھر بناتے تھے۔

اس لئے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ یہ اونٹنی بھی پتھر ہی کی ہوگی۔ جنگل میں چرنے کی اُسے آزادی تھی اور قیام امن اور فساد سے بچنے کے لئے اس کا پانی پینے کا وقت بھی مقرر کر دیا گیا تھا۔

لَهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (الشعراء، ۱۵۶)

ترجمہ، ایک دن اس کے لیے گھاٹ پر پانی پینا مقرر ہے اور ایک دن تمہارے لئے گھاٹ سے پانی لینا مقرر ہے۔

یہ پانی کی باری جو مقرر تھی اس سے یہ مطلب نہیں۔ کہ ایک دن صبح سے شام تک وہ پانی ہی پیتی رہتی تھی۔ بلکہ ایک دن تو سارا دن لوگوں کا اور دوسرے دن حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی باری تھی۔ مگر صرف اتنا وقت جتنے میں وہ پانی سے پیٹ بھر لے۔ اس کے پانی پینے کے بعد اور لوگوں کو ممانعت نہ تھی۔ نہر کی باری کی طرح اس کی بھی ایک دن بعد باری آتی تھی۔ مگر اتنی ہی جتنی دیر میں وہ سیراب ہو جائے۔ یہ نہیں کہ پھر آٹھ پہر وہ اس چشمہ پر قبضہ کئے بیٹھی رہتی تھی۔ یاد رہے کہ یہ اونٹنی کا نشان بھی ان لوگوں کے ہی بار بار

معالیہ اور اصرار سے ان کر دیا گیا تھا۔

فَأْتِ بِآيَةٍ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ○ قَالَ هَٰذِهِ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ (الشعراء ۱۵۵/۱۵۶)

(ترجمہ: پس اگر تو سچا ہے، تو کوئی نشان ظاہر کر، اس نے کہا یہ ایک اونٹنی ہے، ایک دن اس کے لئے گھاٹ پر پانی پینا مقرر ہے اور ایک دن تمہارے لیے گھاٹ سے پانی لینا مقرر ہے۔

بلا طلب کے نہیں دیا گیا تھا۔ (الفضل ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء)

۳۲۲۔ جوامع الکلم

یوں تو قرآن مجید کی ہر آیت جوامع الکلم میں داخل ہے خصوصاً سورہ فاتحہ یعنی ایک ایک آیت میں کئی کئی معنے جمع ہیں۔ اور تھوڑے الفاظ میں وسیع مطالب موجود ہیں۔ مگر مثال کے طور پر چند مشہور آیات یہ ہیں:۔

۱۔ لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ (الحج: ۳۸)

ترجمہ:۔ ان قربانیوں کے گوشت اور خون ہرگز اللہ تک نہیں پہنچتے لیکن تمہارے دل کا تقویٰ اللہ تک پہنچتا ہے۔

۲۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ (البقرہ: ۱۸۰)

ترجمہ: اے عقلمندو! تمہارے لیے (اس) بدلہ لینے میں زندگی (کا سامان) ہے۔

۳۔ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ (النحل: ۹۱)

ترجمہ: اللہ یقیناً عدل کا اور احسان کا اور غیر رشتہ داروں کو بھی) قرابت

والے (شخص) کی طرح (جانتے اور اسی طرح مدد) دینے کا حکم دیتا ہے اور
(ہر ایک قسم کی) بے حیائی اور ناپسندیدہ باتوں اور بغاوت سے روکتا ہے۔

۴۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (النساء، ۵۹)

ترجمہ ۔ اللہ تمہیں یقیناً اس بات کا حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے مستحقوں
کے سپرد کرو۔

۵۔ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ
وَالْعُدْوَانِ (المائدہ ۳)

ترجمہ ۔ اور تم نیکی اور تقویٰ (کے کاموں) میں باہم (ایک دوسرے کی) مدد کرو۔
اور گناہ اور زیادتی (کی باتوں) میں (ایک دوسرے کی) مدد نہ کیا کرو۔

۶۔ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (الانعام ۱۲۱)

ترجمہ ۔ اور گناہ کی ظاہری شکل اور اس کی حقیقت (دونوں) سے بچو۔

۷۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ
(الحج ۳۳)

ترجمہ ۔ جو شخص اللہ کی مقرر کردہ نشانیوں کی عزت کرے گا۔ اس (کے اس فعل)
کو دلوں کا تقویٰ قرار دیا جائے گا۔

۳۲۲ ۔ سیّدوں کا بیجا فخر

سادات کے بعض افراد نے لوگوں میں یہ عام خیال پھیلا رکھا ہے کہ وہ دوسروں کی
نسبت گناہ کرنے میں زیادہ آزاد ہیں ان کو معاصی کی پرسش نہ ہوگی۔ بلکہ وہ تو لوگوں کے
شفیع ہوں گے۔ حالانکہ سب انسان خدا کی نظر میں برابر ہیں جو بھی بُرا کام کرے گا ، سزا پائے
گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقعہ پر فرمایا کہ اگلی امتیں اس وجہ سے

ہلاک ہوئیں کہ کوئی بڑا آدمی گناہ کرتا تھا تو اُسے حد نہ لگاتے تھے۔ لیکن کوئی چھوٹا آدمی وہی گناہ کرتا تو اُسے حد لگائی جاتی تھی۔ خدا کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دوں گا۔ قرآن کریم میں اس سے بھی زیادہ سخت وعید ہے۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (الاحزاب ۳۱)

اے نبی کی بیویو! اگر تم میں کوئی ظاہر طور پر کسی بُرائی کی مرتکب ہوگی تو اُسے نسبت اور لوگوں کے دوگنا عذاب دیا جائے گا۔

پس سادات کے اس قسم کی کوئی انبساط نہیں ہے بمعض شیخی اور تعلّی ہے۔ اگر ان کی بات سچ ہوتی تو نوح علیہ السلام کے بیٹے کو وہ حال ہوتا جو ہے۔ لہٰذا وہ سادات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانبردار نہیں وہ آپ کے اہل سے خارج ہیں

إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ (ہود ۴۶)

ترجمہ: وہ تیرے اہل میں سے ہرگز نہیں۔

اور کسی کی ماں اور لوطؑ کی بیوی کو

قِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ (التحریم ۱۰)

ترجمہ: اور ان دونوں عورتوں سے کہا گیا تھا کہ جہنم میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی جہنم میں چلی جاؤ۔

نہ کہا جاتا۔ نہ آذر اور ابولہب اور ابوطالب کا وہ حال ہوتا

۳۲۲ - باوزن آیات

بعض آیات یا آیتوں کے ٹکڑے قرآنِ مجید میں باوزن بھی واقع ہوئے ہیں مثلاً

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ترجمہ :(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے پڑھتا ہوں) ۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا (آل عمران ۹۳)

ترجمہ : تم کامل نیکی کو ہرگز نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ اشیاء میں سے (خدا کے لیے) خرچ نہ کرو۔

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل ۸۲)

ترجمہ : اور باطل تو ہے ہی بھاگ جانے والا ۔

حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ (البقرہ ۲۳۱)

ترجمہ : جب تک کہ وہ اس کے سوا (کسی) دوسرے خاوند کے پاس نہ جائے

فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ (البقرہ ۶۹)

ترجمہ : جو حکم تمہیں دیا جاتا ہے اسے بجا لاؤ ۔

حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ (ص ۳۳)

ترجمہ : یہاں تک کہ وہ (گھوڑے) اوٹ میں آ گئے ۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (النور ۵۷)

ترجمہ : اور تم سب نمازوں کو قائم کرو اور زکوٰتیں دو ۔

فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ (الغاشیہ ۱۳)

ترجمہ : اس میں ایک بہتا ہوا چشمہ ہوگا ۔

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (التکاثر ۳)

ترجمہ : (خوب یاد رکھو کہ) تم لوگ عنقریب (قرآن کریم کی بیان کردہ حقیقت کو) جان لوگے ۔

إِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الشعراء ۹۸)

ترجمہ : جبکہ ہم تم کو رب العالمین خدا کے برابر درجہ دیتے تھے ۔

اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ (ہود ۶۰)

ترجمہ : سنو! (ہم عذاب کے فرشتوں سے کہتے ہیں) عاد یعنی قوم ہود کے لیے لعنت (مقدر) کر دو

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم ۴۰)

ترجمہ : اور انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے ۔

ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ (البقرہ ۸۵)

ترجمہ : اور تم نے (اس کا) اقرار کر لیا تھا اور تم (اس عہد کے متعلق ہمیشہ) گواہی دیتے رہے ہو ۔

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ (البقرہ ۸۶)

ترجمہ : پھر تم لوگ ہی ہو کہ (اس عہد کے باوجود) آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو ۔

۳۲۵ ۔ نوحؑ اور اصحاب کہف کی عمر

فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ (عنکبوت ۱۵)

ترجمہ : وہ اُن میں نو سو پچاس سال تک رہا ، سو اس کی قوم کے لوگوں کو

طوفان نے آ لیا اور وہ ظالم تھے۔

وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ (الکہف ، ۲۶،۲۵)

ترجمہ: اور (بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ) وہ اپنی وسیع پناہ گاہ میں تین سو سال تک رہے اور اس عرصہ پر) نو (سال) انھوں نے اور بڑھائے تھے۔ تو (انھیں) کہہ (کہ) جتنا (عرصہ غار میں) ٹھہرے رہے اُسے اللہ (ہی) بہتر جانتا ہے۔

اس میں نوح علیہ السلام کا زمانہ نبوت ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام کا دو ہزار سال تا بعثت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ میں ف کے معنی اس کے بعد نہیں ہوں گے بلکہ اور کے ہوں گے اور اگرچہ اصحاب کہف کا معاملہ آیت کے اگلے حصے سے مشتبہ ہو گیا کیونکہ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا کی وجہ سے یہ عرصہ تسلیم نہیں کیا گیا۔ لیکن اگر تسلیم بھی کر لیں تو یہ مطلب ہے کہ کہف میں ان عیسائیوں کے چھپنے اور مخفی پناہ لینے کا سلسلہ کئی پشتوں اور کئی صدیوں تک جاری رہا۔ حتےٰ کہ تین سو سال بعد جب خطرہ جاتا رہا اور ان کے لئے امن کا زمانہ آ گیا تو یہ عیسائی باہر نکل آئے۔

۳۲۶ - علمِ الٰہی سب کے علم پر حاوی ہے۔

وَفَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ (یوسف ، ۷۶)

ترجمہ: اور (حقیقت یہ ہے کہ) ہر علم والے کے اُوپر (اس سے) زیادہ علم والی ہستی (پائی جاتی) ہے۔

کے معنی بہت سے لوگ یہ کرتے ہیں کہ ہر علم والے کے اُوپر ایک اور علم والا ضرور موجود ہوتا ہے۔ یہ معنی بالبداہت غلط ہیں۔ کیونکہ اگر خود خدا تعالیٰ کا استثنا بھی کریں تب

بھی ماننا پڑے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کوئی نقوٰی کے علم میں بڑا ہوگا۔ کوئی نیکی کے علم میں بڑا ہوگا۔ کوئی معرفت میں زیادہ ہوگا۔ کوئی صفاتِ الٰہی کے علم میں زیادہ ہوگا۔ غرض اس طرح حضورؐ کے کمالات اور علوم کی ہر شاخ میں کوئی نہ کوئی آپ سے زیادہ تسلیم کیا جائے گا اور یہ قطعاً غلط ہے۔ اس لئے اس آیت کے معنے یہ ہوئے۔ کہ ہر علم والے کے اوپر ایک علیم خدا موجود ہے۔ یہاں علیم انسان کی صفت نہیں ہے بلکہ خدا کی ہے۔ (الفضل یکم نومبر ۱۹۲۰ء)

۳۲۷ اپنے تئیں سزا

حدود اللہ میں جو حدیں سزا کے طور پر قرآن مجید نے بیان کی ہیں۔ وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ جن میں گورنمنٹ یا قاضی سزا دیتا ہے۔ ایک وہ جن میں وہ شخص خود اپنے تئیں سزا دیتا ہے۔ بلکہ دوسروں کو علم بھی نہیں ہوتا۔ اس قسم کی شرعی حدیں کہ انسان خود اپنے آپ کو بھی بعض قصوروں کے عوض سزا دیا کرے۔ حالانکہ کوئی اور نہ ان سزاؤں کا علم رکھتا ہے نہ ان حدود کو اس پر جاری کر سکتا ہے۔ یہ ثابت کرتی ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ مومنوں میں گناہوں کا احساس اور رضائے الٰہی کا شوق اور سزا کو ٹالنے کی جگہ اُلٹا اسے اپنی مرضی سے برداشت کرنے کی سپرٹ پیدا کرنی چاہتا ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں۔ کہ جب دنیا کے اور مجرم زنا کی سزا سے بچنا چاہتے ہیں تو مسلمان مجرم عورتوں تک نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر خود اپنے گناہ کا اقرار کیا۔ اور سزا کی درخواست کی اور اُسے برداشت کیا تاکہ اللہ کی رضا حاصل ہو جائے۔

بطور نمونہ وہ شرعی جرائم جن پر حدود ہیں۔ اور قاضی اس سزا کو نافذ کرتا ہے یہ ہیں۔ قتل۔ زنا۔ ارتداد۔ چوری اس کے علاوہ شراب خوری، بے حیائی کے کام۔ احرام میں شکار کرنا اور بہت سے دیگر جرائم کے لئے تعزیریں ہیں۔ لیکن بعض ایسے گناہ بھی ہیں جن کی سزا مسلمانوں کو حکم ہے کہ خود اپنے تئیں دیا کریں۔ وہ یہ کہ مثلاً کوئی اپنی بیوی کو ماں کہہ دے تو دو ماہ روزے

رکھے یا غلام آزاد کرے۔ اب ایسی سزا کے متعلق مفتی تو فتویٰ دے سکتا ہے مگر یہ کر دئے رکھے گئے۔ یا غلام آزاد کیا گیا۔ یہ اسی شخص کے اپنے کرنے کی بات ہے۔ اسی طرح قسم توڑنے کا کفارہ ہے جس کے لئے دس مسکینوں کا کھانا یا کپڑا ہے۔ یہ سزا بھی خود اپنے آپ کو دینی پڑتی ہے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے منہ سے صلح حدیبیہ کے دن جو کلمہ نکلا اس کی وجہ سے میں نے بہت سے نیکی کے کام کئے تاکہ

إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (ہود، ۱۱۵)

ترجمہ:۔ یقیناً نیکیاں بدیوں کو دُور کر دیتی ہیں۔

کے ماتحت وہ میرا کفارہ بنیں۔ بس مومن کو اپنے گناہوں کی مغفرت کے لئے نہ صرف دُعا اور استغفار ہی کرنا چاہیے۔ بلکہ اُن کے دُور کرنے اور رضائے الٰہی کے لئے اپنے طور پر بھی اپنے نفس کو بعض سزائیں دینی چاہئیں۔ مثلاً روزے رکھنا۔ صدقہ وغیرہ دینا۔ نوافل پڑھنا۔ شب بیداری۔ بعض آرام کی چیزوں کا عارضی ترک وغیرہ تاکہ یہ باتیں اس کی اُن غلطیوں اور معاصی کا کفارہ ہوں۔ جو اس کے دل میں کھٹکتی ہیں۔

۳۲۸ - بعض زبان زد آیات

بعض آیات قرآن مجید کی خاص و عام میں زبان زد ہو گئی ہیں۔ ہم اپنی گفتگو یا تحریروں کے اندر انہیں لٹریری رنگ میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً:۔

۱۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (الرحمٰن، ۲۷)

ترجمہ: جو کوئی اس (یعنی زمین) پر ہے آخر ہلاک ہونے والا ہے۔

۲۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (البقرہ، ۱۵۷)

ترجمہ:۔ ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

۳۔ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى (طٰہٰ، ۴۸)

ترجمہ :- جو شخص ہماری لائی ہوئی ہدایت کے پیچھے چلے گا (خدا کی طرف سے) اس پر سلامتی نازل ہوگی۔

۴. فَاعْتَبِرُوْا يٰاُولِى الْاَبْصَارِ (الحشر: ۲)

ترجمہ :- پس اے سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگو! عبرت حاصل کرو۔

۵. لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (آل عمران: ۶۱)

ترجمہ :- جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ڈالیں۔

۶. لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِىَ دِيْنِ (الکافرون: ۶)

ترجمہ :- (اوپر کا اعلان نتیجہ ہے اس کا کہ) تمھارا دین تمھارے لیے (ایک طریق کار مقرر کرتا) ہے اور میرا دین میرے لیے (دوسرا طریق کار مقرر کرتا) ہے۔

۷. اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

ترجمہ :- ہر (قسم کی) تعریف کا اللہ (ہی) مستحق ہے۔

۸. لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام: ۱۶۵)

ترجمہ :- اور کوئی بوجھ اٹھانے والی (ہستی) دوسری (ہستی) کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔

۹- وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ (النجم: ۳۹)

ترجمہ :- اور انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

۱۰. هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔ (الرحمٰن: ۶۰)

ترجمہ :- کیا احسان کی جزا احسان کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔

۱۱. لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ: ۲۸۶)

ترجمہ :- اللہ کسی شخص پر سوائے اس (ذمہ داری) کے جو اس کی طاقت میں ہو کوئی ذمہ داری نہیں ڈالتا۔

۱۲ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (الاحزاب: ۶۲)

ترجمہ: اور تو کبھی بھی اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں پائے گا۔

۱۳۔ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (النساء: ۲۹)

ترجمہ: اور انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

۱۴۔ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ (النور: ۲۶)

ترجمہ: خبیث باتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں۔

۱۵۔ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ (النور: ۳۵)

۱۶۔ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (الجمعۃ: ۵)

ترجمہ: اُن کی مثال گدھے کی ہے، جس نے بہت سی کتابیں اُٹھائی ہوئی ہیں۔

۱۷۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران: ۱۸۵)

ترجمہ: ہر ایک جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے۔

۱۸۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (الانشراح: ۶)

ترجمہ: (ہاں) یقیناً اس تنگی کے ساتھ ایک (اور بھی) بڑی کامیابی (مقدر) ہے۔

۱۹۔ حَسْبِيَ اللّٰهُ (التوبہ: ۱۲۹)

ترجمہ: اللہ میرے لیے کافی ہے۔

۲۰۔ حَسْبَكَ اللّٰهُ (الانفال: ۶۲)

ترجمہ: اللہ تیرے لیے یقیناً کافی ہے۔

۲۱۔ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ (التوبہ ۱۲۹، ہود ۸۹، یوسف ۶۸، الرعد ۳۱)

ترجمہ: میں اسی پر توکل کرتا ہوں۔

۲۲۔ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ (یونس: ۱۰۸)

ترجمہ: اس کے فضل کو رد کرنے والا (بھی قطعاً) کوئی نہیں (ہو سکتا)

۲۳۔ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

ترجمہ: یقیناً اللہ ہربات پر پوری طرح قادر ہے۔

۲۴۔ نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (ق ۱۶)

ترجمہ: اور ہم اس (انسان) سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

۲۵۔ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (آل عمران ۱۲۰)

ترجمہ: اللہ یقیناً سینے کے رازوں تک کو بھی جانتا ہے۔

۲۶۔ إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ (البروج ۱۲)

ترجمہ: یقیناً تیرے رب کی گرفت سخت ہوا کرتی ہے۔

۲۷۔ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا (ابراہیم ۳۵)

ترجمہ: اگر تم اللہ کے احسان گننے لگو تو اُن کا شمار نہیں کر سکو گے۔

۲۸۔ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (البقرہ ۱۵۴)

ترجمہ: اللہ یقیناً صابروں کے ساتھ (ہوتا) ہے۔

۲۹ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ (الضحیٰ ۱۱)

ترجمہ: اور سوالی کو تو جھڑک مت۔

۳۰۔ لَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (المائدہ ۵۵)

ترجمہ: اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

۳۱۔ لَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ وَلَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ (النساء ۱۴۴)

ترجمہ: نہ وہ اِن (مومنوں) کے ساتھ ہیں اور نہ وہ اُن کافروں کے ساتھ ہیں۔

۳۲۔ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ (المائدہ ۴۶)

ترجمہ: اور آنکھ کے بدلے آنکھ، اور ناک کے بدلے میں ناک، اور کان کے بدلے میں کان

۳۳۔ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ (النساء ۱۲)

ترجمہ :۔ (ایک) مرد کا (حصہ) دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہے ۔

۳۴۔ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ (الزمر ۵۳)

ترجمہ :۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کبھی نا اُمید نہ ہو ۔

۳۵۔ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (ضحیٰ ۱۱)

ترجمہ :۔ اور تو اپنے رب کی نعمت کا ضرور اظہار کرتا رہ ۔

۳۶۔ فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا (الاحزاب ۵۳)

ترجمہ :۔ پھر جب کھانا کھا چکو تو اپنے اپنے گھروں کو چلے جایا کرو ۔

۳۷۔ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ (اعراف ۳۱)

ترجمہ :۔ اور کھاؤ اور پیو اور اسراف نہ کرو ۔

۳۸۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (المؤمنون ۵۳)

ترجمہ :۔ اور ہر فرقے نے جو طریقہ اپنے لئے اختیار کیا، اس پر فخر کرنے لگ گئے ۔

۳۹۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ (ہود ۸۸)

ترجمہ :۔ اور میرا توفیق پانا اللہ ہی (کے فضل اور رحم) سے (وابستہ) ہے

۴۰۔ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ (اعراف ۸۹)

ترجمہ :۔ ہم اللہ ہی پر توکل کرتے ہیں ۔

۴۱۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ (الرحمٰن ۲۹)

ترجمہ :۔ وہ ہر وقت ایک نئی حالت میں ہوتا ہے ۔

۴۲۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ؕ

ترجمہ :۔ (میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

۴۳۔ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ (الانعام ۳۲)

ترجمہ :- اور دنیا کی زندگی کھیل اور مشغلہ کے سوا (کچھ) نہیں ہے۔

۴۴۔ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ (زلزال ۹۱)

ترجمہ :- اور جس نے ایک ذرہ کے برابر بھی بھلائی کی ہوگی وہ اس (کے نتیجہ) کو دیکھ لے گا۔

۴۵۔ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا (ہود ۴۲)

ترجمہ :- اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرایا جانا اللہ کے نام کی برکت سے ہی ہوگا۔

۴۶۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود ۱۰)

ترجمہ :- اور زمین میں ایسا کوئی بھی جاندار نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔

۴۷۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى (الاعراف ۱۷۲)

ترجمہ :- (اور پوچھا) کیا میں تمہارا رب نہیں؟ انھوں نے کہا ہاں! ہاں!

۳۲۹ - منافقوں کی علامات اور ان کے حالات

۱۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ (بقرہ ۹)

ترجمہ :- اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آنے والے دن پر ایمان رکھتے ہیں، حالانکہ وہ ہرگز ایمان نہیں رکھتے۔

ظاہر میں ایمان سب باتوں پر اور باطن میں بے ایمان۔

۲ مخفی مخفی فساد پھیلاتے پھرتے ہیں اور جب کوئی ٹوکے تو کہتے ہیں کہ یہ باتیں تو ہم اس لئے کرتے ہیں کہ اصلاح ہو جائے جماعت کی۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ (البقرہ ۱۲)

اور جب اُن سے کہا جائے (کہ) زمین میں فساد نہ کرو، تو کہتے ہیں، ہم تو صرف اِصلاح کرنے والے ہیں۔

۳ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ (البقرہ ۱۳)

اور جب اُنھیں کہا جائے کہ (اسی طرح) ایمان لاؤ جس طرح (دوسرے) لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا ہم (اس طرح) ایمان لائیں جس طرح بیوقوف (لوگ) ایمان لائے ہیں۔

جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ساری جماعت جس طرح مانتی ہے۔ اس طرح تم بھی مانو تو کہتے ہیں۔ کہ کیا ہم بیشر حال کی پیروی کریں۔ یہ تو بیوقوف ہیں۔ اہل الرائے نہیں ہیں ٹکڑے کے ٹکڑے توڑنے والے ہیں۔

۴۔ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ (البقرہ ۱۵)

ترجمہ :۔ اور جب وہ اُن لوگوں سے ملیں جو ایمان لائے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو (اس رسول کو) مانتے ہیں اور جب وہ اپنے سرغنوں سے علیحدگی میں ملیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم یقیناً تمہارے ساتھ ہیں۔

جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں۔ الحمدللہ ہمارا بھی یہی ایمان ہے۔ اور جب اپنے چیلے چانٹوں کی مجلس میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بس جو آپ کہتے ہیں وہی صحیح ہے۔

۵۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ (النساء ۶۱)

ترجمہ :۔ اور باوجود اس کے کہ اُن کو حکم دیا گیا تھا کہ سرکشوں سے فیصلہ نہ کرائیں اور ان کے کہے پر نہ چلیں وہ چاہتے کہ انہی سے فیصلہ

کرائیں۔

اپنے جھگڑے باوجود اپنے اس حکم قضا کی موجودگی کے غیر مسلم عدالتوں میں لے جانے کی
کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ حکم ہے۔ کہ وہاں اپنے غیر ضروری مقدمات نہ لے جاؤ۔

۶۔ وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ
طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ (النساء ۸۱)

ترجمہ: اور وہ کہتے ہیں (کہ ہمارا کام تو) فرمانبرداری ہے پھر جب
تیرے پاس سے چلے جاتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ جو کچھ تو کہتا ہے
اس کے مخالف تدبیریں کرتا ہے۔

سامنے کہتے ہیں۔ آمنا۔ صدقنا اور الگ جا کر اس کے خلاف منصوبے باندھتے ہیں۔

۷۔ وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ (النساء ۸۳)
جب کوئی امن یا خوف کی خبر آتی ہے۔ تو حکمہ متعلقہ یا خلیفہ کو اطلاع دیئے بغیر اُسے
اُڑاتے پھرتے ہیں۔

۸۔ وَاللَّهُ أَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوا (النساء ۸۸)
ترجمہ: حالانکہ جو کچھ اُنھوں نے کیا ہے اس کے سبب سے اللہ نے
انھیں اوندھا کر دیا ہے۔

نفاق بد اعمالیوں کی سزا میں ان پر ڈالا جاتا ہے اور یہ کشش بھان کی کرتوتوں کی۔

۹۔ الَّذِينَ يَتَّخِذُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ
أَيَبْتَغُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ (النساء ۱۳۹)
منافقین مومنوں کو چھوڑ کر منکرین سلسلہ کو دوست بناتے ہیں۔ اس لئے کہ مومنوں
کی جماعت کے نزدیک تو بے عزت ہو گئے۔ اب اغیار کے نزدیک ہی معزز بن جائیں۔

۱۰۔ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ يُرَاءُونَ النَّاسَ

وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ
اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ (النساء : ۱۴۲، ۱۴۳)

ترجمہ: اور جب وہ نماز (کی طرف جانے) کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی سے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ اُن کی حالت (یادِ الٰہی اور غفلت کے) درمیان درمیان ہوتی ہے۔ نہ وہ اِن (مومنوں) کے ساتھ ہیں اور نہ اُن (کافروں) کے ساتھ ہیں۔

نمازوں میں سست ہیں لوگوں کے دکھانے کو نماز پڑھتے ہیں اور جتنی پڑھتے ہیں وہ بھی اوپری دل سے۔ مذبذب تھاں کا جنگیں کبھی کفر و اسلام پر اپنے لوگوں سے بحث کی تو فیر سائلہ کی حمایت کرنے لگے کبھی اُن سے جا بھڑے تو بوت کے دلائل دینے لگے۔

۱۱۔ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ
هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ۭ (الانفال : ۵۰)

ترجمہ: نیز (یاد کرو) جب منافق اور جن کے دلوں میں مرض تھی کہتے تھے کہ اِن مسلمانوں کو ان کے دین نے مغرور کر دیا ہے۔

کسی نے جو نصیحت کی تو کہنے لگے۔ کہ تم تو ہر جگہ احمدیت احمدیت لئے پھرتے ہو واقعات کو دیکھو ہر جگہ آیت استخلاف کیلئے پھرتے ہو۔

۱۲۔ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ
اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (التوبہ : ۵۵)

ترجمہ: پس تو اُن کے مالوں اور ان کی اولادوں پر تعجب نہ کر۔ اللہ صرف یہ چاہتا ہے کہ ان مالوں اور اولادوں کے ذریعے سے ان کو اس دنیا کی زندگی میں عذاب دے۔

ان کی اولاد بے دین اور سلسلہ سے بےتعلق اور اُن کے اموال ضائع۔ کہ باوجود فرِیاِ کثیر کے پھر خدا تعالیٰ مومنوں کو ہی غالب رکھتا ہے اور دنیا ایسی بگڑتی ہے۔ کہ ان کی دہریت اور بے دینی کو دیکھ دیکھ کر خود ہی کڑھتے ہیں۔

۳۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ (التوبہ: ۵۸)

ترجمہ: اور اُن میں سے کچھ (منافق) ایسے ہیں جو صدقات کے بارے میں تجھ پر الزام لگاتے ہیں۔

مالی معاملات میں ہر وقت نبی اور خلیفۂ وقت پر اعتراضات

۴۔ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ (التوبہ: ۶۱)

ترجمہ: اور کہتے ہیں کہ وہ تو (کان ہی) کان ہے۔

کہتے ہیں مخبر رکھے ہوئے ہیں۔ جس نے ہماری بابت جو رپورٹ کی فوراً مان لی۔

۵۔ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا (التوبہ: ۶۴)

ترجمہ: منافق (دکھاوے کے طور پر) ڈر کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کے خلاف کوئی سورۃ نازل نہ ہو جائے جو انہیں (اور مسلمانوں کو) ان باتوں سے خبردار کر دے جو ان کے دلوں میں ہیں۔ تو کہہ دے کہ ہنسی کرتے جاؤ۔

ہر وقت ڈرتے ہیں کہ کسی مومن کو کوئی خواب ہمارے نفاق کے متعلق نہ آجائے لیکن یہ بات بھی تمسخر کے انداز میں کہتے ہیں۔

۶۔ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ (التوبہ: ۶۵)

جب کوئی بات ان کی پکڑی جاتی ہے۔ تو کہتے ہیں وہ تو مذاق تھا۔

۷۔ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ (التوبہ: ۶۷)

گندی باتوں کو شائع کرتے ہیں اور اچھی باتوں سے لوگوں کو روکتے ہیں اور بخیل ہیں
کہ مہینوں اور برسوں کے چندے ان کے ذمہ قرض ہیں اور باوجود ترغیب کے ادا نہیں کرتے ۔

۱۸ ۔ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ
وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا (التوبہ ۷۴)

ترجمہ :- حالانکہ انھوں نے کفر کی بات کہی ہے اور اسلام لانے کے بعد کفر کیا ہے اور
(اسلام کے خلاف) انھوں نے (مسلمانوں کے خلاف) ایسی بات کا ارادہ کیا ہے جن کو وہ حاصل نہیں کر سکتے ۔

پہلے نبوت اور خلافت مان کر پھر صاف مکر گئے مگر پھر بھی کامیابی نصیب نہ ہوئی ۔

۱۹ ۔ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي
الصَّدَقٰتِ (التوبہ ۷۹)

ترجمہ :- یہ (منافق ہی) ہیں جو مومنوں میں سے خوشی سے بڑھ بڑھ کر
صدقے دینے والوں پر طنز کرتے ہیں ۔

ان احمدیوں پر طعنے کرتے ہیں جو دل کی خوشی سے چندے اور وصیتیں کرتے ہیں اور
ان کا تمسخر اڑاتے ہیں ۔ مثلاً یہ کہہ کر کہ اب تو وصیت کر دی ہے شوق میں آ کر ۔ جس دن مرے گا اس
دن تیری بیوی بچوں سے جب انجمن والے وصیت وصول کریں گے تو پتہ لگے گا ۔

۲۰ ۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا
اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ○ اَوَلَا يَرَوْنَ
اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ (التوبہ ۱۲۵، ۱۲۶)

ترجمہ :- اور جن کے دل میں بیماری ہے اس (سورۃ) نے ان کے (پہلے)
گند پر اور گند چڑھا دیا ہے ۔ یہاں تک کہ وہ ایسی حالت میں مریں
گے کہ وہ کافر ہوں گے ۔ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ان کی ہر سال میں ایک ..
یا دو دفعہ آزمائش کی جاتی ہے ۔

ان لوگوں میں ناپاکی تو تھی ہی پھر وہ بڑھتی ہی چلی گئی اور ہر سال ایک یا دو دفعہ ان کو نیا ابتلا پیش آجاتا ہے۔ بس پھر کیا یہ اُبل پڑتے ہیں۔ پھر کچھ ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک نیا فتنہ آجاتا ہے۔ پھر اُس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ غرض اسی طرح عمر گزرتی ہے۔

۲۱۔ وَإِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يَٰٓأَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَٱرْجِعُوا۟ ۚ (احزاب: ۱۴)

ترجمہ: اور جبکہ اُن میں سے ایک گروہ یہ بھی کہنے لگ گیا تھا کہ اے مدینہ کے لوگو! (اب) تمہارے لیے کوئی ٹھکانہ نہیں پس (اسلام سے) مرتد ہو جاؤ۔

بعض کہتے ہیں کہ اے انصاریاں والو اب اتنی مخالفتوں میں تمہارا ٹھکانا کہاں ہے۔ بس چلو یہاں سے فرہود یا اپنے اپنے وطن کو۔

۲۲ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَآ إِلَّا قَلِيلًا مَّلْعُونِينَ ۖ أَيْنَمَا ثُقِفُوٓا۟ أُخِذُوا۟ وَقُتِّلُوا۟ تَقْتِيلًا (احزاب ۶۱-۶۲)

ہم اے رسول تجھ کو ایسا ان کے پیچھے لگا دیں گے۔ کہ وہ مقدس مدینہ میں نہ رہ سکیں گے۔ بعض ملعون ہوں گے۔ خواہ کہیں رہیں اور بعض مارے جائیں گے۔

۲۳۔ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِى لَحْنِ ٱلْقَوْلِ ۚ (محمد: ۳۱)

تو اُن کی باتوں کے انداز سے انہیں پہچان سکتا ہے۔

۲۴ يَوْمَ يَقُولُ ٱلْمُنَٰفِقُونَ وَٱلْمُنَٰفِقَٰتُ لِلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱنظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِن نُّورِكُمْ قِيلَ ٱرْجِعُوا۟ وَرَآءَكُمْ فَٱلْتَمِسُوا۟ نُورًا ۖ (الحدید: ۱۴)

ترجمہ: جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں مومنوں سے کہیں گے کہ ذرا ہمارا بھی انتظار کرو ہم تمہارے نور سے روشنی حاصل کر لیں، اس وقت

اُن سے کہا جائے گا اپنے پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ اور وہاں جاکر نُور تلاش کرو۔

اکثر اُن کی عادت ہے کہ مومنوں کے سامنے آکر اعتراض کرتے ہیں کہ ذرا یہ مسئلہ صاف کر دیجئے۔ ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کو اللہ نے بہت نور فراست دیا ہے تو یہ کہنا چاہئے کہ مسئلہ تو صاف ہے مگر تم اپنی عینک ہی پیچھے کہیں گرا کر آگئے ہو۔ اگر تم میں ایمان ہوتا تو یہ بات تم پر بھی سہل ہو جاتی ہے۔

۲۵۔ وَإِذَا جَآءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ (المجادلہ ۹)

اور جب وہ تیرے پاس آتے ہیں تو تجھے ایسے لفظوں میں دعا دیتے ہیں جن (لفظوں) میں خدا نے دُعا نہیں دی۔

پہلے حضرت مسیح موعود آپ پر سلامتی ہو کو نبی کہتے تھے۔ اب حضرت مجدد کہنے لگے۔ پہلے علیہ السلام کہتے تھے۔ اب رحمۃ اللہ علیہ کہنے لگے۔ پہلے حضرت مسیح موعود کہتے تھے۔ اب مرزا صاحب پر اکتفا کرنے لگے۔ پہلے حضرت صاحب یا حضرت خلیفۃ المسیح کہتے تھے۔ پھر میاں صاحب یا مرزا محمود کہنے لگے۔

۲۶۔ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى (الحشر ۱۵)

ترجمہ: تُو ان کو ایک قوم خیال کرتا ہے لیکن ان کے دِل پھٹے ہوئے ہوتے ہیں۔

یہ جماعت بھی بنالیں۔ تو بھی چونکہ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔ کبھی نہ کبھی اپنے صدر یا امیر کی توہین کرنے لگتے ہیں۔

۲۷ إِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنٰفِقِينَ لَكٰذِبُونَ (المنافقون ۲)

ترجمہ: جب تیرے پاس منافق آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم قسم کھا کر گواہی دیتے ہیں کہ تو اللہ کا رسول ہے۔ اور اللہ جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے۔ مگر (ساتھ ہی) اللہ قسم کھا کر گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔ (الفضل ۹ نومبر ۱۹۳۸ء)

۳۳۰ - قابلِ عمل آسمانی کتاب کون سی ہے ؟

بعض لوگوں کو یہ دھوکا لگا ہے کہ تورات و انجیل اب بھی قابلِ عمل ہیں۔ اور بعض ان کو بالکل ردی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ دونوں غلطی پر ہیں۔

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ (مائدہ ۴۸)

یعنی چلو اہلِ انجیل ہمارے ساتھ اسی سے فیصلہ کرلیں جو انجیل میں درج ہے۔ یہاں اتباع مراد نہیں بلکہ یہ مراد ہے۔ کہ عقلی دلائل۔ نصرتِ الٰہی اور نشانات و معجزات نے بھی اس نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر تم اپنی ہی موجودہ کتاب کو حکم بناؤ وہی فیصلہ کر دے گی۔ کہ یہ سچا ہے۔ اور واقعی انجیل اب بھی ان دلائل سے بھری پڑی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ نبی آخرالزمان ہیں۔ جن کا سب اہلِ کتب انتظار کر رہے تھے۔ باقی رہا یہ کہ پھر تو انجیل پر بھی عمل جائز ہو گیا۔ اور قرآن کا کوئی مرتبہ نہ رہا۔ اس کے لئے یہ آیت ہے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۙ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ (آل عمران ۳: ۴)

یعنی اللہ تعالیٰ نے اے محمدؐ تجھ پر یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے۔ جس کی وجہ سے سب پہلی کتابوں کی پیشگوئیاں سچی ہو گئیں۔ اور اسی اللہ نے تورات اور انجیل کو بھی اتارا تھا۔ یہ دونوں کتابیں لوگوں کے لئے اس سے پہلے زمانہ میں ہدایت ہوا کرتی تھی۔

اب ان دونوں آیتوں میں کوئی تناقض نہ رہا۔ ایک کے معنی یہ ہیں کہ اب جس نے سیدھی راہ اور ہدایت پر چلنا ہو۔ وہ قرآن پر چلے۔ تورات و انجیل گزشتہ زمانہ میں ہدایت کا موجب تھیں۔ قرآن کے نازل ہونے کے بعد ویسی نہیں رہیں۔ دوسری کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس رسول کی صداقت دیکھنی ہو تو آؤ۔ جو محرف و مبدل انجیل تمہارے پاس بھی موجود ہے۔ اسی سے فیصلہ کرو۔ اس میں اب بھی اتنا مصالحہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کا اسی سے فیصلہ ہو سکتا ہے۔ (الفضل ۲۰ نومبر ۱۹۳۸ء)

۲۲۱ ۔ سورۂ یوسف کا خلاصہ

زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام پر عاشق تھی اور جہاں تک اس کی طاقت میں تھا اس نے کوشش کی۔ لیکن جب پکڑی گئی تو سب عشق کافور ہو گیا بلکہ اُلٹا یہ کہنے لگی کہ

قَالَتْ مَاجَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (یوسف : ۲۶)

ترجمہ : (جس پر) اس (عورت) نے (اپنے خاوند سے) کہا جو (شخص) آپ کے اہل سے بدی (کرنا) چاہے۔ اس کی سزا سوائے اس کے (کوئی) نہیں (ہونی چاہیئے) کہ اُسے قید کر دیا جائے یا (اسے) کوئی اور دردناک عذاب (دیا جائے)

اور آخرکار جب اپنے مطلب میں ناکام رہی۔ تو یوسف کو قید کرا کے چھوڑا۔ یہ اس وجہ سے کہ عورت کی فطرت میں عشق سے بھی زیادہ نیک نامی اور عفت کی قدر ہے۔ اس لئے فطرت غالب آئی۔ اور اس کے مُنہ سے یہ فقرہ نکل گیا۔ واضح ہو کہ سورہ یوسف نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ ایک بدکار عورت ایک حسین مرد کے پیچھے پڑتی ہے پھر جب اُس کی مراد بر نہیں آتی تو اُن اُس پر اتہام لگاتی ہے اور اُسے گھر گھر بدنام کرتی پھرتی ہے

اس وجہ سے جو بھی یوسف برادران کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آئے تو یہ سمجھ لینا ہر ایک کے لئے سہل ہے۔ کرتہ میں کیا راز ہے اور کون مجرم ہے۔

۳۳۲ - تقدیر معلق و مبرم

تقدیر معلق کے لئے ایک آیت یہ بھی ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۔ (الرعد ۴۰)

ترجمہ: جس چیز کو اللہ چاہتا ہے مٹاتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) قائم کرتا ہے۔

یعنی پہلے ایک تقدیر جاری کرتا ہے۔ پھر کسی وجہ سے منشاء ہوتا ہے۔ تو اُسے مٹا دیتا ہے۔ گویا محو ہونے والا حصہ تقدیر معلق ہے۔ اور ثابت رہنے والا حصہ تقدیر مبرم۔

۳۳۳ - جوارح الٰہی استعارہ ہیں

جو لوگ خدا تعالیٰ کے ہاتھوں، انگلیوں، پیر اور ساق وغیرہ کو بعینہٖ اسی طرح سمجھتے ہیں جس طرح وہ عرفاً سمجھے جاتے ہیں اور اُن کو استعارہ نہیں سمجھتے۔ ان کو

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (القصص: ۸۹)

ترجمہ: ہر ایک چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کے جس کی طرف اس (اللہ) کی توجہ ہو۔

کی آیت پر غور کرنا چاہیئے۔ اگر لفظوں کو ہی پکڑا جائے تو اس کے یہ معنی ہونے کہ خدا کے منہ کے سوا باقی اس کے اعضاء۔ ید۔ ساق۔ رجل۔ اصابع سب ہلاک ہو جائیں گے مگر وہ خدا کیسا جس کا اکثر حصہ بدن بھی ہلاک ہو جائے۔

۲۳۲ ۔ قرآن آسان ہے ۔

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ (القمر : ۱۷)

ترجمہ : ہم نے قرآن کو عمل کے لئے آسان بنایا ہے ۔ پس کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے ؟

اور فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰہُ بِلِسَانِکَ (مریم : ۹۷)

ترجمہ : پس ہم نے تو اس (قرآن) کو تیری زبان میں آسان کر کے اُتارا ہے ۔

آسمانی کتب میں سے قرآن مجید سب سے زیادہ آسان کتاب ہے ۔

۱ ۔ اس کا حفظ کرنا آسان ہے کیونکہ اس کے الفاظ اور آیات کی ساخت اور روانی ہی ایسی ہے ۔

۲ ۔ اس کی لغت آسان ہے ۔ آدھے سے زیادہ ایسے الفاظ ہیں ۔ جو بہت سی دیگر زبانوں میں رائج ہیں ۔ خصوصاً فارسی ، اردو ، پشتو ، بلوچی وغیرہ میں اور مسلمانوں میں تو بہت سے کلمات کثرت استعمال کی وجہ سے آسانی سے سمجھے جاسکتے ہیں ۔ مثلاً تقویٰ ، رحمٰن ، رحیم ، نبی رسول ، حشر ، قیامت ، بخشش ، کفر ، اسلام ، احسان ، لعنت ، رحمت ، ذنب ، توبہ ، استغفار شیطان ، ایمان وغیرہ وغیرہ ۔

۳ ۔ اس کی لغت مختصر ہے یعنی کل ۲ ہزار کے قریب لغت ہے بلکہ اس سے بھی کم

۴ ۔ یہ سب سے چھوٹی کتاب ہے ۔ چینی ، ایرانی ، ہندی اور بنی اسرائیل قوموں کی کتابوں سے سائز میں بہت چھوٹی ہے ۔ ذرا وید اور بائبل سے ہی اس کا مقابلہ کر کے دیکھ لو ۔

۵ ۔ مضمون بہت آسان ہے اور بار بار نئے نئے طریقوں سے انہی مضامین کو مختلف فطرتوں کے مناسب حال ادا کیا گیا ہے ۔

۶۔ اس کے ترجمے بہت سہل الحصول اور بین السطور ہیں۔ بامحاورہ بھی ہیں، لفظی بھی۔ اور اسی طرح لغات القرآن وغیرہ ہر جگہ مل سکتے ہیں۔

۷۔ ہر جگہ اس کے پڑھانے والے اور اس کے حافظ موجود ہیں۔

۸۔ زیر، زبر وغیرہ اعراب ہر قرآن پہ لگے ہوئے ہیں۔ غلطی کا احتمال نہیں۔ اسی طرح اوقاف۔

۹۔ اس کی زبان زندہ زبان ہے جس کے سمجھنے اور بولنے والے موجود ہیں۔

۱۰۔ ۱۳ سو سال سے اس کی تفسیریں ہو رہی ہیں۔ ایک ایک سے بڑھ چڑھ کر جب چاہو۔ انہیں دیکھ کر تسلی کرو۔

۱۱۔ کئی قسم کے نجوم الفرقان اور کلیدیں جن میں الفاظ، مطالب۔ آیات بآسانی نکل سکتے ہیں۔ مل جاتے ہیں۔

۱۲۔ غلط فہمیاں دُور کرنے کو ہر صدی میں مجدد دین اور اب حضرت امام مہدی تشریف لائے۔ اور ان کے بعد اُن کے خلفاء جو معلم اور ماہر قرآن ہیں۔

۱۳۔ بہت سے معانی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کئے ہوئے موجود ہیں۔

۱۴۔ عمل حصّہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کر کے اور کرا کے بطور سُنّت اُمّت کے اندر جاری کر دیا۔

۱۵۔ اس کی تعلیم عین فطرت انسانی اور عقل کے مطابق ہے۔ اس لئے اس پر عمل آسان ہے کیونکہ تکلّف اور تصنّع کی ضرورت نہیں۔

۳۳۵ ۔ حکمت

بزرگ لوگوں نے حکمت کے معنے کئے ہیں۔ سُنّت اور حدیث کے اور یہ بھی بالکل درست ہیں۔ چنانچہ امہات المومنینؓ کو حکم ہے

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِىْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (احزاب ۳۵)

یعنی جو اللہ کی آیات اور حکمت تمہارے گھروں میں پڑھی جاتی ہے۔ اس کی تعلیم لوگوں میں پھیلاؤ۔ یہاں آیات اللہ سے مراد قرآن مجید ہے۔ اور حکمت سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اعمال ہیں۔ جن کو ہم حدیث اور سنت کہتے ہیں۔ علاوہ اس کے حکمت کے معنی تفقہ فی الدین بھی ہیں۔ اور یہ بھی ازواجِ مطہرات نے دنیا میں اپنی حیثیت کے مطابق خوب پھیلایا۔ حضرت عائشہؓ کو تو اس میں حد درجہ کا کمال تھا اور وہ عجیب و عجیب استنباط دینی مسائل میں فرمایا کرتی تھیں۔ اور حضرت ام سلمہؓ کی حکمت تو صلح حدیبیہ کے دن والی مشہور ہی ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو احرام کھول دینے اور قربانیاں ذبح کر دینے کو کہا مگر رنج کے مارے کوئی صحابیؓ نہ اٹھا۔ آخر آپ حضرت اُم سلمہؓ کے پاس تشریف لے گئے تو انہوں نے یہ حکمت بتلائی۔ کہ حضور خود اپنی قربانی ذبح کریں۔ اور سر منڈانا شروع کر دیں۔ حضور کا اس پر عمل کرنا تھا کہ ۱۴۰۰ آدمی یکدم ٹوٹ کر ایک دوسرے پا استرے لے کر گرے اور پل بھر میں سب کے سر مُنڈ گئے اور قربانیاں ذبح ہوگئیں۔ اسی طرح میں نے دیکھا ہے کہ ہر اُم المومنین نے کسی نہ کسی حکمت کی تعلیم لوگوں میں پھیلائی ہے۔ اور اس آیت پر عمل کر کے دکھایا ہے۔ جیسے شوق ہو وہ ان کی سوانح پڑھے۔ (الفضل ۳ دسمبر ۱۹۲۸ء)

۳۲۹ - چار مہینے اور دس دن

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ (البقرہ : ۲۳۵)

ترجمہ:۔ اور تم میں سے جن (لوگوں) کی رُوح قبض کر لی جاتی ہے اور وہ (اپنے پیچھے) بیویاں چھوڑ جاتے ہیں (چاہیے کہ) وہ (بیویاں) اپنے آپ کو چار مہینے (اور) دس (دن) تک روک رکھیں۔

چار ماہ اور دس دن جو عدت بیوہ عورتوں کی رکھی گئی ہے۔ تو اس کا فائدہ یہ ہے کہ

اگر عورت کو ایک دن پہلے کا حمل بھی ہے تو وہ اس عرصہ میں ظاہر ہو جائے گا۔ کیونکہ حمل کی یقینی علامت بچہ کا پیٹ میں حرکت کرنا ہے۔ صرف پیٹ کا بڑھ جانا۔ یا تھنے و پستان کا ہونا۔ یا حیض کا بند ہو جانا کوئی یقینی علامت نہیں ہے جنین کی یہ حرکت چار ماہ دس دن میں شروع ہوتی ہے۔ اسی لئے یہی مدت عورت کے لئے رکھی گئی ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ حمل ہے یا نہیں۔

۲۲۷ - خدا کسی کو عذاب دینے میں راضی نہیں

عذاب دینا خدا کی مستقل صفات میں داخل نہیں۔ وہ تو صرف انسان کے گناہوں اور نافرمانیوں کے عوض دیا جاتا ہے۔ اگر آدمی سرکشی چھوڑ دیں۔ تو بطور تقاضائے صفات الٰہیہ کوئی عذاب لوگوں کے لئے متعین ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَکَانَ اللّٰہُ شَاکِرًا عَلِیْمًا (النساء: ۱۴۷)

یعنی اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت ہے کہ تم کو خواہ مخواہ کا عذاب دے۔ اگر تم مومن اور شکرگزار ہو۔ اس کی صفات تو شاکر اور علیم ہیں نہ کہ معذب اور موذی۔

لیکن تکلیف اور دکھ پھر بھی دنیا میں رہے گا۔ کیونکہ ہر دکھ عذاب نہیں ہے۔ باقی رہے افلاس اور امراض وہ عموماً عذاب میں داخل نہیں ہیں۔

۲۲۸ - متخذات اخدان

مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (النساء: ۲۶)

ترجمہ: ان کے مہر جبکہ وہ پاکباز ہوں نہ کہ زناکار اور نہ مخفی دوست بنانے والیاں انہیں دستور کے مطابق ادا کرو۔

یورپ کا لٹریچر جو آج کل رسالوں میں شائع ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی بدکاری کو سخت نفرت سے دیکھا جاتا ہے اور جو عورت کسی مرد کے ساتھ اس کے مال یا دیگر مفاد کی وجہ سے ناجائز تعلق پیدا کرے وہ ان کے نزدیک کمینی اور فاحشہ ہے۔ مگر باوجود اس کے وہاں زنا عام اور بکثرت ہے۔ اور اُسے وہ جائز سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ شہوت فرو کرنے یا مال وغیرہ حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ محض عشق و محبت کے نتیجہ میں ایک فعل ہے۔ اس لئے مستحسن ہے۔ قرآن مجید نے نکاح کے بیان میں جہاں مال کے لئے یا شہوت رانی کے لئے زناکاری کو بند کیا ہے۔ وہاں ایک خاص فقرہ اس عشق و محبت والے زنا کو بھی حرام کرنے کے لئے رکھا ہوا ہے۔ اَخْدَانٍ یعنی وہ بے نکاح شوہر جو دل کی محبت اور قلبی عشق کی وجہ سے اختیار کئے جاتے ہیں۔ اسلام میں وہ بھی ایسے ہی حرام ہیں جیسے اور قسم کے ناجائز خصم۔

۳۲۹۔ اضطرار کی دُعا

میں پہلے لکھ چکا ہوں۔

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ (النمل ۶۳)

ترجمہ: (نیز بتاؤ تو) کون کسی بے کس کی دُعا سُنتا ہے جب وہ اس (خدا) سے دُعا کرتا ہے اور (اس کی) تکلیف کو دُور کر دیتا ہے۔

میں مسلمان اور کافر عورت اور مرد بڑے اور بچہ حیوان اور انسان کی کوئی خصوصیت نہیں اضطرار کے ساتھ ضرور قبولیت اور فضل آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ خواہ جانور ہی مضطر ہو۔ آج ہی ایک گجراتی دوست نے قصہ سنایا کہ میرے والد بیان کرتے تھے کہ کسی زمانہ میں کھاریاں کی تحصیل میں جب نہریں نہ تھیں۔ تو پانی کی بڑی قلت تھی۔ گاؤں والے اپنے علاقہ کے تالابوں اور گڑھوں میں پانی کی بڑی حفاظت کیا کرتے تھے۔ ایک دن سخت گرمی کی وجہ سے ایک جنگل

سؤر گاؤں کے پاس آیا اور تالاب کی طرف دوڑا کہ پانی پیئے۔ مگر لوگوں نے اسے ناپاک سمجھ کر ڈنڈے مار کر بھگا دیا۔ پیاس اسے سخت تھی۔ پھر آیا۔ پھر انہوں نے مار مار کر بھگا دیا۔ غرض اسی طرح دیر تک وہ تنگ کرتا رہا۔ پیاس سے سخت بیقرار تھا۔ مگر جب بھی آیا۔ لوگوں نے اُسے پانی کے پاس پھٹکنے نہ دیا۔ آخر وہ اسی جگہ درد میں مضمحل ہو گیا۔ اور اس نے ایک خوفناک چیخ ماری جو سخت اضطراب اور اضطرار کی تھی۔ اور لاچار ہو کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ یک دم بادل گھر آیا اور خوب بارش ہوئی جس سے سب گڑھے بھر گئے اور وہ سیراب ہو کر چلا گیا۔ یہ ہے اضطرار کی قبولیت اور ایک ایسے حیوان کا اضطرار کہ جسے لوگ چھونا اور دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔

۳۲۰ ۔ اللہؐ کے معنی

قرآن مجید اکثر جگہ الفاظ کے معنے خود کر دیتا ہے۔ اس کا ایک نمونہ الذی تھا جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اب دوسرا نمونہ لو۔ اللہ کے لفظ کے معنی خود کلام الٰہی نے ہی کر دیئے ہیں۔ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ یعنی اللہ کے معنی ہیں لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ مطلب یہ کہ اللہ اسے کہتے ہیں جو معبود محبوب، مقصود مراد اس کے مقابل پر اور کوئی اس مقام پر نہ کھڑا ہو سکے۔
اسی طرح رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کے معنوں کی تفصیل کے لئے دیکھو سورۃ شعراء آیت ۱۰، سے لے کر تا غور کرو ع تک۔

۳۴۲ ۔ بے عیب قدرت

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (الملک ۴)

یعنی اللہ تعالیٰ کی صنعت اور خلق میں تجھے کوئی نقص اور عیب نہیں مل سکے گا۔ بلکہ بار بار بھی دیکھے گا تو تیری عقل تھک جائے گی۔ مگر نقص نظر نہیں آئے گا۔ ہم نے تو دیکھا ہے کہ صرف بے وقوف لوگ خدا کی مخلوقات اور مصنوعات میں عیب اور نقص نکالتے ہیں۔ لیکن عالم عقلمند، سائنسدان اور فلاسفر ان میں حکمتیں اور فوائد تلاش کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں لمبے تجربہ کے بعد معلوم ہو گیا کہ ہر شے جو اللہ نے پیدا کی ہے۔ وہ لا انتہاء علوم اور حکمتوں کے خزانوں سے معمور ہے۔ اس لئے یہ اہل علم بجائے نقص پکڑنے کے حکمتیں تلاش کرتے ہیں اور نتیجہ یہ کہ بے حد فوائد حاصل کرتے ہیں۔ (الفضل ۹، دسمبر ۱۹۳۸ء)

۳۴۳ ۔ معنے کرنے کا ایک اصول

قرآن کریم کے بعض معنے صرف اس وجہ سے مقبول نہیں کئے جاتے۔ کہ ان معنوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے تقدس اور انبیاء کی عزت پر حرف آتا ہے۔ چونکہ پہلے ہی یہ عقیدہ بتا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ میں سب خوبیاں ہیں اور کوئی نقص نہیں ہے۔ اسی طرح انبیاء خدا کے پیارے اور معصوم ہوتے ہیں۔ ان کی طرف بھی کوئی بُری بات منسوب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے جس ترجمہ میں ان باتوں پر حرف آئے گا۔ اس کو ہم فوراً رد کر دیں گے۔ مثلاً

حَتّٰۤى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا
جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا
عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (یوسف ۱۱۱)

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: یہاں تک کہ جب پیغمبر نا امید ہو گئے۔ اور انہوں نے

خیال کر لیا۔ کہ ہم سے جھوٹ بولا گیا۔ تو اس وقت ان کے پاس ہماری مدد پہنچی پس ان کو نجات
ملی جنہیں ہم چاہتے تھے۔ اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے ہٹایا نہیں جاتا ؁

اب اس ترجمہ میں دو جگہ پیغمبروں کی عزت اور ایمان اور عصمت پر حملہ ہوتا ہے اول
تو ان کی ناامیدی کی وجہ سے۔ کیونکہ اسی صورت میں ایک پیغمبر یعنی حضرت یعقوبؑ فرماتے ہیں کہ
لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (یوسف، ۸۸)
خدا کی رحمت سے کافر کے سوا کوئی نااُمید نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ پیغمبر خیال کرنے
لگے کہ ہم سے جھوٹا وعدہ کیا گیا حالانکہ پیغمبر اپنے ایمان پر جو خدا کے ساتھ وہ رکھتا ہے اور
اسی طرح اپنی وحی پر کبھی متزلزل نہیں ہوتا۔ ناممکن ہے۔ کہ اسے ذرا بھی شک ہو۔ کہ یہ وعدہ
خداوندی جھوٹ ہے۔ یا میری وحی مشتبہ ہے ورنہ امان ہی اُٹھ جاتا ہے۔ اس لئے ان صاف
اور ظاہری معنوں کو ہم پرے پھینک دیں گے۔ اور وہ معنے کریں گے۔ جن کی وجہ سے یہ اعتراض
ان پر نہ پڑیں۔ چنانچہ اس کے معنے یہ ہوں گے۔ کہ جب پیغمبر قوم مجرمین کے ایمان لانے سے ناامید
ہو گئے (یہ لفظ قوم مجرمین کا اسی آیت کے آخر میں موجود ہے) اور ان مجرم لوگوں نے یقین
کر لیا۔ کہ وہ سب وعدے نصرت کے جو یہ رسول ہمارے سامنے پیش کیا کرتے تھے یونہی
جھوٹ ہی تھے۔ ان کے پورے ہونے کے کوئی آثار تک نظر نہیں آتے۔ تو ایسے وقت پھر اللہ
کی نصرت نازل ہوتی ہے۔ مومن نجات پاتے ہیں۔ اور مجرم ہلاک ہو جاتے ہیں۔ پس ہمیشہ معنی
کے لئے یہ دیکھ لینا چاہیئے۔ کہ وہ موصوف کے مناسبِ حال بھی ہیں یا نہیں۔ اور جن لوگوں کا
ذکر ہے ان کی شان کے لائق بھی ہیں یا نہیں۔ ورنہ فوراً رد کر دینے چاہئیں۔

اسی طرح فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (یونس، ۹۵) ہے یعنی تو شک کرنے والوں میں سے
نہ ہو۔ اب یہ فقرہ باوجود مخاطب اول ہونے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہرگز نہیں
ہو سکتا۔ کیونکہ نبی کو اپنی وحی میں کبھی ذرا بھی شک نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم اس کو دوسروں
کے لئے سمجھیں گے۔ نبی کے لئے کبھی نہیں سمجھیں گے۔ پس معنی کرتے وقت ایک اصول یہ بھی

دہن میں رکھنا چاہیے۔

۳۲۴ - بلاغتِ لفظی

قرآنِ مجید معنوی بلاغت اور پُراثر مطالب کے علاوہ ظاہری بلاغت اور لفظی دلچسپی بھی اپنے اندر رکھتا ہے اور کئی جگہ ایسے الفاظ یا مجموعہ الفاظ اُس میں وارد ہوئے ہیں کہ عجب لطف آتا ہے۔ مثلاً ایک لفظ کے بار بار استعمال کا کمال اس آیت میں دیکھو کہ کس طرح ایک لفظ پانچ دفعہ اور دوسرا چار دفعہ پھیر پھیر کر اور ذرا سے تغیر کے ساتھ آیا ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ ۚ قُلِ اللَّهُ
يَهْدِي لِلْحَقِّ ۗ أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ
أَمَّنْ لَا يَهِدِّي إِلَّا أَنْ يُهْدَىٰ ۖ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ
تَحْكُمُونَ (یونس، ۳۶)

ترجمہ: تُو (ان سے یہ بھی) کہہ (کہ) کیا تمھارے (بنائے ہوئے) شریکوں میں سے کوئی (بھی ایسا) ہے جو حق کی طرف (لوگوں کی) رہنمائی کرتا ہو (وہ تو اس سوال کا کیا جواب دیں گے) تُو (خود ہی اُن سے) کہہ دے (کہ) اللہ (ہی ہے جو) حق کی طرف (لوگوں کی) رہنمائی کرتا ہے۔ پس کیا وہ (خدا) جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس (کے احکام) کی پیروی کی جائے یا وہ (فرضی خدا) جو کہ سوائے اس (صورت) کے کہ اسے (ہدایت کا) راستہ دکھایا جائے (خود بھی) راہ نہیں پاتا پھر تم کو کیا (ہوگیا) ہے؟ تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟

۳۴۵ ۔ عالی شان اور پُر ہیبت کلام

جس طرح کلامِ الٰہی مؤثر ہے اور دل میں گھُس جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے بعض حصّے نہایت پُرشکوہ اور پُرہیبت ہیں۔ جس طرح ایک صاحبِ جبروت شہنشاہ کا کلام ہونا چاہیے نمونہ کے طور پر یہ آیات دیکھو۔

۱۔ وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (ہود ، ۴۵)

ترجمہ : اس کے بعد (زمین سے بھی) کہہ دیا گیا (کہ) اے زمین تو (اب) اپنے پانی کو نگل جا اور (آسمان سے بھی کہ) اے آسمان (اب) تو برسنے سے تھم جا اور پانی کو جذب کر دیا گیا اور (یہ) معاملہ ختم کر دیا گیا۔ اور وہ کشتی جودی پر (جا کر) ٹھہر گئی اور کہہ دیا گیا کہ (اے عذاب کے فرشتو!) ظالم لوگوں کے لئے ہلاکت (مقدر) کر دو۔

۲۔ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (ہود ، ۴۹)

ترجمہ : (اس پر اُسے) کہا گیا (کہ) اے نوح! تو ہماری طرف سے (عطا شدہ) سلامتی اور (طرح طرح کی) برکات کے ساتھ جو تجھ پر اور اُن اُمتوں پر جو تیرے ساتھ ہیں (نازل کی گئی ہیں) سفر کر۔ اور بعض جماعتیں ایسی بھی ہیں جنہیں ہم ضرور (دنیا کا عارضی) سامان عطا کریں گے (مگر) پھر ان پر ہماری طرف سے دردناک عذاب آئے گا۔

۳۔ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ؕ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ؕ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ

(احقاف ، ۲۵،۲۴)

ترجمہ: پس جب اس کی قوم نے اس عذاب کو ایک بادل کی صورت میں اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے کہا یہ ایک بادل ہے جو ہم پر بارش برسائے گا (ہم نے کہا) نہیں، یہ وہ (عذاب) ہے جس کو تم جلدی مانگتے تھے (یہ) ایک ہوا ہے، جس میں دردناک عذاب پوشیدہ ہے۔ یہ ہوا اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کرتی جائے گی بس نتیجہ یہ ہوا کہ اُن پر صبح ایسے وقت میں آئی کہ صرف اُن کے گھر ہی نظر آتے تھے (سب قوم ریت میں دب گئی) اسی طرح ہم مجرم قوم کو جزا دیا کرتے ہیں۔

۴ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ۙ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۙ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمْتًا ؕ يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ۙ (طٰہٰ ۱۰۸،۱۰۵)

ترجمہ: اور وہ تجھ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں تو کہہ دے کہ اُن کو میرا رب اُکھاڑ کر پھینک دے گا اور اُن کو ایک ایسے چٹیل میدان کی صورت میں چھوڑ دے گا کہ نہ تو تو اس میں کوئی موڑ دیکھے گا اور نہ کوئی اونچ نیچ۔ اس دن لوگ پکارنے والے کے پیچھے چل پڑیں گے جس کی تعلیم میں کوئی کجی

نہ ہوگی اور رحمٰن (خدا کی آواز) کے مقابلہ میں (انسانوں کی) آوازیں دب جائیں گی پس تُو سوائے کُھسر پُھسر کے کچھ نہ سُنے گا

۳۴۶ - امید افزا کلام

کلام الٰہی جب کمزور انسانوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوتا ہے تو بہت سی اُمنگیں اور امیدیں ان کے دل میں پیدا کرتا ہے تاکہ ان کی ہمت نہ ٹوٹے۔ حوصلہ اور دل مضبوط ہوں۔ اور یاس و ناامیدی پاس نہ پھٹکنے پائے۔ قرآن مجید ایسی امید افزا آیات سے بھرا پڑا ہے جن میں سے بعض یہ ہیں۔

۱۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ (البقرہ، ۲۸۷)

ترجمہ: اللہ کسی شخص پر سوائے اس (ذمہ داری) کے جو اس کی طاقت میں ہو کوئی ذمہ داری نہیں ڈالتا۔

۲۔ وَرَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ ۭ (الاعراف، ۱۵۷)

ترجمہ: اور میری رحمت ہر ایک چیز کو حاوی ہے

۳۔ قُلْ يٰعِبَادِىَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ (الزمر، ۵۴)

ترجمہ: تو (اُن کو ہماری طرف سے) کہہ دے اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جان پر (گناہ کر کے) ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ سب گناہ بخش دیتا ہے۔

۴۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ (صافات، ۱۰۲)

ترجمہ: ہم اسی طرح محسنوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔

۵۔ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (شوریٰ: ۳۱)

ترجمہ: اللہ تمہارے اکثر قصوروں کو معاف کرتا ہے۔

۶۔ اُدْعُونِیٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المؤمن ۶۱)

ترجمہ: مجھے پکارو میں تمہاری دعا سنوں گا۔

۷۔ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ (النمل ۶۲)

ترجمہ: (نیز بتاؤ تو) کون کسی بے کس کی دعا سنتا ہے۔ جب وہ اس (خدا) سے دعا کرتا ہے اور اس کی تکلیف کو دور کر دیتا ہے۔

۳۴۷۔ پُر اثر کلام

قرآن مجید نہایت ہی پُر اثر کلام ہے اور بعض آیات تو بعض لوگوں کے لئے خاص اثر رکھتی ہیں۔ نمونہ کے طور پر

۱۔ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ
وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ
اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ۝
مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ
فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ وَمَا
بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا ۝ (الاحزاب ۲۳، ۲۴)

ترجمہ: چنانچہ (دیکھو) جب حقیقی مومنوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو کہا یہ تو وہی (لشکر) ہیں جن کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ بولا تھا اور ان کو اس واقعہ نے ایمان اور اطاعت میں ہی بڑھایا (کمزور نہیں کیا)۔

ان مومنوں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اس وعدہ کو جو انہوں نے

اللہ نے کیا تھا سچا کر دیا۔ پس بعض تو ایسے ہیں جنہوں نے اپنی نیت کو پورا کر دیا (یعنی لڑتے لڑتے مارے گئے) اور اُن میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو ابھی انتظار کر رہے ہیں اور اپنے ارادہ میں کوئی تزلزل اُنھوں نے نہیں آنے دیا۔

۲ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ
نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ○ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم
بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ
بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ
يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ
إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ○ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ
أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا
عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (الحج ۳۹، ۴۰، ۴۱)

ترجمہ: وہ لوگ جن سے (بلا وجہ) جنگ کی جا رہی ہے ان کو بھی (جنگ کرنے کی) اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے (یہ وہ لوگ ہیں) جن کو ان کے گھروں سے صرف ان کے اتنا کہنے پر کہ اللہ ہمارا رب ہے بغیر کسی جائز وجہ کے نکالا گیا اور اگر اللہ ان (یعنی کفار) میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ سے (شرارت سے) باز نہ رکھتا تو گرجے اور یہودیوں کی عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے برباد کر دیئے جاتے اور اللہ یقیناً اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا۔ اللہ یقیناً بہت طاقتور (اور) غالب ہے۔ یہ (یعنی مہاجر مسلمان) وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم اُن کو دنیا میں طاقت بخشیں

تو وہ نمازوں کو قائم کریں گے اور زکوٰتیں دیں گے اور نیک باتوں کا حکم دیں گے۔ اور بری باتوں سے روکیں گے اور سب کاموں کا انجام خدا کے ہاتھ میں ہے۔

۳ نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ (الحجر: ۵۰۔۵۱)

ترجمہ: (اے پیغمبر!) میرے بندوں کو آگاہ کر دے کہ میں بہت ہی بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہوں

اور (یہ) کہ میرا عذاب ہی (حقیقۃً) دردناک عذاب (ہوتا) ہے۔

۴ اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

(الحدید: ۱۷)

ترجمہ: اب ہم مومنوں سے کہتے ہیں کہ کیا اب تک ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے اور اس کلام کے لیے جو حق (و حکمت) کے ساتھ اترا ہے جھکتے نہیں؟ (الفضل ۱۴ر دسمبر ۱۹۳۸ء)

۴۴۸۔ محبت بھرا کلام

اسی طرح بعض جگہ ایسا محبت بھرا کلام ہے جیسے ایک بزرگ یا باپ مجلس لگائے اپنے پیارے بچوں سے مخاطب ہو کر باتیں کر رہا ہے کسی سے کچھ کہتا ہے کسی سے کچھ علی حسبِ مراتب مثلاً بطور نمونہ

۱۔ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (الاحزاب: ۶۰)

ترجمہ: اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی بیویوں سے
کہہ دے کہ (جب وہ باہر نکلیں) اپنی بڑی چادروں کو سروں پر سے گھسیٹ
کر اپنے سینوں تک لے آیا کریں یہ امر اس بات کو ممکن بنا دیتا ہے کہ
وہ پہچانی جائیں اور ان کو تکلیف نہ دی جائے اور اللہ بڑا بخشنے والا (اور)
بار بار رحم کرنے والا ہے۔

۲۔ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا
تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ
قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۞
وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى
وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ
اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ
وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۞ (احزاب ۳۲-۳۳)

ترجمہ: اے نبی کی بیویو! اگر تم اپنے مقام کو سمجھو تو تم عام عورتوں کی
طرح نہیں ہو۔ پس چبا کر (یعنی ناز و نخرے کے ساتھ) بات نہ کیا کرو۔
تا ایسا نہ ہو کہ جس کے دل میں مرض ہے وہ تمہارے متعلق کوئی بد ارادہ
کرے اور ہمیشہ لوگوں کو نیک باتیں کہا کرو۔

اور اپنے گھروں میں بیٹھی رہا کرو۔ اور پرانے زمانے کی جاہلیت (کے طریق)
کی طرح اپنی زینت (غیر لوگوں پر) ظاہر نہ کیا کرو اور نماز کو (باشرائط) ادا
کیا کرو۔ اور زکوٰۃ دیا کرو۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کیا کرو۔
اے اہل بیت! اللہ تم میں سے ہر قسم کی گندگی دور کرنا اور تم کو کامل طور
پر پاک کرنا چاہتا ہے۔

۳. يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝ وَّسَبِّحُوْهُ
بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۝ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓىِٕكَتُهٗ
لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ
رَحِيْمًا ۝ (الاحزاب ۴۲ تا ۴۴)

ترجمہ: اے مومنو اللہ کا ذکر بہت کیا کرو۔
اور صبح شام اس کی تسبیح کیا کرو
وہی ہے جو تم پر اپنی رحمتیں بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تمہارے لیے دعائیں کرتے ہیں تاکہ (اس کا نتیجہ یہ نکلے کہ) وہ تم کو اندھیروں سے نور کی طرف لے جائے اور وہ مومنوں پر بار بار رحم کرنے والا ہے۔

۴ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝
وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ
بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا (الاحزاب ۴۶ تا ۴۸)

ترجمہ: اے نبی! ہم نے تجھ کو اس حال میں بھیجا ہے کہ تو (دنیا کا) نگران بھی ہے (مومنوں کو) خوشخبری دینے والا بھی ہے اور (کافروں کو) ڈرانے والا بھی ہے۔
اور نیز اللہ کے حکم سے اس کی طرف بلانے والا اور ایک چمکتا ہوا سورج بنا کر (بھیجا ہے)
اور مومنوں کو بشارت دے دے کہ ان کو اللہ کی طرف سے بہت بڑا فضل ملے گا۔

اس آخری آیت میں تو بے تکلفی یہاں تک بڑھی کہ جس طرح مائیں اپنے بچوں کو محبت سے کہتی ہیں کہ آہا میرے بیٹے کا تو چاند سا مکھڑا ہے۔

۲۴۹ - تفاؤل قرآنِ مجید سے

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (بنی اسرائیل ۱۰)

ترجمہ:- یہ قرآن یقیناً اس (راہ) کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ درست ہے۔

قرآن کریم روحانی اور جسمانی طور پر ہر طرح کی ضروری ہدایات مخلوق کو دیتا ہے لیکن میں تو بوقتِ ضرورت اس سے مشورہ بھی کر لیا کرتا ہوں یعنی فال نکال لیتا ہوں مگر عادتاً نہیں۔ بلکہ ایسے وقت جبکہ نہ کوئی مشورہ دینے والا ہو نہ استخارہ کا وقت اور موقعہ ہو۔ اور عموماً اس تفاؤل سے تسلی پاتا ہوں۔ ناظرین کے سامنے اس وقت ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

سنہ ۱۹۳۲ء کے آخر میں رہتک میں تھا کہ وہاں سیلاب آیا۔ پھر بعض اور دقتیں بھی ایسی پیدا ہوگئیں کہ مجھے وہاں رہنا اچھا معلوم نہ ہوا۔ میں نے گورداسپور کے تبادلہ کی درخواست کر دی۔ اور ذاتی طور پر بھی کوشش کی۔ سنہ ۱۹۳۳ء کے آغاز میں مجھے سرکاری تار لاہور سے آیا کہ اس وقت گورداسپور خالی نہیں ہے۔ سیالکوٹ اور گوجرانوالہ خالی ہیں۔ واپسی تار دو کہ تم ان میں سے کہاں جانا چاہتے ہو۔ اس پر مجھے جوابی تار اسی وقت دینا پڑا۔ مشورہ کا کوئی وقت نہ تھا۔ کیونکہ فوری معاملہ تھا۔ اور سوال یہ تھا۔ کہ یا تو ان دونوں جگہوں میں سے کسی ایک کو قبول کروں۔ یا انکار کر کے لکھوں کہ میں تو گورداسپور ہی جانا چاہتا ہوں۔ یا لکھ دوں۔ کہ فی الحال رہتک سے مجھے تبدیل نہ کیا جائے۔ جب تک گورداسپور خالی نہ ہو۔ اس لئے میں نے ان چاروں شقوں کے متعلق دُعا کر کے قرآن مجید سے فال نکال اب دیکھئے جائیے۔

رہتک کے متعلق یہ الفاظ نکلے۔ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔

گورداسپور۔ وَرِثَكَ اُمِنّ (الاحقاف ۱۸)
سیالکوٹ ۔ عَلٰی مَن یشاء من عبادہ لینذر یوم التلاق
گوجرانوالہ ۔ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ
اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (ابراہیم ۳۶)

ترجمہ ۔ اے میرے رب! اس شہر (یعنی مکہ) کو امن والی (جگہ) بنا اور مجھے اور میرے بیٹوں کو اس بات سے دُور رکھ کہ ہم معبودانِ باطلہ کی پرستش کریں۔

چنانچہ میں نے اسی وقت واپسی تار دے دیا کہ میں گوجرانوالہ جانا پسند کروں گا ۔ اور اللہ تعالیٰ نے اُسے ایسا ہی ثابت کیا ۔

یاد رہے کہ یہ باتیں ذوقِ طبع پر موقوف ہیں ۔ کوئی صاحب بغیر بزرگوں کے استصواب اور دل کے انشراح کے خود بخود ایسی باتیں نہ کریں۔

۳۵۰ ۔ بے مانگے مغفرت

اس غفور رحیم نے ہمارے لئے مغفرت کا ایک جال بچھا رکھا ہے ۔ اور اپنی بے انتہا مخلوق ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لئے لگا رکھی ہے ۔ بلکہ کفار تک کے لئے بھی مغفرت کی دعائیں اور سفارشیں ملاءِ اعلیٰ میں برابر ہوتی رہتی ہیں ۔ ورنہ بنی نوع انسان کی بداعمالیوں اور کرتوتوں سے آسمان اور زمین پھٹ جائیں ۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ
بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ
هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (شوریٰ ۶)

ترجمہ ۔ قریب ہے کہ آسمان اپنے اوپر (غالب ذات کے حکم کی وجہ سے

پھٹ کر گر جائیں باوجود اسکے کہ ملائک اپنے رب کی حمد بھی کر رہے ہیں اور تسبیح بھی کر رہے ہیں
اور جو لوگ زمین میں ہیں اُن کے لئے استغفار بھی کر رہے ہیں (پھر بھی خدا
اپنے عذاب کو روکے گا نہیں تاکہ اُس کی غفاری اور رحیمیت ظاہر ہو) سُنو
اللہ بہت بخشنے والا (اور) بے انتہا رحم کرنے والا ہے۔

۲۵۱۔ عورت کا حصہ بچہ میں

بچہ مرد و عورت دونوں کے نطفہ کے ملنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے بچہ میں کچھ
حصہ باپ کا ہوتا ہے۔ اور کچھ ماں کا۔ اس صداقت کو قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ (الدھر ۳:۱)

ترجمہ: ہم نے انسان کو ایک ایسے نطفہ سے پیدا کیا ہے جس میں مختلف
قوتیں ملی ہوئی تھیں۔

ہم نے انسان کو ملے ہوئے یعنی مرکب نطفہ سے پیدا کیا۔ یہ نہیں۔ جیسا کہ پہلے زمانوں
کے اکثر لوگ اور آجکل بھی عوام الناس خیال کرتے ہیں۔ کہ بچہ صرف مرد کا ہوتا ہے اور عورت
صرف زمین ہے۔ یعنی اس نطفہ یا بیج کی پرورش کرنے والی۔ بلکہ عورت بھی نطفہ میں برابر کی
حصہ دار ہے اور حرث اس کے علاوہ ہے۔

۲۵۲۔ قرآن مجید کی تقسیم مضامین

قرآن مجید میں مضامین کی تبویب اور تقسیم نہیں ہے۔ مثلاً اگر تمام احکام عورتوں کے
متعلق ایک جگہ جمع ہوتے۔ اور جہاد کے ایک جگہ حلال حرام کے ایک جگہ اخلاق کے متعلق
ایک جگہ اور عبادات کے متعلق ایک جگہ۔ تو نتیجہ یہ ہوتا کہ اکثر لوگ جن کا تعلق بعض احکام
سے نہ ہوتا۔ وہ اس حصہ قرآن کو ترک کر دیتے۔ مثلاً ایک مجرد آدمی عورتوں بچوں رضاعت۔

نکاح۔ طلاق وغیرہ کا حقیقہ کبھی نہ پڑھتا۔ اسی طرح مجاہد کے سوا کوئی جہاد کے احکام کو نہ دیکھتا۔ غریب آدمی مالی احکام کے باب کا مطالعہ نہ کرتا۔ وَغَیْرَ ذَالِكَ بعینہٖ اسی طرح جس طرح ایک حدیث کی کتب میں مسائلِ حج کو عام لوگ جنہوں نے حج نہ کیا ہو کھول کر بھی نہیں دیکھتے۔

غرض اس طرح قرآن کے نزول کا مقصد فوت ہو جاتا۔ سو مشیت ایزدی نے بکمالِ حکمت مختلف آیات اور احکام اور قصص کو ملا دیا۔ اور مضامین کو اس طرح بکھیر دیا کہ نہ ترتیب بگڑے نہ مطلب میں نقص آئے اور جہاں سے بھی پڑھو۔ وہاں کچھ احکام نکل آئیں کچھ نواہی۔ کچھ نیکی، کچھ بدی کا ذکر۔ کچھ نیک لوگوں کے قصے۔ کچھ اخلاق کی باتیں۔ کچھ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی قدرتیں۔ کچھ اس کے احسانات انسان پر۔ کچھ بشارتیں۔ کچھ انذار۔ کچھ پیشگوئیاں۔ غرض یہ نہیں کہ ہمارے گھر میں آٹا، شکر، گھی، گوشت، چاول، نمک مرچ الگ الگ رکھے ہیں۔ بلکہ دسترخوان پر پکے ہوئے تیار خوشبودار لذیذ کھانے موجود ہیں۔ جن کے ہر لقمہ میں کئی کئی چیزوں کا لطف اور مزے ہیں۔ اور جہاں سے بھی اس کتاب حکیم کا مطالعہ کرو۔ وہیں سے سارے گوہر مراد نکلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ (الفضل ۲۰ جنوری ۱۹۲۹ء)

۲۵۲۔ زوج

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (الذاریات: ۵۰)

ترجمہ: اور ہر ایک چیز کے ہم نے نر و مادہ بنائے ہیں تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

یہ زوج کے ایک معنی یہ بھی ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی مخلوق بھی ایسی نہیں جسے اپنی تکمیل اور بقا کے لئے کسی دوسری مخلوق کی ضرورت نہ ہو۔ ان میں سے ایک مخلوق اثر ڈالنے والی ہوتی ہے اور دوسری اثر قبول کرنے والی۔

۲۵۴ ۔ قرآنی اختلافات

قرآن مجید میں بھی بعض ظاہری اور سطحی اختلافات ہیں۔ مگر ان کی حقیقت سمجھ لی جائے تو وہ حل ہو جاتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر :۔

۱۔ اوّل تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (البقرہ ۲۵۴)

ترجمہ :۔ یہ (مذکورہ بالا) رسول وہ ہیں جن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی تھی ۔

کے مقابل پر لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ ۲۸۶)

ترجمہ :۔ (اور کہتے ہیں کہ) ہم اس کے رسولوں میں سے ایک (دوسرے) کے درمیان (کوئی) فرق نہیں کرتے ۔

یہاں پہلی آیت میں مدارج کا ذکر ہے۔ ملک کی وسعت، شریعت، زمانہ، کام اور ذاتی کمالات کے لحاظ سے بعض نبی بعض سے افضل ہیں۔ مگر رسالت کے لحاظ سے اور ماننے کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ ایک کا بھی انکار کفر ہے ۔

۲۔ دوسرے لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَ لَا يَنْسَى (طٰہٰ ۵۳)

ترجمہ :۔ میرا رب نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے

اور نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (التوبہ ۶۷)

ترجمہ :۔ انھوں نے اللہ کو ترک کر دیا سو اللہ نے بھی ان کو ترک کر دیا۔

پہلی آیت محکم ہے اور واقعی خدا تعالیٰ نہیں بھولتا۔ کیونکہ نسیان ایک کمزوری اور غلطی ہے دوسری آیت میں خواہ اس کے دوسرے لغوی معنے ترک یعنی چھوڑ دینے کے کر لو۔ یا یہ کہ ان کے نسیان کی سزا دے گا۔ یا یہ کہ انہوں نے خدا کو بھلا دیا۔ اس لئے اس نے بھی ان کو ایسا کر دیا۔ گویا بھلا دیا۔

۳. تیسرے مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (النجم ۲)

ترجمہ: کہ تمہارا ساتھی نہ رستہ بھولا ہے نہ گمراہ ہوا ہے۔

اور وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (الضحیٰ: ۸)

ترجمہ: اور تجھ کو اُس نے تجھے (اپنی قوم کی محبت میں اس کی ارشاد و ہدایت) کی اصلاح کا) صحیح راستہ تجھے بتا دیا۔

ان پہلی محکم آیت میں گمراہ کے معنی لئے جائیں گے۔ اور دوسری میں متلاشی اور سرگردانِ الفت اور طالب ہدایت کے معنی ہوں گے۔ کیونکہ دونوں لغوی معنے ہیں۔

۴. چوتھے إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا (الزمر ۵۴)

ترجمہ: اللہ سب گناہ بخش دیتا ہے

اور إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهٖ (النساء ۴۹)

ترجمہ: اللہ (اس بات کو) ہرگز معاف نہیں کرے گا کہ (کسی کو) اس کا شریک قرار دیا جائے۔

ان پہلی مغفرت ان گناہوں کی ہے جو توبہ کے بعد معاف ہوتے ہیں۔ یعنی کوئی ایسا گناہ نہیں جسے توبہ کے بعد خدا تعالیٰ معاف نہ کرے۔ اور دوسری آیت میں بے توبہ کے صرف صفت يَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ (مائدہ ۱۶) والے گناہوں کا ذکر ہے۔ یعنی وہ شرک کو بغیر توبہ کے معاف نہیں کرتا۔ اس سے کم درجہ کے گناہ بغیر خاص توبہ کے بھی معاف ہوتے رہتے ہیں۔

۵. پانچویں إِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۔ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا (مریم ۷۱، ۷۲)

ترجمہ: تم میں سے ہر شخص اس (دوزخ) میں جانے والا ہے۔ یہ خدا کا ایسا پکا وعدہ ہے جو ہو کر رہے گا۔ اور ہم متقیوں کو بچالیں گے۔

اور لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا (الانبیاء ۱۰۳)

ترجمہ:۔ وہ اس کی آواز تک نہیں سُنیں گے۔

(۳) دوسری آیت محکم ہے اور یہی خدا کے فضل و کرم کی صفت کو ظاہر کرتی ہے۔
دوسری آیت کے کئی معنی ہیں۔ ایک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئے ہیں۔ ایک حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے۔ ایک یہ بھی ہیں کہ یہ آیت کفار کے لئے ہی ہے۔

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ۝ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ۝ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ۝ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝ (مریم، ۶۹ تا ۷۲)

ترجمہ:۔ پس تیرے رب کی قسم ہم (جو تیرے رب ہیں) ان لوگوں کو (پھر ایک دفعہ) اٹھائیں گے اور شیطانوں کو بھی (اٹھائیں گے اور) پھر ان سب کو جہنم کے گرد ایسی صورت میں حاضر کریں گے کہ وہ زانوؤں کے بل گرے ہوئے ہوں گے۔ پھر ہم ہر ایک گروہ میں سے ایسے لوگوں کو الگ کر لیں گے جو (خدائے) رحمٰن کے سخت دشمن تھے۔ اور ہم خوب جانتے ہیں کہ ان میں سے کون دوزخ میں جانے کے زیادہ قابل ہے۔ تم میں سے ہر شخص اس (دوزخ) میں جانے والا ہے۔ یہ خدا کا ایسا پکا وعدہ ہے جو ہو کر رہے گا۔

اور اس ترتیب سے صاف ظاہر ہے کہ سب کفار کا ہی ذکر ہے نہ کہ مومنین کا۔ مومنوں کے لئے ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا کر کے استثنا کر دیا ہے۔ اور ثُمَّ کے معنی ہیں "اور" کے۔ ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ سب وارد جہنم ہوں گے۔ یعنی کنارے پر کھڑے اُسے دیکھ لیں گے۔ پھر متقی جنت کو چلے جائیں اور جہنمی اندر داخل ہو جائیں گے۔ یا یہ کہ جیسا حادیث میں آتا ہے۔ پُل صراط جہنم پر لگایا جائے گا جنتی اوپر ہی اُوپر پُل

کہ گزر جائیں گے تو وہ جہنم اس وقت اُن کے نیچے ہوگا۔ اور نظر آجائے گا۔ مگر وہ محفوظ ہوں گے اور جہنمی پھسل پھسل کر نیچے گر پڑیں گے۔

۶۔ چھٹے ایک جگہ انبیاء کو معصوم قرار دیا پھر ذنب کا لفظ ان کی نسبت آنا بیان پہلی بات محکم ہے ورنہ ایمان اُٹھ جاتا ہے۔ اور دوسری جگہ ذنب کے معنی الزامات مخالفین ہیں۔ یا بشری کمزوریاں مثلاً نسیان یا اجتہاد وغیرہ کی غلطیاں۔

۷۔ ساتویں۔ ایک آیت میں رضاعت کی مدت دو سال اور دوسری میں پونے دو سال بیان کی گئی ہے۔ یہاں پہلی آیت میں کامل رضاعت کی مدت ہے (لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ) یعنی اس سے زیادہ رضاعت ناجائز ہے۔ اور دوسری میں اوسط مدت ہے۔

غرض نمونۃً یہ آیات بیان کی گئی ہیں اور بھی ہیں۔ مگر سب اسی طرح صاف ہو جاتی ہیں۔ کوئی لغت سے۔ کوئی ترتیب پر نظر کرنے سے۔ کوئی محکم متشابہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے ماتحت کر کے غرض کئی طریقوں سے یہ اختلاف جو سطحی اور قلیل اختلاف ہے دور ہو جاتا ہے۔ اصلی یعنی اختلاف کثیر ایک بھی نہ ملے گا

۲۵۵۔ فِیْ حُجُوْرِكُمْ

وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ (النساء: ۲۳)

یعنی تم پر تمہاری سوتیلی بیٹیاں حرام ہیں۔ جو تمہاری گود میں رہتی ہیں۔ ان عورتوں کے پیٹ سے جن سے تم ہم بستر ہو چکے ہو۔

یہاں لوگوں کو فی حُجُورِكُم میں بہت مشکل پڑی ہے کہ اس لفظ کا کیا فائدہ اور مطلب ہے۔ بعض نے تو اسے فضول ہی قرار دیا ہے اور بعض نے توڑ دے دیا ہے۔ نہ

اور سوتیلی لڑکی تمہارے گھر میں نہ پلی ہو۔ مثلاً وہ اپنی ننھیال میں ہی رہتی ہو۔ یا اس کی شادی ہو چکی ہو۔ پھر اتفاقاً بیوہ ہوگئی ہو۔ تو اپنی ماں کے مرجانے یا مطلقہ ہوجانے کے بعد اس سے شادی ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر سوتیلے باپ کے گھر میں پلی ہو تو پھر وہ اس کے لئے حرام ہے۔ اور بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ چونکہ سوتیلی لڑکیاں اکثر ماں کے ہمراہ ہی آجاتی ہیں۔ اور ان کی پرورش ہوتی ہے۔ اور وہ سوتیلے باپ کے ہاں ہی رہتی ہیں اس لئے اکثر پر کُل کا حکم لگا کر یہ معنے ہیں کہ چونکہ اکثر حرام ہوگئیں۔ اس لئے دوسری جو سوتیلے باپ کے ہاں نہیں آئیں وہ بھی حرام ہی سمجھی جائیں گی۔

ان میں سے جو دوسرا گروہ ہے وہ یہ بات بڑی معقول کہتا ہے۔ کہ خدا کے الفاظ بے معنی نہیں ہوتے۔ اس لئے ہم کو مسئلہ الفاظ کے مطابق بنانا چاہیئے۔ مگر ان کے مخالف ایک ناقابلِ تردید دلیل یہ ہے کہ گو انہوں نے لفظی فتوے تو جواز کا دے دیا ہے۔ مگر مسلمانوں نے کبھی اس پر عمل نہیں کیا۔ اور تعامل مومنین سے یہ ظاہر ہے کہ باوجود اس فتوے کے ہمیشہ لوگوں نے اس بات کو حرام ہی سمجھا ہے۔ اس لئے حرمت ہی صحیح ہے۔ خواہ مدخولہ کی بیٹی فِیْ حُجُوْرِکُمْ ہو۔ یا نہ ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ پھر ان الفاظ کا مطلب کیا ہوا؟

میرے خیال میں یہ لفظ بطور دلیل حرمت کے بیان ہوئے ہیں۔ یعنی تمہاری مدخولہ بیویوں کی پچھلگ لڑکیاں تم پر حرام ہیں۔ کیونکہ گو وہ تمہارے تخم سے نہ ہوں۔ مگر پھر بھی بسبب اپنی ماں کے رشتہ کے وہ تمہاری گود میں کھلائی ہوئی ہی کہلائیں گی۔ اور اولاد ہی کہی جائیں گی۔ خواہ وہ پرورش کہیں بھی پائیں۔ غرض فِیْ حُجُوْرِکُمْ کے لفظ نے یہ واضح کر دیا۔ کہ وہ بھی تمہاری ان سگی بیٹیوں کی طرح ہی ہیں جن کو تم اپنی گودیوں میں لئے پھرتے ہو۔

گویا تسلیم کیا۔ کہ ہر سوتیلی لڑکی خواہ کہیں بھی ہو۔ فِیْ حُجُوْرِکُمْ کے حکم میں ہے۔ اس لئے اسی طرح حرام ہے جس طرح تمہاری اپنی لڑکی جو یقیناً فِیْ حُجُوْرِکُمْ ہوا کرتی ہے۔

الفضل ۲۲ جنوری ۱۹۲۹ء

۲۵۶ ۔ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے

قرآن مجید اپنی تفسیر آپ بھی کرتا ہے یعنی یفسر بعضہ بعضاً خود قرآن نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے ۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ
ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (القیامت ۷۵ : ۱۷ تا ۱۹)

یعنی ہمارے ذمہ قرآن کا جمع کرنا اور پڑھنا ہے ۔ جب ہم اسے پڑھیں ۔ تو تُو ہمارے پڑھنے کی پیروی کر ۔ پھر ہمارے ذمہ ہی اس کی تفسیر بھی ہے ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید اپنا بیان یعنی تفسیر بھی خود ہی کرتا ہے ۔ اور اس بات کے صدہا نمونے قرآن میں موجود ہیں ۔

۲۵۷ ۔ رُوسیاہی

يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ (آل عمران ۳ : ۱۰۶)

یعنی قیامت کے دن بعض چہرے سیاہ ہوں گے ۔ اور بعض چمکدار یا سفید ہوں گے جو سیاہ ہوں گے وہ کافر ہوں گے ۔ اور جو سفید ہوں گے ۔ وہ اللہ کی رحمت میں داخل اور مومن ہوں گے ۔ شاید اس آیت کی وجہ سے عام مسلمانوں میں یہ مشہور ہو گیا ہے کہ جس کا چہرہ مرنے کے بعد سیاہی مائل ہو جائے ۔ وہ ضرور بے ایمان ہے ۔ اور جس کا منہ زردی مائل یا سفید ہو جائے اُسے جنتی سمجھتے ہیں ۔ حالانکہ بعض بیماریوں کا خاصہ ہے کہ ان میں مرتے وقت بلکہ پہلے ہی چہرہ پر سیاہی آجاتی ہے ۔ کیونکہ خون نیلا یا سیاہ ہو جاتا ہے ۔ بسبب آکسیجن کی کمی کے ۔ مثلاً دل کے اکثر امراض یا پھیپھڑے کی بعض بیماریاں ۔ برخلاف اس کے جن لوگوں میں مرتے وقت خون کی کمی ہوتی ہے یا جریانِ خون سے ان کی موت ہوتی ہے ۔ ان کے چہرے سفید یا زرد ہو جاتے ہیں ۔ لیکن ہرگز اس میں نیک اور بد اعمال کا دخل نہیں ۔ بلکہ بیماری کی وجہ ہے ۔

پس کسی مُردہ کو دیکھ کر اپنے گھر جا کر یہ کہنا کہ اس کا تو منہ کالا ہو گیا تھا۔ پورا جہنمی تھا۔ یہ غلط اور گناہ کی بات ہے۔ بلکہ جہالت اور لاعلمی پر مبنی ہے۔ وہ مُنہ سیاہی۔ اور ترہقہا آخرت میں ہوگی ورنہ

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿عبس ۴۰﴾

ترجمہ: اور کچھ (لوگوں کے) چہرے اس دن ایسے ہوں گے کہ یوں معلوم ہوگا کہ ان پر غبار چھائی ہوئی ہے۔

کی سند پر جس کے چہرہ پر گرد و غبار پڑا ہو۔ اُسے بھی پورا جہنمی کہہ دینا چاہیئے۔

۲۵۸ - مالِ حرام بُود بجائے حرام رفت

ایک اور غلطی اسی قسم کی یہ مشہور ہے کہ کسی کے ہاں چوری ہو جائے یا کسی کا لڑکا آوارہ ہو کر باپ کی کمائی لٹا دے۔ یا کسی کا گھر جل جائے۔ تو لوگ کہنے لگتے ہیں کہ مال حرام کا ہوگا۔ یعنی "مالِ حرام بود بجائے حرام رفت۔" حالانکہ یہ غلط ہے۔ اگر یہ معنے ہوں۔ تو حلال کمائی ہمیشہ باقی رہا کرے۔ اور کبھی حلال مال میں نقصان نہ ہوا کرے۔ حالانکہ یہ بالبداہت غلط ہے۔ ہزاروں لوگوں کی حلال کمائی بسبب ناخلف اولاد کے ضائع ہوگئی۔ اور ہزاروں سود خور راشی بنیوں کا مال بسبب اس کے کہ ان کی اولاد بھی ویسی ہی مال کی قدردان تھی باقی رہا۔ اور سودمند ثابت ہوا۔ حلال یا حرام مال میں چوری ڈاکہ یا ضائع ہونے کا فرق نہیں۔ دونوں پر ایک سا اثر ان باتوں کا ہے۔ حقیقتہً مال خواہ جائز ہو یا ناجائز اپنی طرف چوروں اور بدمعاشوں کو کھینچتا ہے۔ اور وارداتیں ہوتی ہیں

پس ایسے فقرے بھی نہ صرف دِل آزاری کا باعث ہیں۔ بلکہ ان کی اصل ہی غلط ہے۔ مال کو تو خدا تعالےٰ نے فنا ہونے والی چیز قرار دیا ہے۔ خواہ حلال ہو۔ یا حرام۔ نیکی کو باقیات الصالحات یعنی نہ فنا ہونے والی چیز کہا ہے۔ نیکوں اور بزرگوں کا بھی

مال ضائع چلا جاتا ہے۔ جیسے حضرت مسیح کا مال ہیوڈ اسکریوطی کلپے لگا ہے چرا لیا کرتا تھا۔ یا سید عبدالقادر کا ایک جہاز ہی ڈوب گیا تھا بنکوں کا مال اس لئے ضائع ہو جاتا ہے کرتا مالی ابتلاء جو زیر آیت

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَىْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ (البقرہ، ۱۵۶)

ترجمہ: اور ہم تمہیں کسی قدر خوف اور بھوک (سے) اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی (کے ذریعہ) سے ضرور آزمائیں گے۔ (البقرہ، ۱۵۶)

تے ہیں۔ ان کا ثواب مومن کو ملے۔ نہ یہ کہ کہا جائے کہ

؎ مال حرام بود بجائے حرام رفت

۲۵۹۔ قسم کا کفارہ

فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ (المائدہ، ۹۰)

ترجمہ: پس اس (کے توڑنے) کا کفارہ دس مسکینوں کو متوسط (درجہ کا) کھانا کھلانا ہے (ایسا کھانا) جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا ان کا لباس یا ایک (غلام کی) گردن کا آزاد کرنا۔ پھر جسے (یہ بھی) میسر نہ ہو تو اس پر تین دن کے روزے (واجب) ہیں۔

یعنی قسم توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ دس فقیروں کو کھانا کھلائے۔ یا دس مسکینوں کو کپڑے پہنائے۔ یا ایک غلام آزاد کرے۔ لیکن جس کو کسی بات کی توفیق نہ ہو۔ تو وہ تین روزے رکھے۔ یہاں اگر حساب کیا جائے تو تینوں کفاروں میں عجیب فرق نظر آتا ہے۔ دس فقیروں

کا کھانا ایک روپیہ کا ہوتا ہے۔ دس مسکینوں کو اگر فی نفر ایک چادر اور ایک کرتہ بھی دیا جائے تو دس روپیہ اور غلام کی قیمت سینکڑوں روپے تک پہنچتی ہے۔ سوان کفاروں کی قیمت کا تفاوت دیکھ کر کون ہے جو ایک روپیہ کا کھانا چھوڑ کر ہزار روپیہ کا غلام آزاد کرے گا پھر تو کھانا ہی کفارہ بن جائے گا۔ باقی کا نام ہی کیوں لیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ یہ تینوں کفارے تین مختلف قیمتوں کے ہیں۔ ایک ادنیٰ، ایک اوسط، ایک اعلیٰ۔ اس لئے یہ غریبوں اور متوسط درجہ کے لوگوں اور اُمراء کے کفارے ہیں۔ امیر کو جائز نہ ہوگا کہ صرف دس مساکین کو کھانا کھلا کر فراغت حاصل کر لے۔ وہ غلام آزاد کرے گا۔ اسی طرح اوسط درجے والا کپڑے دے گا۔ نہ کہ کھانا۔ کھانا تو غریب آدمی کے لئے ہے۔ اگر سب سے کھانا ہی قبول کر لیا جائے تو باقی دو کفارے بالکل بے معنی ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان کی قیمت میں اتنا فرق ہے کہ پھر کوئی بھی ان کو ادا نہ کرے گا۔ (الفضل ۲۵ جنوری ۱۹۳۹ء)

۲۶۰ قرآن میں مسروقہ قصے نہیں

ایک اعتراض کفار نے یہ کیا تھا کہ قرآن مجید اگلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں سے پوچھ پوچھ کر لکھ لی ہیں۔ اور صبح شام سنائی جاتی ہیں۔ اس کا کیا لطیف جواب قرآن نے دیا ہے کہ اگر لوگوں سے سُن سن کر اور پوچھ پوچھ کر یہ قرآن بنا لیا ہے۔ تو پھر اس میں غیب کی پیشگوئیاں کیوں ہیں۔ قصے تو لوگوں نے بتا دیئے۔ مگر علم غیب جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ وہ اس میں کہاں سے آگیا۔

وَقَالُوْا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اکْتَتَبَهَا فَهِیَ تُمْلٰی عَلَیْهِ بُكْرَةً وَّاَصِیْلًا
قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

(الفرقان ۶، ۷)

ترجمہ: اور وہ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) تو پہلوں کی باتیں ہیں جو اس نے لکھی

سے) لکھواں ہیں اور اب وہ صبح شام اس کے سامنے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں (تاکہ وہ قرآن اچھی طرح کہہ لے)۔ تو کہہ دے کہ اسے (قرآن) کو تو اُس (خدا) نے اُتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کے رازوں سے واقف ہے۔

۳۶۱ - رعایا سب برابر ہے

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ (قصص، ۵)

ترجمہ: فرعون نے (اپنے) ملک میں بڑی تعلّی سے کام لیا تھا اور اس کے بسنے والوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ وہ ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کرنا چاہتا تھا۔

فرعون کی پالیسی یہ تھی کہ اس نے بے انصافی کر کے رعایا کو ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا تھا خصوصاً بنی اسرائیل کو کمزور کر دیا تھا۔ یہ بات اسلامی سیاست میں ناجائز ہے کہ رعایا میں بعض کے حقوق دوسروں کی نسبت فائق ہوں۔ اور بعض کو مثلاً اس طرح کمزور کر دیا جائے کہ اُن کو عام عہدے نہ ملیں۔ یا ان پر بیگار ہو یا تعلیم کے موقعے نہ دیئے جائیں۔ یا بعض لوگوں کو بعض سزاؤں سے معافی ہو۔ اسلام کے سوا باقی اکثر قوموں نے یہی غلطیاں کی ہیں۔

۳۶۲ - موسیٰؑ کی کشش

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بابت اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ أَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي (طٰہٰ، ۴۰) میں نے تجھ میں اپنی محبت کی ایک کشش رکھ دی ہے۔ سو یہی کشش تھی جس کی وجہ سے فرعون کی بیوی نے انہیں دیکھتے ہی اپنے خاوند سے کہہ دیا کہ

قُرَّتُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ ۖ لَا تَقْتُلُوهُ ۖ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ

تَتَّخِذَهٗ وَلَدًا (قصص : ۱۰)

ترجمہ: عورت نے کہا، یہ تیرے لئے اور میرے لیے آنکھ کی ٹھنڈک کا موجب ہوگا۔ اس کو قتل نہ کرو ممکن ہے کہ ایک دن وہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا بنالیں۔

یہ تو مجھے بہت ہی پیارا لگتا ہے۔ اسے نہ مارنا۔ بلکہ میں تو اسے بیٹا بناؤں گی۔ حقیقۃً یہی وہ کشش ہے۔ جس کی وجہ سے انبیاء پر لوگ پروانہ وار گرتے ہیں۔ اور ان کے عشق میں اپنا سب کچھ چھوڑ دیتے ہیں۔

۳۶۳ حنیف کے معنے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے قرآن میں حنیف کا لفظ بکثرت آیا ہے جس کے لغوی معنے میں ایسا آدمی جس کے پَیر مادر زاد ٹیڑھے ہوں۔ جیسے بعض بچے مڑے ہوئے پیروں والے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ اور وہ جب چلنے لگتے ہیں۔ تو سیدھا نہیں چل سکتے۔ ایک رُخ کو ترچھے ہو کر چلتے ہیں۔ اس مناسبت سے حنیف کے معنے ہوتے "شرک سے بیزار۔ خدا کا فرمانبردار" اس لفظ کے مفہوم میں صرف خدا کی طرف ہی یکسُوئی اور توجہ نہیں پائی جاتی ہے۔ بلکہ شرک اور بُت پرستی کی طرف سے ہٹنے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

۳۶۴ - مختلف عدتیں

از روئے قرآن مجید غیر مدخولہ عورت کی کوئی عدت نہیں۔ خواہ خاوند مرجائے یا طلاق دے۔ مدخولہ کی حسب ذیل عدتیں ہیں۔

خاوند کی موت کے بعد۔ (۱) اگر حمل نہ ہو تو چار ماہ دس دن۔

۲۔ حمل ہو۔ تو وضع حمل تک خواہ دوسرے دن بچہ پیدا ہو جائے۔

طلاق والی کی عدت ۱. حیض والیوں کے لئے تین حیض

۲. بے حیض والیوں کے لئے تین ماہ

۳. حمل والیوں کے لئے تا وضع حمل خواہ جلد ہو۔ یا بدیر۔

۲۹۵ ۔ عبادت کی بنیاد فائدہ اور نقصان ہے

اللہ تعالیٰ نے بار بار اپنی عبادت اور غیر اللہ سے بیزاری کے لئے یہ دلیل دی ہے۔ کہ ہر انسان فائدہ حاصل کرنا اور نقصان سے بچنا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کا بندہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ سوائے اس مالک حقیقی کے نفع و نقصان پر قادر کوئی اور ہستی نہیں ہے۔ اس لئے شرک بھی حرام ہے کیونکہ وہ وضع الشئ فی غیر محلہ ہے اس میں ان وجودوں کی عبادت کرنی پڑتی ہے۔ جو نہ نفع کے مالک ہیں۔ نہ ضرر کے۔ پس دین کے تمام کاروبار کی بنیاد نفع نقصان کا مسئلہ ہے۔ نفع حاصل کرنے کے لئے اور ضرر سے بچنے کے لئے ہم مجبور ہیں۔ کہ توحید اور دین اسلام کو اختیار کریں۔ ورنہ تباہی ہے۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ (یونس ۱۰۶)

ترجمہ: اور تو اللہ کے سوا کسی چیز کو جو تجھے نہ (کوئی) نفع پہنچاتی ہے اور نہ (کوئی) نقصان پہنچاتی ہے نہ پکار۔ اور اگر تو نے (ایسا) کیا تو اس صورت میں تو یقیناً ظالموں میں شمار ہوگا۔

۳۶۶۔ رَضِیَ اللہُ عَنۡہُمۡ و رضوا عنہ

بہت لوگ اس فکر میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ معلوم نہیں ہمارا خدا ہم سے راضی بھی ہے یا نہیں۔ کئی دفعہ ایسا سوال میرے سامنے بھی پیش ہوا۔ میں نے تو یہی جواب دیا۔ کہ اس کے جواب کے لئے اپنے دل کو دیکھ لو اور اس سے پوچھ لو۔ کہ کیا تو خدا سے راضی ہے۔ اور اس کی ہر تقدیر پر خوش ہے۔ اگر وہ خدا سے راضی نہیں بلکہ کہتا ہے۔ کہ فلاں تنگی کی وجہ سے فلاں بیماری کی وجہ سے۔ فلاں موت کی وجہ سے۔ فلاں مصیبت کی وجہ سے مجھے خدا کی شکایت ہے اور میں دل سے اس پر راضی نہیں ہوں۔ تو سمجھ لے کہ خدا بھی راضی نہیں ہے۔ جب تک تمہیں خدا کی کوئی شکایت بھی باقی ہے تب تک رضا میں بھی شک ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کیوں ہوئے؟ اس لئے کہ وہ رضوا عنہ ہو گئے تھے۔

۳۶۷۔ انبیاء معصوم ہیں

اس کی سند میں ایک آیت یہ بھی ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ (آل عمران، ۱۶۲)

یعنی نبی کا شان یہ نہیں کہ وہ کسی قسم کی خیانت کرے۔ اور اس سے ایسی بات ظہور میں نہیں آسکتی۔ اب خیانت اتنا وسیع لفظ ہے کہ وہ چوری پر بھی حاوی ہے۔ زنا اور اس کے سب مبادی پر حاوی ہے۔ جھوٹ، غیبت اور اس قسم کے گناہوں پر حاوی ہے۔ غرض ایسا اور ذکر نے والا لفظ ہے کہ کوئی گناہ اس سے باہر نہیں رہتا۔ پس اگر نبی ہر طرح کی خیانت سے پاک ہے تو واقعی وہ معصوم ہے۔ اگلی آیت میں اس کی مزید تفسیر ہے کہ

أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللهِ (آل عمران، ۱۶۳)

ترجمہ: کیا وہ شخص جو اللہ کی رضا کے پیچھے چلتا ہے اس شخص کی طرح

ہوسکتے ہے جو اللہ کی طرف سے (نازل ہونے والے) غضب کرنے کے لئے یعنی نبی تو خدا تعالیٰ کی رضا مندی کی سیدھی راہوں کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ خائن اور گنہگاروں کی طرح کیونکر ہوسکتے ہیں۔ (الفضل یکم فروری ۱۹۳۹ء)

۳۶۸ - دُخان

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۙ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (الدخان ۱۱، ۱۲)

ترجمہ: پس تو اس دن کا انتظار کر جس دن آسمان پر ایک کھلا کھلا دھواں ظاہر ہوگا۔ جو سب لوگوں پر چھا جائے گا۔ یہ دردناک عذاب ہوگا۔

یہ دخان مبین ایک چیز نہیں بلکہ طرح طرح کے عذابوں اور مصائب کا نام ہے جو مختلف زمانوں میں آیا یا آئے گا۔ مثلاً ایک تو قحط جس میں کمزوری اور رزق کی تنگی کی وجہ سے نظر دھندلی پڑ جاتی ہے۔ دوسری ایسی تکالیف جن کے ملنے پر دنیا ہی دھواں دھار اور تاریک نظر آتی ہے۔ تیسرے عالمگیر جنگوں میں زہریلی گیسوں کے بم جو آسمان سے گرتے ہیں۔ چوتھا اس زمانہ میں تمباکو کا عالمگیر استعمال جس میں اکثر لوگ مبتلا ہیں۔ حالانکہ مال اور صحت کے لئے یہ عذاب الیم ہے۔ پانچویں انفلوئنزا جو محیط عالم اور عذاب الیم تھا۔ اور بذریعہ ہوا کے پھیلتا۔ اور سرایت کرتا تھا۔ اور جنگ عظیم سے بھی زیادہ جانیں نکال کر لے گیا۔

۳۶۹ - سب سے پہلا گھر خدا کا

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (آل عمران، ۹۷)

ترجمہ: سب سے پہلا گھر جو تمام لوگوں کے (فائدہ کے) لیے بنایا گیا تھا وہ ہے جو مکہ میں ہے وہ تمام جہانوں کے لیے برکت والا (مقام) اور (موجب) ہدایت ہے۔

یعنی خدا تعالیٰ کا پہلا گھر دنیا میں مکہ میں ہی تعمیر ہوا تھا اس کا مطلب سمجھنے کے لئے دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔

۱۔ پہلی یہ کہ ابراہیمی تعمیر پہلی تعمیر نہ تھی۔ بلکہ کعبہ پہلے بھی تھا۔ مگر وہ لوگ برباد ہو چکے تھے اور چشمۂ زمزم مٹی سے دب کر گم ہو گیا تھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے حکم الٰہی سے اُسے دوبارہ سے تعمیر کیا۔ اور وہ چشمہ جو زمین سے نیچے موجود تھا۔ اسمٰعیل کی ایڑیاں رگڑنے سے ظاہر ہو گیا۔ یہ نہیں کہ نیا اسی وقت اللہ تعالیٰ نے وہاں پیدا کیا تھا۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ دنیا میں خدا کے نام پر سب سے پہلا گھر کعبہ ہی بنایا گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی مختلف قدیم اقوام میں خدا کے مقامات موجود تھے۔ مگر کوئی پتھر کی صورت تھا جہاں قربانی ادا کی جاتی تھی اور کوئی دریا کے کنارے سیڑھی کی شکل میں تھا۔ جیسے ہر دوار میں ہر کی پوڑی غرض مختلف شکلوں کی قربان گاہیں اور ہیکلیں بنی ہوئی تھیں۔ مگر گھر کی صورت میں یہ مکان پہلا تھا جو خدا کے لئے بنایا گیا۔

۲۷۰۔ سدِ سکندری

جو دیوار ذوالقرنین نے یاجوج ماجوج کو روکنے کے لئے بنائی تھی۔ ایسی کئی اور دیواریں مشرقی ایشیا میں موجود ہیں چنانچہ دو تو ملک چین میں بھی ہیں۔ اگلے زمانہ کے لوگ دشمنوں کے حملے سے بچنے کے لئے دروں میں اور حملے کے رستوں میں ایسی دیواریں کھڑی کر لیا کرتے تھے ذوالقرنین کی دیوار کی بابت قرآن مجید فرماتا ہے۔

فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۝

حَقًّا (الکہف: ۹۸)

ترجمہ: پھر جب (عالمگیر عذاب کے متعلق) میرے رب کا وعدہ (پورا ہونے پر) آئے گا تو وہ اس (روک) کو (توڑ کر) زمین سے پیوستہ شدہ ایک ٹیلہ بنا دے گا اور میرے رب کا وعدہ (ضرور) پورا ہو کر رہنے والا ہے۔

یعنی جب ان اقوام کے دنیا میں پھیل جانے اور غالب ہونے کا وقت آ جائے گا تو خدا تعالیٰ اس دیوار کو ریزہ ریزہ کر دے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس دیوار کو فرشتے یا رگ جیھ کر توڑیں گے۔ اور ریت کی طرح کر دیں گے۔ بلکہ اس زمانہ میں وہ دیوار ایسی بیکار ہو جائے گی۔ گو یا اب ہی نہیں ریزہ ریزہ ہو چکی ہے۔ جیسا آج کل کی توپوں اور ہوائی جہازوں کے آگے وہ دیوار حقیقت ہی کیا رکھتی ہے گو یا موجود ہوتے ہوئے بھی وہ ریت کے تودہ سے بڑھ کر نہیں ہے۔ قرآن مجید اسی طرح کئی شہروں ملکوں اور قوموں کی ہلاکت کا بھی ذکر کرتا ہے۔ جس سے یہ شبہ گزرتا ہے کہ گویا ان چیزوں کا دنیا میں کچھ بھی باقی نہیں رہا مگر مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کا اثر اور زور ٹوٹ گیا۔ ایسا محاورہ جا بجا قرآن میں موجود ہے۔

۲۷۱ - مَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى

ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ
فِي الْقُرْبٰى وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا
اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (الشوریٰ: ۲۴)

ترجمہ: یہی وہ چیز ہے جس کی اللہ اپنے مومن بندوں کو بشارت دیتا ہے۔ ایسے مومن بندوں کو جو ایمان کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں۔ تو کہہ دے میں اپنی خدمت کے بدلہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، سوائے

اسی محبت کے جو اپنے قریب ترین رشتہ داروں سے کی جاتی ہے اور جو شخص کوئی نیکی کا کام کرتا ہے ہم اسکی نیکی کو اس کے لیے اور زیادہ حسین بنا دیتے ہیں۔ اللہ بہت بخشنے والا (اور) قدردان ہے۔

اس لفظ مودۃ فی القربیٰ کو لے کر شیعہ صاحبان نے یہ سمجھا ہے کہ گویا میدان مار دیا اور حضرت علیؓ کی خلافت قائم کردی۔ گویا سارے اسلام کا خلاصہ یہی ہے کہ میرے رشتہ داروں سے محبت رکھو۔ اگر یہی معنے ہوتے تو پھر تو ابولہب بلکہ ابوجہل کی مودۃ بھی ہم پر فرض تھی۔ کیونکہ وہ بھی قربیٰ میں داخل تھے۔ اسی طرح ابوبکرؓ عمرؓ۔ عثمانؓ معاویہ۔ یزید بھی نہایت قریبی رشتہ دار تھے۔ دو تو خسر تھے۔ ایک داماد اور ایک نسبتی جائی۔ اور یزید کے تو گویا حضور پھوپھا ہی تھے۔ پس صرف علیؓ کو نکال لینا اور باقی کو (نعوذ باللہ) مردود کر دینا۔ یہ کہاں سے ثابت ہوا۔ معنی اگر یہی ہیں تو سب عزیزوں اور قرابتیوں پر حاوی ہیں۔ نہ کہ صرف ایک خاص شخص پر۔ حالانکہ اصل معنے یہ ہیں کہ اس آیت سے پہلے جو آیت ہے۔ اس میں جنت کا ذکر ہے۔ اور اس آیت کے پہلے حصہ میں کہا گیا ہے کہ یہ وہ جنت ہے جس کا وعدہ خدا تعالیٰ نے اپنے مومن اور نیکوکار بندوں سے کیا ہے۔ اس سے آگے فرمایا کہ بسبب اس قرابت کے جو ہم وطن، ہم قوم۔ ہم برادری اور عزیز و رشتہ دار ہونے کی وجہ سے اہل عرب میری تم لوگوں کے ساتھ ہے۔ تمہاری خیر خواہی مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں تم کو خاص طور پر اس جنت کی طرف دعوت دوں۔ جس کا خدا نے مومنوں سے وعدہ کیا ہے۔ میں اس بات کا بدلہ تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ نہ میری کوئی ذاتی غرض ہے۔ صرف تمہاری قرابت داری کی محبت مجھے مجبور کرتی ہے۔ اور میرا دل چاہتا ہے کہ تم سب کے سب اس جنت کے وارثوں میں سے ہو جاؤ۔ اور کوئی بھی اس انعام سے محروم نہ رہے۔

۳۷۲ ۔ نُصرت

اصل چیز جو حق اور باطل میں مابہ الامتیاز ہے۔ وہ نصرتِ الٰہی ہے

۔اِنَّھُمْ لَھُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ (الصّٰفّٰت ۱۷۲)

اور نصرت دو طرح کی ہے۔ ایک یہ کہ مخالف مقابلہ کے وقت ہلاک ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ مقابلہ نہ بھی ہو تب مرعوب رہے کیونکہ نصراللہ کے معنی فتح کے بھی ہیں اور نصرت بالرعب کے بھی ہیں ۔

۳۷۳ ۔ بلوغت

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ (یوسف ۲۲)

ترجمہ ۔ اور جب وہ اپنی قوت (اور مضبوطی کی عمر) کو پہنچا تو ہم نے اُسے فیصلہ (کرنے کی فراست) اور خاص علم بخشا ۔

جب وہ مضبوطی کو پہنچا تو ہم نے اس کو احتلام کی قابلیت اور علم بخشا۔ بلوغت اور پختگی کتنی طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو بلوغتِ جسمانی جو قریباً پندرہ سال کی عمر سے شروع ہو جاتی ہے۔ اور پختگی اس کی قریباً ۲۵ سال کی عمر میں ہوتی ہے۔ دوسری روحانی بلوغت جو

اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً (الاحقاف ۱۶)

ترجمہ ۔ پھر جب یہ انسان اپنی کامل جوانی یعنی چالیس سال کو پہنچ گیا۔

سے واضح ہے کہ یہ عموماً چالیس سال کی عمر میں ہوتی ہے۔ ایک وہ بلوغت جو کاروبار اور کمائی کی ہوتی ہے۔ وہ ہر پیشے، قوم اور ملک کے لحاظ سے الگ الگ ہے۔ تاہم تعلیم یافتہ طبقوں میں میٹرک پاس سے بی اے یا ایل ایل بی اور ایم بی بی ایس یا بیرسٹری وغیرہ پر ختم ہوتی ہے۔ یعنی جب آدمی وہ امتحان پاس کرے جس کی وجہ سے اُسے روزگار مل سکے۔ اس

کے سوا ایک اور بھی ضرورت ہے۔ یعنی اصل کارکن اور اصل مبلغ دین بننے کی ضرورت میرے نزدیک آئندہ کے لئے ہمارے سلسلہ میں اس کا معیار بی۔ اے فاضل جامعہ ہوگا۔ نا اکیلا بی اے۔ نہ اکیلا فاضل جامعہ۔ کم ازکم اتنی مشترکہ لیاقت اور تعلیم ہو۔ تب وہ شخص سلسلہ کا مفید کارکن اور مبلغ بن سکتا ہے۔ اِلّا ماشاءاللہ۔ سو جو نوجوان دینی خدمت پسند کرتے ہیں اور جو لوگ اپنی اولاد دین کے لئے وقف کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کم ازکم اس معیار تک ان کو پہنچائیں۔ بغیر اس کے موجودہ زمانہ میں وہ علم اور وہ علم جو خدمتِ دین کے لئے ضروری ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔ (الفضل ۱۰ر فروری ۱۹۳۹ء)

۴۷۳۔ سچا الہام فکر کا نتیجہ نہیں

اس کے متعلق یہ تین باتیں قطعی فیصلہ کُن ہیں۔

۱۔ یہ کہ علمِ غیب جو الہام میں ہوتا ہے وہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں۔ ورنہ پھر دُنیا کے بڑے بڑے عقل مند اور فلاسفر سب غیب دان ہُوا کرتے۔

۲۔ دوسرے غیر زبان میں الہام ہونا جسے ملہم جانتا بھی نہیں۔ یہ فکر و خیال کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔

۳۔ تیسرے الہام میں الفاظ اور خیالات تو دل سے اُٹھ سکتے ہیں۔ مگر عدد اور گنتی کسی خیال کا نتیجہ نہیں ہوتی مثلاً جب الہام ہوا کہ اکیس روپیہ آئیں گے اور وہ آ گئے تو روپیہ کا آنا تو خیال پر مبنی ہو سکتا ہے۔ مگر اکیس کی تعداد صرف عالم الغیب کے پاس سے ہی آ سکتی ہے۔ نہ یہ کہ خیال کا نتیجہ ہو۔

پس یہ تین ثبوت قطعی ہیں۔ سچے الہام کے لئے کہ وہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہے۔ غیر۔ کے نمونوں اور مثالوں سے تو قرآن اور الہامات حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) بھرے پڑے ہیں۔ اور انگریزی اور عبرانی الہامات کی مثالیں بھی ہم نے دیکھی ہیں اور فارسی

الہام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ہے۔ لیکن مدد کے لئے دیکھو آیت تکم میعاد یوم۔ یعنی اے کفارِ مکہ میری ہجرت کے ایک سال بعد تم پر عذاب آئے گا۔ اور خلافتِ راشدہ کا تیس سال تک رہنا۔ اور تیرہ صدیوں کے بعد حضرت مسیح موعود کا ظہور۔ اور ایک سو سال تک کسی صحابی کا یا کسی اہلِ ارض کا زندہ نہ رہنا۔ اور نو سال میں پسرِ موعود کا پیدا ہونا۔ اور چھ سال لیکھرام کی میعاد۔ اور ۴۷ سال عمر بر وفات حضرت مولوی عبدالکریم صاحب اور ڈھائی سال اپنی عمر کے باقی رہ جانے جس وقت کوری شڈ میں دو تین گھونٹ آبِ زندگی کو رویا میں دیکھا تھا۔ اور متعدد دفعہ آنے والے روپوں کی گنتی کا قبل از وقت معلوم ہو جانا۔ اور پچیس کو ایک واقعہ والا الہام۔ غرض بکثرت مثالیں اعداد کی مل سکتی ہیں۔

۳۷۵۔ ہر انسان کلام الٰہی سے مشرف ہے

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (الشوریٰ ۵۲)

ترجمہ: اور کسی آدمی کی یہ حیثیت نہیں کہ اللہ اس سے وحی کے سوا یا پردے کے پیچھے بولنے کے سوا کسی اور صورت سے کلام کرے یا (اس کی طرف فرشتوں میں سے) رسول (بنا کر) بھیجے جو اس کے حکم سے جو کچھ وہ کہے بات پہنچا دیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تین طریقوں سے خدا انسان کے ساتھ کلام کرتا ہے ایک تو براہِ راست وحی۔ دوسرے رویا و کشوف۔ تیسرے رسول کو وحی کر دیتا ہے۔ کہ آگے پہنچا دے۔ یہ تیسری قسم کی وحی دُنیا کے ہر انسان کے لئے ہے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ نے قرآنی وحی اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ہم کو

بھیجی۔ اور اس طرح ہم سے کلام کیا۔ اس طریق سے تمام دُنیا کے ہر فرد سے خدا کا کلام ثابت ہے۔ رسول سے صرف فرشتے ہی مراد نہیں۔ بلکہ نبی بھی رسول ہوتا ہے۔ بس نبی کی معرفت بھی جس جس کو کلامِ الٰہی پہنچے۔ وہ ایسا ہی ہے۔ گویا خدا نے اس سے کلام کیا۔ آگے قسمت والے اسے مان لیتے ہیں۔ اور بدقسمت انکار کر دیتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے فضلوں کی طرح اس کے کلام کا دائرہ بھی نہایت وسیع ہے۔ خواب اور رؤیا والا کلام بھی ہر نبی نوعِ انسان سے ہوتا ہے اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا والا کلام بھی نبی رسول کی معرفت ہر انسان سے ہے۔ ہاں پہلی قسم کا کلام خاص لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

۲۷۶۔ مُباہلہ انبیاء کا نشان ہے

قبولیتِ دُعا صرف انبیاء کو بطور نشان کے دی جاتی ہے۔ اور گو ہر انسان کی خصوصاً مومنوں کی دُعائیں قبول ہوتی رہتی ہیں۔ مگر حریف کے مقابلے کے وقت یہ حربہ چلانا صرف انبیاء کا ہی کام ہے۔ اسی طرح مباہلہ بھی جو دُعا ہی کی ایک شاخ یعنی بددُعا ہے وہ بھی انبیاء یا اُن کے خلفاء راشدین کو جو اُن کی گدی پر بیٹھتے ہیں سزاوار ہے۔ قرآن مجید کی آیت مباہلہ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاص طور پر مخاطب ہیں۔ عام مومن مخاطب نہیں۔ میرے نزدیک عام مومنوں کو مباہلہ بطور نشانِ صداقت پیش کرنا۔ اور خود اس نشان سے فیصلہ چاہنا جائز نہیں۔ یہ الگ بات ہے۔ کہ کبھی تیر نشانہ پر بیٹھ جائے۔ مگر علمِ کلامِ الٰہی۔ مکالمہ مخاطبہ۔ کثرتِ غیب۔ قبولیتِ دُعا۔ اور مباہلہ۔ یہ سب نشانات انبیاء کی ذات سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے۔ کہ جھٹ مباہلہ کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ پھر مباہلہ ہو۔ اور بعض دفعہ نتیجہ مشکوک اور مبہم نکلتا ہے۔ تو حیران ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے۔ کہ یہ نشان ان کے لئے ہے ہی نہیں۔ اس لئے کبھی اس پر جرأت نہیں کرنی چاہیئے۔ ہماری جماعت کے لئے تو یکطرفہ مباہلہ حضرت مسیح موعود مقرر کر گئے ہی ہیں

لئے کوئی تشویش کی ضرورت ہی نہیں۔ دشمن صرف یہ بد دعا کرے کہ اگر یہ شخص جو مسیح موعود ہونے کا مدعی تھا۔ یہ سچا ہے۔ تو ہم پر عذاب نازل کر۔

بس اتنا کافی ہے۔ یہ نہ کہیں کہ فلاں احمدیہ جماعت تباہ ہو۔ ورنہ پھر مباہلہ ان سے براہ راست ہو جائے گا۔ غرض مباہلہ خود مسیح موعود سے ہونا چاہیئے۔ نہ کہ مختلف جماعت ہائے احمدیہ یا افرادِ جماعت سے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر عربی نویسی، بے مثال کتابیں لکھنا، دعاوں کا مقابلہ، حقائق و معارف، کتب الہی کا بیان کرنا، کثرت مکالمہ مخاطبہ، کثرت غیب کی پیشگوئیاں کرنا سب کچھ جائز ہونا چاہیئے۔

۳۷۷ ۔ احمدی ہی سچا متقی ہے

جب ۱۹۱۶ء میں غیر مبایعین الگ ہوئے تو انہی دنوں مسجد نور میں مولوی صدر الدین صاحب سے مسئلہ کفر و اسلام پر میری گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کے دوران میں مَیں نے ان سے کہا۔ کہ ان لوگوں کو آپ سُن کر دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ دراصل اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ تعلق نہیں رکھتے۔ اس پر مولوی صاحب کہنے لگے۔ میں بہت سے غیر احمدیوں کو جانتا ہوں۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت اور سچا عشق رکھتے ہیں۔ میں نے کہا۔ کہ میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اصل سے عشق ہو۔ اور جب اُس کا ظِل یا بروز یا وہی خود سامنے آئے۔ تو اس سے مخالفت اور انکار ہو۔ دراصل وہ رواجی اور کہنے کی محبت ہے۔ جب ظل اور بروز آ گیا۔ اور ان لوگوں نے اس کا انکار کر دیا۔ تو واضح ہو گیا۔ کہ ان کا دعویٰ جھوٹ تھا۔

اس کے بعد بھی مدتوں سے میں ایسے فقرے لوگوں سے سُنا کرتا ہوں۔ کہ فلاں شخص گو احمدی جماعت میں داخل نہیں ہے۔ مگر بڑا متقی ہے۔ میں اس کے ماننے کو تیار نہیں ہوں کیونکہ قرآن مجید فرماتا ہے۔

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (الزمر ۳۴:۳۳)

یعنی جو شخص صداقت لے کر مامور ہوا۔ وہ اور جس نے اس کی تصدیق کی۔ وہی لوگ اصل متقی ہیں۔

پس حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) اور آپ کے مصدقوں کے سوا کسی کو متقی سمجھنا بالصراحت قرآن کے خلاف ہے۔ اور ایسے فقرے استعمال کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ لوگ ہدایت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ ماموریت اللہ کی جماعت سے الگ رہ کر بھی انسان سچا متقی ہو سکتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اُسے متقی کہتے ہیں۔ جو زنا شراب اور رشوت سے پرہیز کرتا ہو۔ نماز روزہ کا پابند ہو۔ حاجی ہو اور منہ پر یک مشت و دو انگشت داڑھی ہو۔ حالانکہ تقویٰ دل کا فعل ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کی ہیبت اور خوف سے ہمیشہ اتنا بھرا رہے۔ کہ ظاہری گناہوں سے بچا رہے اور دل بھی پاک ہو۔

میرے ایک رشتہ دار تھے۔ جو بہت نمازی۔ نوافل اور اذکار پڑھا کرتے تھے۔ اور یوں بھی بڑے بادیانت اور محتاط دکھائی دیتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ ہم خود بزرگ ہیں ہمیں کسی مامور کی ضرورت کیا ہے۔ آخر ایک دفعہ ایک زمینداری کے مقدمہ میں ایک غلطی کی وجہ سے ان کے ہاتھ سے زمین جانے لگی۔ تو فوراً چند جھوٹے گواہ کھڑے کر کے گواہیاں دلوا کر اپنی جائداد بچالی اور خود میرے سامنے اقرار کیا۔ کہ کوئی صورت بچنے کی نہ تھی۔ اس لئے ہم نے ایسا کیا۔

اس وقت مجھے یاد آیا کہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) پر بھی ایسے وقت آئے۔ مگر آپ نے سچ کو نہ چھوڑا اور جائداد ضائع کر کے اور خدا کی خوشنودی کو مقدم کر کے دکھا دیا۔ کہ تقویٰ یہ ہے۔

حاصل بات یہ ہے کہ تقویٰ پر عمل کرنا تو دور کی بات ہے۔ عام لوگ تقویٰ کے معنی بھی نہیں جانتے۔ (الفضل ۱۵ فروری ۱۹۳۹ء)

۳۷۸۔ قارون

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں بھی بعض ان کے منکر تھے۔ ایک مشہور آدمی کا نام قارون ہی تھا۔ جو غالباً سود پر روپیہ چلاتا تھا۔ اور طرح طرح کی شرارتیں کرتا رہتا تھا جب لوگ اسے کہتے کہ تو خدا کا شکر کر کہ تجھے اُس نے اتنا مال دیا ہے تو کہا کرتا۔

اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ۔ (القصص، ۷۹)

یہ تو میں اپنے علم کے زور پر کماتا ہوں۔ کیا خدا نے مجھے چیر پھاڑ کر دیا ہے؟ جو میں اتنی خیرات کروں۔ خیر جب عذاب الٰہی آیا تو اس کے گھر کی چھت گر پڑی۔ شاید شہتیر کو دیمک نے کھایا تھا۔ یا گھن لگ گیا تھا۔ چھت گری تو گھر والا بھی دب کر مر گیا۔ یا زلزلہ آیا۔ اس سے زمین کے اندر دب گیا۔ ایسے واقعات ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ خدا کا غضب بعض دفعہ عالمگیر اور قومی ہوتا ہے۔ بعض دفعہ انفرادی۔ قرآن مجید میں صرف اتنا ذکر ہے۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ (القصص، ۸۲)

ترجمہ: پھر ہم نے اُسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔

یعنی گھر میں دھنس گیا۔ اور وہ بھی اسی میں دب گیا۔ باقی یہ قصے کہ زمین کے اندر وہ اور اس کا گھر داخل ہونے اور دھنسنے شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ آج تک وہ تحت الثریٰ میں برابر سفر کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ باتیں کہانی کے طور پر ہیں۔ عبارت اور حالات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے وہ ہلاک ہو گیا۔

یہ ضروری نہیں کہ خدا تعالیٰ کی سزا یا اس کا عذاب ضرور کسی انوکھی طرز پر نازل ہو۔

ہاں، تو کہنا اور معجزہ والی بات یہ ہے کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی تھی۔ وہ اس کے نتیجہ میں ہلاک ہو گیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی قبولیت پر مُہر کر گیا۔

دوسری بات جو عموماً یہ سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی کنجیاں اس قدر تھیں۔ کہ کنجی بردار اُن کے اُٹھانے سے تھک جاتے تھے۔ مگر میں نے تو آج کل دیکھا ہے کہ ایک ایک سیف کی اٹھارہ اٹھارہ کنجیاں ہوتی ہیں۔ ہر سوراخ کی دو کنجیاں۔ اور سیف میں ہر خانہ مقفل ہونے کے قابل ہوتا ہے۔ اگلے زمانے میں تو بڑے بڑے جیسے قفل اور پاؤ پاؤ سیر کی ایک کنجی ہوتی تھی۔ کنجی بردار جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے۔ تیس چالیس کنجیوں کو ہی کمر میں لٹکا کر تھوڑی دیر میں تھک جاتے ہوں گے۔ غرض یہ بھی کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔

عصبۃ کے معنی جماعت کے بھی ہیں۔ اور اس کے یہاں کے کئی کئی نوکر ہوتے ہی ہیں۔ وہ اپنی نوکری کے وقت باری باری کنجیوں کا گچھا اٹھا کر اس کے ہمراہ رہتے ہوں گے۔ ایسی حالت میں تھک جانا۔ یا اتنی کنجیوں سے تکلیف اٹھانا مالک کی امارت کی علامت ہے۔ نہ یہ کہ وہ دنیا کے سب دولت مندوں سے زیادہ مالدار تھا۔ نہ اس سے پہلے کوئی ایسا مالدار گزرا نہ بعد میں۔ یہ سب مبالغے ہیں۔

۳۰۹ ۔ مومن خدا کو کتنا پیارا ہے

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (النساء: ۹۴)

ترجمہ:۔ اور جو (شخص) کسی مومن کو دانستہ قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہوگی۔ وہ اس میں دیر تک رہتا چلا جائے گا اور اللہ اس سے ناراض ہوگا اور اسے (اپنی جناب سے) دُور کر دے گا اور اس کے لیے (بہت) بڑا

عذاب تیار کرے گا۔

مومن خدا کو اتنا پیارا اور عزیز ہے کہ اگر کوئی اُسے جان کر مار ڈالے تو اس کی سزا جہنم ہے۔ اس میں ہمیشہ رہے گا۔ اللہ کا اس پر غضب اور اللہ کی اس پر لعنت اور اس کے لئے عظیم الشان عذاب تیار ہے۔ یہ تہدید یہ تخویف اور اس قدر پُر جوش آیت کسی اور گناہ کے لئے قرآن میں موجود نہیں ہے۔ سوائے نفاق کے

۲۸۰ - اسلام کی ایک فضیلت

اسلام کی ظاہری فضیلت یہ کیا کم ہے کہ اس کے خدا کا اسم معرفہ اللہ جلّ شانہٗ ہے دوسرے مذاہب میں خدا کا نام ہی نہیں۔ پھر خود اس مذہب کا نام اسلام ہے جو دوسرے مذاہب کا کوئی نام ہی نہیں جو انکی اپنی کتاب نے پیش کیا ہو۔ تیسرے اس کی الہامی زبان زندہ ہے۔ باقی سب کی مُردہ چوتھے ان کے نبی کا نام محمد صلعم ہے۔ یعنی تمام اخلاقِ حسنہ کا جامع اور سارے کمالات کا مرکز۔ دوسروں کے انبیاء کے نام میں یہ خوبی ہی نہیں۔ پانچویں اس کی کتاب کا نام قرآن شریف ہے۔ اور کسی مذہب نے اپنی کتاب کا نام خود نہیں بتایا۔ بلکہ لوگوں نے جو چاہا رکھ لیا۔ مثلاً توراۃ نے یہ کہیں نہیں کہا کہ میرا نام توراۃ ہے۔ یا وید نے کہا ہو کہ میں جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہوں۔ میرا نام پرمیشر نے وید رکھا ہے۔ چھٹے اپنے متبعین کا نام کسی مذہب نے تجویز نہیں کیا۔ سوائے قرآن کے جس نے ہمارا نام مسلم رکھا۔ حوالوں کے لئے دیکھو یہ آیات۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران ۲۰)

ترجمہ: اللہ کے نزدیک اصل دین یقیناً کامل فرمانبرداری ہے۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (الشعراء ۱۹۶)

ترجمہ: (اس کو جبریل نے خدا کے حکم سے) کھول کر بیان کرنے والی عربی

زبان میں اُتارا ہے۔ (الشعراء: ۱۹۶)

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ (الواقعہ: ۷۸)

ترجمہ: یقیناً یہ قرآن بڑی عظمت والا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ (الفتح: ۳۰)

ترجمہ: محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔

هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ (الحج: ۷۹)

ترجمہ: اللہ نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔ (الفضل ۲۲ فروری ۱۹۳۹ء)

۳۸۱ ۔ زمین بولے گی

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا (زلزال: ۵)

جس دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی۔ آج کل لوگ دُنیا بھر کی خبریں روزانہ بذریعہ ریڈیو کے سُن لیتے ہیں۔ اور اس کی اصل وجہ وہ برقی لہریں ہیں جو زمین کی سطح پر بغیر تار کے چلتی ہیں آج سے پندرہ بیس سال پہلے ایسی باتوں کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ اب آکر ۱۳ سو سال بعد یہ پیشگوئی قرآن مجید کی کس طرح واضح طور پر پوری ہوئی ہے کہ حیرت آتی ہے

۳۸۲ ۔ ہاتھ پیر، زبان، حرکات سب کی گواہی

شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ (حم السجدہ: ۲۱)

وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقَنَا

اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (حم السجدہ: ۲۲)

ترجمہ: اُن کے کان اور اُن کی آنکھیں اور اُن کے چمڑے اُن کے عمل کی وجہ سے اُن کے خلاف گواہی دیں گے۔

اور وہ اپنے چمڑوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟
اور ان کے چمڑے جواب میں کہیں گے ہم سے اسی خدا نے کلام کروایا ہے جس
نے ہر چیز سے کلام کروایا ہے۔

یہ باتیں بھی نمونہ کے طور پر اس زمانہ میں موجود ہو گئی ہیں۔ جو لوگ خانہ کعبہ میں یا مر گئے ہیں۔ ان کے افعال، اعمال اور باتیں ٹاکی کے پردہ پر ہر شب کو دکھائے جاتے ہیں اور جب فرمایا گیا تھا کہ اعمال محفوظ کئے جاتے ہیں وہ بھی ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اور جلد کی گواہی عدالتوں اور پولیس میں جا رہی ہے۔ جہاں انگوٹھے لگائے جاتے ہیں اور جلد کے نقش لئے جاتے ہیں اور مجرموں کی تلاش اور تفتیش بذریعہ فوٹو۔ اور جلد کے نشانات کے روزمرہ ہوتی رہتی ہے۔

۳۸۳۔ کاہن اور ساحر

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ (الحاقہ ۴۲)

ترجمہ: اور نہ یہ کسی پادری پنڈت کی باتیں ہیں مگر تم بالکل نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

لوگ بعض دفعہ پوچھتے ہیں۔ کہ اب ساحر اور کاہن نظر نہیں آتے کہاں چلے گئے۔ اس سے ذرا پہلے زمانہ میں جو عورتیں ڈائنیں یا کلیجہ نکالنے والی کہلاتی تھیں وہ ساحروں میں سے ہوتی تھیں۔ اسی طرح جوگی اور وہ لوگ جو عامل تھے اور توجہ کیا کرتے تھے۔ نیز شعبدہ باز ٹھگوں کو بھی ساحر کہتے ہیں۔ اور ایک قوم نیم مجذوبوں کی تھی۔ وہ کاہن تھے۔ آج کل مسمرائزر ساحر ہیں اور سپریچولسٹ کاہن ہیں۔ پورے مجذوب اور پاگل مجنوں کہلاتے ہیں۔ اور صرف مزیدار تک بندی اور مقفیٰ عبارتیں بنانے والے اور شعر کہنے والے شاعر۔

تورات میں جو لفظ کاہن کا آتا ہے اس سے محدث یا ملہم یا وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو مذہبی پیشوا اور امام قوم ہوتے تھے۔ قرآن نے یہ اصطلاح یہودیوں کی تسلیم نہیں کی۔ بلکہ وہ

اصطلاح ہی سے جو عربوں میں رائج تھی ۔

۴۸۴ ۔ نماز میں توجہ

اَلَّذِیۡنَ هُمۡ فِیۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ (المومنون ۳،)

ترجمہ : وہ (مومن) جو اپنی نمازوں میں عاجزانہ رویہ اختیار کرتے ہیں ۔

نماز میں خشوع یعنی عاجزی نہایت ضروری بات ہے ۔ کیونکہ وہ وقت اپنے محسن رب کے حضور عبادت کا ہے ۔ حدیث میں آتا ہے کہ نماز میں مومن اپنے رب سے مناجات یعنی باتیں کرتا ہے ۔ تو نماز ایسی چیز ہے جس کا مقصد عاجزی اور دُعا ہے ۔ لیکن بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے ۔ کہ نماز میں توجہ قائم اس طرح رکھنی چاہیئے ۔ جس طرح نیا نیا مسمریزم سیکھنے والا کاغذ پر ایک سیاہ دائرہ بنا کر توجہ کی مشق کرتا ہے ۔ ایسے کسی شخص کو نماز پڑھتے دیکھو تو بجائے عاجزی اور مناجات کے وہ ٹپانسور لگا کر اور ڈیلے باہر نکال کر اپنی سجدہ گاہ کو توجہ کا نقطہ تصور کر کے پوری مشق مسمریزم کی کرتا ہے ۔ مگر اس مسمریزم اور توجہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے توجہ جاتی رہتی ہے ۔ عاجزی جاتی رہتی ہے ۔ مناجات اور دُعا جاتی رہتی ہے ۔ اور صرف توجہ رہ جاتی ہے ۔ چونکہ خدا پر توجہ ہو نہیں سکتی ۔ اس لئے نماز ہی گئی ۔ نتیجہ یہ کہ بہت زور لگانے اور توجہ کرنے سے اعصابی ضعف اور کمزوری تو ہو جائے گی ۔ مگر مطلب نماز کا نہ حاصل ہو گا ۔ نماز کو طاقت زائل کرنے کا ذریعہ شریعت نے نہیں بنایا ۔ بلکہ طاقت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا ہے ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو

فَاِذَا فَرَغۡتَ فَانۡصَبۡ (الم نشرح ۸،)

کا حکم ہوتا ہے ۔ یعنی جب تو کام سے تھک جائے اور تبلیغ سے فارغ ہو تو کوفت دُور کرنے کو نماز کے لئے کھڑا ہو جا ۔ اگر نماز میں مسمریزم والی توجہ کی جاتی تو اُسے کبھی تفریح دینے والا نہ قرار دیا جاتا ۔ نہ کبھی حضور قرۃ عینی فی الصلوٰۃ فرماتے ۔

نماز تو لعنت ہے ۔ نہ کہ شفقت زار خدا یا جلال پر غور کرو پس محض ادب سے عاجزی اور فروتنی اور سکینت سے نماز پڑھو ۔ اور اسی طرح خدا سے باتیں کرو جس طرح ایک دوسرے سے کرتے ہو ۔ اور اسی سے دُعا کرو ۔ انہی باتوں کا نام مناجات ہے ۔ برخلاف اس کے نماز میں سخت زور لگا کر اور توجہ بقوت تمام مسمریزم سیکھنے والوں کی طرح لگا کر تمام اعضاء کو تشنج دے کر اور آنکھیں باہر نکال کر اور دُعا کرنے وقت اس طرح زور لگا کر کر گویا دس من کا بوجھ اٹھا رہے ہیں ۔ یہ سب طریقے مصنوعی اور غلط فہمی کا نتیجہ ہیں اور کوفت پیدا کرتے ہیں نہ کر راحت اور نہ اس حالت میں خدا کے ساتھ مناجات یعنی باتیں ہو سکتی ہیں ۔ نہ عاجزی سے دُعا ہو سکتی ہے پس فروتن بنو ۔ نہ کہ زور لگانے والے پہلوان ۔ اور عاجز بنو نہ کہ مسمریزم سیکھنے والے نو آموز طالب علم اور تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ (الزمر ، ۲۴) والا نمونہ نظر آئے نہ کہ کشتی کرنے والے کا نمونہ اور نماز کی توجہ سے مراد خدا کی طرف خیال اور رجوع ہے ۔ جیسے بادشاہوں کے دربار میں ماتحت اور سوال حاضر ہوتے ہیں اور اُن کی طرف نظر رکھتے ہیں نہ کہ وہ توجہ جو عامل اپنے معمول پر کرتا ہے

۲۸۵ - اُمّی نبی

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ (الاعراف ، ۱۵۸)

ترجمہ ۔ (وہ لوگ) جو ہمارے اس رسول کی اتباع کرتے ہیں جو نبی ہے اور اُمّی ہے ۔

یعنی اَن پڑھ نبی جسے نہ ماں نہ باپ نہ اُستاد ۔ کسی طرف سے بھی کوئی تعلیم نہیں پہنچی ۔ ماں باپ تو چھوٹی سی عمر میں ہی فوت ہو گئے تھے ۔ اُستاد کوئی تھا نہیں جو کچھ بھی حضور نے پڑھا وہ خدا سے ہی پڑھا ۔

۳۸۶ - وہ رزق کہاں جاتا ہے ؟

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود ، ۷)

اور نہیں کوئی چلنے والا زمین پر مگر یہ کہ اللہ کے ذمہ ہے اس کا رزق۔ یہ آیت بھی بکثرت لوگوں کی زبان پر ہے۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ ہزاروں آدمی بھوکے مرتے ہیں اور سخت قحط میں لاکھوں جانیں ضائع چلی جاتی ہیں۔ اس وقت وہ رزق کہاں جاتا ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے ذمہ اس رزق کا مہیا کرنا اور پیدا کر دینا ہے۔ نہ کہ ہر ایک کے گھر اپنے فرشتوں کے ہاتھ دسترخوان لگا کر پہنچا دینا۔ ہر زمانہ میں خواہ وہ کال کا ہو یا سکال کا دنیا میں اتنے آدمیوں کا رزق موجود ہوتا ہے جتنے آدمی روئے زمین پر بستے ہوں۔ یہی حال حیوانات کا ہے۔ لیکن رزق کی تقسیم جو فی نفر اور فی قوم یا فی ملک ہوتی ہے۔ اس کا انتظام انسانوں کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اسی وجہ سے بدانتظام حکام یا حریص افراد یا ڈاکو کمپنیاں اور ملک اپنے ہاں دوسرے لوگوں کا رزق بھی زبردستی یا چالاکی سے جمع کر لیتے ہیں اور غریبوں کو بھوکا مارتے ہیں۔ مزدوروں کے ہاں فاقے ٹوٹتے ہیں اور امرا کے ہاں فالتو رزق معطل اور جمع رہتا ہے رعایا مرتی ہے اور ڈکٹیٹر گول یا دو دارا سلسلہ میں اس کا رزق ضائع کرتے پھرتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اہل دنیا کے لئے رزق کی کمی ہو۔ رزق موجود ہوتا ہے۔ مگر ناصبوں کے خزانوں میں سو رزق دینے والے پر جو مجموعی طور پر تمام دنیا کے ایک ایک فرد کے لئے رزق نازل کرتا ہے۔ کوئی حرف نہیں آسکتا۔ اس نے تو وہ رزق اپنے زمینی خلفاء کو دے دیا کہ اسے تمام مخلوق پر تقسیم کر دیں۔ اب وہ بدنظمی ہی دبا بیٹھیں تو کس کا قصور۔ یہی وہ لڑائی ہے جو آج کل سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان ہو رہی ہے اور اسی کے حد فیصلہ پر اہل دنیا کی آئندہ راحتیں

منحصر ہیں۔ جو بے کاری اور فاقہ مستی آج کل ہے وہ اگلے زمانوں میں نہ تھی۔ کیونکہ کثرت حصہ آبادی کا آپس میں لڑ بھڑ کر اور بیماریوں کی وجہ سے مر جاتا تھا۔ اور آج کل کی نسبت آبادی کم تھی۔ ضروریات بھی کم تھیں۔ زندگی سادہ تھی۔ قناعت تھی۔ امن اور خوشحالی، ایجادات اور علوم کے ساتھ ساتھ گو بہت سے فوائد ملے۔ مگر بہت سے آرام رخصت بھی ہو گئے۔ (الفضل ۲۲ فروری ۱۹۳۹ء)

۳۸۷ - قرآن مجید کا قابلِ حفظ حصہ

ایک حصہ کلام الٰہی کا ہر شخص کو حفظ ہونا چاہیئے تاکہ نمازوں میں سہولت ہو اور بعض ضروریات پوری ہوں۔ جو دوست ہمت رکھتے ہوں۔ ان کے لئے فہرست لکھی جاتی ہے۔

آخری سپارہ کا پچھلا نصف۔ سورۂ اعلیٰ اور غاشیہ جمعہ کی نماز کے لئے الم سجدہ اور دہر جمعہ کی صبح کے لئے ملک، صف اور جمعہ۔ اسی طرح سارا یٰسین جو خصوصاً عورتوں کو یاد ہونی چاہیئے۔ تاکہ موت فوت کے وقت باہر سے حافظ یا مولوی ڈھونڈنے نہ پڑیں۔ احزاب۔ منافقون۔ فتح۔ فرقان۔ حشر اور تحریم کے آخری رکوع۔ آیت استخلاف، آیت الکرسی آیت النور۔ سورۂ کہف کا پہلا اور آخری رکوع۔ سورۂ بنی اسرائیل تیسرا و چوتھا رکوع۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کی دعائیں۔

۳۸۸ - مجبوری سختی

وَلَا تُجَادِلُوٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ (عنکبوت ۴۷)

ترجمہ: اور اہل کتاب سے کبھی بحث نہ کرو مگر اعلیٰ اور مضبوط دلیل کے ساتھ۔ سوائے اُن لوگوں کے جو اُن میں سے ظلم کرنے والے ہوں۔

اس اِلَّا الَّذِیْنَ والے استثنا کے ماتحت حضرت مسیح موعود آپ پر سلامتی ہو نے وہی جوابات یسوع کے بارے میں عیسائیوں کو دیئے اور اس وقت دیئے جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین میں حد سے گزر گئے۔

۳۸۹۔ روح اور نفس

قرآن مجید میں کوئی بیس دفعہ روح کا لفظ آیا ہے اور ہر جگہ اس کے معنی کلام الٰہی یا کلام الٰہی لانے والے فرشتے کے ہیں۔ جس چیز کو ہم لوگ جان کہتے ہیں اس کے لئے قرآن میں ہمیشہ نفس کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس فرق کو ذہن نشین رکھنا چاہیئے۔

وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (بنی اسرائیل: ۸۶)

ترجمہ: اور تمہیں (اس کے متعلق) علم سے کم ہی حصہ دیا گیا ہے۔

اور عالم امر سے ہونا کلام الٰہی کی خاصیت ہے۔ ورنہ نفس تو عالم خلق میں سے ہے اور اس کے متعلق دُنیا میں بہت سا علم موجود ہے۔ علم تزکیہ نفس اور علم النفس اسی علم کی شاخیں ہیں۔

۳۹۰۔ آسمان سے گرنا

ایک صاحب اعتراض کرتے ہیں کہ:

وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰهِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (الحج: ۳۲)

یعنی جس نے شرک کیا وہ گویا آسمان سے گر پڑا۔ بھلا یہ کیا دلیل ہے؟ حالانکہ یہ نہایت لطیف دلیل ہے۔ مشرک خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ تو خود ہی ہو گیا جب خدا کا خلیفہ اور اس عالم کے ساکنین پر حاکم اور ان سے افضل ہو کر پھر خود ہی ان زمینی چیزوں کو پوجنے لگ گیا۔ خدا نے تو اُسے آسمان پر بٹھایا تھا اور اپنا بندہ بنایا تھا لیکن وہ زمینی چیزوں کی

پرستش کرکے کہیں آسمان سے گر کر زمین پر آ پڑا۔

۳۹۱ - منافق کی ایک پہچان

منافقین کی کئی پہچانیں قرآن و حدیث میں آئی ہیں۔ ایک ان میں سے یہ ہے
اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ (التوبہ: ۶۷)

یعنی منافق ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔ اگر ایک آدمی کا نفاق ظاہر ہو تو جو اس سے بکثرت اور مخلصانہ طور پر ملے گا۔ اور تعلقات قائم رکھے گا وہ بھی منافق ہے (اسی طرح مومنوں سے تمسخر کرنے والے۔ بہت قسمیں کھانے والے ہر وقت شکوک و شبہات میں مبتلا رہنے والے)۔

۳۹۲ - سچ مچ کی وحی

اِذْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّكَ مَا یُوْحٰۤى (طٰہٰ: ۳۹)

جب ہم نے تیری ماں کی طرف وحی نازل کی۔ "مَا یُوْحٰى" یعنی سچ مچ کی وحی، یعنی یہ نہیں کہ ان کو خیال آیا بلکہ رویاء یا کشف میں سارا نقشہ دریا میں پھینکنے کا۔ محفوظ طور کرا نبانے کا بہن کا کنارہ کنارہ ساتھ جانے کا اور دھونڈوں کے پاس بچہ کے پہنچ جانے کا۔ اور ساتھ ہی لفظی الہام کا یہ کام اس وقت کر ناجب راز فاش ہونے لگے۔ اور ہم پھر اس کو تیرے ہی پاس واپس لے آئیں گے۔ وغیرہ۔ یہ ہم نے تیری ماں کو بتایا تھا۔ تیری ماں کی عقل اور تجویز اور خیال کا اس میں دخل نہیں۔ بلکہ اُسے وحی ہوا تھا جسے وحی کہا جاتا ہے

۲۹۳ - خیرِ اُمم

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: ۱۱۰)

ترجمہ: تم (سب سے) بہتر جماعت ہو جسے لوگوں کے (فائدہ) کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

اس آیت میں اُمّتِ محمدیہ کو بہترین اُمّت کہا گیا ہے۔ لیکن برخلاف اس کے ان کا اپنا خیال بمقابلہ بنی اسرائیل کے یہ ہے کہ جب خاتم النبیینؐ دنیا میں تشریف لائے تو بنی اسرائیل نے کہا کہ ہم اسے نہیں مانیں گے کیونکہ یہ ہم میں نہیں پیدا ہُوا۔ لیکن مسلمانوں نے مسیح موعود کو جب دیکھا تو کہا۔ کہ ہم اسے نہیں مانیں گے۔ اس لئے کہ یہ ہم میں کیوں پیدا ہُوا۔ تجاسرائیل میں کیوں پیدا نہیں ہُوا ؎

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

ادھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (آل عمران: ۱۶۵)

ترجمہ: اللہ نے مومنوں میں سے ایک ایسا رسول بھیج کر جو انہیں اس کے نشان پڑھ کر سناتا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے کتنا بڑا احسان مسلمانوں پر کیا۔ کہ ان میں سے ایک کو نبی بنا دیا۔ مگر آج کل کے مسلمان ہیں کہ ان کے اس بجائے شکر احسان کے ایک ماتم پڑا ہُوا ہے کہ ہم میں سے نبی کیونکر بن سکتا ہے۔ یہ تو صرف بنی اسرائیل کی شان ہے کہ ان میں ان کا نبی ہو اور ناحق اصلاح کرے۔ ہم میں سے صرف بُرے بن سکتے ہیں۔ لیکن نیک کوئی پیدا نہیں ہو سکتا۔

۲۹۴ ۔ سورتوں میں ربط

سورتوں کی ترتیب میں مضمون کے ربط کا بڑا دخل ہے۔ اور قرآن مجید کی ہر سورت اپنی ماقبل اور مابعد سورت سے مضامین کے لحاظ سے تعلق رکھتی ہے۔ نمایاں نمونے کے طور پر بقرہ اور آل عمران، اخلاص، الفلق اور الناس، کافرون اور نصر۔ اسی طرح بنی اسرائیل، کہف اور مریم۔ علاوہ مضامین کے بعض دفعہ ربط اور طرح بھی ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ قمر اور رحمٰن میں جو متصل سورتیں ہیں۔ یہ بات خاص ہے۔ کہ دونوں میں بار بار اور مکرر آنے والی آیت موجود ہے ایک میں

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ (القمر: ۱۷)

ترجمہ: ہم نے قرآن کو عمل کے لیے آسان بنایا ہے۔ پس کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے ؟

دوسری میں فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (الرحمٰن)

ترجمہ: سو بتاؤ تو سہی کہ تم دونوں (جن وانس) اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے۔

۳۔ اسی طرح بعض خاص قصے یا نام پاس پاس والی سورتوں میں ملتے ہیں۔ جیسے قارون کا ذکر کہ قرآن مجید میں سورۂ قصص اور اس سے اگلی سورۂ عنکبوت میں آتا ہے۔ اور دونوں سورتیں متصل ہیں۔

۴ چوتھی وجہ ترتیب کی سورتوں کی لمبائی یا سائز ہے۔ قرآن مجید شروع ہوتا ہے لمبی اور آسان سورتوں سے اور رفتہ رفتہ ختم ہوتا ہے۔ چھوٹی اور مشکل سورتوں پر۔ کیونکہ کسی کتاب کے شروع کا حصہ مبتدی کے لئے ہمیشہ آسان ہونا چاہیئے۔ اور آخری حصہ اس کے علم کے ساتھ ساتھ زیادہ مشکل ہونا چاہیئے۔

۵. پانچویں وجہ ترتیب سورۃ کی یہ ہے کہ شروع میں وہ حصہ قرآن ہے۔ جو زیادہ تر قرونِ اولیٰ کے لئے تھا۔ اور آخر کا وہ حصہ ہے جو آخری زمانہ کے متعلق ہے۔

۶. چھٹے یہ کہ ابتدائی سورتیں احکام وغیرہ کی حامل ہیں۔ اور پچھلے حصہ کی پیشگوئیوں وغیرہ کی۔

۷. ساتویں عموماً ایک قسم کے مقطعات والی سورتیں پاس پاس ہیں۔ مثلاً الٓمّٓ والی سورتیں۔ بقرہ اور آلِ عمران ساتھ ساتھ ہیں۔ اور عنکبوت، روم، لقمان، سجدہ دوسری جگہ جمع ہیں۔ اور الٓرٰ والی سورتیں سب ایک جگہ ہیں۔ جیسے یونس، ہود، یوسف، ابراہیم اور حجر۔ علیٰ ہٰذا القیاس طٰسٓ اور طٰسٓمّٓ والی تین سورتیں شعراء، نمل اور قصص اور حٰمٓ والی سات سورتیں سب اکٹھی ایک جگہ جمع ہیں۔ یعنی مومن، سجدہ، شوریٰ، زخرف، دخان جاثیہ اور احقاف۔

۸. آٹھویں یہ کہ عموماً جو مضمون ایک سورۃ کے آخر میں ہوتا ہے۔ اگلی سورۃ میں وہی مضمون شروع ہو جاتا ہے۔ مثلاً القیٰمۃ کا آخر اور دہر کا شروع یا واقعہ کا آخر

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (الواقعہ: ۹۷)

ترجمہ: پس تُو اپنے عظمت والے رب کے نام کے ذریعہ سے تسبیح کر

اور حدید کا شروع سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ (الحدید: ۲)

ترجمہ: آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا کی تسبیح کر رہا ہے۔

یا طور جو فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ (الطور: ۵۰)

ترجمہ: اس (خدا) کی تسبیح کر اور جب ستارے پیٹھ پھیر لیں (یعنی رات ختم ہونے والی ہو) تب بھی

پر ختم ہوتی ہے۔ اور نجم جو وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۙ (النجم: ۲)

ترجمہ: میں ثریا ستارہ کو جب وہ معنوی طور پر نیچے آجائے گا اس اَمر کی شہادت کے لیے پیش کرتا ہوں۔

سے شروع ہوتی ہے۔ یہ تعلق کئی جگہ ظاہر اور صاف ہے۔ اور کئی جگہ مخفی۔
یہاں صرف تین مثالیں دے دی گئی ہیں۔

۲۹۵۔ کامل یقین صرف الہام سے پیدا ہوتا ہے

قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۝ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى (الشعراء ۶۲ تا ۶۴)

ترجمہ: موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا، ہم تو پکڑے گئے۔
(موسیٰ نے) جواب دیا، ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔ میرا رب میرے ساتھ ہے
اور وہ مجھے کامیابی کا راستہ دکھائے گا۔
تب ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی

جب بنی اسرائیل مصر سے بھاگے۔ تو سمندر کے کنارے آکر رک گئے۔ راستہ آگے صاف نہ تھا۔ اسی وقت پیچھے سے فرعون بھی بمع لشکر قریب آپہنچا۔ بنی اسرائیل کہنے لگے۔ کہ اب ہم پکڑے گئے۔ موسیٰ نے کہا ہرگز نہیں۔ میرے ساتھ میرا رب ہے جو ضرور مجھے خلاصی کی راہ دکھائے گا۔ پس خدا نے موسیٰ کی طرف وحی کی۔ کہ سونٹا مار اور اس خشک راستہ پر چلا جا۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ کامل یقین صرف خدا کی وحی اور الہام سے پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ انسان شکوک و شبہات میں ہی گرفتار رہتا ہے۔ اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا لیکن جب خدا کے الفاظ سنتا ہے پھر ان کے ساتھ جو سکینت اور اطمینانِ قلب نازل ہوتا ہے اُسے محسوس کرتا ہے۔ پھر مصیبت سے رہائی پاتا ہے پیشگوئی کو پوری ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور نصرت و امداد الٰہی اپنے شاملِ حال دیکھتا ہے۔ تو پھر کامل یقین اسے ملتا ہے جو اور کسی طرح سے ملنا ممکن نہیں۔ ہاں یہ ضروری نہیں۔ کہ خود ہی سب باتیں حاصل کرے۔ نبی کی معرفت بھی جو باتیں چشم دید طور پر حاصل ہو جاتی ہیں۔ وہ ویسے ہی یقین کو مضبوط کرتی ہیں۔ جیسے کہ

گویا ساری واردات خود اپنے پر گزری ہو۔

سمندر کے پار گزرنے پر جیسا موسیٰ کا ایمان خدا تعالیٰ کی تائید و نصرت اور اس کی پیشگوئی پورا ہونے پر بڑھا۔ اسی طرح بنی اسرائیل کا یقین بھی زیادہ ہوا۔ بقول میرے ایک بزرگ دوست کے موسیٰ نے ایک واسطہ سے وہ خدائی الہام سُنا تھا۔ (یعنی جبرائیل کے واسطے سے) اور بنی اسرائیل نے دو واسطوں کے ذریعہ سے یعنی جبرئیل اور موسیٰ کے واسطے سے وہ الہام سُنا تھا۔ پھر دونوں نے اسے پورا ہوتے دیکھ لیا۔ اس لئے دونوں کا یقین اور ایمان اور عرفان یکساں ہی بڑھا۔ ایک واسطہ کم و بیش ہونے سے اتنا کیا فرق پڑتا ہے۔ حضرت مسیح موعود آپ پر سلامتی ہو جب الہام سنتے تھے اور حاضرین وقت سے پہلے اُسے سنتے تھے تو حضور کا صرف ایک واسطہ ہوتا تھا۔ اور ہمارے دو واسطے پھر اس پیشگوئی کا انتظار کرتے۔ جب پوری ہو جاتی۔ تو حضور کے ساتھ جماعت کو بھی وہی یقین اور ایمان حاصل ہوتا تھا۔ گویا نبی کے زمانہ میں خدا صرف نبی سے ہی کلام نہیں کرتا۔ اس کی جماعت بھی برابر کی شریک ہوتی ہے۔ نبی فرشتہ کے واسطے سے وہ کلام حاصل کرتا ہے۔ اور جماعت دو واسطوں سے یعنی فرشتے اور رسول دونوں کے واسطے سے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کے زمانہ کے لوگوں کے ایمان نہایت مضبوط ہوتے ہیں۔

۲۹۶۔ یتیموں کے مال کی حساب فہمی

فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَیْهِمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِیْبًا (النساء:۷)

ترجمہ:۔ پھر جب تم انھیں ان کے مال واپس دو تو اُن (یتامیٰ) کے روبرو گواہ مقرر کرو اور اللہ حساب لینے کے لحاظ سے (اکیلا) کافی ہے

اس سے یہ مراد ہے کہ جب یتیم کا مال اُسے واپس کرنے لگو۔ تو تمام حساب کتاب

لہٰذا اول تا آخر گواہوں کے روبرو سمجھا کر اس کی باقی امانت واپس کرو۔ یہ کافی نہیں۔ کہ گواہوں کے سامنے صرف اتنا کہہ دو کہ جائیو گواہ رہنا کہ یہ دو ہزار روپیہ میں اس کا واپس دیتا ہوں بلکہ یوں چاہیئے کہ دیکھو اتنا اصل زر تھا۔ اتنا روپیہ اس کے کھانے کپڑے تعلیم وغیرہ پر خرچ ہوا اس کاپی میں اس کا مفصل حساب ہے۔ اسے دیکھ لو۔ اب اتنا روپیہ باقی ہے۔ اور یہ حوالہ کیاجاتا ہے۔

غرض سادی حساب فہمی مراد ہے جس کا استدلال وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا سے ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا قیامت میں جب کسی کا حساب لے گا۔ تو وہاں پائی پائی کا حساب ہوگا۔ نہ صرف منہ سے دو حرف کہہ دینے کا۔

۹۷ - تعزیرات کے اصول

قرآن مجید نے حدود کے تین اصول بیان کئے ہیں۔

۱- سزا ۲- عبرت ۳- اصلاح یعنی آئندہ کا انسداد

۱- اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا

۲- نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ (المائدہ ۳۹)

۳- فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (المائدہ ۴۰)

یعنی چور کا ہاتھ کاٹو تاکہ اس کے لئے سزا ہو۔ اور دوسروں کو عبرت ہو۔ اور وہ کٹا ہوا ہاتھ دیکھ کر آئندہ چوری سے توبہ کرے۔ اور اپنی اصلاح کرے۔ اس اصلاح کے لئے پھر اخلاقی پہلو اُمید کا یہ پیش کیا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ ڈیڑھ سطر کی مختصر آیت میں حدود اور سزا کے اصول کا خلاصہ نکال کر رکھ دیا ہے۔

۲۹۸ - جان کے بدلے جان

آج کل جو لوگ پھانسی کی سزا کو منسوخ کرنے کے درپے ہو رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ایک زندگی تو گئی تھی۔ دوسری کو عدالت ختم کرتی ہے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ قاتل زندہ رہے۔ زیادہ سے زیادہ جیل خانہ کی چار دیواری میں بند رہے اور اس کے لئے ذلت اور دل کڑھنے کی سزا کافی ہے۔ قرآن مجید نے اس کا جواب دیا ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ (البقرہ ۱۸۰)

ترجمہ: اور اے عقلمندو! تمہارے لیے (اس) بدلہ لینے میں زندگی (کا سامان) ہے

اے عقل والو بے وقوفی سے یہ خیال نہ کرو۔ کہ ایک قاتل کو قتل کر دینا ایک جان کو کم کر دینا ہے بلکہ اس سزا میں دُنیا کی زندگی ہے۔ ورنہ ایک آدمی نہیں۔ بلکہ ساری سوسائٹی کی جان خطرہ میں پڑ جائے گی۔ وہ شخص بے باک ہو کر اور قتل کرے گا۔ اور دوسرے لوگ بھی قتل کرنے پر دلیر ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں۔ اگر جیل کی چار دیواری میں بھی بند رہے۔ تو جب قاتل کو یقین ہو گا کہ مجھے قتل کی سزا قتل کبھی نہیں ملے گی۔ تو جیل کے اندر وہ ذرا ذرا سی بات پر جیل کے منتظمین اور سپاہیوں کو قتل کرے گا۔ کسی اور قیدی سے لڑے گا۔ تو اسے جان سے مار دے گا۔ غرض اس سے وہاں بھی کسی کو امن نہ ہو گا۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ اس ملک میں جو قاتل لوگ عدالتوں کی گرفت سے بچ کر آ جاتے ہیں۔ وہ زیادہ دلیر اور بے باک ہو جاتے ہیں۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اور سُنا جاتا ہے کہ فلاں نے اتنے خون کئے ہیں۔ اور فلاں نے اتنے۔ دل کڑھنے کی سزا بھی عجیب ہے۔ قتل سفاکی اور گناہ سے دل زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ یا نرم۔

یکساں ہوتے سا ختلف خدا تعالیٰ کی طاقت کبریائی اور دانائی کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر اختلاف نہ ہوتا تو کوئی کام دُنیا کا نہ ہو سکتا۔ ہاں البتہ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ محاسبہ ہر شخص کا الگ الگ ہوگا جو ایک بادشاہ کی جواب دہی ہوگی۔ وہ ملازم کی نہ ہوگی۔ جو ایک عقلمند کی ہو گی۔ وہ بیوقوف کی نہ ہوگی۔ جو مرسل کی ہوگی۔ وہ اُمت کی نہ ہوگی جہاں کوئی علم نہیں پہنچا۔ وہاں صرف موٹی توحید کی ہوگی۔ کیونکہ دُنیا میں کوئی قوم نہیں۔ جہاں خدا کا ہونا اور ایک ہونا نہ پہنچ چکا ہو۔

اختلاف اور جبر دو چیزیں ہیں۔ جہاں خدا تعالیٰ نے خود اختلاف رکھا ہے۔ وہ بے شک جبر ہے۔ وہاں اس اختلاف کی پرسش نہ ہوگی۔ مگر جہاں اختیار دیا ہے جبر نہیں کیا۔ وہاں شریعت حکم ہے اور وہاں پرسش ہوگی۔ پس جو اختلاف خدا کی طرف سے جبری ہے۔ اس میں جبر یہ نہیں۔ بلکہ انسان کی مرضی سے پیدا ہوا ہے۔ اس کی جزا سزا ظلم نہیں۔ کیونکہ انسان صاحب ارادہ ہستی ہے۔ جو اختلاف جبری ہے۔ وہ کام چلنے کو ہے۔ نتیجہ تناسخ نہیں۔ جو اختیاری ہے۔ اس پر شریعت حاوی ہے کیونکہ انسان اسے خود پیدا کرتا ہے اور نتیجہ پاتا ہے۔ ان دونوں اختلافات کے ملا دینے اور گڈمڈ کر دینے سے تناسخ یا مسئلہ جبر (بلکہ وحدت وجود) پیدا ہوا ہے۔ یہ دوسرا اختلاف انسان ہی سے مخصوص ہے۔ کیونکہ اور سب مخلوقات مجبور ہیں۔ حتیٰ کہ ملائکہ تک بھی صرف انسان ہی ہے جو اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ہے۔ اس لئے نعمت بھی اسی کے لئے ہے۔ باقی سب مخلوقات پر رحمت ہے انعام نہیں ہے۔ اسی طرح سزا بھی اسی کے لئے مخصوص ہے۔

۴۰۰۔ مسیح موعود کی وحی سے قرآن کی تفسیر

بعض وحی حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی قرآن کی تفسیر ہوتی ہے۔ مثلاً
لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (الفتح: ۳)

ترجمہ: اللہ تیرے متعلق کئے گئے وہ گناہ بھی جو پہلے
گذر چکے ہیں ڈھانک دے گا اور جو اب تک ہوئے نہیں (لیکن آئندہ ہونے
کا امکان ہے) اُن کو بھی ڈھانک دے گا۔

کی تفسیر الہام ہے۔ لا نبقی لک من المخزیات ذکرا۔ پس یہاں ذنب
کے معنی مخزیات کے ہیں۔ یعنی وہ الزامات جو دشمن تجھ پر لگاتے ہیں۔

۲۰۱۔ مناسب اور مطابق سزا

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ
اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ (البقرہ: ۸۵)

ترجمہ: اور اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم
(آپس میں) اپنے خون نہ بہاؤ گے اور اپنے آپ کو (یعنی اپنی قوم کے لوگوں
کو) اپنے گھروں سے نہ نکالو گے (البقرہ: ۸۵)

یعنی اے بنی اسرائیل ہم نے تجھ سے عہد لیا تھا کہ اپنے لوگوں کو قتل نہ کرنا نہ اُن کو جلا وطن
کرنا مگر نتیجہ کیا ہوا۔

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا
مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ (البقرہ: ۸۶)

ترجمہ: پھر تم لوگ ہی ہو کر (اس عہد کے باوجود) آپس میں ایک دوسرے
کو قتل کرتے ہو اور اپنے میں سے ایک جماعت کو گناہ اور ظلم کے ساتھ
(اُن کے دشمنوں کی) مدد کرتے ہوئے اُن کے گھروں سے نکالتے ہو۔

باوجود اس عہد کے تم اپنے لوگوں کو قتل بھی کرتے رہے اور جلا وطن بھی تو اس کی سزا۔

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ

الدُّنْيَا ۚ (البقرۃ، ۸۶)

ترجمہ: پس تم میں سے جو ایسا کرتے ہیں اُن کی سزا اِس (جہاں کی) زندگی (ہی) میں رسوائی (اُٹھانے) کے سوا اور کیا ہے (جو انہیں ملے گی)

یعنی ویسی ہی سزائیں اب اس رسول کے ہاتھوں تمہیں ملیں گی تم بھی قتل کئے جاؤ گے۔ اور جلا وطن کئے جاؤ گے۔ چنانچہ بنی قریظہ اور بنی نضیر میں سے اول الذکر قتل کر دیئے گئے اور آخر الذکر کو جلا وطن کر دیا گیا۔

۲۰۲ - دائمی اور غیر مکدر خوشی

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۚ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (قصص، ۶۱)

ترجمہ: اور جو کچھ تمہیں دیا جاتا ہے وہ تو صرف ورلی زندگی کا سامان ہے اور اس کی زینت ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ کیا تم عقل نہیں کرتے۔

یعنی دنیا اور آخرت کی نعمتوں میں یہ فرق ہے کہ دنیا کی نعمتیں زیادہ سے زیادہ دنیا کی زندگی تک ہیں اور آخرت سراسر خیر اور ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے۔ پس عقل کا تقاضا یہ ہے کہ آخرت کو اختیار کیا جائے۔ ہمارے پیر منظور محمد صاحب خیر کے معنے غیر مکدر کیا کرتے ہیں اور ابقیٰ کے معنی دائمی دنیا کی جو لذت نعمت اور خوشی ہے وہ اپنے اندر ہمیشہ کدورتیں رکھتی ہے اور فانی ہوتی ہے۔ بس یہ فرق ہے دُنیا اور آخرت میں پس کیوں عقلمند مومن اس چیز کو ترک نہ کرے جو دائمی اور غیر مکدر ہے۔

۴۰۳۔ بعض سورتوں کے نام

سورتوں کے نام لوگوں کے رکھے ہوئے ہیں اور مشہور ہیں۔ بعض دفعہ مصری نجوم الفرقان دیکھتے ہوئے یہ دقت ہوتی ہے کہ ہندوستان کے چھپے ہوئے قرآنوں میں بعض سورتوں کا پتہ نہیں چلتا۔ ہمارے ہاں جس سورت کا نام بنی اسرائیل ہے۔ وہاں اُس سورۃ کا نام صرف اسرائیل لکھا ہوتا ہے۔ اسی طرح فاطر کی جگہ ملائکہ۔ حٰم سجدہ کی فُصّلت۔ محمد کی جگہ قتال اور دہر کی جگہ انسان لکھا جاتا ہے۔ اس فرق کو یاد رکھنا چاہیئے۔ ورنہ بعض وقت مشکل پیش آتی ہے۔

۴۰۴۔ داڑھی کا فائدہ

داڑھی رکھنے کا حکم حدیث شریف میں تو صاف ہے۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے بھی ایسا ہی فرمایا ہے۔ حضور کے دو خلفاء کی لمبی داڑھیاں ہم میں سے ہر ایک نے دیکھی ہیں۔ غرض ابتداء سے داڑھی رکھنا انبیاء کی سُنت میں داخل ہے۔ اور یہ بھی سنت ہے کہ داڑھی بڑی ہو چھوٹی نہ ہو۔ قرآن میں آتا ہے کہ یَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي (طٰہٰ: ۹۵) ہارون کہتے ہیں کہ اے میرے بھائی موسیٰ میری داڑھی نہ پکڑ۔ اس قصور کا سارا الزام مجھ پر نہیں ہے۔ اس سے نہ صرف داڑھی کی موجودگی ایک گزشتہ نبی کے لئے ثابت ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ وہ اتنی لمبی تھی کہ مٹھی میں آ سکے۔ حضرت مسیح موعود نے بھی فرمایا ہے کہ داڑھی ایک مٹھی بھر لمبی ہونی چاہیئے۔ یہ جو آج کل ہمارے نوجوان داڑھیاں رکھتے ہیں ان کو مٹھی میں لینا کیا معنے۔ یہ تو خورد بین سے بھی بمشکل نظر آتی ہیں۔ ہاں ہاتھ پھیرو تو معلوم ہوتا ہے کہ داڑھی ہو گھنڈ سے زیادہ کی مُنڈی ہوئی ہے اور بس۔ پس یہ تو مسئلہ کا مذاق بنانا ہے میرے نزدیک آج کل کسی کا بجیٹ نوجوان کا نمایاں داڑھی رکھنا واقعی ایک ایسا مجاہدہ ہے

جو موت کے برابر ہے۔ اس لئے داڑھی رکھنے کا موجودہ زمانہ میں بے انتہا ثواب ہے اور اس میں جہدِ نفس کشی ہے۔ اور ایسے شخص کی نسبت یقین ہوتا ہے کہ اسے اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سچا عشق ہے۔ اور دجال سے کامل نفرت ہے۔

ایک فائدہ داڑھی کا یہ ہے کہ وہ تمیز ہے مرد اور عورت کے درمیان اور اس کا مکمل شعار اسلام ہے اور باعث خوشنودی اللہ تعالےٰ کی۔ اور وہ رعب ہے مرد کے چہرے کا۔ خدا نے مرد کو رعب اور طاقت کا مظہر بنایا ہے۔ اور عورت کو حسن اور نزاکت کا پس تعجب ہے مرد پر اگر وہ اپنی خوبی چھوڑ کر دوسری جنس کی خوبی اختیار کرے۔ جو اس کے لئے نقصان دہ ہے۔ بڑھاپے میں جب عورت کے دانت نکل جائیں تو اس کی جلدی کے رخسار پچک جاتے ہیں۔ جھریاں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ ٹھوڑی ناک سے جا لگتی ہے اور شکل نہایت بدصورت ہو جاتی ہے۔ مگر بڈھے مرد کے سب عیب اس کی داڑھی چھپا لیتی ہے۔ اور باوجود عمر رسیدہ ہونے کے اس کی شکل نہیں بگڑتی۔ کیونکہ داڑھی کے ہونے کی وجہ سے ان عیبوں میں سے کوئی عیب نظر نہیں آتا۔ مگر جو ساری جوانی داڑھی منڈاتا رہتا ہے۔ اس کے لئے بڑھاپے میں داڑھی کا رکھنا سخت مشکل ہے۔

۲۰۵۔ آدم کی اصل خلافت علم کی ہے

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (البقرہ: ۳۱)

ترجمہ: کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

یہاں خدا تعالیٰ نے آدم کو خلیفہ کہا یعنی زمین میں خدا کا جانشین اور دوسری جگہ

اس سے معلوم ہوا کہ وہ خلیفہ بنے خدا کے علم میں۔ اب خدا تعالیٰ کی صفات کو دیکھو کہ وہ علم پر ہی ختم ہوتی ہیں۔ مثلاً سمع بصر وغیرہ سب علم کا ہی ذریعہ ہیں۔ رہی قدرت وہ خود علم کامل کا نتیجہ ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ علم کامل ہی اصل اور سب صفات کو اپنے اندر لینے والی صفت ہے۔ جو اس صفت میں خلیفہ ہوا وہی اصل خلیفہ ہے اللہ تعالیٰ کا۔ اور پھر لازماً اس میں باقی سب صفات بھی ہوں گی۔

۴۰۶۔ موت کی آرزو

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (الجمعہ : ۷)

اے اہل کتاب اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو۔ سوال یہ ہے کہ اس تمنا سے کیا مراد ہے۔ دوسری جگہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مطلب جنگ میں خدا کے لئے لڑنا اور مارا جانا ہے۔ یعنی جانی قربانی۔ چنانچہ فرمایا:

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوْهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (آل عمران : ۱۴۴)

ترجمہ: اور تم (لوگ تو) اس موت کی خواہش اس کے وقت سے بھی پہلے کیا کرتے تھے۔ سو (اب) تم نے اُسے اس حالت میں دیکھ لیا ہے کہ اس کا سب جستی و تیغ تم پر ظاہر ہو گیا ہے (پھر اب بعض کیوں گریز کر رہے ہیں ؟)

یہ مسلمانوں کو خطاب ہے کہ جہاد فرض ہونے سے پہلے تم لڑ کر مر جانے اور خدا کی راہ میں قربان ہو جانے کی خواہش رکھتے تھے۔ اب کیوں ڈرتے اور پیچھے ہٹتے ہو۔

اسی طرح جب یہود کو فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ کہا تو اس سے مراد یہ ہے کہ تم بھی جان ہتھیلیوں پر رکھ کر جنگ میں ہمارے مقابلہ پر نکلو۔ اگر سچے ہو اور اپنے تئیں سچا سمجھتے ہو اور

یہ یقین رکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد پر ہے جنگ کے نتیجے سے ہی فیصلہ ہو جائے گا کہ خدا کس طرف ہے۔ موجودہ زمانہ میں چونکہ دُعائے مباہلہ سے فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ کا حکم پیدا ہوتا ہے اور تلوار والی جنگ بند ہے۔ اس لئے حضرت مسیح موعود آپ پر سلامتی ہو نے مباہلہ کا طریقہ اپنایا اور علماء کو بلایا کہ اگر کچھ ہمت ہے تو میرے بالمقابل مباہلہ کے میدانِ جنگ میں مرنے کے لئے نکلو۔

۴۰۷۔ اہل کتاب کا کھانا

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
حِلٌّ لَّكُمْ ۖ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ (المائدہ : ۶)

آج کے دن تمہارے لئے سب پاکیزہ چیزیں حلال کی گئیں۔ اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے۔ اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ۔

۱۔ اہل کتاب اگر شراب اور سور کھلائیں۔ تو کیا وہ جائز ہے ؟

۲۔ تمہارا کھانا تمہارے لئے تو حلال ہو سکتا ہے۔ مگر اہل کتاب کے لئے کیونکر حلال ہوا؛ کیا وہ اسلامی شریعت کے ماتحت ہیں۔ جو ان پر حکم چلایا گیا۔

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ ساری آیت پڑھو وہ اس طرح شروع ہوتی ہے۔ کہ تمہارے لئے صرف پاک چیزیں حلال ہیں۔ جو چیزیں شریعت نے ناپاک قرار دی ہیں۔ اور ان کو حرام کر دیا ہے۔ وہ اگر اہل کتاب پیش کریں تو نا جائز ہیں۔ ہاں طیبات پیش کریں تو ان کے ہاں کھا لیا کرو۔ غرض پہلے حصہ کے حکم کے ماتحت دوسرا حصہ آیت کا چلے گا اور بشرط طیبات ان کے ہاں کا کھانا تمہارے لئے جائز ہوگا۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ اہل کتاب کو پلیدا و نجس سمجھ کر کہیں تم ان کو دعوت میں بُلانے سے یا غریب کو صدقہ کے طور پر کھانا دینے سے یا اگر

وہ بھوکا ہو اور تم سے کھانا مانگے تو کھانا کھلانے سے انکار نہ کرنا۔ کیونکہ تمہارا کھانا اس کے لئے جائز ہے۔ اگر وہ غربت یا بے تکلفی یا دوستی کی وجہ سے کھانا چاہے تو اس سے کراہت نہ کرنا اور یہ نہ کہنا کہ تو نجس ہے۔ ہمارا کھانا تجھے مل نہیں سکتا۔ بلکہ خدا نے تمہارا کھانا ان کے لئے جائز کر دیا ہے۔ اگر وہ کھانا چاہے۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میرا کھانا طیب ہے۔ میں کیوں اسے ایک کافر کے پیٹ میں جانے دوں۔ (الفضل ۷ مارچ ۱۹۲۹ء)

۴۰۸ - کہنا اور کرنا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (الصف: ۳)

اے مومنو تم کیوں کہتے ہو وہ جو تم نہیں کرتے۔ اس کے یہ معنی کہ جو نیکی آدمی خود نہ کرے اُسے دوسروں کو بھی نہ کہے۔ بالکل غلط ہے۔ اس طرح تو دنیا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ ہی بند ہو جائے۔ بعض لوگ بعض لاچاریوں یا بیماریوں یا اور وجوہات سے بعض نیکیاں نہیں کر سکتے۔ مثلاً ایک غریب مولوی اگر صدقہ اور زکوٰۃ خود نہیں دیتا تو کیا وہ کسی اور مالدار کو بھی نہ کہے کہ تو زکوٰۃ دیا کر۔ اس طرح تو قوم میں سے آہستہ آہستہ سب نیکیاں رخصت ہو جائیں گی۔ حالانکہ دوسرے کو نیکی کا حکم کرنے سے خود انسان کو اپنے نفس سب سے پہلے نصیحت حاصل ہوتی ہے اور اپنی سُستی کو دُور کرنے کا سب سے بہتر یہی طریقہ ہے کہ جس عمل میں سُست ہو یا نہ کرتا ہو اسی کے متعلق امر بالمعروف کیا کرے۔ پس اگر یہ صحیح ہے تو پھر اس آیت کے معنی کیا ہوئے؟ سو مطلب اس کا یہ ہے کہ یہاں تقولون سے امر بالمعروف مراد نہیں ہے بلکہ دعویٰ ہے۔ یعنی تم ایسے اعمال کا دعویٰ نہ کرو جو تم نہ کرتے ہو۔ مثلاً یہ سخت گناہ کی بات ہے کہ ایک آدمی جھوٹ بولتا ہو مگر دعوےٰ یہ کرتا ہو کہ میرے جیسا راست گو کوئی نہیں یا بزدل ہو مگر ہر مجلس میں اپنی شجاعت کے قصے بیان کرتا رہتا ہو۔ یا فرض نمازوں کو تو ناغہ کرے۔ مگر جہاں بیٹھے وہاں یہ ذکر کرے

کہ رات کو تہجد میں سب لوگوں کے لیے بڑی دُعا کی۔ بعض لوگوں کو ایسی باتیں کہنے کی عادت ہوتی ہے یہ تو

وَيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا (آل عمران ۱۸۹)

ترجمہ: اور جو (کام) انھوں نے نہیں کیا اس کی بابت (بھی) چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے۔

کے ہم معنی آیت ہے کہ کام تو نہیں کرتے مگر پبلک پر اس کا اظہار ضرور کرتے ہیں تاکہ ان کی تعریف ہو۔ سو یہ بڑے گناہ کی بات ہے کہ ایک آدمی کام نہ کرتا ہو مگر لوگوں میں یہ کہتا پھرے کہ میں کرتا ہوں۔

۴۰۹۔ ربطِ آیات

ایک معترض صاحب فرماتے ہیں کہ سورۂ قیامت میں جو یہ آیات ہیں۔

يُنَبَّؤُا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ○ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ○ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ (القیامت ۱۳ تا ۱۵)

ان آیات کا ربط اس اگلی آیت سے بالکل نہیں ہے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ○ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ○ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ○ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ○ (القیٰمۃ ۱۶ تا ۲۰)

یہاں یکدم قیامت میں مجرموں پر سوال جواب کو چھوڑ کر قرآن کی وحی اور اس کے جمع کرنے کا ذکر کیوں کیا گیا۔ اسے تطبیق دیں۔ سو عرض یہ ہے کہ میں صرف ان آیات کا ترجمہ کر دیتا ہوں۔ اگر تطبیق نہ ہو تو پھر اعتراض فرما دیں۔

اس قیامت کے دن آدمی کو بتایا جائے گا جو اس نے آگے بھیجا یا پیچھے چھوڑا بلکہ

انسان تو اپنے نفس کا خود آگاہ ہے۔ خواہ ظاہر میں کتنے ہی عذر پیش کرے۔ اے انسان تو اپنے عذر پیش کرنے میں اپنی زبان بڑھ بڑھ کر نہ چلا۔ تیرے جتنے اعمال ہیں وہ سب ہم نے جمع کئے ہیں۔ اور اب ہم ہی ان کو پڑھ کر تجھے سنائیں گے۔ پس جب ہم پڑھیں تو تو غور سے اُس کو سننا۔ پھر اس کے بعد ہم ان پر اپنا تبصرہ کریں گے۔

اب بتلایئے کہاں سے ربط ٹوٹا۔ اسی طرح یہ صاحب فرماتے ہیں کہ۔

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى (البقرہ : ۲۳۹)

ترجمہ: تم (تمام) نمازوں کا اور (خصوصاً) درمیانی نماز کا پورا خیال رکھو۔

کا اپنی پہلی آیت سے جو طلاق کے متعلق ہے۔ اور اگلی آیت سے جو وہ بھی اسی مضمون کی ہے کیا ربط ہوا۔ سو عرض یہ ہے کہ یہ آیت یہاں ربط اور تسلسل کے لئے نہیں لائی گئی۔ بلکہ ربط اور تسلسل کو توڑ کر انسان کو یکدم چونکا دینے اور ہوشیار کر دینے کے لئے اس مقام پر رکھی گئی ہے۔ یعنی جس طرح یہ آیت ایک مضمون کو توڑ کر زور سے اس کے اندر داخل ہو گئی ہے۔ اور بالکل غیر متعلق ہے۔ اسی طرح دنیا کے کاموں میں خواہ تم کتنے ہی منہمک ہو۔ لیکن نماز کا وقت آ جائے تو تم اس کام کو بھی اسی طرح توڑ دو جس طرح اس آیت نے اس تسلسل مضمون کو توڑ دیا ہے۔ اور نماز کے لئے بھی اسی طرح بیدار اور خبردار ہو جایا کرو۔ جس طرح مضمون کے یکدم ٹوٹ جانے سے اس جگہ تم یکدم بیدار اور حیران ہو گئے ہو۔ پس یہ بے ربطی نہیں بلکہ نماز کی اہمیت جتلانے کے لئے مسلمانوں کو جھنجھوڑا گیا ہے کہ کیسا ہی ضروری کوئی معاملہ یا کام یا تنازعہ ہو کبھی اس میں دیر نہ کرنا بلکہ وقت آنے پر سب کام چھوڑ چھاڑ کر نماز کے لئے کھڑے ہو جانا۔ پس چونکہ اس بے ربطی میں بھی ہزار ربطوں سے زیادہ تاکید اور فائدہ ہے۔ اس لئے ارادۃً اسے لایا گیا ہے۔

۴۱۰ ۔ اسماء الحسنیٰ

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ اللہ کے سوا بعض اسمائے الٰہی ایسے بھی ہیں جو غیراللہ کے لئے استعمال کرنے ناجائز ہیں ۔ مثلاً رحمٰن ، قیوم ، مالک یوم الدین لیکن بعض اسماء الٰہی کا اطلاق خدا تعالیٰ کے سوا دوسروں پر بھی ہو سکتا ہے ۔ اور وہ یہ ہیں ۔ رب ۔ حفیظ ۔ علیم ، رؤف ، رحیم ، شکور ، البصیر ، سمیع ، ولی ، حق ، حلیم ، شہید ، شفیع ، قوی ، کریم ، جبار وغیرہ حوالے آپ خود نکال لیں ۔ (الفضل ۹ مارچ ۱۹۳۹ء)

۴۱۱ ۔ حضرت ابراہیمؑ کے امتحانات

وَاِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّہُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ (البقرہ ۱۲۵)

ترجمہ : اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ابراہیم کو اس کے رب نے بعض باتوں کے ذریعہ سے آزمایا اور اس نے اُن کو پورا کر دکھایا (اس پر اللہ نے) فرمایا کہ میں تجھے یقیناً لوگوں کا امام مقرر کرنے والا ہوں ۔

یعنی ابراہیم پر اللہ تعالیٰ نے ابتلا ڈالے تو انہوں نے اس امتحان میں سو فیصدی نمبر لئے ۔ کوئی ابتلا نہ تھا ۔ جو ان پر نہ آیا ہو ۔ اور کوئی امتحان نہ تھا ۔ جو انہوں نے پورے طور پر پاس نہ کیا ہو ۔

پہلا امتحان تو وطن برادری ، عزیز اور جائیداد چھوڑنے کا اس وقت پیش آیا جب انہوں نے بُت توڑے تھے ۔ اور آگ میں ڈالنے کی تیاری ہوئی تھی ۔ آخر ان کو ہجرت کرنی پڑی صرف بیوی سارہ ہمراہ تھیں ۔

دوسرا ابتلاء اسی بیوی کے متعلق پیش آیا ۔ جب شاہ مصر نے اسے جبراً بلوایا ۔

مگر انہوں نے اُس کی عزت بچائی ۔

تیسرا ابتلا پھر ایک زمانہ کے بعد آیا۔ اس میں دوسری بیوی اور اکلوتے بچے کو ایک بے آب وگیاہ وادی میں چھوڑنا پڑا۔ مگر یہ اُمید تھی کہ شاید اسمٰعیل کسی طرح زندہ بچ گیا ہو۔ چوتھا امتحان پھر اسی لڑکے کے متعلق ہے جو قریباً جوان ہوگیا تھا۔ خواب دیکھا کہ اسے ذبح کرتے ہیں۔ اس پر عمل کرنے کو تیار ہوگئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے عین وقت پر روک دیا غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ابتلا اور امتحان معمولی نہ تھے۔ گھر بار وطن جائداد، رشتہ دار برادری سب چھوڑے۔ جان خطرہ میں پڑی۔ پھر بڑی بیوی کا ابتلا آیا۔ پھر دوسری بیوی اور بچہ کا پھر لڑکے کو ذبح کرنے کا مگر ایک دفعہ بھی تو ابراہیم نے ہچکچاہٹ ظاہر نہیں کی۔ ہر امتحان میں پاس ہوا۔ اور ہر امتحان میں پورے نمبر لئے پھر کیوں ابوالانبیاء اور امام دُنیا نہ بنایا جاتا۔

۴۱۴ ۔ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (التکویر ۱۰۹)

یعنی ایک زمانہ آنے والا ہے جب زندہ درگور لڑکی کی بابت پرسش ہوگی۔ یا خود اس سے پوچھا جائے گا۔ کہ اُسے کس گناہ کے بدلے قتل کیا گیا سو وہ یہی زمانہ ہے کہ لوگوں سے بھی پرسش ہوتی ہے۔ اور خود اس سے بھی پوچھا جاتا ہے۔ مراد اس سے خود سوال کرنے سے یہ ہے کہ بذریعہ پوسٹ مارٹم کے اس کے جسم اور اعضاء سے دریافت کیا جاتا ہے اور علم لیا جاتا ہے کہ اس کی موت کا کیا باعث ہے؟ آیا ڈبو کر ماری گئی یا گلا گھونٹ کر یا افیم دے کر۔ سو وہ خود اس کا جواب دے دیتی ہے کہ مجھے مارا گیا ہے۔ اور کس طرح اور بہت طبعی طور سے ہوئی ہے یا غیر طبعی طور سے ۔

۴۱۳ ۔ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ

نہ صرف یہ کہ بکثرت اشتہارات، رسالے اور کتابیں شائع ہوں گی۔ بلکہ یہ مطلب بھی ہے کہ ڈاکخانہ کا رواج ہو جائے گا اور کروڑوں خطوط دنیا میں روزانہ تقسیم ہوا کریں گے۔

۴۱۴ ۔ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ

نہ صرف یہ کہ اس زمانہ میں بداعمالیاں اس قدر بڑھ جائیں گی کہ دوزخ میں ان کی وجہ سے جوش آ جائے گا بلکہ آلاتِ حرب اسلحۂ آتشین۔ گولہ بارود اور جنگیں اس قدر ہیبت ہو جائیں گی کہ گویا دنیا میں آگ ہی آگ ہے۔

۴۱۵ ۔ اَلْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ

پھر جانے والے۔ سیدھا چلنے والے۔ ٹھہر جانے والے۔ یہ وہ ستارے ہیں جو نظامِ شمسی کے اندر اور زمین کی برادری میں داخل ہیں۔ باقی سب ستارے ایک ہی طرف چلتے نظر آتے ہیں۔ لیکن سیارے چونکہ سورج کے گرد گھومتے ہیں اور زمین بھی اسی طرح چکر کھاتی ہے اور ہر ایک کی رفتار میں فرق ہے۔ اس لئے یہ کبھی ایک طرف چلتے نظر آتے ہیں۔ پھر ٹھہر جاتے ہیں یا ڈوب جاتے ہیں۔ پھر واپس ہوتے ہیں۔ اس طرح کبھی یہ شام کو مغرب پر دکھائی دیتے ہیں اور کبھی صبح کے وقت مشرق میں پس ان کا ترجمہ ہوا۔ Planets یعنی مریخ۔ زحل۔ مشتری۔ زہرہ۔ عطارد وغیرہ کواکب۔

۴۱۶ - منی اور نطفہ

یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں کئی جگہ آتے ہیں: "منی" کا لفظ مشہور ہے "نطفہ" سے مطلب وہ حصہ منی کا جس سے بچہ بنتا ہے یعنی سپرمیٹزوا۔ اور اووَم Spermatozoa. اسی لئے فرمایا کہ

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى (القیامہ، ۳۷)

ترجمہ: کیا وہ کسی وقت پانی کا ایک قطرہ نہیں تھا جو اپنی مناسب حال جگہ میں ڈالا گیا۔

۴۱۷ - مشک و عنبر

نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ (النحل، ۶۶)

یعنی اللہ تعالیٰ گوبر اور خون سے خالص۔ پاکیزہ اور لذیذ دودھ تم کو پلاتا ہے۔ گوبر بھی نجاست ہے اور خون بھی نہایت درجہ سڑنے والی اور حرام چیز ہے۔ مگر اس حکیم کی کاریگری کو دیکھو کہ قدرتی چھلنیوں میں چھن کر کیسی عمدہ غذا نکل آتی ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ یہ جو پچاس روپیہ تولہ کا مشک ہوتا ہے اور جس سے بڑھ کر فوری اقویٰ قلب Stimulant کوئی دوا اب تک ایجاد نہیں ہوئی اور سو روپیہ تولہ کا عنبر جس کو بڑے بڑے امراء فرحتِ مزاج کے لئے خرید کر کھاتے ہیں۔ اُن کی اصلیت سنو تو حیران ہو جاؤ، مشک تو ایک ہرن کے حشفہ کا میل ہے جو اس کی مستی کے ایام میں قدرت اس لئے پیدا کرتی ہے تاکہ اس کی خوشبو پر ہرنیاں کھچی چلی آئیں۔ اور عنبر وہیل مچھلی کا پاخانہ ہے جو سمندر کی

لہروں میں دُھل دُھل کر صاف ہو جاتا ہے اور آخر میں گوند کی طرح بن جاتا ہے ماہی لہریں اُسے کنارہ پر پھینک دیتی ہیں۔ یا کشتیوں والے اٹھا لیتے ہیں۔

۴۱۸ ۔ قادیان میں کیوں ہجرت کی جاتی ہے

قادیان نہ کوئی تجارتی منڈی ہے نہ یونیورسٹی۔ نہ صدر مقام گورنمنٹ کا جہاں ملازمتیں ملتی ہوں۔ پھر احمدیوں کے یہاں ہجرت کر کے آنے، مکانات بنانے اور اپنی آئندہ نسل کو اس جگہ آباد کرنے کا کیا مقصد ہے؟ سُنیے وہ مقصد اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (ابراہیم، ۳۸)

ترجمہ: اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے معزز گھر کے پاس ایک ایسی وادی میں جس میں کوئی کھیتی نہیں ہوتی لا بسایا ہے اے میرے رب (میں نے ایسا اس لیے کیا ہے) تا وہ عمدگی سے نماز ادا کریں

یعنی اے رب میں نے اس غیر آباد علاقہ میں جو اپنی اولاد کو آباد کیا ہے تو صرف اس لئے کہ وہ نماز کو قائم کریں۔

بس یہ مقصد ہے جس کے لئے ہم سب لوگ یہاں آباد ہوتے ہیں۔ اور اسی کو ہمیں اپنی آئندہ نسل کے ذہن نشین کرنا چاہیئے۔

اصل بات یہی ہے کہ تمام دین کا خلاصہ نماز ہے اور بس:

۴۱۹۔ بیٹیاں اور تالیاں

وَمَا کَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَآءً وَّتَصْدِیَةً

ترجمہ:۔ اور خانہ کعبہ کے پاس اُن کی نماز سوائے سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے اور ہے کیا۔

یعنی یہ مشرک تو یوں عبادت کرتے ہیں کہ کعبہ کے پاس بیٹھ کر کچھ سیٹیاں ماریں اور کچھ تالیاں بجائیں۔ اس کوشش کر آپ لوگ ہنستے ہوں گے۔ کہ کیا لغو حرکت ہے جو کفار مکہ کیا کرتے تھے۔ لیکن دیکھا جائے تو اسلام کے سوا جہاں سچی عبادت اور دُعا اور کلام الٰہی کی تلاوت پر زور ہے۔ اور تمام مذاہب یہی سیٹیاں اور تالیاں کا پیش کرتے ہیں۔ کہیں پیانو بج رہا ہے۔ کہیں گانا ہو رہا ہے۔ کہیں ڈھول اور چھینے بجائے جا رہے ہیں۔ کہیں ناچ ہو رہا ہے۔ غرض مشرکین مکہ کا کیا ذکر۔ مساجد کے سوا دُنیا کی ہر عبادت گاہ یہی نمونہ پیش کر رہی ہے۔

(الفضل ۲۲۔ مارچ ۱۹۳۹ء)

۴۲۰ ۔ یوم الفرقان

انبیاء کو علاوہ عام نصرت اور کلام الٰہی کے نزول کے ایک یوم الفرقان بھی ملا کرتا ہے۔ اس دن ایسی کھُلی کھُلی اور امتیازی فتح ان کو ملتی ہے کہ دشمن بھی اُسے تسلیم کر لیتا ہے موسیٰ علیہ السلام کا یوم الفرقان وہ تھا جس دن فرعون غرق ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم بدر اور حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کا دھرم مہوتسو کا دن کہ دوست دشمن سب کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ ان کے مقابلہ میں حضور کا مضمون غالب رہا۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
وَأَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْإِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ
وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۝ (آل عمران ۲۰۵)

ترجمہ:۔ اُس نے تجھ پر یہ کتاب حق پر مشتمل اُتاری ہے جو اُس (وحی) کو جو اس (کتاب) سے پہلے (آ لی) تھی پورا کرنے والی ہے اور اُس نے لوگوں کو ہدایت دینے کے لیے اس سے پہلے تورات اور انجیل کو نازل کیا تھا اور

(نیز) اُس نے فیصلہ کُن نشان نازل کیا ہے ۔

یہاں قرآن، تورات اور انجیل سے علاوہ ایک چیز ہے جس کا نام فرقان ہے اور

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ (الانفال: ۴۲)

ترجمہ: اور اس پر بھی جو ہم نے اپنے بندہ پر حق و باطل میں فیصلہ کر دینے والے دن میں نازل کیا تھا۔

سے بدر کا دن یوم الفرقان معلوم ہوتا ہے۔ یعنی اس دن صادق اور کاذب میں ایسا نمایاں فرق ہوگیا۔ کہ شُبہ کی گنجائش ہی نہیں رہی ۔

۴۲۱ - عملی شکریہ

ایک شکریہ ہوتا ہے۔ جَزَاکُمُ اللّٰہ اور تھینک یُو والا ایک عملی شکریہ ہوتا ہے۔ جو عبادت قربانی اور مشق کے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس قسم کا شکریہ اس آیت سے نکلتا ہے ۔

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا (سبا: ۱۴)

یعنی اے آلِ داوٗد صرف زبانی ہی نہیں۔ بلکہ عملی شکریہ کر کے دکھاؤ منہ سے تو سبھی الحمدللہ اور شکر ہے اللہ کا کہہ دیتے ہیں۔ مگر وہ جن پر خدا اپنے بندوں سے چاہتا ہے وہ عملی شکریہ ہے۔ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے پیر تہجد میں کھڑے کھڑے سوج جایا کرتے تھے ۔

۴۲۲ - خاتَم کے معنی مُہر

وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (احزاب: ۴۱)

ترجمہ: لیکن اللہ کے رسول ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر نبیوں کی مہر ہیں۔
کسی لفظ کے معنی پر جھگڑا ہو تو دوسری جگہ جہاں وہ لفظ استعمال ہوتا ہو۔ ان معنوں کو دیکھ لو۔ پھر وہ جھگڑا صاف ہو جاتا ہے۔ مثلاً مسیح کے توفی پر جھگڑا ہے۔ تو اور جگہ توفی کے معنی دیکھ لئے جب سب جگہ موت ہی ثابت ہو گئی تو پھر مسیح کے لئے بھی موت ہی کے معنی ہوں گے۔ اسی طرح خاتم کے معنے کے لئے اس حدیث کو دیکھو جس میں

خاتم النبوة بين كتفيه مثل ذر الحجلة ◦

کے الفاظ آئے ہیں۔ یہاں خاتم النبوة کے معنے سب مُہر کے کرتے ہیں۔ نبوت کو ختم کرنے والا پھر قرآن میں وہی معنے لینے سے کیوں انکار ہے؟

۴۲۲ ۔ باریک گناہ

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ۚ (الانعام: ۱۲۱)

ترجمہ: اور گناہ کی ظاہری شکل اور اس کی حقیقت (دونوں) سے بچو۔
اندرونی اور باریک گناہ کوئی نئے گناہ نہیں ہوتے۔ بلکہ وہی مشہور گناہ ہیں جو ترقی مدارج کے ساتھ زیادہ باریک ہوتے جاتے ہیں۔ مثلاً زنا وغیرہ سے نیچے اُترو۔ تو بدنظری ہے ایک بدنظری ارادۃً پھر بدنظری عادۃً۔ پھر بھول کر اور نسیاناً۔ پھر اتفاقاً۔ پھر اتنا محتاط ہو جاتا ہے۔ کہ اگر اتفاقاً بھی نظر پڑ جائے تو نفس کو ملامت کرتا ہے۔ پھر بُرے خیالات بھی جاتے رہتے ہیں۔ آخر یہاں تک ہو جاتا ہے۔ اگر نامحرم پر نظر بھی پڑ جائے تو یہ خیال تک نہیں آتا کہ یہ نامحرم ہے۔ یا مقام شہوت۔ تمام عالم ماں کی طرح ہو جاتا ہے۔ اس لئے نبی کسی بات پر عمل کرتا یا خود بچاؤ کرتا ہے۔ تو وہ اَمر دوسروں کی تعلیم کی خاطر ہوتا ہے نہ کہ اپنی کمزوری کے باعث۔ اسی طرح مثلاً غصب ہے پہلے تو ایک مومن حق اللہ یا حق العباد غصب کرتا تھا۔ پھر ان کا خیال بھی گناہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ بلکہ کسی کی چیز

پر نظر ڈالنا بھی ناجائز ہو جاتا ہے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ۚ (طٰہٰ ۱۳۱)

ترجمہ: اور ہم نے جو کچھ ان میں سے بعض لوگوں کو دنیوی زندگی کی نمائش کے سامان دے رکھے ہیں تو اس کی طرف اپنی دونوں آنکھوں کی نظر کو پھیلا پھیلا کر مت دیکھ۔

غرض گناہ وہی معدودے چند ہیں۔ مگر باریک اور لطیف اور خیالی ہوتے جاتے ہیں۔ اسی طرح نیکیوں کا حال ہے۔ سب سے اعلیٰ نیکی وہی ہے۔ جو قلبی اور خیالی ہو اور سب سے اعلیٰ تقویٰ بھی وہی ہے۔ جو دل پر مستولی ہو۔ نہ کہ صرف جوارح پر۔ جس قدر علم و معرفت وسیع ہو جاتی ہے۔ اسی قدر باریک گناہ زیادہ سوجھتے ہیں۔ مگر جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ بڑے گناہ یہی ہیں یعنی ۱۔ شرک۔ ۲۔ چوری ۳۔ زنا۔ ۴۔ قتل۔ ۵۔ جھوٹ۔ اور نافرمانیٔ رسول۔ باقی ان کی شاخیں ہی ہیں۔

أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ ...... وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ (ممتحنہ ۱۳)

ترجمہ: اس شرط پر کہ وہ اللہ کا شریک کسی کو نہیں قرار دیں گی اور نہ ہی چوری کریں گی اور نہ ہی زنا کریں گی۔ اور نہ ہی اولاد کو قتل کریں گی۔ اور نہ ہی کوئی جھوٹا بہتان کسی پر باندھیں گی۔ اور نیک باتوں میں تیری نافرمانی نہیں کریں گی۔

۴۲۴۔ آیتِ نُور

اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ

فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۔ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ (النور: ۳۶)

ترجمہ: اللہ آسمانوں کا بھی نور ہے اور زمین کا بھی۔ اس کے نور کی کیفیت یہ ہے جیسے کہ ایک طاق ہو جس میں ایک دیا پڑا ہو (اور وہ) دیا ایک شیشے کے گلوب کے نیچے ہو۔

یعنی ایک ہوتا ہے خدا کا نور۔ جیسے ایک لیمپ ہو۔ ایک اس کی چمنی۔ اور تیسرا ایک طاق جس میں وہ رکھا ہو۔ سو اس آیت میں اللہ تعالیٰ خود تو چراغ ہے اور چمنی اس کی نبی ہے۔ اور طاق جنہیں اسی رکوع میں آگے چل کر بیوت اور رجال بھی کہا گیا ہے۔ وہ خلفائے راشدین ہیں۔ یعنی مخلوقاتِ الٰہی تک اللہ تعالیٰ کا نور نہیں پہنچ سکتا جب تک یہ ذرائع نہ ہوں۔ اور جو بھی اس نور کو بغیر نبی اور خلفاء کی وساطت کے لینا چاہے گا وہ ناکام رہے گا۔ ان معنوں کے علاوہ اس تمثیل کے اور معنی بھی ہو سکتے۔ جنہیں بطور جدول ناظرین کے ملاحظہ کے لئے لکھا جاتا ہے۔

نمبر شمار	الٰہی نور یعنی مصباح	زجاجہ یعنی چمنی	مشکوٰۃ یعنی طاق	نمبر شمار	الٰہی نور یعنی مصباح	زجاجہ یعنی چمنی	مشکوٰۃ یعنی طاق
۱	اللہ	محمدؐ	خلفاء	۸	وحی	معرفت	عقل
۲	قرآن	محمدؐ	عالمین	۹	اللہ	ملائکہ	انسان
۳	محمدؐ	خلفاء	امتِ محمدیہ	۱۰	روحِ قرآن	الفاظِ قرآن	قلبِ مومن
۴	احمد	خلیفۃ احمد	جماعتِ احمدیہ	۱۱	روحانی لوگ	دُعا و توجہ	عامۃ الناس
۵	خلیفۂ راشد	ناظر	کارکنانِ جماعت	۱۲	آفتاب	چاند	زمین
۶	قرآن	دیگر کتبِ الہامیہ	کتبِ علمیہ فلسفیہ	۱۳	اسلام	کعبہ	مساجد
۷	ذاتِ باری	رُوح	مادہ	۱۴	ایمان	مومن	دُنیا

۴۲۵۔ خدا کے رحم پر ایک اعتراض کا جواب

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ
رَبِّهِمْ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا
اِنَّا مُوْقِنُوْنَ (السجدہ ، ۱۳)

یعنی قیامت کے دن مجرم اپنے رب کے حضور سر جھکائے کھڑے ہوں گے۔ اور کہیں گے۔ کہ اے رب ہم نے سب کچھ دیکھ لیا۔ اور سن لیا۔ اب ہم کو دنیا میں واپس کر دے۔ تاکہ ہم نیک عمل کریں۔ ہم کو تو اب یقین کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔ اسی طرح

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ
لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ
قَآئِلُهَا ؕ (المؤمنون ، ۱۰۰، ۱۰۱)

یعنی جب موت آجاتی ہے۔ تو ظالم کہتا ہے۔ کہ اے رب مجھے واپس کر دے تاکہ میں پھر دنیا میں نیک عمل کروں۔ یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ یہ تو اس کی باتیں ہی باتیں ہیں۔

ایک اور جگہ سورۂ انعام میں فرمایا کہ

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ
بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا
كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ
وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (الانعام ، ۲۸، ۲۹)

یعنی جب مجرم نارِ جہنم پر کھڑے ہوں گے۔ تو کہیں گے۔ اے کاش ہم واپس کئے جاتے۔ تاکہ ہم نشاناتِ الٰہی کی تصدیق کرتے اور ایمان لے آتے۔ اب تو جو کچھ وہ چھپاتے تھے۔ وہ صاف ظاہر ہو گیا۔ اور اگر انہیں واپس بھی کیا جائے تو پھر بھی وہ پہلے جیسی بدکاریاں ہی کریں

گے۔ اور اس بات میں وہ جھوٹے ہیں۔ یہاں سوال یہ ہے کہ جب کفار واپسی کی درخواست کریں گے اور وعدہ کریں گے کہ ہم کو خدا پر یقین حاصل ہو گیا ہے۔ ہم اب ضرور اپنی اصلاح کریں گے۔ اور توبہ کے آثار دکھا دیں گے۔ اور پھر کبھی ویسے عمل نہیں کریں گے۔ تو خدا تعالیٰ ان کو مہلت کیوں نہیں دے گا۔ یہ بات رحم کے برخلاف ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو پہلی دفعہ اس دُنیا میں کافی عمر اور وقت ان کو ملا تھا۔ جیسے فرمایا۔

اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ۖ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ (فاطر ۳۸)

ترجمہ:۔ (ہم اُن سے کہیں گے) کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی جس میں نصیحت حاصل کرنے کا خواہش مند نصیحت حاصل کر لیتا ہے اور تمہارے پاس ہوشیار کرنے والے (بھی) تو آئے تھے (پھر تم نے ان کی بات کیوں نہ مانی) پس (اب یہ) عذاب چکھو کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔

اگر اس طرح روز روز امتحان ہوا کریں۔ تو پہلی دفعہ پاس ہونے والے مومنین کی کمال ناقدری متصور ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر واپس بھی کئے جائیں تو پھر بھی اصلاح نہیں ہوگی۔

وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (انعام ۲۹)

ترجمہ:۔ اور اگر انہیں (واپس) لوٹایا جاتا تو وہ ضرور (اس بات کی طرف) پھر جاتے جس سے انہیں روکا جاتا تھا اور وہ یقیناً (اپنے اس دعویٰ میں) جھوٹے ہیں۔

بظاہر یہ امر مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ مگر دُنیا میں ہر روز اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص لوگوں کو آتشک میں مبتلا دیکھتا ہے۔ مگر پھر زنا کرتا ہے۔ خود مبتلا ہوتا ہے اچھا ہو کر پھر وہی حرکت کرتا ہے۔ بلکہ اس بیماری یعنی سزا کے دوران میں ہی وہ گناہ کئے جاتا ہے چور قید ہو کر جیل میں جاتا ہے۔ تو اندر جا کر چوری کرتا ہے اور چھٹ کر باہر آتا

ہے تو اُسی شب پھر نقب زنی کی واردات کرتا ہے پس خدا کا فرمان بالکل سچ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قلوب کی اصلاح نہیں ہوئی وہ ایسے مسخ اور مختوم ہو جاتے ہیں کہ جب تک نہ جہنم سے اُن کی مہریں ٹوٹ کر صفائی قلب گناہ سے نفرت اور حقیقی طہارت نہ پیدا ہو تب تک ایک ہزار دفعہ بھی ایسا آدمی واپس کیا جائے گا تو پھر بھی گناہ کرے گا۔ (الفضل ۱۹ اپریل ۱۹۲۹ء)

۴۲۶۔ تردید کفارہ

قرآن مجید میں کفارہ کی تردید کئی جگہ ہے اور مشہور آیات اس کی بابت یہ ہیں۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (الانعام: ۱۶۵)

ترجمہ: اور کوئی بوجھ اٹھانے والی (ہستی) دوسری (ہستی) کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی

اور لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرہ: ۲۸۷)

ترجمہ: جو اس نے (اچھا) کام کیا ہو (وہ) اس کے لئے (نفع مند) ہوگا۔

اور جو اس نے (بُرا) کام کیا ہو (وہ) اسی پر (وبال ہو کر) پڑے گا

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم: ۴۰)

ترجمہ: اور انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

اور يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (الانشقاق: ۷)

ترجمہ: اے انسان! تُو اپنے رب کی طرف پورا زور لگا کر جانے والا ہے (اور) پھر اس سے ملنے والا ہے۔

وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایک اور آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفارہ کا تیر باغ دکھانا مومن کا کام نہیں۔ بلکہ کفار کی عادت ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۚ اِنَّهُمْ

لَكٰذِبُوْنَ ۝ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ
وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (عنکبوت ۱۲، ۱۳)

کافر لوگ مومنوں سے کہا کرتے ہیں۔ کہ تم ہمارے مذہب میں داخل ہو جاؤ ہم تمہارے گناہوں کا کفارہ ہو جائیں گے۔ حالانکہ وہ کسی کا ایک گناہ بھی اپنے سر پر نہیں لا سکتے۔ وہ جھوٹے ہیں ہاں وہ اپنے کئے ہوئے گناہ اٹھائیں گے اور ان کے علاوہ لوگوں کو اس طرح گمراہ کرنے کا جو گناہ ہے۔ اس کا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور قیامت کے دن ان سے اس افترا کی بابت باز پرس ہوگی۔

۴۲۷۔ خلیفہ اور انجمن

قرآن مجید نے خلیفہ اور انجمن کے کاموں کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ اور دو کام ایک دوسرے سے اس طرح علیحدہ ہیں کہ خیال بھی نہیں آسکتا۔ کہ انجمن سلسلہ احمدیہ کو خلیفہ سے بے نیاز کر سکتی ہے۔ کوئی بھی انجمن یا کمیٹی ہو۔ اس کے متعلق صرف یہ تین کام ہیں جو قرآن نے مقرر کئے ہیں۔

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ
اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ (نساء ۱۱۵)

ترجمہ: ان لوگوں (کے مشوروں) کو چھوڑ کر کے جو صدقہ یا نیک بات یا لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ ان کی بہت سے مشوروں میں کوئی بھی بھلائی نہیں (ہوتی)

یعنی عموماً انجمنیں اور کمیٹیاں بنی نوع انسان کے لئے مفید نہیں ہوتیں۔ جو اچھی ہوتی ہیں۔ ان کے کام کا دائرہ یہ ہے کہ کچھ مالی امداد غریبوں کو۔ کچھ نیکی کے کام اور کچھ لوگوں کے جھگڑے تصفیہ کرا دیا کریں۔ لیکن خلفائے راشدین کی بابت یہ

کہیں نہیں لکھا کہ لَاخَیْرَ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنَ الخلفاء بلکہ ان میں سے ہر ایک سراسر خیر ہے ان کے کام بھی اس طرح محدود نہیں ہیں۔ بلکہ وہ نبی کے جانشین ہوتے ہیں۔ نبی کے تمام کاموں میں (مثلاً کتاب وحکمت سکھانا۔ خدا کے احکام پہنچانا۔ تزکیہ نفوس کرنا) اور ان مسائلِ دینیہ کی تمکین جماعت کے اندر کرتے ہیں۔ جن کی بابت یا تو لوگوں میں علم نہیں ہوتا یا ان میں اختلاف موجود ہوتا ہے۔ پھر ان کو ایک ہاتھ پر جمع کرکے وہ ایسی وحدت اور محکم نظام قائم کر دیتے ہیں کہ خوف جاتا ہے۔ اور شرک کو نکال کر توحیدِ الٰہی کی روح اور عبادتِ الٰہی کا جذبہ جماعت میں پیدا کر دیتے ہیں۔ بھلا انجمن بھی کہیں ایسی دعا گو اور خیرخواہ اور خلافت والی باتوں کے قیام کا باعث ہو سکتی ہے۔ انجمن کی بنیادی اختلاف اور کثرتِ رائے اور بحث ومباحثہ اور نفسا نفسی پر ہے۔

توحید کے سلسلوں کے کام کے چلانے والے ہمیشہ سے شخصِ واحد ہی ہوتے چلے آئے ہیں۔ نہ کہ کمیٹیاں۔ موسیٰؑ کے وقت بھی ہارون بطور ان کے مرید اور کارندے کے تھے۔ اس سے زیادہ نہ تھے۔

۴۲۸ ۔ مومن اور منافق میں فرق

مومن اور منافق میں خاص تمیز کسی بڑی مصیبت، بڑے ابتلا اور بڑی قربانی کے وقت ہوا کرتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

لَوْکَانَ عَرَضًا قَرِیْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَ
لٰکِنْ بَعُدَتْ عَلَیْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ (توبہ ۴۲)

ترجمہ۔ اگر قریب میں ملنے والا فائدہ ہوتا یا چھوٹا سفر ہوتا تو یہ لوگ تیرے پیچھے چل پڑتے لیکن انہیں مسافت دور معلوم ہوئی۔

یعنی اگر فاصلہ کم اور سفر آسان ہوتا۔ تو منافق بھی تیرے ساتھ لگے رہتے لیکن

اب جنگِ تبوک میں جو مسافت بہت دُور نظر آئی۔ تو ان کا نفاق بھی ظاہر ہو گیا۔

۴۲۹ - قومی عذاب آخرت میں

انسان کے نیک اور گنہگار ہونے میں اس کے ماحول۔ اس کی قوم۔ برادری۔ ملک تہذیب اور گورنمنٹ کا بھی اثر ہے۔ کیونکہ بعض نیکیاں اور بدیاں انفرادی نہیں ہوتیں۔ بلکہ قومیں اُن کو رائج کرتی اور قائم رکھتی ہیں۔ ایسے ماحول میں جو بدی ہو۔ اس کی سزا اس شخص کو بھی ملے گی اور اس قوم یا برادری یا گورنمنٹ کو بھی بحیثیت مجموعی ملے گی جس کا اس کے افراد میں دخل ہو گا۔ انسانی سوسائٹی کا وہی کا یہ اصل قرآن مجید میں موجود ہے۔ جہاں فرمایا گیا ہے کہ دوزخ میں انفرادی عذاب کے سوا قومی عذاب بھی ہو گا۔ اس وقت ایک اُمت دوسری اُمت پر لعنت کرے گی پچھلی اُمتیں کہیں گی کہ اے رب ان پہلی اُمتوں کی وجہ سے ہم گمراہ ہوئے اس لئے ان کو دوگنا عذاب ملنا چاہئیے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ان کو تسلی رکھو۔ ان سب کو دوگنا ہی عذاب تو مل رہا ہے۔ اب پڑھو اس آیت کو سورہ اعراف میں۔

كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا ۖ ...... قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِن لَّا تَعْلَمُونَ (اعراف: ۳۹)

ترجمہ: جب کوئی قوم (آگ میں) داخل ہو گی تو (اپنے سے پہلی) بہن (یعنی قوم) کو لعنت کرے گی۔ یہاں تک کہ ..... (اس پر وہ) فرمائے گا۔ سب کو ہی زیادہ عذاب مل رہا ہے لیکن تم جانتے نہیں۔

علاوہ اس دُنیا میں دیکھو انفرادی عذابوں کے وہ قومی عذاب بھی برابر نازل ہو رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ جس طرح بعض سلسلوں اور خاندانوں اور ملکوں اور قوموں کو بلند کرتا ہے۔ اسی طرح بعض علاقوں۔ قوموں اور ملکوں کو بحیثیتِ مجموعی رُسوا اور ذلیل بھی کرتا ہے۔

(الفضل ۲۱ اپریل ۱۹۳۹ء)

۴۳۰ - استویٰ

ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ کے معنی بعض کتابوں میں یہ لکھے ہیں کہ آسمان پر چڑھ گیا۔ کیا وہ کوئی محدود اور جسمانی چیز ہے کہ پہلے نیچے ہو۔ پھر اپنی جگہ وہاں سے چھوڑ کر اوپر چڑھ جائے۔ اس کا چڑھنا اس کی توجہ کا اس طرح پھرنا ہے یعنی پھر اس نے بلندی کی طرف توجہ فرمائی تو ان کو سات آسمان ٹھیک ٹھاک بنا دیا۔ اسی طرح اَسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یعنی خلق کرنے کے پیچھے اور ہر بات کو مکمل کر دینے کے بعد اس نے تخت حکومت اور انتظام کی طرف توجہ فرمائی۔ تو یہ نظام عالم گھڑی کی طرح باقاعدہ قوانین کے ماتحت چلنے لگا۔ اور ایک بے عیب گورنمنٹ عالمین میں قائم ہو گئی۔ یہ معنے کہ کسی مادی تخت پر بیٹھ گیا۔ جس طرح دُنیا کے بادشاہ بیٹھ جاتے ہیں۔ بالکل ہی غلط معنی ہیں۔

كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (ہود ۸)

ترجمہ: اس کا عرش پانی پر ہے۔

کے معنی بھی یہی ہیں۔ کہ ان قدیم زمانوں میں خدا کی حکومت پانیوں پر تھی۔ اس وقت یہ دُنیا اس طرح نہ تھی۔ بلکہ ایک ابتدائی زمانہ میں کرہ ارض پر پانی ہی پانی تھا۔ اسی کو بطور استعارہ بائبل میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ خدا کی رُوح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی۔ استویٰ کے معنے استوٰی کرنے والے وجود عظمت شان اور صفات کے ماتحت کرنے چاہئیں۔ نہ یہ کہ استویٰ تو خدا کا ہو اور تفصیل اس کی انسانی ہو۔ یہ تو ایسا ہے۔ جیسے ایک گڑیا کا کُرتا کسی پورے قد کی عورت کو پہنانے کی کوشش کرنا۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ (النحل ۷۵)

ترجمہ: پس (اے مشرکو!) تم اللہ کے متعلق (اپنے پاس سے) باتیں مت بناؤ۔

۴۲۱ - گرمی میں باہر نہ نکلو

مجھے ایک مرض ہے جس کی وجہ سے گرمی ذرا بھی برداشت نہیں اور ساری گرمی گیلا کپڑا جسم پر لپیٹ پر پنکھے کے نیچے پڑا رہتا ہوں۔ مگر جب اس آیت کو پڑھتا ہوں کہ۔

قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ

(التوبہ : ۸۱)

ترجمہ: (ایک دوسرے سے) کہا تھا کہ ایسی (شدید) گرمی میں جنگ کے لیے (اکٹھے ہو کر) مت نکلو۔ تُو (ان سے) کہہ دے کہ جہنم کی آگ (اس گرمی سے) زیادہ سخت ہے

(منافق کہتے ہیں کہ گرمی میں باہر نہ نکلو) اور ساتھ ہی حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کا یہ شعر دُہراتا ہوں۔ ؎

وکیف علی النّار النھا بر تصبرُ

وانت تاذّیٰ عند حرّ الھواجر

(یعنی تو دوزخ کی آگ پر کس طرح صبر کرے گا۔ حالانکہ موسم گرما میں دوپہر کی گرمی کے وقت تجھے سخت تکلیف محسوس ہوتی ہے)

تو میں اپنے تئیں بالکل اور واقعی منافق سمجھنے لگتا ہوں۔ اور خدا کے آگے روتا اور اسی سے التجا کرتا ہوں۔ کہ میرا خاتمہ بالخیر کرے۔ اور ایمان میرے دل میں مضبوط کر دے۔ اب میں اپنے ان دوستوں کی خدمت میں بھی جو یہ مضامین پڑھتے ہیں۔ عرض کرتا ہوں کہ وہ بھی میرے لئے خاتمہ بالخیر کی دُعا کریں۔ اور یہ کہ جو زندگی باقی ہے۔ وہ بھی سلامتی اور ایمان کے ساتھ گزر سے۔ آمین۔

۴۳۲۔ کاہن کیوں سزا نہیں پاتا

کاہن اس لئے سزا نہیں پاتا کہ وہ مفتری نہیں ہوتا۔ بلکہ واقعی اُسے الہام ہوتا ہے مگر شیطانی الہام اور نفسانی الہام۔ شیطانی تو اس لئے کہ ایسے لوگوں کے تعلقات عموماً ارواحِ خبیثہ اور شیاطین سے ہوتے ہیں

اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓـئِہِمْ (الانعام: ۱۲۲)

ترجمہ: شیطان یقیناً اپنے دوستوں کے دل میں (ایسے خیال) ڈالتے رہتے ہیں۔

اور نفسانی کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دماغ کی بناوٹ رؤیا۔ اور کشوف اور الہام کے لئے موزوں ہوتی ہے۔

پس جب کوئی خیال ان کے دماغ پہ دور کرتا ہے۔ یا کوئی تقدیر ملاءِ اعلیٰ سے جاری ہوتی ہے۔ تو ان کا ریڈیو بھی بجنے لگتا ہے۔ مگر سچ جھوٹ سب گڈ مڈ۔

۴۳۳۔ لَھْوَ الحَدِیث

بعض لوگ سلسلۂ حقہ احمدیہ کی مخالفت بسبب علم کی کمی کے خود تو نہیں کر سکتے نہ انہیں قرآن و حدیث کی واقفیت ہوتی ہے۔ نہ مذہبی مسائل کی کچھ خبر۔ مگر مخالفت ضرور کرنی ہوتی ہے۔ ورنہ نمبرداری پر حرف آتا ہے۔ اس لئے ایسے لوگ یہ کرتے ہیں کہ مولوی ثناء اللہ صاحب کی کتابیں اور ایسے ہی دیگر مصنفین کے رسالے وی پی منگوا لیتے ہیں۔ پھر اُن کو سنا سنا کر عوام الناس کو گمراہ کرتے پھرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اس قسم کتب اور گمراہانہ کارروائی کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں موجود ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَھْوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ یَتَّخِذَھَا ھُزُوًا۔ اُولٰٓئِکَ

لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ (لقمان: ۶)

ترجمہ: اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو (اپنا روپیہ ضائع کر کے) کھیل تماشہ کی باتیں لیتے رہتے ہیں تاکہ بغیر علم کے لوگوں کو اللہ کے رستہ سے گمراہ کریں اور اس (یعنی اللہ کے راستہ) کو ہنسی کے قابل چیز بنا لیتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے ذلت والا عذاب ہوگا۔

بعض لوگ بے ہودہ لٹریچر خرید کر پبلک کو خدا کے راستے سے گمراہ کرتے ہیں۔

۴۳۲۔ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۣاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۣانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (الحج: ۱۲)

بعض آدمی اللہ کی عبادت گویا کنارے پر کھڑے ہو کر کرتا ہے۔ اگر فائدہ پہنچتا رہے۔ تو وہ بھی خدا سے خوش رہتا ہے۔ لیکن اگر تکلیف پہنچے۔ تو بس ایسا بھاگتا ہے کہ منہ پھیر کر بھی نہیں دیکھتا۔ ایسے شخص کو دنیا میں بھی نقصان ہے اور آخرت میں بھی۔ یہ آیت بہت قابلِ توجہ ہے۔ جو مصیبت کے وقت خدا کی طرف آگے نہیں بڑھتا۔ وہ اپنے ایمان کا انکار کرے۔ اسی لئے میرا خیال ہے کہ شاکر کی نسبت صابر کا بہت بڑا درجہ ہے۔ کیونکہ ذکر سے یا منافق بھی تو بڑا شکرگزار بندہ بنا رہتا ہے۔ جب تک اُسے پیسے ملتے جائیں۔ تو ساری حقیقت کھل جاتی ہے۔ صبر نہیں کر سکتا۔

۴۲۵ - مائدہ آسمانی

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ (مائدہ ۱۱۵، ۱۱۶)

یعنی عیسٰی ابن مریم نے دُعا کی کہ اے اللہ ہمارے پروردگار ہم پر آسمانی خوان نازل کر تا کہ وہ ہمارے پہلوں اور پچھلوں کے لئے عید ہو۔ اور تیرا ایک نشان ہو اور ہم کو رزق دے۔ تُو تو بہترین رزق دینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہاں میں ضرور اس خوانِ آسمانی کو تم پر نازل کروں گا۔ یہاں مائدہ آسمانی سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ خوانوں میں گرم گرم کھانا اس زمانہ میں اترا کرتا تھا۔ بلکہ اس سے بے محنت کا آسمانی رزق مراد ہے۔ اور قبولیت صرف ان لوگوں کے لئے ہی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ ان کے پچھلے نسلوں کے لئے بھی تھی۔ سو وہ ویسا ہی رزق تھا جیسا کہ اب سلسلہ احمدیہ کو مل رہا ہے۔ آسمانی رزق سے متعلق کبھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو رزق عیسائی اقوام کو آج کل مل رہا ہے۔ وہ اس دُعا کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ یہ تو زمینی رزق ہے جو دابۃ الارض اقوام کو ملا کرتا ہے۔ آسمانی رزق صرف ہدایت یافتہ اقوام کا حصہ ہے۔ اوّلنا سے مراد حواری اور ابتدائی مسیحی تھے۔ جب تک وہ راہِ حق پر قائم رہے اور اٰخرنا سے مراد مسیح موعود کی جماعت ہے۔ نشان اس سے فرمایا کہ حضرت مسیح موعود نے چندہ اور نذرانہ اور لنگر خانہ اور سلسلہ کے سب اخراجات کے روپیہ کو بار بار خدا کا نشان قرار دیا ہے۔ اور بات یہی سچ ہے۔ یہ جو لاکھوں روپیہ آتا ہے۔ یہ اس طرح سے مائدہ آسمانی ہے۔ کہ ایک ناظر سارا دن سلسلہ کا کام کرتا ہے اور اس کو بیت المال سے خرچ کے لئے بیٹھے بٹھائے اور بغیر دُنیا کا کام کئے رزق ملتا ہے۔ ایک ادنیٰ کارکن ہے۔ وہ

بھی اپنی حیثیت کے مطابق سارا وقت خدا کے سلسلہ کے کام میں گزارتا ہے۔ جب شام کو وہ سودا کرتا ہے تو بیت المال کے ذریعے یعنی مَآیُنَزَّلُ مِنَ السَّمَآءِ سے حصہ لیتا ہے وہ معاوضہ نہیں ہے۔ وہ ملازمت نہیں ہے بلکہ خدائی دعوت ہے۔ جو آسمانی خزانہ سے ملتی ہے۔ بسبب اس خدمت کے جو یہ لوگ خدا کے دین کی کرتے ہیں۔ یہی حال سلسلہ کے باقی سب اخراجات کا ہے۔ پس جب تک کارکن محنت سے کام کئے جائیں گے اور ناشکری نہیں کریں گے۔ اور کم و بیش کی شکایت نہیں کریں گے تو انشاء اللہ ان پر مائدہ آسمانی نازل ہوتا رہے گا۔

۴۲۶ ۔ دعویٰ کے ساتھ دلیل

قرآن مجید اہل کتب سے مباحثہ کرتا ہوا ان سے سوال کرتا ہے۔

تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (البقرہ: ۱۱۱)

یہ تو نرے دعوے ہی دعوے ہیں اور خواہشیں ہی خواہشیں ہیں۔ اگر سچے ہو تو دلیل بھی تو ساتھ دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن خود دلیل دیتا ہے۔ جبھی تو دوسروں سے دلائل کا مطالبہ کرتا ہے۔

۴۲۷ ۔ زمین ہی میں سب کا روزگار ہے

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ (الاعراف: ۱۱)

ہم نے تم کو زمین میں قدرت دی اور زمین میں ہی تمہارا روزگار اور معاش کا سامان بنایا۔ یعنی تمہاری رہائش اور معاش سب زمین پر ہی منحصر ہے۔ معاش کو دیکھو کہ نباتات جمادات حیوانات۔ پانی سب اس سے نکلتے ہیں۔ اور لوگ ان کو لے کر جیتے ہیں علاوہ ازیں محکمہ سررشتہ جنگلات ادویات۔ بجلی۔ نہریں۔ ریلوے اور قریباً سب زمینیں اور

کاروبار کسی نہ کسی طرح زمین سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ مٹی کا کھودنا بھی معاش ہے۔ پیشاب۔ پاخانہ تک معیشت ہے۔ غرض ایسی کوئی چیز نہیں جس کی وجہ سے کمائی نہ ہو۔ بڑے بڑے ڈاکٹر صرف پیشاب کے چند قطروں اور پاخانہ کی ایک چٹکی کے باقاعدہ ملاحظہ کے بیسیوں روپے وصول کر لیتے ہیں۔

۴۲۸ - لاخلافته الّا بالمشورة

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ: ۳۹)

ترجمہ: اور ان کا طریق یہ ہے کہ اپنے ہر معاملہ کو باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔

یعنی مسلمانوں کی حکومت مشورے سے ہوا کرے گی۔ اسی کے ہم معنی یہ الفاظ ہیں کہ لاخلافته اِلّا بالمشورة یعنی خلافت بغیر مشورہ کے نہیں ہونی چاہیئے۔ یہاں دو مطلب ہیں۔ ایک تو یہ خلیفہ بغیر مشورے کے حکومت نہ کرے جیسے کہ ہمارے زمانہ میں ہوتا ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح تمام اہم امور میں جماعت سے مشورہ لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مشورے کے بغیر خلیفہ کا تقرر عمل میں نہ آوے۔ آگے یہ اجازت ہے کہ وہ مشورہ چاہے عام لوگوں کا ہو یا خاص لوگوں کا یا اگر ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کو نامزد کرے۔ تو نامزد کرنے سے پہلے اپنے طور پر مناسب لوگوں سے مشورہ کرے۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح کا مشورہ ضرور ہوتا ہے۔ صرف ایک شخص کی رائے نہیں ہوتی۔ الاماشاءاللہ۔

۴۲۹ - صرف قرآن ہی حفظ کیا جاتا ہے

دُنیا میں جتنی مذہبی کتابیں ہیں۔ ان میں سے سوائے قرآن کے اور ایک بھی ایسی کتاب نہیں جسے لوگ حفظ کرتے ہوں۔ نہ دُنیا میں تورات کے حافظ کبھی ہوئے اور نہ اب ہیں۔

اسی طرح انجیل وید اور دیگر مقدس مذہبی کتابوں کا حال ہے۔ یہی ایک کتاب دُنیا میں ایسی ہے جس کی لفظی حفاظت لاکھوں انسان ہر زمانہ میں اپنے سینوں کے اندر کرتے رہتے ہیں۔ اور جس کی معنوی حفاظت کے لئے ہر صدی میں خدا کی طرف سے مجدد مبعوث ہوتے رہے ہیں۔

پس یہی ایک کمال اس کا اہل دل کے سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ وعدہ الٰہی

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر:۱۰)

ترجمہ:۔ اس ذکر (یعنی قرآن) کو ہم نے ہی اُتارا ہے اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے۔

کس شان سے پورا ہو رہا ہے۔

۲۴۰۔ سُننا اور نہ ماننا

قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (البقرہ:۹۴)

ترجمہ:۔ (تم میں سے جو لوگ اس وقت ہمارے مخاطب تھے) انھوں نے کہا تھا کہ (بہت اچھا) ہم نے سُن لیا اور (ہم یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ) ہم نے (اس حکم کے) نہ ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

یہودیوں نے کہا کہ ہم نے سُنا اور ہم نے نافرمانی کی۔ اس کا یہ مطلب نہیں معلوم ہوتا کہ وہ لوگ کہا کرتے تھے۔ کہ ہم سنتے تو ہیں مگر مانیں گے ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ ایسا فقرہ ہے جیسے اب بھی اکثر لوگ وعظ و نصائح اور احکامِ الٰہی کو سُن کر کہا کرتے ہیں کہ بات تو ٹھیک ہے لیکن ہم سے ہو نہیں سکے گی۔ یا ہم سمجھ تو گئے ہیں لیکن دل نہیں مانتا۔

۴۴۱۔ یحییٰ کا نام

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اِسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا (مریم: ۸)

اے زکریا ہم تجھے ایک لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں۔ اس کا نام یحییٰ رکھنا۔ اس سے پہلے ہم نے اس کا کوئی ہم نام نہیں بنایا۔ یہاں یحییٰ علیہ السلام کی یہ فضیلت بیان کی گئی ہے کہ اس سے پہلے اس کا کوئی ہم نام نہ تھا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ محض ایک نیا نام ہونا بغیر کسی پیشگوئی یا عزت یا خصوصیت کے کوئی فضیلت نہیں ہے۔ یہاں جب ہم خصوصیات تلاش کرتے ہیں۔ تو حسب ذیل باتیں اس آیت اور اس نام میں سے ملتی ہیں۔

۱۔ اول یہ کہ یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ وہ زندہ رہے گا۔ اور اس کی عمر لمبی ہوگی۔ یہ لفظی معنی ہیں۔

۲۔ دوسرے یہ کہ وہ خدا کی راہ میں قتل کیا جائے گا۔

بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ○ (آل عمران ۱۷۰)

ترجمہ: وہ تو اپنے رب کے حضور زندہ ہیں (اور) انہیں رزق دیا جاتا ہے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ ساری آیت کے معنی یوں ہوں گے۔ کہ اس کا نام یحییٰ ہوگا۔ اور اس سے پہلے اس کا کوئی مثیل یا ہم نظیر نہیں گزرا۔ ان میں سے پہلے معنے زیادہ چسپاں معلوم نہیں ہوتے۔ کیونکہ یحییٰ علیہ السلام جوانی ہی میں قتل ہو گئے تھے۔ اور لمبی عمر نہیں پائی تھی۔ اصل میں وہ موسوی سلسلے کے آخری نبی مسیح ناصری کی آمد کی خوشخبری کی تصدیق کرنے آئے تھے۔ اور جب کام ہو چکا تو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مگر ان کا تھوڑی مدت زندہ رہنا ان کی ناکامی کی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ جس کام میں مامور تھے۔ وہ کام انہوں نے کر دیا۔ اسی طرح دوسرے معنے گو شہادت کے اعتبار سے درست ہیں۔ مگر یہ نہیں۔ کہ ان کی قوم یا برادری میں اور کوئی

شہید نہ ہوا ہو۔ خود حضرت زکریا علیہ السلام یوحنا کے والد تھے ان کو شہید کیا گیا تھا۔ یہ

تیسرے معنے وہ بھی ہمارے عقائد کی رُو سے ٹھیک نہیں۔ کیونکہ یحییٰ کا ایک مثیل ایلیا اس سے پہلے گذر چکا تھا جس سے اسے کمال مشابہت حاصل تھی۔ بلکہ یحییٰ اُس کا بروز تھا۔

اب ایک چوتھے معنے رہ گئے وہ حالات کے مطابق درست معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی حضرت یحییٰ سے پہلے کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس کا نام خدا کے ہاں سے نازل ہوا ہو۔ جس قدر انبیاء ان سے پہلے بنی اسرائیل میں گزرے۔ ان کے نام ان کے والدین یا بزرگوں نے رکھے۔ نہ کہ خدا نے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام بوجہ پانی میں سے نکالا جانے کے فرعون کی بیوی نے رکھا۔ اسی طرح جتنے اور نبی بنی اسرائیل کے تھے۔ ان کے نام ان کے والدین یا بزرگوں نے خود رکھے۔ یحییٰ پہلا نام تھا جو آسمان سے رکھا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ یہ نام نیا تھا۔ کیونکہ یہودیوں میں یہ نام تو پہلے سے رائج تھا۔

نئی بات صرف یہ تھی کہ یحییٰ نبی کا نام خدا تعالیٰ کا تجویز کردہ تھا۔ نہ کہ ماں باپ کا اور یہ بڑی فضیلت ہے۔ حضرت یحییٰ سے پہلے کوئی نبی بنی اسرائیل کا ایسا نہیں گزرا جس کا نام خدا کا مجوزہ ہو۔

لوگ بزرگوں سے نام تجویز کرا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ پھر اس سے بڑھ کر کون فخر کر سکتا ہے جس کا نام اس کی پیدائش سے پہلے خدا تعالیٰ کی بارگاہ سے نازل ہوا ہو۔ جیسا کہ عیسیٰ، محمد، احمد اور محمود کے اسماء نازل ہوئے۔ مگر یہ سب بزرگ یحییٰ کے بعد کے ہیں۔ رہی یہ بات کہ خدا تعالیٰ نے کیوں ان کا نام یحییٰ تجویز کیا۔ اس میں یہ حکمت ہے کہ یحییٰ کے معنے ہیں زندہ رہے گا۔ اور یحییٰ علیہ السلام بسبب بروز ایلیا ہونے کے اور اس بات پر دلیل ہونے کے کہ مُردے خود واپس نہیں آتے۔ بلکہ جہاں ایسی پیشگوئی ہو۔ وہاں ایک بروز اور مثیل مراد ہوتا ہے۔ جو موجودہ زمانہ میں دو ہزار سال بعد گویا زندہ کئے گئے یعنی وہ بطور

شاہد کے مسیح موعود کے بروز ہونے پر گواہ قرار دیئے گئے۔ اور ان کا ذکر بروز کے مسئلہ میں اور فوتِ مسیح کے مسئلہ میں حضرت مسیح موعود نے بار بار کیا ہے۔ (الفضل ۲۲ اپریل ۱۹۳۱ء)

۴۴۴ ۔ شرک کے چار زمانے

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (اخلاص)

ترجمہ ۔ (ہم ہر زمانہ کے مسلمان کو حکم دیتے ہیں کہ) تو (دوسرے لوگوں سے) کہتا چلا جا ، کہ (اصل) بات یہ ہے کہ اللہ اپنی ذات میں اکیلا ہے۔ اللہ وہ (ہستی) ہے جس کے سب محتاج ہیں (اور وہ کسی کا محتاج نہیں) نہ اُس نے کسی کو جنا ہے اور نہ وہ جنا گیا ہے اور (اُس کی صفات میں) اس کا کوئی بھی شریک کار نہیں۔

یعنی توحید اسی وقت قائم ہوتی ہے جب اللہ کو بے نیاز مانا جائے اور اس کا کوئی بیٹا تسلیم نہ کیا جائے ۔ نہ کوئی باپ ۔ بلکہ اس کے برابر کا کسی کو بھی نہ سمجھا جائے ۔ دنیا میں سب سے پہلے شرک خدا کا صمد نہ ماننے سے پیدا ہوا تھا۔ اور یہ سمجھا گیا۔ کہ وہ اپنی حکومت کے لئے بتوں یا حصہ داروں یا دیوتاؤں کا محتاج ہے۔ جیسے کہ پرانے ہندو اور مشرک قومیں کہتی ہیں۔ دوسرے زمانے میں لَمْ يَلِدْ والا شرک پیدا ہوا۔ یعنی خدا بچوں والا سمجھا جانے لگا۔ گنیش جی ۔ عزیر اور ملائکہ وغیرہ اس زمانہ کی اولاد مشہور ہیں۔ اور شرک کی یہ صورت ہو گئی کہ گو دوسرے دیوتا خدائے واحد کے ساتھ برابر کے شریک نہیں۔ مگر اس کی اپنی اولاد اس کی شریک ہے۔ یہ موحد قوموں کا زمانہ تھا۔ جن کے پاس کلام الٰہی کا کچھ علم تھا۔ تیسرا زمانہ شرک کا وہ آیا۔ جب لَمْ يُوْلَدْ والا شرک زور پر آیا۔ یعنی اصل خدا بیٹا ہی تسلیم کیا گیا۔ اور اس کے نام کا ڈنکا دنیا میں بجایا گیا۔ کہ بس اسی کا ماننا کافی ہے۔ اور اسی میں نجات ہے۔

بچاسے باپ کو نیا منیا کر دیا گیا۔ یہ ضالین کا زمانہ ہے۔

چوتھا زمانہ جو آج کل ہے۔ اس میں شرک کا یہ رنگ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کو اس قدر پیچھے ہٹا دیا ہے۔ کہ ہر چیز اس سے بڑھ کر وقعت اور قدر رکھتی ہے۔ مال۔ عزت۔ زمین۔ برادری۔ حکومت۔ عورت بچے۔ پالیٹیکس۔ نفس۔ لذاتِ دنیا۔ غرض ہر چیز خدا لکم ہم کفو ہو رہی ہے۔ بلکہ اس کی ذات سے زیادہ ان چیزوں کی مانگ ہے یہی دجال کا زمانہ ہے۔ اور یہی وہ شرک ہے جس کے لئے حضور علیہ السلام نے یہ عہد لیا ہے۔ کہ میں دین کو دنیا پر مقدم رکھوں گا۔ یقیناً یاد رکھو۔ کہ ہر غلط مذہب ہر غلط عقیدہ ہے۔ ہر جرم اور ہر سرکشی کی بنیاد کسی نہ کسی رنگ کے شرک پر ہے۔ خواہ جلی ہو یا خفی۔ اگر شرک نکل جائے۔ اور خالص توحید میسر ہو تو کوئی جرم باقی نہیں رہتا۔ ہر دانستہ گناہ سرکشی بغاوت اور جرم کی جڑ یہی ہے۔ موحد سے صرف خطا اور نسیان سرزد ہو سکتا ہے۔ یہ تو شرک ہے۔ جو مشرک سے طرح طرح کے مقابلے انبیاء کے طرح طرح کے نفاق اور طرح طرح کے کفر کراتا ہے۔

۴۴۳ ۔ سدرۃ المنتہیٰ

سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى وہ انتہائی مقام روحانیت اور قرب کا ہے۔ جہاں تک انسان اپنی کوشش اور جد وجہد سے ترقی کر سکتا ہے۔ اور جس سے آگے بڑھنا انسان کی فطرت اور بناوٹ کے لئے ناممکن ہے۔ معراج میں یہیں تک آپ کو پہنچایا گیا تھا۔ تاکہ معلوم ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام تک ترقی کریں گے۔ جہاں تک انسان کی فطرت کے لئے ترقی کرنا ممکن ہوگا۔ اور جس سے آگے کوئی انسان نہیں جا سکتا۔ اس درجہ کے بعد جو ترقی ہے وہ وہبی ترقی ہے۔ یعنی بغیر جد وجہد محض فضل و کرم خداوندی سے اور اس سے آگے بندہ اوپر نہیں چڑھتا۔ بلکہ خدا اس کی خاطر نیچے اُترتا ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ○ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى
عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (النجم ۱۴/۱۵/۱۶)

ترجمہ: حالانکہ اس نے یہ (نظارہ) ایک دفعہ نہیں دیکھا بلکہ دو دفعہ دیکھا ہے (یعنی ایک اس وقت جب آپ خدا کے قریب ہونے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسرے اس وقت جب خدا نے آپ کی طرف نزول فرمایا) (یعنی) ایک ایسی بیری کے پاس جو انتہائی مقام پر ہے اُسی کے پاس جنت الماویٰ ہے۔

۴۴۴۔ ہر دُعا مقبول ہے

أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (البقرہ:۱۸۷)

میں دُعا مانگنے والے کی دُعا کو قبول کرتا ہوں جب بھی وہ مجھ سے دُعا کرے۔

اس آیت پر اکثر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ بھلا سب دُعائیں کس طرح قبول ہو سکتی ہیں۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کی صاف تصریح کر دی ہے۔ جہاں فرمایا ہے کہ ہر دُعا کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔ اور وہ اسی صورت میں قبول ہو جاتی ہے۔ جس طرح مانگی جائے۔ لیکن مصلحتِ الٰہی اسی طرح قبول کرنے کی نہ ہو تو پھر۔

۱۔ اتنی ہی مصیبت اور تکلیف جو اس شخص کے مقدر میں ہے وہ دُور کر دی جاتی ہے۔ یا اُتنے ہی گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

۲۔ یا پھر اتنی ہی کوئی اور فائدہ مند چیز اس دُعا کے قائم مقام اسے عطا کی جاتی ہے۔

۳۔ یا آخرت میں اس شخص کو اس دُعا کا معاوضہ ملتا ہے۔ اور اس کے اعمال کی کمی پوری کر دی جاتی ہے۔ یا جنت کی بعض نعمتیں اس دُعا کے بدلے اسے دی جاتی ہیں۔ جو یوں ملتی ہیں۔

مثال کے طور پر ایک شخص کا لڑکا بیمار ہو گیا۔ اس نے بہت دُعا کی۔ لیکن وہ جانبر

نہ ہو سکا۔ اب یا تو اُس کے بدلے ایک اور بیٹا مل جائے گا۔ یا خود اُس کی اپنی موت جو آپہنچی تھی۔ وہ ٹل جائے گی۔ یا اس کی میزان میں چند اعمال کی کمی تھی اور وہ دوزخ کا عذاب چکھنے والا تھا۔ اُس دُعا کے بدلے میں کمی پوری ہو کر وہ جہنم سے خلاصی پا جائے گا۔ یا جنت میں اُس کی قسمت میں کوئی لڑکا نہ تھا۔ وہاں وہی لڑکا اُس کو مل جائے گا۔ گر وہ لڑکا زندہ رہتا۔ اور بڑا ہو کر جنتی بھی ہوتا۔ تو جنت میں اپنے طور پر رہتا نہ کہ اُس کا بیٹا۔ اور اُس کے گھر کی رونق ہو کر۔

پس دُعائیں کرنے میں سُست نہ ہوں وہ کبھی ضائع نہ ہوں گی۔ اور اگر ایک طرح قبول نہ ہوں گی۔ تو دوسری طرح جو اُس سے بھی بہتر ہے قبول ہو جائیں گی۔ کیونکہ نا ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی قبولیت کا وعدہ کرے اور پھر قبول نہ کرے۔ مگر یاد رہے کہ اس کی قبولیت کے لئے دو شرطیں ہیں۔ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي یعنی میرے بندے میرا حکم مانیں اور دوسری وَلْيُؤْمِنُوا بِي۔ یعنی مجھ پر ایمان لائیں۔ اور مجھے دُعا قبول کرنے پر قادر سمجھیں۔

۲۲۵۔ مقبرہ بہشتی کو تنگ نہ سمجھو اور نہ تنگ کرو

وَسَارِعُوٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (اٰلِ عمران، ۱۳۴)

یعنی بڑھو اپنے رب کی بخشش کی طرف اور اُس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ اور وہ متقی لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

بارہا میرے سامنے لوگوں نے حیرت اور تعجب کا اظہار کیا ہے۔ کہ کیا مقبرہ بہشتی اور بڑھایا جائے گا۔ اور کیا یہ وعدہ بہشتی ہونے کا صرف اس زمین کے متعلق نہیں ہے۔ جو حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے اپنی زندگی میں مقبرہ کے لئے تجویز کی تھی۔ کیا یہ

ہمیشہ کارپردازان مقبرہ بہشتی کی آمدنی کافی ہو جائے۔ تو اُسے بند نہیں کر دینا چاہیئے۔ غرض اس قسم کے خبث اور کنجوسی اور مناقصوں کی مغفرت اور جنت کو محدود کرنے والے خیالات کئی دفعہ سننے میں آئے ہیں۔ گویا لوگ یہ تو پسند کرتے ہیں کہ جہنم ھل من مزید کہتی رہے۔ لیکن جنت میں صرف سو، دو سو آدمیوں سے زیادہ گنجائش نہیں ہونی چاہیئے۔ ورنہ غضب ہو جائے گا۔ یا شاید جنت میں ان کا اپنا مکان یا باغیچہ چھن جائے گا۔ جس کی انہیں ابھی سے فکر پڑی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو قرآن میں یہ فرماتا ہے کہ دوزخ آخر کار خالی ہو جائے گی اور سب بہشت میں چلے جائیں گے۔ اور میری رحمت میرے غضب پر غالب آ جائے گی۔ اور ایک بھی انسان باقی نہیں رہے گا۔ کہ جنت میں داخل نہ ہو جاوے اور جو سب سے آخر میں جاوے گا۔ اس کے پاس بھی اتنا علاقہ ہوگا کہ جتنا کہ دُنیا و مافیہا سے بھی کہیں زیادہ مگر یہ لوگ چند قبروں کی جگہ بھی اپنے بھائیوں کو دینا پسند نہیں کرتے۔ اگر یہ بہشتی مقبرہ انہی لوگوں کے لئے ہے۔ جنہوں نے آخری جنت میں بھی جانا ہے۔ اور وہ جنت ایسی وسیع ہے کہ جہاں کے لئے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ میرا ہر مومن بندہ اس میں آ جائے اور اسی لئے اس نے تمام سلسلہ انبیاء کا قائم کیا۔ اور ساتھ ہی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سلسلہ احمدیہ ترقی کرے گا۔ حتیٰ کہ دُنیا پر حاوی ہو جائے گا۔ اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر مومن ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ تو پھر ایسے خیالات کیا معنے رکھتے ہیں اور ان سوالات کا کیا مطلب ہے۔ سوائے اس کے کہ روافض کی طرح یہ اعتقاد ہو۔ کہ صرف چالیس مومن دنیا میں ہو سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں اور سوائے اہل بیت کے تمام صحابہ اور امت محمدیہ نعوذ باللہ جہنمی ہے۔ مقبرہ بہشتی میں داخل ہونا اور جماعت احمدیہ میں داخل ہونا درحقیقت ایک ہی معنی رکھتا ہے۔ اور یہ کہنا کہ بس اب مقبرہ کا سلسلہ بند کرنا چاہیئے اور ساتھ ہی یہ خواہش رکھنا کہ جماعت احمدیہ بڑھتی جائے اور ترقی کرے۔ متضاد بالکل متضاد خیالات ہیں۔

پس آیت مندرجہ بالا کو پڑھو اور خدا کی مغفرت اور جنت کی حد بست نہ کرو اور جنت کے بانٹنے میں کنجوسی نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم خود نقصان اٹھاؤ۔ کیونکہ جو اپنے بھائی کے لئے جنت کا دروازہ کھولنے میں انقباض پاتا ہے۔ ڈر ہے کہ وہ خود انقباض سے حصہ نہ لے لے۔ (الفضل ۔ جنوری ۱۹۳۹ء)

۴۴۶ ۔ جنتی ہونے کا اصل

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝

(القارعہ : ۸،۷)

یعنی جس کا نیکیوں کا پلڑہ جھک جائے گا اور اُس کی نیکیاں اس کی بُرائیوں سے زیادہ ہوں گی۔ وہ جنت میں داخل ہو کر آرام کی زندگی حاصل کرے گا۔ کم از کم دو دفعہ میں نے دو جنتیوں کی بابت یہ اعتراض بعض لوگوں کو کرتے سُنا۔ کہ ان میں تو یہ یہ عیب اور نقص تھے۔ وہ کس طرح بہشتی مقبرہ دفن ہو گئے۔ پھر بعض لوگوں کو دیکھا۔ کہ ان الزامات کی تردید کرتے تھے۔ کہ نہیں وہ ایسے نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ جو شخص مقبرہ میں دفن ہو گیا وہ بقول خداوندی یقینی جنتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے علم کی بنا پر کہتا ہے کہ اس مدفون میں یہ عیب تھا۔ تو میں تو یہ جواب دیتا ہوں کہ ہاں تھا۔ کیا وہ نبی تھا؟ یعنی معصوم تھا اگر نہیں تو کیا معصوم کے سوا کوئی جنتی نہیں ہوتا؟ اگر ہوتا ہے تو اس کے متعلق خدا تعالیٰ نے کیا قانون بیان فرمایا ہے۔ وہ یہی اصول ہے کہ اگر اس کی نیکیاں اس کی بُرائیوں سے زیادہ ہیں۔ تو وہ جنتی ہے۔ پس چونکہ فلاں شخص بسبب مقبرہ میں مدفون ہونے کے یقینی جنتی ہے۔ اس لئے ہمیں یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ اس میں فلاں فلاں عیب تھا وہ کیونکر جنتی ہو گیا؟ بلکہ یہ کہنا چاہیئے۔ کہ باوجود ان سب عیبوں کے اس کا ایمان اور اس کی نیکیاں اس کی برائیوں سے زیادہ وزنی تھیں۔ اس لئے وہ جنتی ہو گیا۔

۲۲۷۔ پیدائش عالم

اس زمانہ میں یہ دلچسپ سوال بھی اکثر مجالس میں پوچھا جاتا ہے کہ خدا نے عالم کو کیوں پیدا کیا؟ عیسائی بھی اس کا ایک جواب دیتے ہیں اور مسلمان بھی۔ مگر آریہ برخلاف اس کے خدا، روح، مادہ، جگہ اور وقت سب کو قائم بالذات مانتے ہیں۔ اس لئے ان کی طرف سے تو جواب ہی نفی میں ہے۔ کیونکہ وہ عالم کی سب چیزوں کو غیر پیدا شدہ مانتے ہیں۔ اور ایسی ہی ازلی اور ابدی جیسے خود خدا تعالیٰ کا وجود۔

اسلامی اعتقادات کے مطابق پیدائش عالم کی وجہ معلوم کرنے کے لئے ہمیں طبعاً قرآن مجید کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ جو تمام اعتقادات کا منبع اور کلام الٰہی مانا جاتا ہے قرآن مجید اس سوال کا جواب دو حصوں میں دیتا ہے۔

۱۔ پہلا حصہ یہ کہ تمام دنیا اور اس کے متعلقات اللہ تعالیٰ نے اس لئے پیدا کئے ہیں کہ انسان اس سے فائدہ اٹھائے۔ چنانچہ فرمایا جو کچھ ہم نے دُنیا میں پیدا کیا ہے۔ نیز چاند اور سورج اور ستارے وغیرہ سب انسان کے فوائد کے لئے مسخر ہیں۔ اور اسی کے وجود کے نفع کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اس پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر جملہ اشیائے عالم انسان کے لئے ہیں تو پھر انسان کس لئے پیدا کیا گیا ہے؟ اس کا جواب قرآن یہ دیتا ہے کہ

۲۔ انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور بس۔

ان دو باتوں سے یہ واضح ہو گیا کہ آفرینش عالم انسان کے وجود کے قیام کے لئے ہے۔ اس کی علیحدہ اور خاص غرض کوئی نہیں۔ صرف اتنی ہے کہ انسان اس سے فائدہ حاصل

کرے۔ اور اپنا فرض ادا کرے۔ غرض انسان تمام عالم کا مخدوم اور مسجود ہے۔ اصل غرض انسان کا وجود ہے۔ اب اگر ہم کو انسان کی پیدائش کی غرض معلوم ہو جائے تو گویا عالم کی پیدائش کی غرض معلوم ہو گئی۔ سو اس غرض کو کسی مذہبی کتاب نے ایسے صاف اور واضح طور پر بیان نہیں کیا جیسے قرآن مجید نے۔ جو خدا تعالیٰ کی آخری اور بہترین کتاب ہے۔ فرمایا ۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (الذّٰریٰت : ۵۷)

ہم نے جن وانس کو پیدا ہی اس غرض کے لئے کیا ہے۔ کہ وہ ہماری عبادت کریں ۔

یعنی جس طرح انسان تمام کائنات کا مخدوم اور مسجود ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ انسان کا مخدوم اور مسجود ہے۔ اور یہی غرض وغایت تمام مخلوقات کو وجود میں لانے کا باعث ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں یہ سمجھو کہ ایک ایسی ذات ہے۔ جس میں تمام اعلیٰ صفات موجود ہیں۔ کوئی نقص یا عیب یا کمی اس میں نہیں پائی جاتی۔ اس کی قدرت لاانتہا ہے۔ اس کا حسن لازوال ہے۔ اس کا وجود ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ کبھی اسے فنا نہیں۔ ہر حسن ہر احسان بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ اس میں پایا جاتا ہے۔ وہ سراسر محبت ہے۔ سراسر فضل ہے۔ سراسر کرم ہے۔ سراسر سخاوت ہے۔ سراسر رحم ہے اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں۔ اس کے علم میں کوئی نقص نہیں۔ جو چاہے کر سکتا ہے۔ ہر شکستہ کی مرمت ہر مستغفر کی بگار رسے دگند۔ ہر نیکی کرنے والے پر انعام۔ ہر مانگنے والے پر بخشش اس کے اختیار میں ہے۔ وہ ہر کمال کی قدر دانی اور ہر فرمانبردار پر مہربانی کر سکتا ہے۔ ہر صاحب کی ہر خواہش پوری کر دینے کی طاقت ہر آن اور ہر وقت رکھتا ہے۔ سمیع ہے۔ بصیر ہے۔ علیم ہے۔ رحیم ہے۔ کریم ہے۔ سبحان ہے۔ رحمان ہے۔ رب بلکہ رب العالمین ہے۔ مالک بلکہ مالک یوم الدین ہے۔ محیط ہے قدیر ہے۔ حکیم ہے تواب ہے۔ بصیر ہے۔ ولی ہے۔ نصیر ہے۔ عزیز ہے۔ کلیم ہے۔ بدیع ہے معطی ہے۔ شکور ہے۔ غفور ہے۔ قریب ہے مجیب ہے حلیم ہے خبیر ہے۔ واسع بلکہ واسع المغفرۃ ہے۔ اول ہے۔ آخر ہے۔ ظاہر ہے۔ باطن ہے۔ حی وقیوم ہے علی عظیم ہے

غنی حمید ہے۔ مولیٰ ہے۔ وہاب ہے۔ حفیظ ہے۔ شہید ہے۔ رقیب ہے۔ حسیب ہے۔ کبیر ہے۔ عفو ہے۔ غفور ہے۔ عالم الغیوب ہے۔ قاہر ہے اور فاطر ہے۔ شفیع ہے۔ لطیف ہے۔ قوی ہے۔ حمید مجید ہے۔ مجیب ہے۔ فعال لما یرید ہے وال متعال ہے۔ جبار قہار، رزاق، غفار فتاح ہے۔ ملک ہے نور ہے۔ کریم ہے وارث ہے۔ کافی ہے شافی ہے۔ حکم ہے۔ ملیک مقتدر اور متین ہے۔ حکیم ہے۔ خالق ہے۔ باری ہے مصور ہے۔ ہادی ہے۔ قائم بالقسط ہے۔ ودود ہے احد، صمد، لم یلد ولم یولد ہے۔ محی ہے ممیت ہے۔ بر ہے۔ حلیم ہے۔ منعم ہے منتقم ہے۔ معز ہے۔ مذل ہے ذوالعرش العظیم اور ذوالفضل العظیم ہے۔ ذوالجلال والاکرام ہے۔ ضار ہے۔ نافع ہے۔ رشید ہے۔ صبور ہے۔ غنی ہے مغنی ہے۔ پھر اُسی کی ذات خیرالراحمین، خیرالناصرین خیرالرازقین۔ خیرالفاتحین۔ خیرالغافرین۔ خیرالحاکمین اور خیرالمنزلین ہے۔ وہی ہے جو یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ اور عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر ہے اور

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمٰن ، ۳۰)

ترجمہ:۔ وہ ہر وقت ایک نئی حالت میں ہوتا ہے۔

ایسا خدا تھا اور اکیلا تھا۔ نہ اُس سے پہلے کوئی چیز تھی نہ اُس کے برابر کوئی چیز تھی۔ نہ اس سے مستغنی کوئی چیز تھی۔ جو علیحدہ اپنا وجود یا اپنی صفات رکھتی ہو۔ پس اُس سراسر حسن اور سراسر جمال اور سراسر کمال خداوند کی صفات نے تقاضا کیا۔ کہ کوئی ہمارا قدردان ہو۔ کوئی ہمارا دلدادہ ہو۔ کوئی ہمارا فریفتہ ہو۔ حُسن نے محبت کو چاہا۔ اور جمال نے عاشق کو طلب کیا۔ قدرت نے عرض کیا کہ مجھے قدردان کی ضرورت ہے۔ رزاقیت نے کہا۔ کہ میرے جود وسخا کے لئے مرزوق درکار ہے۔ صفت خلق نے کہا کہ میرا جلوہ ظاہر کیجئے۔ رحم نے عرض کیا۔ میں کس پر ابر کرم ہو کر برسوں۔ غفاریت نے التماس کیا کہ میرے لئے مستغفر کی ضرورت ہے لائیے۔ ربوبیت کہنے لگی۔ کہ سب سے وسیع میرے عمل کا میدان

ہے۔ وہ کہاں ہے اُسے ظاہر فرمایئے۔ غرض ہر صفت نے ذاتِ باری سے اپنے ظہور کا تقاضا کیا۔ ہر اسم نے اپنے کمال کی داد چاہی۔ اور ہر حسن نے اپنے قدموں میں عشق کی نذر اور قربانی کا خراج طلب کیا۔ آخر جب صفاتِ باری اور اسمائے الٰہی کے تقاضوں کی صدائیں اس طرح ذاتِ باری کی درگاہ میں بلند ہوئیں۔ اور بارگاہ احدیت میں ان تقاضوں کو حق بجانب قرار دیا تو حکم ہوا کہ اچھا ہم تمہارے تمام مطالبات کو منظور کرتے ہیں اور عدم سے ایک ایسی چیز کو وجود میں لاتے ہیں۔ جس پر تمہارے سب کے تقاضے پورے ہو جائیں۔ وہ خود ہماری صفات کا مظہر ہو۔ اور پھر ہماری ہر صفت اس پر جلوہ گری کرے۔ اُسے ہم اپنی شکل و صفت پر پیدا کریں گے۔ تاکہ وہ قدردان بھی ہو اور سمجھ بھی سکے اور ہمارا تشبہ بھی اختیار کر سکے۔ اسے ہم اتنی عقل دیں گے کہ وہ ہمارے ماسوا سے تعلق قطع کر کے ہم سے اپنا تعلق جوڑے۔ اتنا علم دیں گے کہ ہماری قدرت اور باریکیوں کو سمجھ سکے۔ اتنی محبت دیں گے کہ ہم پر قربان ہو سکے۔ اتنی ہمت دیں گے کہ مصائب کے پہاڑ ہوں تو منہ نہ موڑے۔ اور اتنی وسعت قابلیت اور ظرف دیں گے کہ دائمی اور ابدی ترقی علم حکمت اور معرفت میں کرتا چلا جائے۔ میں اس کا مالک اور خدا ہوں گا۔ اور وہ میرا بندہ اور غلام اپنے لحاظ سے وہ فانی اور نیستی محض ہو گا۔ اور میرے لحاظ سے وہ ایک زندہ وجود اس کی اپنی کوئی مرضی نہ ہو گی۔ بلکہ سراسر میری مرضی اور حکم پہ چلے گا۔ وہ دُنیا میں میرا قائم مقام اور خلیفہ ہو گا۔ اور جو کرے گا میرے حکم اور میری فرمانبرداری کے لئے کرے گا۔ اس کی زندگی۔ اس کی موت۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا اس کا کھانا اس کا پہنا سب میرے لئے ہوں گے۔ اس کی خاطر میں تمام عالم کو مسخر کر دوں گا۔ وہ ہر چیز کا مسجود ہو گا اور میں اُس کا مسجود میں اپنی تمام صفات کا اظہار اس کے سوا اور تمام مخلوقات پر بھی کروں گا مگر میرا خلیفہ اس کے سوا کوئی نہ ہو گا۔ میں اپنے اسماء کے فیض سے ہر مخلوق کو حصہ دوں گا۔ مگر میرا عاشق اس کے سوا کوئی نہ ہو گا۔ میں اپنے فیض سے ہر مخلوق کو بہرہ یاب کروں گا۔ مگر علیٰ وجہ البصیرت میرا قدردان اس کے سوا کوئی نہ ہو گا۔ میں تقدوتہ کا رب ہوں گا

اور ہر ذرہ میری تسبیح کرے گا۔ مگر عبودیت کا مقام سوائے اس کے اور کسی کو عطا نہ ہوگا۔
اور اس درجہ اور مقام کے لئے میں اس کو پیدا کروں گا۔ میں احتیاج اور کمزوری اور مجبوری سے
بے نیاز اور بالاتر خدا ہوں۔ مجھے مخلوق کی طرف کوئی حاجت اور ضرورت نہیں۔ مگر میرا حسن
میرا جمال میری صفاتِ کاملہ تقاضا کرتی ہیں کہ ان کا ظہور ہو۔ ان کی قدردانی ہو۔ ان کا نشہ
ہو۔ ان کا الفاظ چھوٹے نہیں گئے
ا اس لئے ہم نے انسان اور کی خاطر
تمام عالم پیدا کیا اور فرمایا کہ

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ٥ (الذّٰریٰت: ۵۷)

ترجمہ: اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا
کیا ہے۔

یہ ہے غرض اور غایت پیدائش عالم کی جو اسلام نے بیان کی ہے

(الفضل ۲۸ر اگست ۱۹۳۸ء)

باب دہم

سوالات کے جوابات

قرآن سُنّت اور حدیث کے مدارج

ایک سناتا ہوں نکتۂ حکمت　　جس سے احمد کی تجھ کو ہو عظمت
جو خدا نے کہا ہے قرآں میں　　اس کو حاصل ہے سب پہ فوقیت
دوسرا مرتبہ ہے سُنّت کا　　فعلِ حضرتؑ ۔ تعاملِ اُمّت
تیسرا درجہ ہے حدیثوں کا　　کہ حدیثیں ہیں قولِ آنحضرتؐ
تین ہیں یہ ستون مذہب کے　　جن پہ قائم ہے دین اور ملّت
ان مراتب کا گر رکھو گے خیال　　گمرہی سے نہ پاؤ گے زحمت
حق تعالیٰ تمہیں ہدایت دے　　اور ملے تم کو علم اور حکمت

ہے یہ تجدید حضرتِ مہدی
ان پہ لاکھوں سلام اور رحمت

(بخاری ۱۸۹۰ء)

حدث ـــ ایک آریہ کے سوال کا جواب

ایک دن ایک دوست نے ایک آریہ کا یہ اعتراض نقل کیا کہ مسلمانوں کے ہاں حکم ہے کہ جب کسی کی ہوا خارج ہو جائے تو وہ وضو کرے تاکہ پاک ہو کر نماز پڑھ سکے۔ حالانکہ ان کو چاہیئے تھا کہ ہوا خارج ہونے کے مقام کو دھوتے۔ یہ کیا لغو بات ہے کہ یہ ہوا ہاتھ، منہ پیر وغیرہ کو تو اپنی ناپاکی کی وجہ سے ناپاک کر دیتی ہے۔ مگر اس جگہ کو ناپاک نہیں کرتی جہاں سے وہ نکلتی ہے۔ اگر دھونا تھا تو پہلے اس کی جائے خروج یعنی مبرز کو دھویا جاتا نہ یہ کہ غیر متعلقہ اعضاء کو دھونے لگے۔ اور اگر غیر متعلقہ اعضا کو دھونا ہی تھا تو پہلے آبدست کی جاتی۔ پھر وضو کیا جاتا۔ مسلمانوں کی یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ تو ایسا ہے کہ - سوال از آسماں و جواب از ریسماں ۔

جواب

واضح ہو یہ بات تو درست ہے کہ جب کسی ایسی چیز کے نکلنے سے وضو ٹوٹ جائے جو باہر نکلتے ہوئے بدن سے لگ جائے۔ جیسے پاخانہ۔ مذی، خون تو واقعی یہ ضروری ہے کہ پہلے اس گندگی کو دھویا جائے۔ بعد میں تازہ وضو کیا جائے۔ لیکن ہوا ایسی چیز نہیں ہے نہ وہ بدن کے کسی حصّہ کو آلودہ کرتی ہے نہ پہنے ہوئے کپڑے کو دیگر نجاستوں کی طرح چمٹ کر ناپاک کرتی ہے۔ نہ بدن پر اپنا اثر باقی چھوڑتی ہے۔ اس لئے اس پر وہ

حکم جاری نہیں ہوسکتا ۔ جو چمٹ جانے والی اور لگ جانے والی نجاستوں پر ہوتا ہے۔ اگر انسان کی ہوا خارج ہونے کے بعد مقام ریح کو دیکھا جائے۔ تو کوئی نشان یا گندگی یا اثر اس کا وہاں پایا نہیں جاتا۔ پس یہ ظاہر ہے کہ اس مقام کو دھوتے پھرنا فضول بے معنی اور تکلیف مالایطاق ہے ۔ اسلام نے کمال حکمت سے اُسے بدنی نجاستوں میں شمار ہی نہیں کیا۔ یعنی ایسی نجاستوں میں جو بدن کو لگ کر ناپاک کر دیتی ہیں۔ نہ اسلام کے سوا کسی اور شریعت میں ایسا حکم ہے۔ شاید وہمی اور پاگل لوگ ہوا خارج ہونے کے بعد آبدست کرتے ہوں گے۔ غالباً آریہ صاحبان بھی نہیں کرتے۔ پس یہ مسئلہ تو صاف ہو گیا کہ ہوا کے اخراج کے بعد طہارت یعنی آبدست ایک فعل لغو ہے ۔

اب صرف اس بات کا جواب رہ گیا کہ پھر مسلمان ریح کی وجہ سے نیا وضو کیوں کرتے ہیں ؟ یہ تو ہم کہہ چکے ہیں کہ نئے وضو کی وجہ مقامی گندگی یا نجاست نہیں ہے ۔ اور نہ دنیا میں کوئی عقل مند خواہ کسی مذہب کا ہو۔ اُسے مقامی گندگی تسلیم کرتا ہے۔ ہوا اندر پیٹ میں سے آتی ہے۔ اور ایک راستہ میں سے ڈکار یا جمائی کی طرح نکل جاتی ہے۔ اور اس مقام کو گندگی سے بھر کر اور نجاست میں لتھیڑ کر نہیں جاتی جس میں سے وہ نکلتی ہے۔ پس وہاں کی مقامی صفائی فضول ہے۔ اگر محض ریح کا نکلنا مبرز کو گندہ کر دیتا تو پھر وہ ریح باہر نکل کر مجلس میں جس جس چیز کو لگتی۔ وہ چیز بھی گندی ہو جایا کرتی۔ اور ضروری ہوتا کہ ہم اپنی دھوتیوں اور پاجاموں کو اور اس مکان کی دیواروں کو اور اپنے تمام جسم کو نیز اس مجلس کے بیٹھنے والے سب کے سب اپنے بدنوں کو دھویا کرتے اور غسل کیا کرتے۔ جس طرح پیشاب یا پاخانہ کے چھینٹوں کے پڑنے کے بعد ہر شخص ان چیزوں کو دھویا کرتا ہے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اور یہ بات خلاف عقل اور خلاف رواج معروف ہے ۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ مبرز پلید نہیں ہوا اور مہاشہ صاحب محض تمسخر اور بیہودگی کی وجہ سے ایسا اعتراض کرتے ہیں ۔ ان کا اعتراض صرف یہ ہو سکتا تھا کہ ریح کے بعد تجدید وضو

کیوں کیا جاتا ہے ۔ اور بس ۔

آریہ لوگ غالباً یہ خیال کرتے ہیں کہ وضو صرف جسم کی جسمانی صفائی کے لئے کیا جاتا جاتا ہے ۔ حالانکہ وضو کا مقصد اس سے اعلیٰ اور ارفع ہے ۔ وضو نہ صرف ایک مختصر غسل ہے ۔ اور تمام ضروری اور منکشف اور برہنہ رہنے والے اعضا کو اس میں دھوکر پاک کیا جاتا ہے ۔ بلکہ ہر وضو کے لئے لازماً ایک روحانی طہارت دینے والا دعا بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے ۔ مثلاً کُلّی صرف اس لئے نہیں کی جاتی کہ مُنہ سے گندے اور خراب ذرے خوراک کے صاف ہو جائیں بلکہ اس سے زیادہ ضروری یہ روحانی امر مدِّ نظر رکھا جاتا ہے ۔ کہ میں جس طرح ظاہری کُلّی کرتا ہوں ۔ اسی طرح مُنہ کی اخلاقی اور روحانی نجاستوں مثلاً جھوٹ غیبت ، گالی چغل خوری افترا ۔ حرام خوری وغیرہ سے اپنے منہ کو دھوتا اور پاک کرتا اور ان معائب سے توبہ کرتا ہوں اور پچھلی غلطیوں کی معافی اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہوں اور ان کے نقصانات اور سزاؤں سے بچنے کے لئے دُعا کرتا ہوں ۔ یہ تو صرف کُلّی ہوئی اسی طرح منہ ہاتھ دھونے ناک صاف کرنے اور اس میں پانی ڈالنے اور بانہیں دھونے ۔ سر اور کان اور گردن کا مسح کرنے اور پیروں کے دھونے کا ایک جسمانی مطلب ہے ۔ اور ایک اخلاقی اور روحانی ۔ یہاں اس تفصیل کی گنجائش نہیں ۔ پس وضو صرف جسمانی پاکیزگی ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ روحانی تطہر کے لئے بھی ہے ۔ بلکہ مزید براں جب ایک مسلمان نماز کی تیاری کرتا ہے ۔ تو وہ نہ صرف وضو کرتا ہے بلکہ اپنے کپڑوں اور اپنی نماز کی جگہ کو بھی پاک و صاف کرتا ہے ۔ اور جہاں تک ہو سکتا ہے ۔ اس کا ماحول جسمانی صفائی اور روحانی پاکیزگی کا مجموعہ ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مسجدوں میں خصوصاً جمعہ کے دن مسجد میں علاوہ وضو کے غسل کر کے کپڑے بدل کر اور خوشبو لگا کر جانے کا حکم ہے ۔ اور مسجدوں میں خوشبو جلانے کی تحریص دی گئی ہے اور بڑے بڑے پیغمبروں تک کو حکم ہوا ہے کہ مسجدوں کو پاک صاف رکھا کریں جیسا کہ

اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (البقرہ ۱۲۶)

سے واضح ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کو فرماتا ہے کہ میرے گھر کو طواف کرنے والو، معتکفوں اور نمازیوں کے لئے پاک صاف رکھا کرو) پس یہ وہ ماحول ہے جس میں مسلمان نماز پڑھتا اور جنابِ الٰہی کے دربار میں حاضر ہو کر اس سے دعائیں مانگتا ہے

اب غور کرو۔ کہ اگر ایسی پاک جگہ اور پاک ماحول میں اتفاقاً کسی شخص کی ریح خارج ہو جائے۔ تو صاف ظاہر ہے کہ وہ پاکیزگی ستھرائی اور تقدّس کا قلعہ جو اس نے اپنے گرد بنایا تھا وہ ٹوٹ جائے گا اور اس پر پہلی حالت کو دوبارہ لانے کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پھر وضو کر کے پاک ہو کر اپنے مقام پر واپس آوے۔

ریح بہر حال، ایک بدبودار چیز ہے اور بدبو بھی انسان کے شکم کی تعفن والی گیسوں کی۔ نکلتے ہی اس کا اثر خود اس شخص پر ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ حس بصر کے اعصاب آنکھوں سے چل کر دماغ کے پچھلے حصہ میں ختم ہوتے ہیں سا دہ دماغ کا پچھلا حصہ ہی ہے جو دیکھنے والا حصہ ہے۔ اس طرح حسِ سمع کے اعصاب دماغ کے درمیانی حصّہ میں اپنی خبریں پہنچاتے ہیں۔ مگر برخلاف ان کے سونگھنے کا حصہ دماغ کا سب سے اگلا یا سامنے کا حصّہ ہے۔ اور آنکھ کے اعصاب کی طرح ناک کے اعصاب وہاں نہیں پہنچتے۔ بلکہ دماغ کا ایک حصّہ خود ناک کے اندر آگیا ہے۔ گویا کہ دیگر حسّوں کو اعصاب دماغ تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن قوتِ شامہ بذریعہ اعصاب کے دماغ تک نہیں پہنچتی۔ بلکہ دماغ براہِ راست خود سُونگھتا ہے جو توسط ایسے اعصاب کے جیسے کہ بصر سمع یعنی آنکھ کان وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ پس دماغ انسانی ساخت کے لحاظ سے قوتِ شامہ سب حسّوں سے اعلیٰ اور افضل ہے کیونکہ دماغ کا سب سے اگلا اور سامنے والا حصہ بغیر توسط عام اعصاب کے براہِ راست خوشبو اور بدبو کو سونگھتا اور اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اس قسم کی بناوٹ کے علاوہ خود ہمارا ذاتی تجربہ بھی یہی ہے کہ انسان خوشبو اور بدبو سے بہت جلد متاثر ہوتا ہے۔ ذرا سی بدبو سے اس کی ساری بشاشت اور فرحت میل بہ کراہت اور رنجیدگی ہو جاتی ہے۔

اور طبیعت کا امن اور سکون اور یکسوئی اور اطمینان تھوڑے سے تعفن سے غارت ہو کر روح منغض اور طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ اور صفائی۔ پاکیزگی اور تطہر کا احساس یکدم تباہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ مسجد جیسی پاک جگہوں میں یہ حرکت نہ کی جائے۔ اور اگر اتفاقی طور پر صادر ہو جائے۔ تو پھر نئے سرے سے وضو کر کے پاکیزگی اور تطہر کا نیا ماحول قائم کیا جائے کیونکہ دماغ بدبُو سونگھنے کے بعد منغض ہو کر نماز اور دُعا میں وہ بشاشت اور راحت نہیں پاتا جو ہونی چاہیئے۔ اور چونکہ بشاشت اور راحت ہی کی وجہ سے یکسوئی میسر آتی ہے۔ اور عبادت یکسوئی پر منحصر ہے اس لئے دوبارہ وضو کر کے پھر اس حالت کو قائم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ سو یہ توجیہ ہے کہ ریح کے بعد وضو کیا جاتا ہے۔ اور ریح کی جگہ کو دھویا نہیں جاتا۔

اب صرف ایک اعتراض باقی رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ جب کوئی شخص کسی قسم کی بدبو سونگھے۔ خواہ وہ اپنی ہو یا غیر کی۔ یا کسی نالی کی۔ گندگی کے ڈھیر کی۔ تو اس کا وضو ضرور ٹوٹ جانا چاہیئے۔ اور اُسے بھی تازہ وضو کرنے کا حکم ہو۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ جس قدر اپنی خارج بدبُو کا بسبب قرب کے اپنے دماغ پر اثر ہوتا ہے۔ اس قدر دوسرے کا اور غیر کا نہیں ہوتا۔ اگر یہ مسئلہ ہر شخص پر حاوی کر دیا جاوے۔ تو انسانوں کے لئے نماز جیسی عبادت تکلیف مالایطاق ہو جائے۔ پس عوام کے لئے تو یہ مسئلہ ہے۔ کہ صرف اپنی ریح کے خارج ہونے پر وضو کی تجدید کر لیا کریں۔ لیکن خواص کے لئے واقعی یہی مسئلہ ہے کہ ہر نماز سے پہلے خواہ پہلا وضو موجود بھی ہو تب بھی وہ نیا وضو کر لیا کریں۔ اس میں بڑی فضیلت اور ثواب ہے جیسا کہ ترمذی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان موجود ہے

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من توضأ علیٰ طُهرٍ کُتِبَ لَهٗ عشر حسناتٍ

یعنی جو شخص باوضو ہونے کے باوجود پھر اگلی نماز کے لئے نیا وضو کرے۔ اس کے

اعمال نامہ میں دس نیکیاں مزید لکھی جائیں گی ۔ اس کا یہی مطلب ہے ۔ کہ گو ظاہری شرع کے لحاظ سے اس کا وضو ٹوٹتا نہیں ۔ مگر دوسروں کی بدبو وغیرہ سے اس کے دماغ پر اثر ہو سکتا ہے ۔ پس ہر نماز سے پہلے وہ شخص اگر پاکیزگی ۔ صفائی اور تطہر کا ایک علقہ نئے سرے سے بنایا کرے ۔ تو اس کی توجہ دُعا اور عبادت میں زیادہ یکسوئی زیادہ انبساط اور زیادہ بشاشت میسر آجائے گی ۔ اور لازماً نیکی کا پلہ بھاری ہو جائے گا ۔ پس خواہ ایک نماز پڑھ کر دوسری تک وضو قائم بھی رہے ۔ پھر بھی شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فضیلت اسی بات میں قرار دی ہے ۔ کہ اس دوسری نماز کے لئے بھی نیا وضو کیا جائے تو افضل ہے ۔ ہاں اگر ہر شخص کو یہ حکم دے دیا جاتا تو عوام کے لئے جبت دقت ہو جاتی ۔ اس لئے صرف اعلیٰ طبقہ کے لئے یہی مناسب قرار دیا گیا ہے ۔ اور اس کی فضیلت بیان کر دی گئی ۔

(الفضل ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۳ء)

اسلام اُن ممالک میں جہاں دن اور راتیں بہت لمبی ہوتی ہیں

سوال

چند روز ہوئے کہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے ایک نشان کے متعلق ایک عزیز کا خط آیا۔ اُس حصہ کا جواب ایک حد تک دے چکا ہوں۔ اس خط کا دوسرا حصہ یہ ہے "غیر مسلموں کا اعتراض ہے کہ چونکہ نمازوں کا تعلق سورج سے ہے اور زمین کے اس حصہ پر جہاں چھ ماہ مسلسل دن اور رات رہتے ہیں۔ اس نماز کو سورج کے اوقات کے مطابق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لحاظ سے ثابت ہوا کہ اسلام عالمگیر مذہب نہیں ہے۔"

جواب

جواباً عرض ہے۔ کہ اگر عالمگیر مذہب ہونے کے یہ معنے ہیں کہ تمام دُنیا مسلمان ہو جائے گی تو یہ بات تو بالبداہت غلط ہے اور نہ اسلام نے کبھی ایسا دعوے کیا بلکہ بخلاف اس کے یہ کہا ہے۔ کہ دیگر مذاہب بھی قیامت سے پہلے تک دُنیا میں قائم رہیں گے۔ بلکہ قیامت سے پہلے تو دنیا میں کفار ہی کفار ہوں گے۔ ہاں اگر عالمگیر کے یہ معنے ہیں۔ کہ ہر ملک اور قوم کا انسان اُسے قبول کر سکتا ہے اور یہ دین ایک۔ آسان دین ہے۔ اور ہر تنگی

کا جو ملک، موسم، بیماری، سفر اور پیداوار وغیرہ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا اسلام میں علاج موجود ہے۔ تو ان معنوں میں واقعی یہ عالمگیر مذہب ہے۔

ہر تنگی کا علاج

اگر قطب شمالی پر ایک مسلمان پہنچ جائے گا۔ تو اس کا دین اُسے کوئی تکلیف نہیں دے گا۔ اور جو جو سہولتیں اسے درکار ہوں گی۔ انہیں مہیا کر دے گا۔ اور اگر صحرائے افریقہ میں کوئی مسلمان چلا جائے گا۔ تو وہاں بھی اس کے لئے جو جو سہولتیں ضروری ہیں۔ اسلام سب کو مہیا کرے گا۔ اور کبھی اس کو یہ شکایت پیدا نہ ہوگی کہ افسوس مسلمان ہونے کی وجہ سے مجھے یہ مالا یطاق تکلیف محسوس ہوئی۔ پانی نہ ملے گا۔ یا سخت سرد پانی کی وجہ سے بیماری کا خطرہ ہوگا تو تیمم کرے گا۔ قبلہ کا رُخ معلوم نہ ہوگا۔ تو اندازہ کرکے نماز پڑھے گا۔ ضرورت کے وقت نمازیں جمع کرے گا۔ سفر اور مرض میں روزہ چھوڑ دے گا۔ مسافر ہوگا تو نمازیں قصر کرے گا۔ ضرورت حقہ پر چار بیبیاں تک کرے گا۔ بھوکا مرنے لگے گا۔ تو سؤر تک قرآنی اجازت کے مطابق کھا لے گا اور اپنی جان بچانے کے لئے سیلف ڈیفنس میں حملہ آور کو قتل بھی کر دے گا۔ نیز ضروری علاج کے طور پر شراب بھی استعمال کرے گا۔ غرض

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (الحج ۹۰)

ترجمہ: اور دین (کی تعلیم) میں تم پر کوئی تنگی کا پہلو اختیار نہیں کیا۔

کے مطابق اس کے دروازے کشادہ ہیں۔ کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہی ایک مذہب دراصل عالمگیر مذہب ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آئس لینڈ اور گرین لینڈ کے باشندے اگر مسلمان ہو جائیں تو ان کے لئے بھی اسلام نے سہولت کے ویسے ہی راستے کھول رکھے ہیں۔ جیسے دنیا کے دیگر ہر حصہ اور ہر خطہ کے باشندوں کے لئے

لمبے دن اور لمبی راتیں

واضح ہو کہ برف اور سردی کی شدت کی وجہ سے انسانی آبادی گرین لینڈ وغیرہ میں بہت کم ہے۔ اور یہ لوگ غیر مہذب اور وحشی ہیں اور لاکھوں مربع میل زمین پر صرف چند ہزار نفوس کی آبادی ہے اور بس۔ گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ دنیا کا ایک غیر آباد حصہ سمجھنا چاہیئے۔ ہاں البتہ ناروے، سویڈن اور فن لینڈ کے شمال میں کچھ حصہ ملک کا ایسا ہے جہاں کانیں یا لکڑیوں کے جنگل ہونے کی وجہ سے کچھ بستیاں اور کارخانے موجود ہیں اور یورپ کے لوگ وہاں کاروبار کے لئے جاتے اور رہائش اختیار کرتے ہیں۔ مگر یہ سب آبادیاں ایسی جگہ واقع ہیں جہاں زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی ماہ کا دن اور دو ڈھائی ماہ کی رات ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ شمال میں انسان نہیں رہ سکتا۔ ۶ ماہ کا دن اور ۶ ماہ کی رات صرف قطب شمالی اور قطب جنوبی کے ایک محدود علاقہ میں ہوتی ہے جہاں ریچھ تو ملتا ہے مگر انسان نہیں پایا جاتا۔ سوائے کسی سائنسدانوں کی مہم کے جو وہاں پر عارضی طور پر گئی ہو۔ قطب سے ورے جتنے علاقے ہیں سال میں پھر دن اور رات چھوٹے چھوٹے ہوتے جاتے ہیں۔ یعنی مثلاً ۵، ۵ مہینے کے پھر اور ورے آکر ۴-۴ ماہ کے۔ پھر ۳-۳ ماہ کے پھر ۲-۲ ماہ۔ اور یہاں سے پھر ایسا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ جہاں کہیں کہیں آبادیاں اور کارخانے پائے جاتے ہیں۔ آخر خطِ استوا کی طرف آتے آتے دن اور راتیں چھوٹی ہوتے ہوتے اسی انداز پر آجاتی ہیں جیسے ہمارے ملک میں ہیں۔ مگر باوجود لمبے دنوں اور لمبی راتوں کے ان ممالک میں جا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا سوائے بھی دن کے وقت خواہ دو مہینہ برابر سورج نکلا رہے مگر وہ سورج آسمان پر گول گول دائروں کے چکر کی چال چلتا رہے گا جس میں ہر دائرہ میں سورج کا سفر ہمارے ملک کے ایک دن رات کے برابر ہوگا۔ یعنی گو سورج وہاں ہمارے ساٹھ دن کے برابر نکلا رہے گا۔ مگر ساٹھ دفعہ وہ آسمان پر پھر

چوبیس گھنٹہ میں ایک دائرہ Circle بھی بنایا جائیگا۔ جس سے لوگوں کو یہ اندازہ ہو جائے گا۔ کہ مثلاً مکہ معظمہ میں (جو خط استوا کے نزدیک ہے) اس وقت فجر کا وقت ہے اور اس وقت دوپہر کا ہے اور اس وقت شام کا وقت ہے۔ اور اب آدھی رات کا۔

دن رات کا اندازہ

سو یہ تو قسمت کا اندازہ ہوا۔ مگر ہم کو بالکل اس کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ جہاں کارخانے، کانیں اور فیکٹریاں ہیں وہاں جب دو مہینے رات ہوتی ہے تو وہ رات کا علاقہ بجلی سے روشن رہتا ہے۔ بازاروں اور کارخانوں میں باقاعدہ کام ہوتا رہتا ہے۔ لوگ کھاتے بھی ہیں، سوتے بھی ہیں۔ رفع حاجت بھی کرتے ہیں۔ ۸ گھنٹہ کام کرکے باقی گھنٹے کارخانے سے تعطیل بھی مناتے ہیں اور یہ سب چوبیس گھنٹہ کے حساب پر ہوتا ہے۔ نہ کہ دو ماہ والے دن کے حساب پر۔ یہ نہیں ہوتا۔ کہ جب اس علاقہ میں دو ماہ کی رات ہو تو وہاں کے لوگ دو مہینے سوتے رہیں اور جب دو ماہ کا دن ہو تو دو ماہ برابر جاگتے رہیں اور دو مہینے والے دن میں ایک دفعہ قضائے حاجت کریں۔ اور صرف دو دفعہ کھانا کھائیں۔ اور اس علاقے میں نو سے سال بچہ ماں کے پیٹ میں رہ کر اور حمل کی مدت اس علاقہ کے دنوں کے مطابق پوری کر کے پیدا ہو۔ بلکہ وہاں بھی اوقات کا یہی حساب ہے جو ہمارے ملک میں ہے۔ خواہ سورج دو ماہ تک برابر نکلا رہے یا چھپا رہے۔ مگر کام کاج کے لئے اور قدرتی ضروریات کے لئے وہ ساٹھ دن کے برابر شمار ہوگا نہ کہ ایک دن۔ ہر شخص کے پاس وہاں گھڑیاں ہیں۔ کیونکہ انہی گھڑیوں کے اوقات پر ان لوگوں کے سب کاموں اور زندگی کا مدار ہے۔ ہر کارخانے میں گھنٹے، کلاک اور ہر فیکٹری میں گھگو اور سیٹیاں بجتی ہیں۔ پس یہ سب چیزیں جو اور دیگر حوائج زندگی کے لئے کام آتی ہیں نماز اور روزے کا وقت بتانے کے لئے بھی کام آسکتی ہیں۔ اگر کوئی مسلمان ایسی جگہ چلا جائے تو وہ وہاں مثلاً لندن کے

اوقات کے مطابق اپنی گھڑی سے ۸ بجے صبح کی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اور ۲ بجے ظہر کی ۔ اور ۵ بجے عصر کی اور ۹ بجے مغرب کی اور ۱۱ بجے عشا کی ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ حالانکہ ان سب اوقات میں سورج باہر موجود ہوگا ۔ یا بالکل غائب ہوگا ۔ بس وہاں اندازہ اور حساب جس طرح ہر دوسری چیز پر چلتا ہے ۔ نماز اور روزہ پر بھی چلے گا ۔ اور گھڑیوں کے اوقات پر چلے گا نہ کہ سورج پر ۔

ترمذی کی حدیث

اب میں ترمذی کی ایک حدیث کا حوالہ دیتا ہوں جس میں نواس بن سمعان رضؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث مسیح موعود اور دجال کے زمانہ کی بابت بیان کرتے ہیں ۔ جس میں آپؐ نے فرمایا کہ اُس آخری زمانہ میں دن لمبے ہو جائیں گے حتیٰ کہ بعض دن ایک سال کے برابر ہوگا ۔ صحابہ نے پوچھا ۔ یا رسول اللہ جو دن کہ ایک سال کے برابر ہوگا کیا اس دن ہم کو ایک دن کی صرف پانچ نمازیں ہی کافی ہوں گی ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں ۔ بلکہ اندازہ کرنا پڑے گا ۔

قلنا یا رسول اللّٰہ فذالک الیوم الذی کسنۃ ایکفینا فیہ صلوٰۃ یوم قال لا اقدروا لہ قدرہ ۔

ہم نے عرض کیا ۔ اے رسولؐ اللہ وہ دن جو سال بھر کے برابر ہوگا ۔ کیا ہم کو اس میں ایک دن کی نمازیں کافی ہوں گی ۔ فرمایا نہیں ۔ بلکہ اندازہ کرنا نمازوں کے اوقات کا ۔ اور اب تو ایسے مقامات پر گھڑیوں گھنٹوں ۔ کلاکوں ۔ گھگوؤں ۔ سیٹیوں ۔ گھنٹیوں ۔ توپوں وغیرہ سے ایسے اندازہ میں کوئی دقت ہی نہیں ۔ کیا اگر لاہور میں آٹھ دن ابر کی وجہ سے سورج نہ نکلے گا تو نمازیں ضائع ہو جائیں گی ۔ اور اسلام پر حرف آجائے گا ۔ پس جو انتظام لاہور والے ایسے وقت میں اپنی گھڑیوں سے کریں گے ۔ وہی قطب شمالی والے بھی کریں

گے۔ کیونکہ جو چیز لاہور میں جائز ہے وہ کسی اور ملک میں بھی جائز ہو سکتی ہے اور جو چیز آٹھ دس دن کے لئے صحیح ہو سکتی ہے وہ سال بھر کے لئے بھی درست ہو سکتی ہے۔

پس یہ ہے اسلام کی عالمگیری کہ ہر جگہ کے لئے آسانی اور مسئلہ موجود ہے۔

گھڑی کی ضرورت

اور یہ وقت بھی نہیں ہے کہ ہمیں ایسے ملکوں اور مقامات پر صرف نماز اور روزہ کے لئے گھڑیاں خریدنی ہوں گی۔ بلکہ ایسے مقامات پر چونکہ لوگوں کا اپنا کام بھی بغیر گھڑیوں کے نہیں چلتا۔ اس لئے ہر شخص گھڑی رکھتا ہے۔ اور اس کے لئے گھڑی رکھنی اپنے دیگر ضروری امور کے لئے لازمی ہے پس وہی گھڑی نماز روزہ کے لئے بھی کام دے سکتی ہے۔

خواہ مخواہ کی پیچیدگی

معترض نے خواہ مخواہ اس سوال کو پیچیدہ کر دیا تو وہ یہ اعتراض بھی کر سکتا تھا کہ روزہ سورج سے وابستہ ہے۔ جب ابر آجائے اور سورج دکھائی نہ دے تو روزہ کس طرح کھلے گا۔ اور جب روزہ ہی نہ کھل سکا تو اسلام عالمگیر مذہب کس طرح ہوا؟ یا سمندری جہاز پر کوئی مر جائے۔ اور اس کی قبر زمین میں نہ کھودی جا سکے۔ اور نعش دریا بُرد کر دی جائے تو اسلام عالمگیر مذہب کس طرح ہوا؟ پس ان سب سوالوں کا جواب یہی ہے کہ عالمگیر کے معنے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اس کے صرف اتنے معنے ہیں کہ ہر مشکل جگہ کوئی نہ کوئی سہولت اسلام نے بیان کر دی ہے۔ یہ مراد نہیں کہ خواہ قطب شمال ہو یا سمندر ہو۔ ہر جگہ ہندوستان والے مسائل ہی چلا کریں یا ہر بات کے لئے صرف ایک ہی مسئلہ بیان کیا گیا ہو۔ بلکہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام نہایت مطابق عقل اعلیٰ مذہب ہونے کے علاوہ نہایت آسان اور نہایت لچکدار Elastic مذہب بھی ہے اور یہ تینوں خوبیاں مشترکہ طور پر کسی اور مذہب

میں نہیں پائی جاتیں ۔ ورنہ وہ عالمگیر مذہب نہیں ہو سکتا تھا ۔ اسلام صرف چند عملی رسوم کا نام نہیں ہے کہ اگر وہ اپنی ظاہری صورت پر پوری نہ ہوں گی تو نجات نہ مل سکے گی ۔ بلکہ اسلام درحقیقت خدا شناسی اور پھر اُس خدا کی کامل فرمانبرداری کی رُوح کا نام ہے ۔ خواہ کسی مقام یا ملک میں کوئی عملی حصہ ادا نہ بھی ہو سکے ۔ حالانکہ دیگر مذاہب کا تو یہ حال ہے کہ وہ

؎ بُت ترک کر کے پھر بھی بتوں کے غلام ہیں

یہی وجہ ہے کہ معترض کہتا ہے کہ نمازوں کا تعلق سُورج سے ہے ۔ حالانکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ نماز ایک خاص دُعا ہے ۔ اور اس کا تعلق خدا سے ہے ۔ نماز کے اوقات تو صرف آدابِ نماز میں داخل ہیں ۔ اور جہاں میسر نہ آسکیں گے ۔ وہاں ہم کوئی اور مناسب راستہ اختیار کریں گے ۔ کیونکہ شریعت نے ایسے راستے بتانے میں بخل نہیں کیا ۔

نہایت عجیب دلیل

اور جو حدیث گذری ہے جس میں دن ایک سال کا مسیح موعود کے زمانہ میں بتایا گیا ہے ۔ وہ آج کل بالکل صحیح ثابت ہو رہی ہے ۔ یعنی اس زمانہ میں بعض لوگ عین قطب شمالی یا جنوبی تک جا پہنچیں گے ۔ جہاں وہ چھ مہینہ کا دن اور چھ مہینہ کی رات پائیں گے ۔ گویا پورا دن رات (یوم) وہاں کا ایک سال کا ہوگا ۔ پس یہ پیشگوئی بھی مع اپنی تفصیل کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منجانب اللہ صادق نبی ہونے پر ایک نہایت عجیب دلیل ہے ۔

بالآخر یہ عرض ہے کہ اسلام تین وجوہ سے عالمگیر مذہب ہے ۔

۱ ۔ ایک تو یہ کہ وہ مختص بالملک اور مختص القوم مذہب نہیں ہے ۔ اس کی تبلیغ عام اور کافۃ للناس کے لئے ہے ۔

۲ ۔ دوسرے یہ کہ ہر انسان اس کو بغیر تکلیف مالایطاق کے دُنیا کے ہر حصّہ میں اختیار

کر سکتا ہے اور کوئی تنگی اور حرج اس کے راستہ میں نہیں ہے اور یہ ہر شخص ہر ملک اور ہر قوم کے لئے آسانی کے ساتھ قابل عمل ہے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ اسلام اپنی ظاہر طاقت کے ساتھ جملہ مذاہب پر غالب آچکا ہے۔ اور دلائل سے تو ہمیشہ ہی غالب ہے۔ مگر اب مسیح موعود آپ پر سلامتی ہو کی بعثت کے بعد روحانی نشانات اور الٰہی تائیدات کے ساتھ ظاہری اور باطنی طور پر پھر اس طرح غالب ہو جائے گا کہ دوسرے مذاہب کے پیرو اس کے متبعین کے سامنے خشل سانس، شوریدہ اور خانہ بدوش قوموں کے مغلوب، پست اور ذلیل ہو جائیں گے۔ کیونکہ حقیقتاً زندہ اور بابرکت مذہب یہی اور صرف یہی ہے۔ عالمگیر ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باقی مذاہب کے پیرو دُنیا میں رہیں گے ہی نہیں کیونکہ ؎

گر نبودے در مقابل رُوئے مکروہ وسیہ
کس چہ دانستے جمال شاہد گلفام را

(الفضل ۱۳، ۱۴؍ اکتوبر ۱۹۴۳ء)

بسم اللہ پڑھ کر بندوق کا شکار تو حلال ہو جاتا ہے مگر جھٹکا حرام کا حرام ہی رہتا ہے

ایک دوست نے یہ لکھا ہے کہ "تیر بندوق اور شکاری جانوروں کے ذریعے خدا کا نام لے کر مارا ہوا۔ جانور جب حلال ہے۔ تو خدا کا نام لے کر جھٹکا شدہ جانور کیوں جائز نہیں؟ اور اسے حرام کیوں قرار دیا جاتا ہے۔

جواب:۔ میرے خیال میں اسی سوال کو اگر مجھے لکھ کر بھیجنے کی بجائے وہ دوست خود ہی چند دفعہ غور سے پڑھ لیتے۔ تو جواب ان کو سوجھ جاتا۔ اور مجھے لکھنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ یا مارا ہوا جانور کی جگہ مارا ہوا ہرن پڑھ لیتے اور جھٹکا شدہ جانور کی جگہ جھٹکا شدہ بکرا لکھ دیتے۔ تو جواب نظر کے سامنے آپ ہی آپ آجاتا۔ یہ سب غلط فہمی اسی وجہ سے پیدا ہوئی۔ کہ انہوں نے شکار اور گھریلو جانوروں میں فرق نہیں کیا۔ اور دونوں قسم کے جانوروں پر جو بالکل الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں ایک ہی مسئلہ کو لگانا چاہا۔ حالانکہ شکار کے احکام میں اور گھریلو جانوروں کے احکام میں شریعت نے فرق رکھا ہے۔ اور وہ عین عقل کے مطابق ہے۔ مثال کے طور پر ذبیحہ اور شکار میں کچھ اسی قسم کا تفاوت ہے۔ جیسا کہ حضر کی نماز اور سفر کی نماز میں۔ یا جیسا کہ تندرست کی نماز اور مریض کی نماز میں۔ ایک شخص حضر میں چار رکعتیں پڑھتا ہے تو سفر والا دو رکعتیں۔ اور تندرست کھڑا ہو کر پڑھتا ہے۔ تو بیمار بیٹھ کر اور تیمم کر کے پڑھتا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر اور مطابق عقل ہے۔ یعنی یہ کہ حالات مختلف

ہیں۔ سفر اور مرض میں بعض دقتوں اور تکالیف کا سامنا ہوتا ہے۔ اس لئے مذہب کی طرف سے رعایت ہونی ضروری ہے۔ اور یہی اسلام کی فضیلت ہے کہ حالات کے مطابق احکام دیتا ہے۔ کیونکہ یُسر اور آسانی اس کا بنیادی اصول ہے۔ نہ کہ تنگی اور سختی۔ پس آپ سمجھ لیں کہ اس معاملہ میں بھی جنگلی تیتر اور چیز ہے اور گھر کی مُرغی اور چیز۔ گھریلو جانور چونکہ ہمیشہ اپنے قبضہ میں اور مجبور رہتا ہے۔ اس لئے اس کے ذبح کے لئے الگ اور مخصوص احکام ہیں اور اس کا ذبح ہمیشہ ایک ہی طریقہ پر ہوگا اور ہونا چاہیئے۔ برخلاف اس کے شکار ایک بھاگنے والا اور اُڑنے والا اور وحشی جانور ہوتا ہے۔ اس لئے کئی طرح اس کا مارا جانا جائز ہے۔ غلیل سے بھی بندوق سے بھی۔ تیر سے بھی نیزہ سے بھی اور کئی اور قسم کے ہتھیاروں اور آلات سے بھی بلکہ چیتے، کُتے، باز اور شکرے سے بھی۔ اور ان میں سے ہر قسم کا ہتھیار الگ طرح کا زخم اور مختلف قسم کی چوٹ شکار کے جسم پر لگاتا ہے۔ ساتھ ہی یہ کہ شکار بسبب آزاد اور وحشی ہونے کے ان ہتھیاروں کی ضربات کو نئے نئے رنگ میں برداشت کرتا ہے۔ کبھی تیر اس کی آنکھ میں لگتا ہے تو کبھی اس کا پیٹ پھاڑ دیتا ہے کبھی پُٹھے پر لگتا ہے۔ تو کبھی گردن پر۔ کبھی شکار زخمی ہو کر اتنی دُور چلا جاتا ہے کہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے گھنٹوں میں ملتا ہے۔ اور پھر مرا ہوا۔ اور کبھی چوٹ لگتے ہی آناً فاناً اس کا دم نکل جاتا ہے۔ یا غلیل سے پرندہ کا سر ہی اُڑ کر صاف الگ جا پڑتا ہے۔ غرضیکہ آلۂ شکار اور فاصلہ اور خود جانور کے آزاد اور وحشی ہونے کی وجہ سے نتائج اس قدر مختلف ہو جاتے ہیں کہ شکار پر مذبوحہ ذبیحوں کا حکم ہرگز نہیں لگ سکتا۔ اور اگر وہ حکم لگایا جائے۔ تو اکثر شکار ضائع ہو جائے اور بہت سی جانیں بیکار ماری جائیں گی۔ اور ایک اسراف یا قتلِ ناحق کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ پس مذہب جو مجموعہ قواعد و ضوابط کا نام ہے وہ ضرور اس کے لئے ان قواعد سے کسی قدر مختلف قواعد تجویز کرے گا۔ جو پالتو اور گھریلو جانوروں کے لئے مقرر ہیں۔ اور جن کے لئے فقط اتنا کافی ہے۔ کہ پکڑ کر لٹا دیا۔ اور گلے پر چھری پھیر دی۔ لیکن شکار کو تو

آپ پکڑ کر چھری نہیں پھیر سکتے۔ نہ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ کہ اس کو ایسی ضرب لگائیں کردہ ناکارہ تو ہو جائے مگر مرے نہیں۔ اس لئے شریعت اسلامیہ نے کمال حکمت اور نرمی سے قصر نماز کی طرح دوران شکار میں مرجانے والے جانوروں کے متعلق بھی کچھ رعایت دے دی ہے۔ جو عام ذبیحوں کو نہیں دی جاسکتی۔ اسی طرح شریعت نے گھریلو جانوروں سے بھی بعض وہ سختیاں اٹھادی ہیں۔ جو شکار کے جانوروں کے لئے ضروری اور لابدی ہیں۔ مثلاً آپ ہر شکار کو غلیل تیر یا بندوق سے مار سکتے ہیں۔ لہذا اسے اس طرح گرا کر ذبح کرسکتے ہیں برخلاف اس کے اگر آپ گھر کے بکرے یا مرغ کو سامنے رکھ کر اس پر تیر اندازی کریں۔ یا بندوق کا نشانہ بنائیں۔ اور جب وہ گر پڑے۔ تو اسے ذبح کرلیں۔ تو یہ ظلم ہوگا۔ اور شریعت نے صاف الفاظ میں اس سے منع فرمایا ہے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ گھریلو ذبیحہ کے احکام شکار پر نہیں لگتے اور شکار کے احکام گھریلو ذبیحہ پر نہیں لگتے۔ دونوں بالکل الگ الگ چیزیں ہیں۔ کیونکہ حالات مختلف ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ شکار کے احکام کو شکار کے مرجانے کی صورت میں شریعت نے نرم کردیا ہے۔ گھر کے مقبوضہ جانوروں کا ذبح تو ایک قاعدہ کے ماتحت آسکتا ہے۔ مگر زخمی شکار کو ہمیشہ ہی زندہ حاصل کرلینا اور ذبح سے پہلے اُسے مرنے نہ دینا انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ اس لئے نرمی اور رعایت اور قواعد کی تبدیلی ضروری تھی۔

اتنی بات سمجھ لینے کے بعد یہ معلوم کرلینا آسان ہوگا کہ زخم خوردہ مرے ہوئے شکار کو جو بندوق وغیرہ کے زخم سے مرا ہو کھانے کی اجازت دینا ایک الگ قاعدہ یا رعایت یا استثنائی اجازت ہے جو ہرگز گھروں میں تکبیر پڑھ کر جھٹکا کرلینے پر حاوی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ رعایتیں عام قانون سے علیحدہ چیزیں ہیں۔ مثلاً قتل کی سزا پھانسی ہے۔ لیکن اگر کوئی لڑکا خون کردے تو اس پر وہ سزا عائد نہ ہوگی۔ مگر یہ غلطی ہوگی۔ کہ چونکہ چھوٹا لڑکا مستثنیٰ

سے مستثنیٰ سمجھا جائے بکرے وغیرہ کے ذبح میں تو عام قانون یہی ہے کہ (۱) اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے کیونکہ وہ خدا کی مخلوق ہے اور ہم کو اس کے قتل کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ سوائے اس حق کے جو مالک نے ہی ہم کو دیا ہو۔ اس وجہ سے ہم پہلے مالک کا ہی نام لیتے ہیں۔ یہ سمجھ کر کہ ہم کو تو اس مخلوق کے قتل کرنے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ صرف اس کے مالک حقیقی کی اجازت ہے جو اسے ہم اسے مارتے ہیں۔ تاکہ بجائے قساوت قلبی کے ہمارے دلوں میں بوقت ذبح خدا کا شکر اس کی خشیت اور اس کی مالکیت تسلیم کرنے کا خیال جاگزیں رہے۔ اور اس کی اجازت جو اس کے کلام قرآن مجید میں موجود ہے (نہ ہماری نفسانی خواہش) ہمارے ذہن میں مستحضر رہے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ خون چونکہ بسبب اپنے زہریلے مادوں کے زیادہ مقدار میں نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس لئے جس قدر بھی ہو سکے وہ جانور کے جسم میں سے نکال دیا جائے۔ ان دو باتوں سے پھر ایسا جانور مسلمانوں کے لئے بطور خوراک کے حلال ہو جاتا ہے۔

(۳) لیکن ایک تیسری بات بھی ہے جس کو گو حلال ہونے سے تعلق نہیں مگر شفقت علی خلق اللہ اور اخلاق فاضلہ سے اس کا تعلق ضرور ہے۔ وہ یہ کہ شریعت نے سب سے زیادہ رحم والا اور کم تکلیف دہ طریقہ ذبح کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ جیسے مثلاً یہ کہ چھری تیز ہو گردن کے سامنے کی طرف پھیری جائے تاکہ بڑی بڑی رگیں یک دم کٹ جائیں یا اونٹ کو نحر کیا جائے۔ تاکہ جلد سے جلد اس کا تمام خون جسم سے خارج ہو جائے۔ اور چونکہ ذبح کا فعل بہ نسبت شکار کے دنیا میں بہت زیادہ کثرت سے ہوتا ہے۔ اس لئے یہ تین مستقل قواعد اس کے لئے لازمی قرار دیئے گئے اور انہیں ہر ذبح کے لئے بطور اصل کے مقرر فرما دیا گیا۔ اور چونکہ یہ قانون بہترین اصولوں پر تھا اس لئے اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ ورنہ نقص لازم آئے گا اور وہ فوائد حاصل نہیں ہوں گے جن کے لئے یہ قانون وضع کیا گیا تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ مشین سے بھی گردن کاٹی جا سکتی ہے۔ اور تلوار سے بھی اور لاٹھی سے بھی

یک جانور مارا جاسکتا ہے۔ اور گلا گھونٹ کر بھی لیکن ان سب باتوں میں کامل فوائد ذبح والے حاصل نہیں ہوسکتے۔ علاوہ بریں مختلف احکام شرعیہ کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ نے ایک مجمل عام حکم یہ بھی دے دیا کہ چونکہ ہمارا مقرر کردہ مذہب اسلام ایک کامل مذہب ہے اور اس کے اندر ہر بات کے متعلق ضروری ہدایات موجود ہیں۔ پس آئندہ اے مسلمانو! تم دیگر مذاہب کی نقلیں نہ کرنا ورنہ تکلیف پاؤ گے اور بعض فوائد سے محروم رہ جاؤ گے ہم نے تم کو کامل اور اعلیٰ شریعت دے کر ناقص مذاہب کا محتاج نہیں رکھا۔ اور سورہ انعام میں ارشاد فرمادیا کہ

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا
السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (الانعام، ۱۵۴)

ترجمہ:۔ اور یہ یقیناً میرا سیدھا راستہ ہے پس اس کی پیروی کرو اور
مختلف راستوں کے پیچھے نہ پڑو نہیں تو وہ تمھیں اُس (خدا) کے رستے سے
اِدھر اُدھر لے جائیں گے وہ اس (امر) کی تمھیں اس لیے تاکید کرتا ہے
کہ تم متقی ہوجاؤ۔

(یعنی جو راستہ میں نے تمھارے لئے تجویز کیا ہے یہی سیدھا راستہ ہے۔ اسی پر تم چلا کرو۔ اور دیگر مختلف مذاہب کے طریقوں پر نہ چلو۔ کیونکہ وہ تم کو خدا کی مقرر کردہ فائدہ مند راہ سے الگ کردیں گے۔ یہ نصیحت اس لئے کی جاتی ہے کہ تم دکھوں سے محفوظ رہو)

سو یہ وجہ ہے کہ ہم کسی اور مذہب کے طریق ذبح یا کسی اور غیر اسلامی طریقہ کو اختیار نہیں کرتے۔ کہ وہ ایمان۔ صحتِ جسم اور احسان بر مخلوقات کے منافی ہیں اور اس لئے بھی کہ ان کے اختیار کرنے سے کسی نہ کسی صورت میں ہم اپنا کوئی نہ کوئی نقصان کر لیتے ہیں اور سہولتوں سے محروم ہوجاتے ہیں۔

پس یہ سبب ہے جھٹکا وغیرہ کے حرام ہونے کا۔ اس وقت میں ذبح اور جھٹکہ کا فرق بیان نہیں کر رہا۔ ورنہ میں لکھتا کہ جھٹکے میں ذبح اسلامی کی نسبت کیا کیا خرابیاں ہیں۔ صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ذبح کا قانون عام قانون ہے اور وہ اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔ اور شکار کا قانون علیحدہ قانون ہے۔ جس میں بعض مشکلات کی وجہ سے نرمیاں کر دی گئی ہیں۔ اور یہ رعایتیں حسب ذیل ہیں۔ اور وجوہات ان رعایتوں کی پہلے بیان ہو چکی ہیں۔

۱۔ پہلی رعایت یہ ہے کہ شکار بغیر دھار والے آلات سے بھی مارا جا سکتا ہے۔ مثلاً چھرہ۔ گولی۔ غلیلہ وغیرہ۔

۲۔ دوسری رعایت یہ ہے کہ باوجود خوف رحم ہونے کے شکار مارنے کے بعض طریقے جائز ہیں۔ جو ذبیحہ کے لئے ناجائز ہوتے ہیں مثلاً کتوں سے شکار کا رگیدنا۔ یا بجائے گردن کاٹنے کے جسم پر ہر جگہ ضرب لگا کر جانور کو گرا لینا یا مار لینا۔ کیونکہ شکار ہمیشہ وحشی جانور کا ہوا کرتا ہے۔

۳۔ تیسری رعایت یہ ہے کہ اگر شکار زخمی ہو کر ذبح ہونے سے پہلے مر جائے بشرطیکہ وہ خدا کے نام پر زخمی کیا گیا ہو اور اس کے جسم پر کہیں بھی ایسی ضرب ہو جس کی وجہ سے خون نکل آئے۔ یا زخم پیدا ہو جائے تو ایسا زخم اور خون کا بہنا ذبح کے قائم مقام سمجھا جائے گا۔ بلکہ تھوڑا سا خون نکلنا بھی پورے ذبح کے برابر ہی تسلیم کر لیا جائے گا تاکہ لوگوں کو شکار میں مصیبت نہ ہو اور خانہ بدوش اقوام۔ نیز مسافر اور شکاری لوگ اور وہ جن کا گذارہ شکار پر ہے تکلیف مالا یطاق میں نہ پڑیں۔

سو یہ رعایتیں خاص شکار کے لئے ہیں اور رعایتوں اور استثناء پر عام قانون کو چلانا کسی عقلمند گورنمنٹ نے جائز نہیں رکھا۔ لیکن اگر شکار زخمی ہو کر زندہ پکڑ لیا جاوے تو پھر اُسے بھی ذبح کرنے کا ویسا ہی حکم ہے جیسے گھریلو جانوروں کو۔ رعایت صرف اس شکار کے متعلق ہے جو مر جائے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "تو کھا لے اس چیز کو جس کو تیرا تیر زخمی کر دے اور مت کھا اس چیز کو جس کو تیرا تیر چوڑان میں لگے اور زخم نہ پیدا کرے۔" گویا بِسۡمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكۡبَر تو دونوں صورتوں میں ضروری ہے۔ ذبح میں بھی اور شکار میں بھی۔ لیکن خون بہنے کے متعلق یہ رعایت دی گئی ہے کہ اگر زخم کسی جگہ بھی لگ گیا ہے اور جانور مر گیا ہے۔ تو وہ زخم ہی شکار میں ذبح کا قائم مقام ہے جیسا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر تو شکار کی ران میں بھی زخم لگا دے۔ تو کافی ہے!

میں نے پہلے گھریلو جانوروں کا ذکر کیا تھا کہ ان کے لئے ایک مقررہ قانون ذبح کا ہے۔ لیکن اگر اتفاقاً کسی جانور کے ذبح پر بھی قدرت نہ رہے۔ مثلاً یہ کہ ایسا جانور بھاگ کر اگر وحشی ہو جائے اور ہاتھ نہ آئے۔ یا مثلاً کنوئیں میں اندھا گر کر پھنس جاوے اور نکل نہ سکے۔ تو پھر ایسے جانور پر بھی شکاری جانوروں والا حکم چلے گا۔ یعنی یہ کہ ان کو بندوق وغیرہ سے مار لینے کی اجازت ہوگی۔ اور کنوئیں والے جانور کے تو جسم کے جس حصہ پر پہنچ سکو وہیں سے اس کو ذبح کر لو۔ کیونکہ حلال کرنے کے لئے صرف دو اصول ہیں۔ یا اللہ کا نام لینا اور یا خون نکالنا۔ باقی خاص طریقہ سے ذبح کرنا یہ تو جانور پر رحم اور احسان ہے۔ اور بعض دفعہ اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔

خدا کا نام لے کر جھٹکا کرنا اس لئے بھی جائز نہیں۔ کہ جانور کو مارنے کی اجازت تو مالک سے حاصل کرنا اور مارنا اس کے ان قواعد کے برخلاف جو خود مالک نے مقرر فرمائے ہیں یا لبداہت ایک ناجائز امر ہے۔ بلکہ یہ تو قانون ساز حاکم کا منہ چڑانا ہے۔

(نوٹ) تیر میں تو چوڑے حصہ کا لگنا شکار کو ممنوع بھی کر دیتا ہے۔ لیکن گولی یا چھرّو تو شکار کے جسم میں داخل ہو کر ہمیشہ زخم ہی پیدا کرتا ہے۔ پس بندوق کی صورت میں تکبیر کے بعد ہر شکار حلال ہے۔ اسی طرح سدھے ہوئے شکاری کتے کا ہر شکار کیونکہ اس میں پنجے اور دانت شکار کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور پورے جنگ و جدل کے بعد شکار قابو

آتا ہے۔ اس لئے وہاں صرف تکبیر اور سامانت کی شرط ہے۔

رہا یہ سوال کہ اگر کوئی غیر مسلم اہل کتاب اپنے طریق پر خدا کا نام لے کر بندوق یا تیر سے شکار کرے۔ اور وہ حلال کرنے سے پہلے ہی مر جائے۔ تو کیا اس کا کھانا بھی جائز ہے؟

سو اس کا جواب یہ ہے۔ ہمارے سلسلہ نے جن اہل کتاب کے ہاتھ کا عام ذبیحہ کھانا جائز رکھا ہے (یعنی یہودی) ان کا اس قسم کا شکار بھی ذبیحہ کی طرح جائز ہے۔ اور اگرچہ اکثر قومیں دُنیا کی کسی نہ کسی رنگ میں اہل کتاب ہیں۔ مگر حضرت مسیح موعود آپ پر سلامتی ہو نے صرف یہودیوں کا ذبیحہ کھانے کی اجازت دی ہے۔ عیسائیوں اور ہندوؤں کو اس معاملہ میں باہر رکھا ہے۔ کیونکہ عیسائیوں کے نزدیک شریعت لعنت ہے اور ہندوؤں کے نزدیک گوشت خوری مہان پاپ۔ رہ گئے سکھ تو ان کو تو حضور نے اہل کتاب محسوب کرنے سے ہی انکار فرما دیا ہے۔

(دیکھو فتاویٰ احمدیہ جلد ۲ صفحہ ۵۷)

(روزنامہ الفضل ۵ اگست ۱۹۴۴)

تین سوالات کے جواب

ایک صاحب بغیر نام کے اپنے کارڈ میں تین سوال تحریر فرماتے ہیں۔

(۱)

حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے لوگ کیسے تھے۔ ان کا طرزِ رہائش کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے کب سے وہ مخلوق پیدا کی اور ان واقعات کا پتہ کہاں سے مل سکتا ہے۔

حضرت آدم سے پہلے جو انسان تھے وہ غیر مہذب انسان تھے۔

باقی رہے ان کے اعضاء سو وہ ایسے ہی تھے جیسے آدم کے۔ وہ زمین کے اندر غار کھود کر رہا کرتے تھے۔ یہ معلوم نہیں۔ کہ وہ مخلوق کب سے تھی۔ ان واقعات کا کچھ کچھ اشارہ الہامی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اور کچھ کچھ علم انیتھروپالوجی کے ماہرین نے نکالا ہے جو زمین کے اندر دفن شدہ انسانی ڈھانچوں اور ہڈیوں سے بعض علمی نتیجے نکالتے ہیں۔

(۲)

قرآن کریم نے بدکاری کے ثبوت کے لئے چار گواہ مقرر کئے ہیں۔ اگر کوئی اپنی بیوی کی ایسی حرکت دیکھ لے۔ تو چار آدمی کہاں سے ڈھونڈتا پھرے۔

جواب میں عرض ہے کہ جہاں قرآن میں چار گواہوں کا ذکر ہے۔ وہیں آپ کے اس سوال کا جواب بھی ہے۔ کوئی سا مترجم قرآن مجید لے کر سورۂ نور کا پہلا رکوع پڑھ لیں۔ جہاں لکھا ہے کہ جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگاتے ہیں اور ان کے پاس گواہ نہیں ہیں سوائے اپنے نفس کے تو خاوند قاضی کے روبرو چار دفعہ خدا کی قسم کھا کر گواہی دے

کہ میں سچا ہوں اور پانچویں بار کہے کہ اگر جھوٹا ہوں تو مجھ پر خدا کی لعنت۔ اس پر اس عورت کو سزا مل جائے گی سوائے اس کے کہ وہ بھی چار دفعہ قسمیہ شہادت دے کہ میرا خاوند جھوٹا ہے اور پانچویں دفعہ یہ کہے کہ مجھ پر خدا کا غضب ہو اگر وہ سچا ہو۔ اس کے بعد قاضی دونوں میں علیحدگی کرا دے گا اور فیصلہ خدا پر چھوڑ دیا جائے گا ۔

(۳)

لوگ اپنے نام سے پہلے خاکسار کا لفظ لکھتے ہیں۔ جس کے معنی ہیں "مٹی چھاننا" یہ جھوٹ اور قابل اعتراض بات ہے۔ خاکسار کے معنی چھاننے کے نہیں بلکہ اس کے معنی ہیں خاک کی طرح۔ خاک والا۔ خاک کے برابر۔ جیسے سبکسار اور گرفتار۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ ہم واقعی مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔ اس لئے ہم اپنے تئیں مٹی کے برابر حقیر سمجھتے ہیں۔ پس اس میں نہ کوئی جھوٹ ہے نہ قابل اعتراض بات۔ کیا انسان مٹی سے نہیں بنا۔ اور کیا اسے خاکساری نہیں دکھانی چاہیئے۔

میں حیران ہوں۔ کہ انکسار کے طور پر وہ اپنے آپ کو اور کیا لکھے۔ کیا اس سے بہتر لفظ اُسے مل سکتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک دفعہ مسجد میں سوتے پایا۔ تو آپ نے اُن کے جسم پر خاک جھاڑی۔ اور فرمایا۔ کہ اے ابو تراب اُٹھ ۔

پس یہ خاکسار کا لفظ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پسند فرمودہ ہے اور حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کا بھی اور حضرت خلیفۃ المسیح کا بھی۔ اور اکثر بزرگ اسے استعمال کرتے ہیں ؎

خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر

چند سوالوں کے جوابات

ایک دوست نے لکھنؤ سے کچھ سوال لکھ کر بھیجے ہیں اور خواہش کی ہے کہ ان کے جواب "الفضل" کے ذریعہ دیئے جائیں تاکہ دوسرے لوگ بھی پڑھ لیں۔ وہ سوال مع جواب ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

سوال (۱): ابلیس و شیطان میں خود ان دونوں کے متعلق سبقت رحمتی علیٰ غضبی اور الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کا کیا ظہور ہو سکتا ہے؟

جواب (۱): جواباً عرض ہے کہ شیطان تو ایک ایسی ہی مخلوق ہے جیسے فرشتے۔ فرق صرف یہ ہے کہ فرشتے نیکی کی تحریک کرنے والے ہیں اور شیطان بدی کی۔ شیطان پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ بدی کی تحریک کرے۔ جس طرح فرشتے نیکی کی تحریک کرنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اس شیطان کو نہ عذاب ہے نہ ثواب۔ کیونکہ وہ فرشتوں کی طرح مقصود و مجبور اپنے کام میں لگا ہوا ہے اگر یہ پیدا نہ ہوتا تو انسان کے جوہر نہ کھلتے اور نیکی و بدی میں تمیز نہ رہتی اور انسان انعام کا حقدار نہ بنتا۔

باقی رہا ابلیس تو یہ آدم کے وقت میں شیطان کا ایسا ہی نمائندہ تھا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت میں نمرود اور حضرت موسیٰ کے زمانہ میں فرعون اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ابوجہل۔ شیطان کے ان نمائندوں کو اپنے رسولوں کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ اس لئے کھڑا کیا کرتا ہے کہ رسول کی عظمت اور اس کا مرتبہ بلند دنیا پر آشکارا ہو۔ ایسے نمائندگان شیطان کو میرے خیال میں اتنا شدید عذاب نہیں ہوگا۔ جتنا عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کیونکہ

ان کے افعال میں خدا تعالیٰ کے جبر کا بھی ایک حصہ شامل ہے۔ اس لئے کچھ نہ کچھ تخفیف ان کے عذاب میں ضرور ہوگی۔

سوال۔ مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ اور هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ (الملک: ۴) کے کیا معنی ہیں؟

جواب۔ یہی معنے ہیں کہ ہر شے اور ہر چیز دُنیا کی نہایت درست اور نہایت ٹھیک بنی ہوئی ہے اور اس میں کسی طرح کا کوئی نقص یا عیب نہیں۔ اور اس کو حقیقتاً اسی طرح بننا چاہیئے تھا۔ مثلاً باز کو تیز رفتار اور چلبلا اسی لئے بنایا کہ وہ چڑیا کو جھپٹ کر پکڑ سکے کیونکہ وہ اس کی خوراک ہے۔ چڑیا کو نسبتاً کم رفتار اور غریب اسی لئے بنایا کہ وہ باز کی خوراک بن سکے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ چڑیا کو بھی ایسے ہی پنجے شکار کے لئے اور ایسی ہی تند اُڑنے کے لئے دی جاتی۔ جیسی باز کو ملی ہے۔ تو پھر نظامِ عالم نہ چل سکتا اور یہ سب کارخانہ درہم برہم ہو جاتا۔ البتہ اس حکیم و قدیر خدا نے چڑیا کا رنگ ایسا خاکی بنا دیا ہے کہ وہ باز کے حملے کے وقت پتّوں وغیرہ میں چھپ کر ایک حد تک اپنی جان باز سے بچا سکتی ہے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ چڑیا کی نسل دُنیا سے معدوم نہ ہو جائے۔ اسی طرح سینکڑوں چھوٹے چھوٹے کیڑے ہیں جو زمین سے پیدا ہوتے ہیں اور پرندوں کی خوراک بنتے ہیں۔ اگر یہ نہ پیدا کئے جاتے تو پرندوں کے لئے غذا کہاں سے آتی؟ اور ان کا پیٹ کس طرح بھرتا؟ یہ تو ہوئی عام بات اگر آپ معیّن صورت میں سوال کریں گے کہ آپ کو خدا تعالیٰ کی کس مخلوق میں بظاہر کیا نقص نظر آتا ہے۔ تو پھر اس کا جواب دیا جا سکے گا۔ بالفرض آپ کہیں کہ انسان کی دو کی بجائے چار آنکھیں ہوتیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے انسانی بصارت تو بیشک بڑھ جاتی۔ مگر اس کے مقابلہ میں بصیرت اتنی ہی کم ہو جاتی اور بصیرت ہی اصل چیز ہے

یا بالفرض آپ کہیں کہ انسان میں پرواز کی کمی ہے اگر وہ اُڑ سکتا پھرتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو یہ دنیا اپنی جسامت کے لحاظ سے اتنی چھوٹی ہے

کہ اس میں پُردار انسان کا رہنا نہایت تنگی کا موجب ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اس صورت میں دنیا کی موجودہ معاشرت کے لحاظ سے ہزار ہا طرح کے نئے نئے فتنے اور فساد ایسے پیدا ہوتے کہ ہر روز خون خرابے کی نوبت پہنچتی پس موجودہ نظام کے لحاظ سے بے پُر انسان زیادہ موزوں ہے بہ نسبت پُردار انسان کے۔

سوال۔ شہید کا اطلاق سید عبداللطیف اور نعمت اللہ وغیرہ پر ہے۔ یا احمدی نوجوانان جو لیفٹیننٹ اور کپتان شہیدوں کا رینک پانے والے ہوں گے؟

جواب۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس بحث کے متعلق میرا مضمون مندرجہ الفضل غور سے نہیں پڑھا جس میں میں نے صاف طور پر لکھا ہے کہ وہ احمدی نوجوان جو خلیفہ کے حکم کے ماتحت اور سلسلہ کے وقار، عظمت اور عزت کی خاطر میدانِ جنگ میں جاتے ہیں۔ اور وہاں مارے جاتے ہیں شہید ہیں۔ لیکن ان کے بالمقابل وہ لوگ جو محض تنخواہ اور حصولِ زر کے لئے جاتے ہیں۔ ان کی حیثیت ایک اجیر اور مزدور سے زیادہ نہیں۔ وہ اگر مارے جائیں تو شہید نہیں ہوں گے بلکہ اجیر ہوں گے۔ اور اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پائیں گے۔ اول الذکر گروہ کو اگر اپنی خدمات کے معاوضہ میں کچھ تنخواہ بھی ملے۔ تو وہ ان کی شہادت کے درجہ کو کم نہیں کرے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نیتوں کو دیکھتا ہے۔ اور اسی کے موافق لوگوں سے سلوک کرتا ہے۔ نوجوان کی نیت خلیفہ کی اطاعت اور سلسلہ کے مفاد کی تھی۔ نہ کہ تنخواہ لینے کی۔ تنخواہ تو ایک زائد انعام ہے جو اُسے ملتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص اپنے مکان میں کھڑکیاں اور روشندان اس نیت سے رکھتا ہے۔ کہ ان سے ہوا اور روشنی آئے۔ اب ظاہر ہے کہ اذان کی آواز کے ساتھ ساتھ ان میں سے روشنی بھی آئے گی۔

سوال۔ شعبان اور رمضان کی تصدیق اس وقت مخالفوں کے سامنے کس طرح پیش کریں؟

جواب۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے وجود میں اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ میں دونوں باتوں کو رکھ دیا ہے اور وہی مخالفوں کے سامنے بڑی آسانی سے پیش کی جا

سکتی ہیں۔ وہاں ایک لمبا چوڑا سونٹا تھا۔ یہاں مسیح موعود نے صرف ایک تنکا (قلم) اُٹھا کر اپنے دشمنوں کے تمام دلائل کو بے کار کر دیا۔ سارے دشمن اور تمام دنیا کے مذاہب مسیح موعود کے اس معمولی سے تنکے کے آگے مجبور و لاچار ہو کر رہ گئے کسی سے بھی کچھ نہ بن سکا۔ اس امر کا اعتراف مخالفین بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ حضور کے انتقال پر اخبار وکیل نے لکھا تھا۔ "اس کی آواز حشر اور اس کا قلم جادو تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

باقی رہا بیضاء تو دینِ حق) کی سچائی فضیلت اور برتری کے ایسے ایسے دلائل نیرہ مسیح موعود نے دنیا کے سامنے پیش کئے کہ لوگوں کی آنکھیں چکا چوند ہو کر رہ گئیں اور کوئی بھی ان کے مقابل پر دم نہ ٹھہر سکا۔ اپنے تو خیر غیروں نے بھی اس بات کو تسلیم کیا کہ مرزا صاحب میں ایسی غیر معمولی قابلیت تھی کہ مخالف خواہ کسی درجہ اور کسی لیاقت کا ہوتا ایک دفعہ قرآن کے برجستہ جواب سے ذرا گہرے فکر میں پڑ جاتا تھا۔

بتلائیے اس سے زیادہ بیضاء اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیح موعود نے خود اپنے وجود کو اس رنگ میں پیش کیا اور فرمایا۔ ؎

مَیں ہوں وہ نُورِ خدا جس سے ہوا دن آشکار

(روزنامہ الفضل ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۴ء)

جن۔ پری۔ بھوت۔ چڑیل۔ جادو اور نظر

سوال:- ایک صاحب لاہور سے تحریر فرماتے ہیں کہ جن۔ پری۔ بھوت وغیرہ انسان کو مار ڈالتے ہیں۔ جن کو سوائے ولی اللہ کے کوئی نہیں نکال سکتا ہے اور چڑیلیں معصوم بچوں کا کلیجہ نکال لیتی ہیں اور بچہ مرجاتا ہے۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

جواب:- مختصر جواب یہ ہے کہ

وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ (المدثر ۳۲)

ترجمہ:- اور تیرے رب کے لشکروں کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا۔

یعنی خدا تعالیٰ کی مخلوق کو کوئی نہیں جانتا سوائے اس کے اور بے تعداد مخلوق میں سے بعض ظاہر ہے اور بعض مخفی اور لطیف۔ مخفی رہنے والی مخلوق کو ہم جن کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ جن کے لغوی معنی مخفی رہنے والی چیز کے ہیں۔ اور خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کس کس قسم کی مخلوقات ہے لیکن جو نقشہ جن۔ پری۔ بھوت اور چڑیل وغیرہ کا عام لوگوں میں مشہور ہے۔ اس کے ملنے کے لئے ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملا۔ یا تو پرانی کہانیاں اور قصے ہیں۔ یا غلط خیالات اور وہم یا بعض بیماریوں کے کرشمے۔ اور ولی اللہ کی بھی آپ نے خوب کہی۔ میں نے کئی جگہ حلال خوروں اور چماروں کو بھوت پریت نکالتے دیکھا ہے۔ اگر یہی لوگ ولی اللہ ہیں تو پھر ایمان کا خدا ہی حافظ ہے۔ چند روز ہوئے قادیان میں ایک لڑکے کا جن اتارا جا رہا تھا۔ جسے پرانا بخار تھا۔ اور چونکہ کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے جنات کا عمل سمجھ لیا گیا تھا اسی طرح اکثر عورتیں جو ہسٹریا کی بیمار ہوتی ہیں ان پر جن آتے ہیں اور وہ سر ہلاتی ہیں۔

اور گانا بجانا سن کر قوالی کے حال کی طرح حال کھیلتی ہیں۔ اگر یہی حال کھیلنا جن کی وجہ سے ہوتا ہے تو مردوں کو جب قوالی سن کر حال آتا ہے۔ اس کا باعث جنات کو کیوں نہیں قرار دیتے۔

نہ آج تک ہم نے بھوتوں کے ہاتھ سے کسی انسان کو مارے جاتے دیکھا۔ نہ کبھی یہ دیکھا کہ بچوں کا کلیجہ چڑیل نکال کر لے گئی ہو اور طبی کتابوں اور نعشوں کے ملاحظہ کرنے والے ڈاکٹروں نے یہ رپورٹ شائع کی ہو کہ ہم نے بغیر کلیجہ کے بچے بھی دیکھے ہیں۔

پس یہ تمام کرشمے جہالت۔ شرک اور توہمات کے ہیں بچے اپنی بیماری سے مرتے ہیں۔ اور نام چڑیل کا ہوتا ہے۔ بڑے آدمی اپنے امراض سے مرتے ہیں۔ نام بھوت اور جنات کا ہوتا ہے۔ ہندو بھی تو کہتے ہیں۔ کہ ماتا یعنی چیچک کی دیوی بچے کھا جاتی ہے۔ لیکن جب چیچک کا ٹیکہ لگا ہوا ہو پھر خبر نہیں وہ کہاں چلی جاتی ہے۔ بچوں کو دق کی بیماری ہو کر جب سوکھنے لگتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ان کو مسان ہو گیا ہے یعنی قبرستان کے بھوتوں کا اثر ان پر ہے۔ حالانکہ یہ مشہور بیماری ہے۔ کوئی شخص فوری طور پر فالج یا سکتہ سے مر جائے تو کہتے ہیں جنات نے جان نکال لی۔ اسی طرح کوئی پاگل ہو جائے تو مشہور ہو جاتا ہے کہ اس نے فلاں شہید کی قبر کے پاس پیشاب کر دیا تھا۔ اب وہ اس کے سر پر چڑھے بیٹھے ہیں۔ سو یہ سب جہالت کی باتیں ہیں اور بے ثبوت۔

سوال: جادو کیا چیز ہے۔ اور کیا یہ بھی انسانوں پر اثر رکھتا ہے۔

جواب: جسے عوام جادو کہتے ہیں۔ اسے اہل علم مسمریزم یا علم توجہ کہتے ہیں۔ اس کے برحق ہونے میں کوئی شک نہیں۔ آپ خود اس کی پریکٹس کر سکتے ہیں۔ اور کمزور عورتوں اور بچوں کو بے ہوش کر سکتے ہیں اور بعض امراض کا علاج بھی کر سکتے ہیں۔ اس کیلئے مسمریزم کی کتابوں کا مطالعہ کریں۔

سوال: کیا نظر بھی انسانوں پر اثر کرتی ہے جیسے کہ یعقوب علیہ السلام نے نظر بد سے

بچنے کے لئے بیٹوں کو کہا تھا کہ شہر میں اکٹھے داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا۔

جواب۔ نظر اور میسمریزم ایک ہی چیز ہے۔ یا اس کی ایک شاخ ہے۔ شدتِ خواہش ارادہ اور توجہ کسی شخص یا چیز کے متعلق ہو تو اس کا کچھ اثر ضرور پڑتا ہے۔ لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام کا قصہ تو قرآن مجید میں موجود ہے۔ وہاں تو اس کی اور وجہ بتائی گئی ہے۔ یعنی خدا کی ہدایت کے ماتحت یعقوب علیہ السلام نے اپنے لڑکوں کو اس لئے علیحدہ علیحدہ شہر میں داخل ہونے کو کہا تھا کہ چھوٹا بیٹا بن یامین یوسف علیہ السلام سے الگ ہو کر مل سکے۔ نہ یہ کہ اسے کو نظرِ بد نہ لگے۔ اگر وہ سب کے ساتھ مل کر شہر کے اندر داخل ہوتا تو اُسے یوسف علیہ السلام سے تنہائی میں ملنے اور اپنا دُکھ سُکھ کہنے کا موقع نہ ملتا۔ نظر لگنے کی توجیہہ تو صراحتہً غلط ہے کیونکہ اس طرح نظرِ بد سے بچتے ہوئے شہر میں داخل ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹے صاحب پر چوری کا الزام لگا اور وہ قید ہو گیا۔ بڑا بھائی شرمندگی کی وجہ سے وہیں ٹھہر گیا اور باقی سب بھائی پبلک میں انگشت نما ہو کر روتے پیٹتے واپس وطن میں آگئے۔ کیا یہی نتیجہ نظرِ بد کے خدائی علاج کا ہوا کرتا ہے۔ اس نتیجہ سے ہی ظاہر ہے کہ نظرِ بد سے بچانے کا سوال ہی نہ تھا بلکہ کوئی اور ہی مطلب تھا۔ جس کو پورا کرنے کے لئے یہ ہدایت کی گئی تھی۔

(روزنامہ الفضل ۲۱ نومبر ۱۹۴۴ء)

فری میسن

ایک عزیز نے لکھا کہ فری میسن سوسائٹی کے متعلق تحریر فرمادیں کہ اس کا بانی کون تھا ؟ اور اُن کے اصول کیا ہوتے ہیں۔ کیا مسلمان کے لئے اس سوسائٹی کا ممبر بننا جائز ہے یا نہیں ؟

جواب

حضور کی مجلس میں امیر کابل کا ذکر ہوا کہ اس کے فری میسن ہونے کے سبب اس کی قوم اس پر ناراض ہے۔ حضرت اقدس مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے فرمایا :۔

" اس کی قوم اس ناراضگی میں حق پر ہے کیونکہ کوئی موحد اور سچا مسلمان فری میسن میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس کا اصل شعبہ عیسائیت ہے اور بعض مدارج کے حصول کے واسطے کھلے طور پر بپتسمہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں داخل ہونا ایک ارتداد کا حکم رکھتا ہے۔"

(فتاویٰ احمدیہ جلد دوم صفحہ ٦٢)

حضور کا ایک الہام بھی اپنے متعلق ہے کہ فری میسن اس پر مسلط نہیں کئے جاویں گے۔ باقی آپ اپنے سوال کے جواب کے متعلق انسائیکلو پیڈیا دیکھ لیں جہاں سے کئی باتیں ان فرقوں کے متعلق جو فری میسن کہلاتے یا ہیں مندرج ہیں۔ اس نام سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مذہب کی عام جکڑ بندیوں اور پابندیوں سے آزاد ہیں۔ اور ایک مخفی پولیٹیکل پارٹی کا حکم رکھتے ہیں۔ جو ابتدائے دنیا سے ہمیشہ چلی آئی ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے دشمنوں نے بھی

ایک ایسی پارٹی بنائی تھی۔ یہودیوں نے بھی بخت نصر وال پراگندگی کے بعد ایسی ایک پارٹی بنائی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی یہود اور منافقین نے ایسی خفیہ انجمن بنا لی تھی۔ شیعہ مسلمانوں نے بھی خلافت و حکومت کے حصول کے لئے قرون وسطیٰ میں کئی ایسی کمیٹیاں بنائی تھیں۔ چونکہ مذہب سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ اس لئے احمدیوں کا ان سے تعلق ہونا ایک بے معنی بات ہے۔ قرآن مجید نے ایسی ہی کمیٹیوں کے لئے ارشاد فرمایا ہے کہ۔

اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا.... (سورۃ مجادلہ ۱۱)

ترجمہ۔ خفیہ مشورہ کرنے کا طریق شیطان کی طرف سے آیا ہے اور اس کی غرض یہ ہے کہ مومنوں کو فکر میں ڈالے۔

پس قرآنی وحی اور حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے الہام اور حضور کے فتوی کی موجودگی میں فری میسن بننا کسی مسلمان کا کام نہیں۔ ہاں اگر کسی نبی کی معرفت کسی وقت بعض پولیٹیکل امور کے لئے مسلمانوں کی کوئی ایسی انجمن سلامتی ایمان اور مومنوں کی حفاظت کے لئے بنانی پڑے اور مقصد صرف مذہب حقہ کی حفاظت ہو نہ کہ ظلم اور اس وقت دفاع کے لئے یہی ضروری قرار پائے تو ممکن ہے کہ ان حالات میں اس قسم کی کسی انجمن کا بنانا جائز ہو جائے ورنہ جس قدر دنیا میں ایسی انجمنیں پہلے سے موجود ہیں وہ تو سب خدا اور رسول کی مخالف ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(الفضل ۱۴ر نومبر ۱۹۲۲ء)

صحبت کا اثر ـــ اور ـــ ڈیڈی کیشن

سوال: صحبت کا اثر کس طرح ہوتا ہے۔

جواب: میرے ہاں ایک تیل کا برتن رکھا ہے اور تیل اس کے اندر ہے۔ باہر نہیں ہے لیکن اگر آپ اس جگہ کو دیکھیں۔ تو زمین دُور دُور تک چکنی نظر آئے گی۔ میرے ہاں ایک لیمپ بجلی کا ہے۔ جب وہ روشن ہوتا ہے تو ہر چیز دور دُور تک اس کی وجہ سے روشن ہو جاتی ہے۔ میرے ہاں ایک درخت رات کی رانی کا لگا ہوا ہے جس کی خوشبو رات کے وقت ایک ایک فرلانگ تک پہنچتی ہے۔ جب بے جان چیزوں کے اثرات کا یہ حال ہے۔ تو انسانی سوسائٹی کے اخلاق اور نیک و بد انسانوں کی صحبت کا اثر اس سے بھی زیادہ طاقتور ہونا چاہیے۔ اسی لئے تو کُونُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کا حکم ہے ؎

صحبت صالح ترا صالح کند

صحبت طالع ترا طالع کند

ابلیس جنت میں نہ آتا۔ تو ابوالبشر سے غلطی کیونکر ہوتی؟ گرم چیز کے پاس بیٹھیں گے تو جسم بھی گرم ہو جائے گا۔ اور سرد چیز کے نزدیک بیٹھیں گے تو جسم بھی ٹھنڈک محسوس کرے گا۔ ہر چیز میں کم و بیش نفوذ اور سرایت کرنے کی خاصیت خدا تعالیٰ نے رکھی ہے۔ خواہ وہ جسمانی ہوں یا روحانی یہاں تک کہ انبیاء کے زمانے میں تو عام زمانے میں تو عام لوگوں کے دماغ ایسے روشن ہو جاتے ہیں۔ کہ ہر انسان اپنی فطرت اور استعداد کے مطابق اٹھا لیتا ہے۔ کیونکہ نبی سورج ہوتے ہیں۔ دوسروں کو بھی اسی طرح قیاس کر لیں۔ یہی وجہ ہے۔

کہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) ہمیشہ اپنے مریدین کو یہی نصیحت فرماتے رہتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے آپ لوگ بار بار میرے پاس آئیں۔ اور میری صحبت میں رہیں ؎

یک زمانہ صحبتے با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

صحبت کا اثر کس طریق سے ہوتا ہے۔ یہ فلسفیانہ اور باریک سوال ہے۔ ہاں یہ بات یقینی ہے۔ کہ ہوتا ضرور ہے۔ اور کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

سوال :۔ یہ جو آج کل ڈیڈی کیشن یا انتساب کا دستور مصنفین نے اختیار کیا ہے اس کی اصلیت کیا ہے؟ کسی کتاب کو خداوند تعالیٰ کی نذر کیا جاتا ہے۔ کسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔ کسی کو اپنی بیوی کی۔ اور کسی کو والدین یا استاد کی۔ کیا یہ سب باتیں درست ہیں؟

جواب :۔ ڈیڈی کیشن یا انتساب ایک اسلامی طریق ہے۔ اس لئے جائز ہے بلکہ ضروری ہے اور ہمارا کسی کتاب کے شروع میں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھنا ہی اصل ڈیڈی کیشن ہے۔ یعنی یہ تصنیف میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ معنون کرتا ہوں۔ جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ رہا یہ امر کہ خدا کے سوا دوسروں کے نام سے کوئی تصنیف معنون کی جاوے یہ بالکل غیر اسلامی طریق ہے جب خود مصنف نے بسم اللہ کہہ کر خدا تعالیٰ کے نام کے ساتھ اپنی کتاب کو ڈیڈی کیٹ کر دیا۔ تو پھر اس تصنیف کو ایک دوسرے صفحہ پر کسی اور کے نام سے ڈیڈی کیٹ کرنا بیوقوفی نہیں تو کیا ہے؟

مسلمانوں کی تصنیف اللہ تعالیٰ کی نذر ہی ہونی چاہیئے۔ جیسے اس کی ہر دیگر عبادت قرآن مجید سے لے کر ہر مفید کتاب کو تمام اسلامی دنیا آج تک خدا کے نام (بسم اللہ) سے ہی معنون کرتی آئی ہے۔

(الفضل ۲۹ جولائی ۱۹۴۲ء)

غیر مسلم کو السلام علیکم

سوال :۔ کیا ہم غیر مسلم کو السلامُ علیکم کہہ سکتے ہیں۔ اگر نہیں تو کیوں ؟

جواب :۔ اسلام نے جب سلام کو قائم کیا۔ تو اس وقت تو اس کا یہی منشا تھا کہ یہ صرف مومنوں کے لئے مومنوں کی طرف سے دُعا ہے نہ کہ عام تعظیمی فقرہ۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ۔

وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (انعام: ۵۵)

یعنی جب مومن لوگ آپ کے پاس آیا کریں تو آپ ان کو السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا کریں۔ یہاں اس سلام کے لئے مومن ہونے کی شرط لگا دی۔ دوسری جگہ فرمایا۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (نساء: ۹۵)

یعنی جو تم کو السلام علیکم کہے اس پر بے تحقیق غیر مومن ہونے کا فتویٰ نہ دے دیا کرو۔ اس سے بھی معلوم ہوا۔ کہ السلام علیکم کہنا مومن ہونے کی ایک نشانی ہے۔ سو یہ تو ہے ابتداء اس سلام کی جو مسلمانوں میں رائج ہے۔

لیکن جب یہ مسلمانوں کا ایک قومی شعار بن گیا۔ تو اب غیر احمدی جو گو احمدیوں کے نزدیک سچے مسلمان نہیں۔ مگر ان کے ہاں قومی شعار ہونے کی وجہ سے اس فقرہ کا رواج موجود ہے۔ اور ہمارے ہاں یہ مذہبی شعار ہونے کے سبب رائج ہے۔ اس لئے روا ناً اس کا کوئی حرج نہیں سمجھا گیا۔ خود حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے پاس جب غیر احمدی

لوگ آیا کرتے تھے۔ تو حضور ان کو السلام علیکم کہتے بھی تھے۔ اور وعلیکم السلام جواب بھی دیتے تھے۔ رہا معاملہ غیر مسلم قوموں کا۔ سو ان کے ہاں السلام علیکم کا فقرہ رائج نہیں ہے نہ وہ اسے کہتے ہیں۔ اسی طرح غیر احمدی مسلمان بھی غیر مذہب والوں کو السلام علیکم نہیں کہتے۔ البتہ سلام صاحب۔ سلام صاحب کا رواج کئی جگہ ہے اور یہ السلام علیکم نہیں ہے سو اس کا کوئی حرج نہیں۔ بلکہ وہ لوگ گڈ مارننگ۔ آداب عرض۔ تسلیمات وغیرہ الفاظ کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی السلام علیکم کہہ دے۔ تو ان کو ناگوار گزرتا ہے۔ پس غیر احمدیوں کو تو بسبب ان کے قومی شعار ہونے کے السلام علیکم کہنے کا حرج نہیں۔ مگر غیر مسلموں کو السلام علیکم کہنا بالکل فضول بلکہ نامناسب ہے۔ ہاں اگر وہ ہی ابتدا کریں۔ تو صرف وعلیکم کہہ دینا مناسب ہے۔ یہودی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ تو بعض دفعہ السلام علیکم کہتے تھے تو آپ بھی اُن کو وہی جواب دیا کرتے تھے لیکن جب السام علیکم یا ایسا ہی کوئی شرارت کا لفظ بولا کرتے تھے تو آپ فقط وعلیکم ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اصل میں تو السلام علیکم مومنوں کے لئے ہی ہے۔ اور قرآن مجید میں بھی یا تو یہ مومنوں کے لئے وارد ہوا ہے۔ یا اہل جنت کے لئے بولا گیا ہے۔ لیکن اگر کسی قوم میں یہ قومی شعار کے طور پر استوار ہوتا ہے تو ان سے ایسا ہی طریق کر لینا درست ہے لیکن غیر مذاہب والوں کا چونکہ یہ قومی شعار بھی نہیں ہے۔ اس لئے ان کو ابتدءً السلام علیکم کہنا فضول سی بات ہے۔ ہاں اگر وہ ہی خود کہیں تو وعلیکم کا لفظ جواب میں کہہ دینا مناسب ہوگا۔ ان کے علاوہ دوسری قسم کے سلام کرنے والوں کو ہاتھ کا اشارہ یا محض لفظ سلام کہنا کافی ہوگا۔ آج کل قادیان کے کئی ہندو اور سکھ احمدیوں کو پورا السلام علیکم کہتے ہیں۔ اور ہم لوگ بھی ان کا جواب وعلیکم السلام سے دے دیا کرتے ہیں۔ دعا کے طور پر نہیں بلکہ اس لئے کہ ایک اسلامی رواج قائم ہو جائے۔ اور ایک اسلامی رسم کے غلبہ کی صورت پیدا ہو جائے۔ ورنہ اصلی دعائیہ السلام علیکم تو مومنوں کے لئے ہی ہے۔

(الفضل ۳۰ جولائی ۱۹۴۶ء)

شیخ سعد اللہ لدھیانوی کی وفات

حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم کا

ایک اہم مکتوب

پشاور سے مکرمی محترمی ڈاکٹر محمد عبد الرحمٰن صاحب ایم۔ بی۔ بی۔ ایس نے حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب مرحوم کا ایک خط بھجوایا ہے۔ جو حضرت ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مکرم ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب کے ایک استفسار کے جواب میں ۴ ستمبر ۱۹۱۲ء کو شیخ سعد اللہؒ لدھیانوی کی وفات کے باعث کے متعلق علمی نکتہ نگاہ سے لکھا تھا۔ حضرت ڈاکٹر صاحب مرحوم کا یہ خط جو مکرم منشی عبد الکریم صاحب کے واسطہ سے لکھا گیا مع استفسار ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب موصوف احباب کے فائدہ کے لئے درج کیا جاتا ہے۔

(خاکسار مرزا بشیر احمد رتن باغ لاہور ۵۰-۹-۹)

سوال از مکرم ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب پشاور

سوال: حضرت مسیح موعودؑ (آپ پر سلامتی ہو) نے تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۵ میں سعد اللہ لدھیانوی کے لئے عربی اشعار میں چند الفاظ تحریر فرمائے۔ میری خاص توجہ شعر نمبر چار پر پڑی

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ میں تجھے ناز اور تکبر کے ساتھ چلتا ہوا دیکھتا ہوں کیا تو طعنۃ الجلاد والے دن کو بھول گیا۔

سعد اللہ نے بموجب مذکورہ بالا پیشگوئی کے Pneumonic Plague · نمانک پلیگ سے وفات پائی۔ حضرت اقدس نے بھی اس کی وفات کو نمانک پلیگ سے ہی موسوم کیا اور تحریر فرمایا ہے کہ اس بیماری میں چونکہ پھیپھڑا پھٹ جاتا ہے اس لئے طعنۃ الجلاد کے نقلی معنوں کے لحاظ سے بھی یہ پیشگوئی مکمل طور پر پوری ہوئی۔

اب جبکہ ہم نمانک پلیگ جس میں کہ پھیپھڑا بجائے پھٹ جانے کے منجمد ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ہوا کے خلیئے کچھ بلغم۔ کچھ رطوبت۔ کچھ دیگر مادیات سے بھر جاتے ہیں اور سانس کے ذریعہ ہوا کا آنا جانا رک جاتا ہے۔ جو کہ باعثِ موت اور مہلک ہوتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ حاصل سعد اللہ کی موت پھیپھڑے کے پھٹ جانے سے واقعہ نہ ہوئی ہوگی۔ بلکہ اس کے اندر رطوبات کے منجمد ہو جانے کی وجہ سے ہوئی ہوگی۔ چونکہ یہ نتیجہ باعثِ تسلی نہیں ہے۔ اس لئے استدعا ہے کہ ڈاکٹری نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی جاوے اور اس بیماری کی پیتھالوجی Pathology بھی مدنظر ہے۔

خاکسار ڈاکٹر محمد عبدالرحمن عفی عنہ

جواب از حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب مرحوم قادیان

الصفہ قادیان

۴ر ستمبر ۱۹۳۰ء

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

مکرمی منشی عبدالکریم صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا خط مجھے ملا۔ میں بسبب علالت کے لکھنے پڑھنے سے آج کل معذور تھا۔ تاہم مختصر جواب لکھ دیتا ہوں۔ حضرت مسیح موعودؑ آپ پر سلامتی ہو نے انجام آتھم میں سعداللہ کے لئے یہ دعا کی اور الہام اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ یعنی وہ بے نسل ہی رہے گا شائع کر دیا۔ مقابل پر سعداللہ کی بد دُعا بھی موجود ہے جو اس نے شائع کی۔ غرض الہام اَبْتَر والا اور ساتھ ہی ایک مُباہلہ دونوں پبلک کے سامنے آ گئے۔ اَبْتَرْ والا الہام تو آپ جانتے ہیں کہ پورا ہو چکا۔ اس میں تو کوئی شک و شبہ نہیں۔ مباہلہ کی دعا جو تھی وہ بھی خدا تعالیٰ نے قبول کر لی۔ اور جو جو حضرت اقدس نے سعداللہ کے مقابل پر ان عربی اشعار سعدیہ تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۴-۱۵ میں مانگا تھا۔ اسے لفظی طور پر قبول کر لیا اور جو جو الفاظ حضور نے اس بد دعا میں لکھے ہیں وہ عین صحیح طور پر پورے ہو گئے منجملہ اس کے ایک شعر زیر صفحہ ۱۴ پر درج ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ میں تجھے ناز و تکبر کے ساتھ چلتا دیکھتا ہوں۔ کیا تو طعنۃ النجلاء والے دن کو بھول گیا۔ یعنی اب تو تُو ناز و تکبر سے پھر رہا ہے۔ وہ دن بھی آتا ہے۔ جب طعنۃ النجلاء تیرے سامنے آ جائے گا۔ طعن کے معنی نیزہ مارنا یا نیزہ سے زخمی کرنا اور طعنۃ النجلاء کے معنی ایسا زخم نیزہ کا جو بہت وسیع ہو۔ یہ بد دعا کا لفظ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس مباہلہ یعنی بد دعا کو منظور کیا۔ تو لفظوں کے احترام سے بالکل اسی طرح اس کو موت دی۔ یعنی طاعون جو نمونیا پلیگ کی قسم کا تھا۔ اس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ طعنۃ کے معنی لفظی طاعون کے نہیں ہیں۔ لیکن لفظی مشابہت طعنۃ اور طاعون میں اتنی ہے کہ اس کی وفات خدائی نیزہ کے زخم سے ہوئی لیکن وہ گلٹی والی پلیگ سے بھی مر سکتا تھا اور صرف بخار والی پلیگ سے بھی مر سکتا تھا۔ کیونکہ ہر دو صورتیں بھی طاعون ہی کہلاتی ہیں۔ لیکن لفظ نجلاء یعنی وسیع اور بڑے زخم کی تعریف کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے اسے وہ طاعون دیا۔ جو وسیع اور بڑا زخم پیدا کرنے والا تھا۔ یعنی نمونیا پلیگ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ گلٹی والے اور صرف بخار والے طاعون میں

اگرچہ وہ بھی طعنہ یعنی خدائی مار کا زخم ہے۔ اتنی فراخی اور وسعت زخم کی نہیں ہوتی جتنی نمونیہ والے طاعون میں۔ کیونکہ نمونیا والے طاعون میں دونوں پھیپھڑے اتنے متورم یعنی زخمی ہو جاتے ہیں۔ کہ مریض انسان کے بلغم میں بکثرت خون آتا ہے۔ گویا فرشتوں نے اس کے پھیپھڑوں میں واقعی نیزے مارے ہیں۔ اور ان کو خوب زخمی کر دیا ہے۔ باقی دو قسم کے طاعون کے بیمار خون نہیں تھوکتے۔ اس لئے وہ صرف طعنہ یعنی طاعون سے یعنی الٰہی نیزہ کے زخم سے مر جاتے ہیں لیکن نمونیا پلیگ میں چونکہ خون کھنکار اور بلغم میں برابر آتا رہتا ہے۔ اس لئے وہ صرف طعنہ نہیں بلکہ طعنۃ النجلاء یعنی معمولی زخم نہیں بلکہ وسیع زخم اور خوں چکاں زخم والا بیمار ہوتا ہے۔ اور جب پھیپھڑوں سے خون جاری ہو جائے۔ خواہ جلدی سے خواہ کسی اور وجہ سے وہ بہر حال پھیپھڑے کے سیل Cells اور اس کی باریک رگیں پھٹنے کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ اور یہ پھٹنا کسی ایک جگہ پھیپھڑے میں مثل چھری کے زخم کے نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر دو پھیپھڑے ہر جگہ سے متورم اور زخمی ہو کر خون دینے لگتے ہیں۔ ایسے پھیپھڑوں کو زخمی کہنا اور وسیع طور پر زخمی کہنا عربی اردو دونوں زبانوں میں فصاحت کہلاتا ہے۔ نہ کہ قابلِ اعتراض۔

حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے سعد اللہ کے لئے طعنۃ النجلاء یعنی وسیع زخم نیزہ کا مانگا تھا۔ خدا نے کہا اچھا طعنہ بھی ملے گا (زخم نیزہ کا) اور وہ طاعون کی شکل میں اور ایسا وسیع ہو گا کہ لوگ اور خود بیمار اس زخم کی شدت اور فراخی اور وسعت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اور وہ جب تھوکے گا اور کھانسے گا تو خون تھوکے گا۔ تا کہ دیگر دو قسم کی طاعونوں کی نسبت ایک امتیاز نمایاں موجود ہو زخمی ہو کر پھٹ جانا کے لفظ ایسے ہی ہیں۔ جیسے کوئی کہے پھیپھڑے سخت متورم ہو کر ان کے Cells کی دیواریں پھٹ گئی ہیں۔ اور ان میں سے خون بہہ رہا ہے۔ پس کوئی بات بھی قابلِ اعتراض نہیں۔ خدائی زخم اور خدائی نیزے ایسے لطیف ہوتے ہیں۔ کہ باہر تو نشان نہیں ہوتا اور چھاتی کے

اندر کے اعضاء چھلنی ہو جاتے ہیں۔

اقرب الموارد جو عربی کی مشہور لغت ہے اس میں لکھا ہے۔ طعنة نجلاء ایک محاورہ ہے۔ جس کے معنی وسیع زخم کے ہیں۔ پس طاعون کے کیڑوں نے سعد اللہ کے ہر دو پھیپھڑوں میں ہر جگہ زخم کر دیئے اور یہ لفظ پورے طور پر اس پر صادق آگیا۔ کیونکہ وہ بیوبانک پلیگ اور Septicawic Plague سے نہیں مرا بلکہ ایسے طاعون سے مرا۔ جس میں سارے جہان نے اس کے زخم کے خون کو دیکھ لیا اور اس طاعون کی قسم سے ہلاک ہوا۔ جس کا زخم سب سے وسیع اور فراخ تھا۔ والسلام

(ڈاکٹر میر) محمد اسماعیل

(روزنامہ الفضل ۱۷ ستمبر ۱۹۵۰ء)

دُعا اور سلام

سوال :- لوگ کہتے ہیں کہ دُعا کے وقت آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کر التجا کرنا گناہ اور بے ادبی ہے۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ دُعا صرف بعد از نماز مسنون ہے۔ تو کیا نماز کے علاوہ چلتے پھرتے دُعا کرنا بے فائدہ ہے؟

جواب :- نماز کے تو خاص آداب ہیں۔ اس لئے اِدھر اُدھر دیکھنا یا آسمان کی طرف منہ کرنا منع ہے۔ لیکن نماز کے علاوہ اگر آپ کو جوشِ دُعا کا اُٹھے تو بیشک آسمان والے سے آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر دُعا کر سکتے ہیں۔ کوئی حرج نہیں۔ جب مشرق و مغرب شمال جنوب ہر سمت دُعا ہو سکتی ہے تو آسمان کی طرف منہ کر کے دُعا کرنا بھی منع نہیں ہو سکتا۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ (البقرہ : ۱۴۵)

ترجمہ :- ہم تیری توجہ کا بار بار آسمان کی طرف پھرنا دیکھ رہے ہیں۔

پر بھی غور کریں۔ اسی طرح دُعا بعد از نماز کے علاوہ نماز کے اندر دُعا یا ہر وقت ہر لحظہ اور ہر جگہ دُعا کرنا بھی امر مسنون ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ

ترجمہ :- (وہ عقلمند) جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اللہ کو یاد کرتے (رہتے) ہیں۔ (آل عمران : ۱۹۲)

کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کھڑے چلتے بیٹھے لیٹے ہر حالت میں دُعا کرنی چاہیئے۔ انسان کی تمام حالتوں میں کوئی بھی ایسا منٹ یا لمحہ نہیں ہے جس میں دُعا کرنے کی ممانعت

ہو۔ بندہ کی تو بندگی ہی دُعا کرنے میں ہے۔ کیا خدا کی بندگی اور عبد ہونے کی حالت سے کوئی بندہ کسی وقت آزاد ہو سکتا ہے ؛ جب جماع کرتے وقت یا پاخانہ پھرتے وقت کے لئے تک بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دُعائیں بتائی ہیں۔ پھر آپ کو یہ شبہ کیونکر پیدا ہوا؟

سوال :۔ ایک جماعت جب چل رہی تو ان میں سے صرف ایک آدمی سلام کہے اور بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے صرف ایک آدمی جواب دے۔ کیا یہ کافی ہے ؟

جواب :۔ سلام اور اس کا جواب فرض کفایہ ہے۔ فرض کفایہ اسے کہتے ہیں کہ جماعت میں سے ایک کر دے یا چند آدمی وہ کام کر دیں تو سب کی طرف سے ادا ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر کوئی بھی نہ کرے تو سب گنہگار ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی مر گیا ہے تو جنازہ کے ساتھ اگر چند آدمی چلے جائیں تو سارے مسلمانوں کی طرف سے مردہ کا فرض پورا ہو گیا۔ لیکن اگر کوئی بھی نہ جاوے تو سب گنہگار ہوں گے۔ یہ عین عقل کے مطابق ہے۔ اسی طرح سلام اور اس کا جواب ہے اگر ایک جماعت کے سب لوگ سلام کریں اور دوسرے سب اس کا جواب دیں تب بھی اچھا ہے۔ اگر چند اشخاص یا صرف ایک شخص سلام کرے اور دوسروں میں سے بھی ایک یا چند جواب دے دیں تو بھی جائز ہے۔ کیونکہ جب ایک نے السلام علیکم کہا (یعنی تم سب پر سلام ہو) اور دوسروں میں سے ایک نے جواب دیا کہ علیکم السلام (یعنی تم سب پر بھی سلام ہو) تو پھر کسی کو یہ شکایت باقی نہیں رہے گی کہ فلاں آدمی دعا سے باہر رہ گیا۔

(روزنامہ الفضل ۲۵ر دسمبر ۱۹۲۲ء)

رشتوں کی حرمت اور ورثہ کے متعلق قرآنی احکام میں حکمتیں

جامعہ احمدیہ کے ایک طالب علم کا خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

جناب میر صاحب:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ہمارے سلسلہ کے علماء خصوصاً حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے کئی بار فرمایا ہے کہ قرآن کریم اپنے احکام اور دعووں کی حکمت اور دلیل بیان کرتا ہے۔ میں اسی بات کو مدنظر رکھ کر قرآن کریم کا ایک رکوع روزانہ غور سے اور اچھی طرح سمجھ سمجھ کر مطالعہ کرتا ہوں۔ اکثر مقامات ایسے ہیں جہاں قرآنی احکام کا فلسفہ اور منطقی دلیل بیان کی ہوئی سمجھ میں آجاتی ہے۔ لیکن بعض مقامات ایسے بھی ہیں۔ جہاں ان احکام کی دلیل اور حکمت بالکل سمجھ میں نہیں آتی۔ اس لئے میں یہ بات بھی چاہتا ہوں کہ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کریم ہر حکم کا فلسفہ اور اس کی منطقی دلیل بیان کرتا ہے یا یہ کہ بعض خاص نوعیت کے احکام کی دلیل بیان کرتا ہے۔ اور بعض کی بیان نہیں کرتا۔ اور پھر اگر بعض احکام کے لئے تخصیص ہے۔ تو ایسے احکام کے امتیاز کا کیا ذریعہ ہے۔ چونکہ پرسوں کے "الفضل" میں آپ کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں اس امر پر کسی قدر روشنی ڈالی گئی ہے اس لئے میں جناب سے اس امر

کے متعلق تفصیلی علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ نیز ان احکام میں سے جن کی حکمت اور دلیل قرآن کریم میں بیان کی گئی۔ مجھے نظر نہیں آئی۔ وہ سمجھنا چاہتا ہوں۔

۱۔ سورۂ نساء کے چوتھے رکوع میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ (النساء ۲۴)

ترجمہ: تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں تم پر حرام کی گئی ہیں۔

ان آیات میں ان رشتوں کے حرام ہونے کی وجہ اور دلیل بیان نہیں کی گئی۔

۲۔ اسی سورت کے دوسرے رکوع میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ

(النساء ۱۲)

ترجمہ: اللہ تمہاری اولاد کے متعلق تمہیں حکم دیتا ہے (کہ) (ایک) مرد (کا حصّہ) دو عورتوں کے حصّہ کے برابر ہے۔

یہاں بھی مرد کو عورت کی نسبت دگنا حصہ دینے کی وجہ بیان نہیں کی گئی۔

ازراہ کرم ان دو باتوں کو حل فرما دیں اور نیز اس امر کی وضاحت فرمائیں۔ کہ جارا یہ دعوے تمام قرآنی احکام کے متعلق ہے۔ یا یہ دعوے بعض احکام کے لئے مخصوص ہے بہت مہربانی ہوگی۔

خط کا جواب

عزیز مکرم ۔ السلام علیکم

قرآنی احکام کی حکمتیں

قرآن مجید بے شک اکثر جگہ اور جہاں ضرورت ہو احکام کا فلسفہ بیان کرتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر حکم کا فلسفہ ہو۔ کیونکہ بعض باتوں کی حکمت تو ایسی ظاہر ہے کہ بے وقوف بھی اسے سمجھتے ہیں۔ اور اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ اور بعض کی قرآن میں تو موجود ہے مگر ہر شخص اسے نہیں نکال سکتا۔ یہ اس لئے کہ ایسی حکمت نکالنا بھی سرسری کام نہ رہے۔ بلکہ مطہروں کا ہی کام ہو۔ یہی وجہ ہے کہ باریک حکمتیں ہما شما نہیں نکال سکتے۔ بلکہ حضرت مسیح موعود اور حضرت خلیفۃ المسیح ہی نے یہ کام کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر روز اول ہی ساری حکمتیں قرآن کی میری یا آپ کی سمجھ میں آجائیں تو پھر تو قرآن انسانی کتاب ہوا نہ کہ خدائی الہام انسانی کتابیں ظاہر اور صاف دلیلیں دیتی ہیں۔ اور جو کچھ ان میں ظاہر لکھا ہوا ہوتا ہے۔ وہی ان کا تمام مبلغ علم ہوتا ہے۔ ان میں خزانے نہیں ہوتے کہ نئے نئے اور بوقت ضرورت اور زمانہ کے مطابق اور مخالفین کے اعتراضوں کے موافق استنباط اور جواب نکلتے رہیں۔ چوتھے یہ کہ بعض جگہ ظاہر طور پر دلائل اس لئے نہیں دیئے۔ کہ وہ علمی مسائل ہیں اور خدا تعالیٰ نے دنیاوی علوم کے ذریعہ آئندہ زمانہ میں ان کی صداقت ثابت کرنی ہے۔ تا جب وہ علوم کھلیں۔ تب معلوم ہو کہ سبحان اللہ قرآن میں یہ صداقت پہلے سے موجود تھی۔ مگر راز اس کا اب علوم جدیدہ کے ذریعہ کھلا ہے۔ یہ علمی راز اگر قرآن میں صاف الفاظ میں لکھے بھی جاتے۔ تو اس زمانہ کے لوگ اس کو سمجھ نہ سکتے بلکہ وہ ٹھوکر کھاتے پہلے زمانہ کے مخالف لوگوں کے لئے اس وجہ سے قرآن باریک اشارہ تو کر دیتا ہے مگر صداقت کے دلائل کو آئندہ اپنے وقت پر ظاہر

ہونے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ شلاً شراب کی دلیل یہ کافی ہے کہ اس کا نام عربی میں
خمر ہے۔ وہ عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ فرمایا کہ وہ جھگڑے اور فساد کا
باعث ہے۔ مگر ایک مجمل دلیل یہ بھی دی کہ

اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۚ (البقرہ، ۲۲۰)

ترجمہ: اور ان کا گناہ (اور نقصان) ان کے نفع سے بہت بڑا ہے

اب اس میں بات مخفی کر دی۔ کہ آئندہ زمانہ میں جب سائنٹفک تحقیق اور تجربے ہونگے۔ تو اس حقیقت کے
کے مزید نقصانات جگر، دل، گُردوں، رگوں اور دماغ پر اور آئندہ نسل پر ثابت ہوں گے۔
اسی طرح اس کے فوائد بعض بیماریوں یا اشیاء کو محفوظ رکھنے یا کیمسٹری کے تجربوں کے لئے
بھی ثابت ہوں گے۔ مگر بہرحال کتنے ہی نقصانات اور کتنے ہی فوائد ثابت ہوتے چلے جائیں۔
نقصانات کا پلہ بہت بھاری رہے گا۔

کئی جگہ خدا تعالیٰ نے اس لئے بھی حکمت ظاہر نہیں کی کہ لوگ بعض حکمتوں کو پڑھ کر باقی
حکمتیں اپنی عقل اور فکر سے نکالیں۔ اسی طرح قرآن ذہن اور عقل کو تیز کرتا ہے جس طرح
استاد بہت سی ہدایتیں دے کر پھر شاگرد کو کہتا ہے۔ کہ اب تم کو ایک راستہ پر چلا دیا ہے
آئندہ تم خود بھی حکمتیں نکالا کرو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے تفقہ اور اجتہاد کو ضروری قرار دیا ہے۔
اور قرآن ایک صداقت بتا کر پھر کہہ دیتا ہے اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ اور اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۔
اسی طرح تفکر اور تدبر ظاہر سے باطن کی طرف جانے کی تاکید قدم قدم پر پائی جاتی ہے۔

الغرض اصول باندھ دیا ہے کہ شریعت کے احکام بادلائل اور مفید اور مطابق عقل
ہیں۔ پھر بکثرت نمونے خود ان دلائل کے دے دیئے ہیں۔ اس کے بعد عقل اور فکر کے لئے
ترغیب دی ہے۔ کہ خود بھی نکالا اور آئندہ نسلوں کے لئے بہت سی صداقتوں کو چھوڑ دیا ہے۔
تاکہ جب نئے نئے علوم ان کی تائید کریں تو ثابت ہو جائے کہ یہ ایک عالم الغیب ہستی کا کلام

ہے۔ آقرماں باپ بھی تو ساری باتیں بچوں کو نہیں بتا دیتے۔ بلکہ یہ امید رکھتے ہیں کہ ہم لے بہت سی باتیں سکھا کر ان کو سیدھے راستہ پر چلا دیا ہے۔ اب یہ خود سوچیں اور غور کریں۔ علاوہ ازیں بہت سی روحانی باتوں کے دلائل وجدانی بھی ہوتے ہیں اور قرآن کے ساتھ ایک اور مخفی علم یعنے علم لدنی مومن انسان خدا کی طرف سے پاتا ہے۔ ہزاروں گناہوں اور نیکیوں کا علم مومن، منہ معانی سے براہ راست قرآن مجید کی اتباع اور برکت سے حاصل کرتا ہے۔ اور اُن کے دلائل روحانی ہوتے ہیں جو الفاظ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ایک باطنی نور ہوتا ہے جس سے ہر بات کی حکمت اور اس پر انشراح انسان کو نصیب ہوتا ہے۔ اور وہی ان کی دلیل ہے۔ مگر یہ ایک باریک سلسلہ ہے۔

آپ اگر غور اور تدبر کرتے رہیں۔ تو بعض دلائل صاف نظر آئیں گے۔ بعض غور و تدبر کے بعد ملیں گے۔ بعض علوم جدیدہ سے دستیاب ہوں گے۔ کیونکہ قرآن خدا کی قولی کتاب ہے۔ اور صحیفۂ نیچر خدا کی فعلی کتاب۔ اور ایک کے لئے دوسرے سے دلائل لئے جا سکتے ہیں۔ پھر کئی دلائل مطہر لوگوں سے ملیں گے۔ پھر بھی کئی باتیں رہ جائیں گی۔ وہ آئندہ زمانہ میں بھی ثابت ہوں گی۔ یا اگلے جہان میں ان کی صداقت ظاہر ہو جائے گی۔

رشتوں کی حرمت

اب میں آپ کے دونوں سوالوں کو لیتا ہوں۔ سوال رشتوں کی حرمت۔ اس میں پانچ قسم کے رشتے حرام ہیں۔ ۱۔ خونی رشتے۔ مثلاً ماں بہن۔ بیٹی وغیرہ۔ ۲۔ تعظیمی رشتے۔ مثلاً ساس بہو۔ سوتیلی ماں اور ازواج النبی۔ ۳۔ قاطع رحم رشتے جو محبت توڑ کر فساد کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً دو سگی بہنوں کا۔ یا بموجب حدیث شریف پھوپھی بھتیجی۔ اور خالہ بھانجی کا جمع کرنا۔ ۴۔ کفر پیدا کرنے والے رشتے۔ مثلاً مشرک سے نکاح کرنا۔ یا اہل کتاب کو لڑکی دینا۔ ۵۔ رضاعی رشتے جو دودھ کے رشتے کہلاتے ہیں۔

اب دیکھ لو۔ یہاں کئی باتیں جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ موجود ہیں۔ یعنی شلہ

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُم مِّنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۚ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا وَسَاءَ سَبِيلًا ○ (النساء ۲۳)

ترجمہ ۔ اور ان عورتوں میں سے جنہیں تمہارے باپ دادے نکاح میں لا چکے ہوں کسی سے نکاح نہ کرو مگر جو (پہلے) گذر گیا (سو گذر گیا) یہ فعل یقیناً گندہ اور غصہ دلانے والا تھا اور (یہ) بہت بُری رسم تھی۔

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے آخری حصہ میں ایک دلیل اس حرمت پر دی ہے پس معلوم ہوا کہ بے وجہ یہ رشتے حرام نہیں۔ بلکہ ان کی حرمت میں دلائل ضرور ہیں اور ایک دلیل نمونہ کے طور پر دے بھی دی۔

حرمت کے متعلق دلائل

ظاہر ہے کہ میاں بیوی میں مدارج کی برابری ضروری ہے۔ مگر یہ بات تعظیم والی جگہ کہاں ہو سکتی ہے۔ یہ کہنا کہ تعظیمی رشتہ کا لفظ کہاں سے نکال لیا؟ یہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ

وَلَا أَن تَنكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِن بَعْدِهِ أَبَدًا ۚ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمًا (احزاب ۵۴)

ترجمہ ۔ اور نہ یہ جائز ہے کہ تم اس کے بعد اس کی بیویوں سے کبھی بھی شادی کرو۔ یہ بات اللہ کے فیصلہ کے مطابق بہت بُری ہے۔

یہ رشتہ عظیم ہے اس لئے حرام ہے۔ اور خود حرام کے معنے بھی عزت وعظمت کے ہوتے ہیں۔ پس جہاں فریقین میں عظمت کا سوال آجائے اور مدارج کی برابری نہ رہے وہاں حرمت بھی آجائے گی۔ دو بہنوں کا جمع کرنا ظاہر ہے یہ عقل کا اور تجربہ کا سوال ہے ہر شخص جانتا ہے کہ دو سگی بہنوں میں کس قدر محبت ہوتی ہے۔ پھر جب وہ سوکنیں بن جائیں گی

تو کس قدر عداوت ہو جائے گی اور فساد برپا ہو گا۔ پس یہاں اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ والی دلیل سامنے آ جائے گی۔ اسی طرح مشرکہ عورت کی اولاد شرک سے متاثر ہو گی۔

اسی رکوع کے ختم پر آگے چل کر ان رشتوں کی حرمت پر ایک دلیل پھر دی ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۔ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا (نساء ۲۶، ۲۷)

ترجمہ: اللہ چاہتا ہے کہ جو لوگ تم سے پہلے (گذرے) ہیں اُن کے طریقے تمہارے لیے بیان کرے اور ان کی طرف) تمہاری رہنمائی کرے اور تم پر شفقت کرے اور اللہ بہت جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔

اور اللہ تو (یہ) چاہتا ہے کہ تم پر شفقت کرے اور جو لوگ بُری خواہشوں کے پیچھے پڑتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم (بدی کی طرف) بالکل جھک جاؤ۔

یعنی ایسی ہی حرمتیں تم سے پہلے سب مذاہب میں ہم نے قائم کی تھیں۔ اور اُن کی حکمتیں علیم وحکیم خدا ہی خوب جانتا ہے وہ تم پر مہربان ہے اُس کی بات مان لو۔ ورنہ بدکار شہوت پرست لوگ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم اندھے ہو کر ماں بہن اور بیٹی کا بھی لحاظ نہ کرو۔ اور جانوروں کی طرح جماع کرتے پھرو۔

یہاں یہ دلیل دی۔ کہ دُنیا کے تمام مذاہب میں رشتوں کی حُرمت موجود ہے پس ضرور ان میں کوئی فطری بات ہے۔ کون ہے جو اپنی ماں کو بیوی بنا سکے یا بیٹی۔ بہن پر نظر بد ڈال سکے۔ سوائے اس کے جس کی فطرت ہی مسخ ہو چکی ہو۔ انسانی فطرت ہی اس بات کو دھکے دیتی ہے۔ پھر جو حکمتیں ابھی تک ظاہر نہیں ہوئیں۔ علیم وحکیم خدا ان کو اپنے وقت پر ظاہر کرے گا۔ ابھی تم بغیر مزید علمی انکشافات کے ان کو سمجھ نہیں سکو گے۔ کیا سوائے سخت بدکار

اور یہ معاشی شہوتی لوگوں کے کسی کسی شنا بھی ہے کہ ماں۔ بہن بیٹی وغیرہ سے کسی شریف نے کبھی تعلق پیدا کیا ہو؟

خداوندانہ احکام

حلال حرام کے متعلق شریعت اسلام کا ایک اصل یہ بھی ہے کہ ہر بات میں اس نے ایک خانہ خدا کے لئے بھی خالی چھوڑا ہوا ہے۔ تاکہ شریعت ایک بادشاہی قانون معلوم ہو۔ اور خدا کی فرمانبرداری کا دین و دُنیا کے ہر کام میں امتحان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کھانے پینے۔ نکاح۔ کمائی حتیٰ کہ نماز روزہ اور نیک کاموں تک میں بھی بعض باتیں ناجائز رکھ دیں۔

لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ (المائدہ: ۹۵)

ترجمہ۔ تاکہ اللہ اُن لوگوں کو ظاہر کر دے جو علیحدگی میں اس سے ڈرتے ہیں۔

تاکہ اصلی فرمانبردار اور خواہش کے بندے میں فرق ہوتا رہے اور بندہ بھی افراط و تفریط سے بچتا رہے۔

مثال کے طور پر آیت

غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (المائدہ: ۱)

ترجمہ۔ بشرطیکہ تم اس اجازت کی وجہ سے احرام کی حالت میں شکار کرنا جائز نہ سمجھ لو۔ اللہ یقیناً جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے۔

بتاتی ہے کہ احرام میں شکار کو حرام کر دینا بظاہر بڑی سختی ہے۔ ایک حلال طیب چیز کو کیوں حرام کر دیا گیا۔ سو اس کا جواب یہ دیا کہ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ۔ ہم بادشاہ جو ہوئے جو چاہیں۔ حکم دیں۔ تم کو ماننا ہوگا۔ یہ ہم مانتے ہیں کہ خدا

کی کوئی بات علم وحکمت سے خالی نہیں ہوتی۔ مگر بعض اوقات وہ ان کی حکمت واضح نہیں کرتا۔ یونہی شاہانہ احکام جاری کر دیتا ہے۔ تاکہ دیکھے کہ بندے صرف اپنے فائدہ کی غرض سے ہی میرے احکام مانتے ہیں۔ یا مجھے مالک سمجھ کر بھی میرے فرمانوں پر سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

خونی رشتوں کی حُرمت میں حکمت

اب ان خونی رشتوں کے متعلق میں ایک نئی بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ انسانی خون کے متعلق موجودہ تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ کئی قسم کا ہوتا ہے۔ اور ایک قسم کا خون اگر دوسری قسم کے خون والے آدمی میں ڈال دیا جائے تو مہلک ثابت ہوتا ہے۔ اگر اسی قسم کے خون والے آدمی میں ڈالا جائے تو غیر مہلک بلکہ مفید ہوتا ہے۔ زید اگر ایسا سخت بیمار ہے کہ اس کے اندر جان بچانے کے لئے کسی کا خون بذریعہ پچکاری داخل کرنے کی ضرورت ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ ہر شخص کا خون کارآمد ہو سکے۔ اگر زید کا خون اے کلاس کا خون ہے تو ویسے ہی آدمی کا خون اس کی جان بچا سکے گا۔ جو خود اے کلاس کا خون رکھتا ہو۔ اگر بی کلاس والے کا خون زید کے اندر چڑھا دیا جائے گا تو زید مر جائے گا۔ یہی حال سی کلاس اور ڈی کلاس وغیرہ کا ہے۔

یہ تفتیش اور تجربات گو ابھی تکمیل کو نہیں پہنچے۔ پھر بھی بعض قانونی مقدمات میں بچہ اور ماں باپ کے خون کا مقابلہ کرنے سے یہ معلوم ہو گیا۔ کہ یہ بچہ اسی باپ کا ہے یا ولد الحرام۔ پس خون لوگوں کے مختلف ہوتے ہیں اور اپنی اپنی تاثیر رکھتے ہیں۔

اسی طرح مزید قسمیں خون کی دریافت ہو رہی ہیں۔ کیا تعجب کہ کسی زمانہ میں سگے رشتہ داروں کا خون اور ان کے آپس میں ملنے کے نقصانات اور نسل پر اس کا اثر یہ سب باتیں روشن ہو جائیں۔ ابھی تو یہ ابتدا ہے۔ مگر جب اتنا ثابت ہو گیا کہ مختلف انسانوں کے

خون مختلف تاثیرات رکھتے ہیں۔ تو یہ بھی ضرور ثابت ہو گیا۔ کہ خونی رشتوں پران کا اثر ضرور ہے۔ اور جتنا قریب رشتہ ہے اتنا ہی اثر ہے۔ آگے مزید توضیحات ہوتی رہیں گی۔ ابھی تو ایک اشارہ مومن کے لئے خونی رشتوں کی علت حرمت کے مسئلہ کے متعلق کافی ہے۔

اسی طرح تحقیقات جدیدہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ انسانوں میں رشتہ داریاں اگر ہمیشہ اقرب رشتہ داروں میں ہوں تو نسل اور خاندانی کمالات اور خصوصیات تو قائم رہتے ہیں۔ مگر نسل کم ہو جاتی ہے اور بعض پیدائشی نقص مثلاً مادر زاد گونگا بہرا اندھا ہونا وغیرہ زیادہ ہو جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر رشتہ داریاں غیروں کے ساتھ ہوں تو نسل زیادہ ہوتی ہے۔ مادر زاد نقص کم ہوتے ہیں۔ اور نئی نسل زیادہ عمدہ ہوتی ہے۔ گو خاندانی خصوصیات کم ہو جاتی ہیں۔ چونکہ اسلام دونوں قسم کے فوائد دینا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے ایک طرف تو نہایت اقرب رشتہ داریاں بند کر دیں۔ اور دوسری طرف ہندوؤں کی طرح یہ نہیں کیا کہ سات پشت تک بھی خونی رشتہ ملتا ہو تو ہرگز نکاح نہ کیا جائے۔ بلکہ نہایت قریبی رشتہ داروں کے علاوہ باقی برادری سے بھی اجازت دے دی ہے۔ اور غیروں سے بھی تاکہ لوگوں کو تنگی نہ ہو۔ تورات کی طرح یہ نہیں کہا۔ کہ بنی اسرائیل کے سوا کسی کی لڑکی لینی نہیں چاہیئے۔

دودھ کے رشتوں میں حرمت کی حکمت

اب رہا دودھ کے رشتوں کا معاملہ تو خون کی طرح انشاءاللہ وہ بھی ایک دن کھل جائے گا ابھی کئی باتیں ہیں جن کے لئے یوم تبلی السرائر والے انکشافات کا وقت نہیں آیا علاوہ ازیں آئندہ زمانوں کے لئے بھی قرآن صداقتوں کے ثبوت چھوڑنے چاہئیں۔ اگر ساری دلیلیں پہلے ہی موجود ہوتیں تو یہ خدائے حکیم کا کلام نہ ہوتا جب بکثرت حکمتوں سے ہم واقف ہو گئے۔ تو باقی بھی مان لینی چاہئیں۔ ورنہ ایمان کبھی بھی نہ ہو گا۔

تقسیم ورثہ میں حکمت

اب دوسری بات لیجئے یعنی ورثہ میں مرد کا عورت سے دوہرا حصّہ ہونا اس کی دلیل خدا تعالیٰ نے یہ بیان کی ہے ۔

اوّل ۔ مرد عورتوں پر اس لئے فضیلت رکھتے ہیں کہ ان کا نان نفقہ اور مہر مردوں کے ذمہ ہے ۔ (وَبِمَآ اَنۡفَقُوۡا) مردوں پر خرچ کرنے والا کوئی نہیں ۔ عورتوں پر خرچ کرنے والے مرد ہیں ۔

وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَيۡنَكُمۡ (البقرہ ۲۳۸)

ترجمہ : اور تم آپس میں (معاملہ کرتے وقت) احسان کو نہ چھوڑا کرو ۔

وَعَلَى الۡمَوۡلُوۡدِ لَهٗ رِزۡقُهُنَّ وَكِسۡوَتُهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ

(البقرہ ۲۳۴)

ترجمہ : اور جس کا بچہ ہے اُس کے ذمہ حسب دستور اُن (دودھ پلانے والیوں) کا کھانا اور اُن کی پوشاک ہے ۔

غرض مردوں کے ذمہ شریعت نے عورتوں کے سب ضروری خرچ لگا دیئے ہیں ۔ حتّٰی کہ مرنے کے بعد بھی عدّت پوری ہونے تک بلکہ ایک سال تک وہ ان کی جائداد سے خرچ طلب کر سکتی ہیں ۔ پس جب تمام اخراجات عورتوں کے اور اُن کے بچوں کے سب مردوں کے ہی ذمہ خدا تعالیٰ نے رکھے ہیں ۔ تو پھر آمدنی بھی مردوں کو ہی زیادہ جانی چاہئے ۔ اسلئے ورثہ کا حصہ بھی ان کو زیادہ ملنا چاہیئے ۔

باقی یہ کہ کتنا زیادہ ملنا چاہیئے ۔ یہ اس آیت سے استنباط ہوتا ہے ۔ جہاں مردوں کی شہادت کی قیمت عورتوں کی شہادت سے دگنی بیان کی گئی ہے ۔ اس لئے ان کو ورثہ بھی دگنا ملنا چاہیئے ۔ (الفضل ۷ مارچ ۱۹۳۰ء)

روزہ دار کا نسوار (ہُلاس) مُنہ میں ڈالنا

تمباکو کھانے کے مختلف طریقے دنیا میں رائج ہیں۔ کوئی اسے پان میں رکھ کر کھاتا ہے کوئی سگریٹ بیڑی یا حُقہ کے طور پر استعمال کرتا ہے اور کوئی بطور ہُلاس یعنی نسوار بنا کر ناک میں چڑھاتا ہے۔ کوئی مسوڑھوں پر ملتا ہے۔ اثر ان سب طریقوں کا ایک ہی ہے۔ خواہ کھایا جائے۔ خواہ دھواں چھاتی کے اندر کھینچا جائے۔ خواہ اس کے باریک ذرّات ناک میں چڑھائے جائیں۔ خواہ اسے مسوڑھوں پر ملا جائے۔ معدہ بھی اسے جذب کرتا ہے اور سانس کی نالیاں بھی۔ اور مُنہ یا ناک کی جھلیاں (میوکس ممبرین) بھی اسے اسی طرح جذب کرتی ہیں جس طرح معدہ کی دیواریں اور تمباکو خوار کا نشہ ان چاروں راستوں سے ایک ہی طرح پورا ہوتا ہے۔ اکثر صورتوں میں تو اگر ایک چیز مُنہ کے اندر مل جائے تو اس کا اثر دوسرے طریقوں کی نسبت جلد تر کارگر ہو جاتا ہے مثلاً اگر روٹی کے ٹکڑوں کے اندر سٹرکنیا یعنی کچلہ کا زہر ملا کر دس کتوں کو ہلاک کرنے کے لئے دیا جائے۔ تو جو کتے ان ٹکڑوں کو کھائیں گے وہ غالباً آدھ گھنٹے میں زہر کے اثر سے ہلاک ہوں گے لیکن جو کتے ٹکڑا چبا کر تھوک دیں گے اور تلخی کی وجہ سے انہیں باہر نکال دیں گے اور نگلیں گے نہیں۔ وہ قریباً دس منٹ کے اندر ہی ہلاک ہو جائیں گے۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ سٹرکنیا معدہ میں جا کر زیادہ دیر میں جذب ہوتا اور اپنا اثر پیدا کرتا ہے۔ مگر وہی سٹرکنیا مُنہ کی جھلی میں سے بہت سُرعت کے ساتھ جذب ہو کر خون میں پہنچ جاتا ہے اور جلد تر باعثِ مرگ بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر لوگ جب کسی دوا کا اثر فوری طور پر چاہتے ہیں تو اُسے بذریعہ ٹیکہ سُوئی سے لگاتے ہیں۔ اور اگر اس سے کم جلدی چاہتے ہیں۔ تو ان ادویات کو مُنہ میں زبان کے

نیچے رکھ دیتے ہیں۔ اور اگر اس کا اثر بہت جلدی درکار نہ ہو۔ تو پھر دوا بیمار کو کھلا دیا کرتے ہیں۔ یعنی مُنہ میں دوا رکھنا زیادہ جلدی اثر پیدا کرتا ہے بہ نسبت کھانے کے۔ مثلاً آپ ایک شخص کو مارفیا دینا چاہتے ہیں۔ تو اگر ایک گھنٹہ تک اثر چاہتے ہیں تو اسے کھلائیں گے۔ اگر بیس منٹ میں اثر درکار ہے تو مارفیا کی ٹکیہ زبان کے نیچے رکھ دیں گے۔ اور اگر پانچ منٹ میں اثر درکار ہے تو مارفیا بطور ٹیکہ زیر جلد پچکاری سے جسم میں داخل کریں گے۔

اس تمام تحریر سے یہ ثابت ہے کہ تمباکو کھانے والوں کی نسبت مُنہ میں تمباکو رکھنے والے لوگوں پر اس کا اثر جلدی ہوتا ہے۔ ورنہ لوگ نسوار مُنہ میں ڈالتے ہی کیوں ہیں۔ اصل مطلب تو تمباکو کا وہی نشہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ جو کھانے والا یا سگریٹ پینے والا کرتا ہے۔ صرف راستے اور طریقے کا فرق ہے۔ پس جس طرح کلوروفارم سونگھنے سے یا حقنہ کے ذریعہ پانی چڑھانے سے یا ٹیکہ کی سوئی کے راستہ دوا جسم میں داخل کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح نسوار مُنہ کے اندر رکھنے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ صرف اتنا یاد رکھنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں یہ چیزیں دُنیا میں مروج نہ تھیں۔ اب مروج ہو گئی ہیں۔ اس لئے اہل عقل واجتہاد اس زمانہ کی نئی چیزوں پر قرآن وحدیث کے موافق اور روزہ کی اصلیت کو دیکھ کر فتوے لگاتے ہیں۔ صرف لفظ پرستی نہیں کرتے۔

اس تمہید کے بعد میں ایک دوست کے سوالات کا جواب لکھتا ہوں۔ جنہوں نے اپنا پتہ نہیں لکھا۔ مگر غالباً سرحد کے رہنے والے ہیں۔ کیونکہ مُنہ میں نسوار ڈالنا اسی علاقہ سے مخصوص ہے۔

سوال اوّل:- کیا نسوار مُنہ میں ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب:- چونکہ نسوار لینے والا نشہ کے ارادہ سے نسوار کو منہ میں ڈالتا ہے اور پھر عملی طور پر اس کا نشہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی تمباکو کا جوہر اس کے جسم میں رچ جاتا اور اس کی تسلی ہو جاتی ہے۔ آپ ہی بتائیے کہ روزہ ٹوٹنے میں کیا شک رہ گیا۔ کیا نسوار والے یونہی یہ لغو شغل کرتے ہیں یا نشہ پورا کرنے کے لئے۔ جو اس کا فیصلہ میں آپ پر ہی چھوڑتا ہوں۔

سوال ۱۲: اگر روزہ ٹوٹ جاتا ہے تو کس وجہ سے نسوار ماکولات و مشروبات میں سے نہیں؟

جواب: دین کا ایک حصہ واضح ہوتا ہے اور ایک حصہ زمانہ کے حالات اور ایجادات کے موافق تفقہ اور عقل اور استنباط پر چلتا ہے۔ تمباکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھا۔ اس لئے اس کا ذکر نہیں آتا۔ نہ لوگ کسی اور چیز کو منہ میں ڈالا کرتے تھے۔ اب جبکہ تمباکو یا نسوار رائج ہو گئے تو اس اصل کے ماتحت یہ فتویٰ استنباط کیا گیا کہ جو اثر تمباکو کھانے کا ہوتا ہے۔ وہی منہ میں ڈالنے یا اس کا دھواں سونگھنے سے ہوتا ہے اور چونکہ نتیجہ ایک ہی تھا۔ اس لئے کھانے والا فتویٰ باقی دونوں صورتوں پر بھی جاری ہوا۔ سگریٹ تو Smoke کیا جاتا ہے اور نہ مشروبات میں سے ہے اور نہ ماکولات میں سے پھر اس کو روزہ شکن کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ صرف اسی وجہ سے کہ اس کا اثر بالکل وہی ہے جو کھانے کا۔ نسوار منہ میں ڈالنا ماکولات میں داخل ہے۔ گویا ہر نسوار ڈالنے والا اُسے تھوک دیتا ہو۔ بلکہ کھانے سے بھی زیادہ زود اثر یہ طریقہ ہے۔ ہمیں نتائج اور منشاء پورا کرنے کا عمل دیکھنا ہے نہ کہ الفاظ اور روح احکام پر عمل کرنا ہے نہ کہ حیلوں پر۔

یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ نسوار منہ میں ڈالنے سے حلق کے نیچے نہیں اترتی۔ ایک حصہ ضرور اُترتا ہے۔ خواہ عام لوگ نہ سمجھیں۔ انسان ہر وقت اپنا لعاب دہن نگلتا رہتا ہے اور اس لعاب کے ساتھ ہر وہ چیز جو منہ میں جاتی ہے کچھ نہ کچھ اس کے اندر بھی جاتی رہتی ہے۔ اسی بیان کے لئے ایک فقیہ حضرت عطاء نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی روزہ دار اپنے منہ میں پانی ڈال کر کُلی کر دے۔ اور پھر اپنا تھوک نگلے تو وہ پانی ملا ہوا تھوک اس کے روزہ کو خراب نہیں کرے گا۔ لیکن اگر وہ مصطگی چبا کر تھوک دے۔ پھر اپنا لعاب دہن نگلے تو اس سے احتیاط لازم ہے۔ اور ایسا نہ کیا جائے۔ (یہ قول مشکوٰۃ میں موجود ہے)

بیشک نسوار عام لوگوں کے لئے تو ماکولات میں سے نہیں ہے لیکن ایک عادی کے لئے تو وہ ماکولات میں سے ہے۔ بھنی کوئی نہیں کھاتا لیکن بعض حاملہ عورتیں اسے شوق سے کھا لیتی ہیں۔

تو کیا مٹی کھانے سے روزہ نہ ٹوٹے گا۔

سوال:۔ اگر یہ وجہ بتائی جائے کہ نسوار کا اثر وجود پر پڑتا ہے تو کیا اگر روزہ دار صرف پانی کی کُلی کرتا ہے۔ اور اس سے اپنی پیاس بجھائے۔ تو پھر پانی بھی منہ میں نہیں ڈالنا چاہیئے۔

جواب:۔ پانی کی کُلی کا تو روزہ دار کو خدا کی طرف سے حکم ملا ہے۔ کیونکہ روزہ بغیر نماز کے بیچ ہے۔ اور نماز بغیر وضو کے نہیں ہو سکتی بس کُلی تو حکماً کی جاتی ہے۔ اس لئے معلوم ہوا کہ وضو والی کُلی کی اجازت ہے اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا لیکن وضو والی کُلی ناقص روزہ نہیں ہے تو ویسی ہی کُلی جس وقت بھی کر لی جائے۔ اس کا کچھ حرج نہ ہوگا بلکہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ غسل کرتے وقت انسان کی جلد بھی کچھ پانی جذب کر لیتی ہے۔ مگر شریعت نے چونکہ اس مجبوری کو جائز رکھا ہے اس لئے اس کا حرج نہیں ہے۔ نیز واضح ہو۔ کہ کُلی کے بعد جو ایک آدھ قطرہ پانی کا لعاب دہن کے ساتھ اندر چلا جاتا ہے۔ اس سے روزہ دار کو کوئی خاص قوت نہیں ملتی۔ صرف منہ کی خشکی دُور ہو جاتی ہے۔ لیکن ایک چٹکی نسوار مُنہ میں ڈالنے سے تو روزہ دار کی پشت دو تین گھنٹہ تک مضبوط رہتی ہے۔

آپ تو کُلی کے متعلق اعتراض کرتے ہیں۔ شارع اسلام نے تو صرف پانی ہی نہیں بلکہ ہانڈی کا نمک چکھنے تک کی بھی بعض صورتوں میں اجازت دی ہے۔ چنانچہ ایک مشہور مسئلہ ہے کہ اگر خاوند کی بدمزاجی کا خوف ہو تو بیوی ہانڈی کا نمک چکھ کر اسی وقت تھوک دے۔ اس فعل سے اس کا روزہ باطل نہیں ہوتا۔

اب ایک لطیفہ سُنیئے ایک بادچی تھا۔ اور باورچیوں کو اکثر دھوئیں میں بیٹھنا پڑتا ہے اور چولہے کا دھواں ان کی سانس کے ساتھ اندر جاتا ہے وہ حقہ بھی پیا کرتا تھا۔ اور روزہ میں اسی غرض سے حقہ نہیں چھوڑتا تھا کہ جب چولہے کے دھوئیں سے میرا روزہ نہیں ٹوٹتا۔ تو حقہ کے دھوئیں سے کیونکر ٹوٹ جائے گا۔ شائد اسی طرح نسوار والے بھائی کی دلیل یہ دیتے ہوں گے۔ کہ جب کُلی کی تری

سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ تو نسوار بھی اگر اس تری کے ساتھ مل کر اندر چلی گئی۔ تو کیا حرج ہوا۔ حالانکہ کُلّی ضروری ہے۔ اور اس کا اثر نہایت ہی خفیف ہے اور اس کی اجازت شرعاً حاصل ہے۔ پانی کے اس استعمال سے ہم کو چارہ نہیں۔ کیونکہ کُلّی وضو کے ارکان میں سے ہے اور مُنہ کی بُو اور اس کی گندگی کو رفع کرنے والی ہے۔ ہاں بے جا اور ہر وقت کُلیاں کرتے رہنے کو بھی فقہاء نے مکروہ سمجھا ہے۔ کیونکہ ڈر ہے۔ کہ کسی وقت بے اختیار زیادہ مقدار پانی کی گلے کے نیچے نہ اُتر جائے۔

دوسرا لطیفہ مجھے یہ یاد آیا کہ ۱۹۲۵ء میں بمقام سولن ہیڈ ایک دینیات کے مدرسہ کے ہیڈ مولوی میرے پاس رمضان شریف میں اپنے لئے دوا لینے آئے۔ جب میں نسخہ لکھ رہا تھا۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد نسوار اپنے مسوڑھوں پر ملتے تھے۔ (وہ کوہاٹ کے تھے) نسخہ لے کر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ایک خوراک روزہ کھول کر اور دوسری سحری کے وقت پی لیا کروں۔ میں نے حیران ہو کر کہا۔ آپ کو تو روزہ نہیں ہے پھر ابھی پینے میں کیا مضائقہ ہے؟ فرمانے لگے ہم تو روزہ سے ہیں۔ میں نے کہا آپ بار بار نسوار مُنہ میں ڈال رہے تھے کہنے لگے اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ میں نسوار کھاتا تو نہیں ہوں۔ مسوڑھوں پر لگا کر فوراً تھوک دیتا ہوں۔ اس طرح سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ میں ان کے علم و فضل اور ان کے اس عمل اور توجیہہ کو دیکھ کر اور کشی کر حیران ہی رہ گیا۔ اسی وجہ سے میں نے اندازہ کیا ہے کہ مجھ سے سوال کرنے والے کا علاقہ بھی غالباً سرحد کا ہے۔

یہاں تک میں نے صرف ان اشیاء کا بیان کیا ہے۔ جو مُنہ کے لعاب ہی میں تحلیل ہو کر اور مُنہ سے براہِ راست جذب ہو کر انسان کے جسم میں داخل ہو جاتی ہیں اور روزہ دار پر وہی اثر کرتی ہیں گویا اس نے اس چیز کو کھایا۔ مثلاً بعض غذائیں یا تمباکو یا وہ دوائیں جو لعاب دہن میں گھُل کر حل ہو جاتی ہیں۔ اور انہیں سے روزہ ٹوٹتا ہے۔ لیکن وہ اشیاء جو پانی یا لعاب دہن میں گھُل ہی نہیں سکتیں۔ اور تحلیل نہیں ہوتیں۔ وہ اگر مُنہ میں ڈال لی جائیں تو ان سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ مثلاً کوئی شخص شیشہ کی گولی یا پتھر کا ٹکڑا سارے دن بھی منہ میں رکھے۔ تو چونکہ ان کا کوئی حصہ تحلیل

کے اندر تھوک میں حل ہو کر بدن میں جذب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ روزہ کو خراب نہیں کرتیں۔ اسی وجہ سے ایسے منجنوں کا کام صرف دانتوں کو صاف کرنا ہوتا ہے۔ اور جن کی اصلیت چاک یا کوئلہ وغیرہ اشیاء ہوتی ہیں۔ اُن کو مُنہ میں رگڑنے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ بشرطیکہ وہ نگل نہ لی جائیں۔ ہاں اگر منجن میں کوئی اس قسم کی دوا شامل ہوگی جو جذب ہو کر اپنا اثر پیدا کرے گی۔ تو اس پر وہی حکم صادر ہوگا جو نسوار کا ہے۔ روزہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسواک بھی ثابت ہے۔ اس لئے سادہ مسواک بھی روزہ شکن نہیں ہے۔ ہاں اگر ہم گنے کی مسواک کرنے لگیں تو وہ ناجائز ہوگی۔ کیونکہ اس کی مٹھاس بڑی آسانی سے مُنہ میں سے جذب ہو کر غذا کا کام دے سکتی ہے۔ خواہ نگل نہ بھی جائے۔ اس لئے صرف ایسی چیزیں جو لعابِ دہن میں گھُل جائیں۔ وہ روزہ کو فاسد کرتی ہیں۔ مگر جو نہ گھُلیں اور نہ جذب ہونے والی ہوں۔ وہ روزہ کو فاسد نہیں کرتیں۔

یہ تمام باتیں میں نے عقلیہ طور پر لکھی ہیں۔ کیونکہ آپ نے مولویانہ بحث اور کتابوں کا سند قبول کرنے سے انکار فرما دیا تھا۔

(روزنامہ الفضل یکم ستمبر ۱۹۲۴ء)

قرآن پڑھ کر بخشنا

ایک دوست ضلع گجرات سے تحریر فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں قرآن ختم کر کے وہ شخص کسی دوسرے کو اس ختم کا ثواب بخش دیتا ہے۔ آیا یہ جائز ہے۔ اور ثواب پہنچ جاتا ہے؟ اور اگر ناجائز ہے تو کیا دلیل ہے؟

جہاں تک میرا علم ہے ایسا ختم مُردوں کو بخشا جاتا ہے۔ زندوں کو نہیں اور اصولاً یہ بات یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ صرف دو چیزیں مُردوں کو پہنچتی ہیں۔ یعنی اگر خدا چاہے تو ان کا فائدہ اُسے ملتا ہے۔

۱۔ اوّل دُعا جو مردہ کے حق میں کی جائے۔ دُعا تو خدا سے درخواست ہے کہ فلاں شخص کے گناہ بخش یا اس کے مدارج بلند کر یا اسے عذابوں سے بچا وغیرہ وغیرہ اور دُعا زندہ اور مُردہ دونوں کے لئے کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ درود شریف بھی دُعا ہے اور اپنے والدین یا مومنین کے لئے خواہ وہ مر چکے ہوں یا زندہ ہوں۔ دُعا کرنے کا حکم ہے۔

۲۔ دوسرے مالی امداد۔ یہ بھی ہم زندوں کی کیا کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کا قرضہ اُتار دیا جرمانہ ادا کر دیا۔ اسی طرح مرنے کے بعد بھی اگر مرنے والے پر قرضہ ہو۔ تو کوئی عزیز اس کا قرضہ اُتار سکتا ہے۔ کوئی زندہ شخص بیمار ہو تو اس کی طرف سے صدقہ و خیرات۔ چندہ اس کے اقربا دے سکتے ہیں۔ اسی طرح مُردہ کی طرف سے بھی صدقہ خیرات وغیرہ اس کے عزیز دے سکتے ہیں۔ لیکن نماز روزہ قرآن پڑھنا اور دیگر عبادات جسمانی نہ زندہ کی طرف سے ادا ہوسکتی ہیں نہ مردہ کی طرف سے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جب یہ مالی عبادات ادا ہوسکتی ہیں۔ تو

دوسری کیوں نہیں ہو سکتیں۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ صدقہ خیرات وغیرہ جب آپ اپنے ایک مُردہ عزیز کی طرف سے کسی غریب کو دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ میرے مرحوم باپ یا ماں کی طرف سے ہے۔ تو وہ غریب صدقہ لینے والا فوراً بجائے آپ کے اس مُردہ کو دُعا دیتا ہے۔ پس مالی عبادت کا نتیجہ بھی مُردہ کے حق میں دُعا ہی ہے۔ اور دُعا کے متعلق کسی قسم کا کوئی شبہ ہی نہیں۔ دوسری وجہ مالی قربانی کی قبولیت کی یہ بھی ہے کہ بیٹا بیٹی یا بیوی وغیرہ رشتہ دار جو صدقہ ماں باپ یا خاوند کی طرف سے دیتے ہیں۔ وہ عموماً اس مردہ کے مال کے وارث بھی ہوتے ہیں۔ پس جو مال مُردہ کا کمایا ہوا ہو اور اس کے وارث اسے قبضہ میں لائیں۔ پھر جب بھی وہ صدقہ دیں گے تو اس صدقہ میں اصل کمانے والا بھی شریک ہوگا۔ جس طرح نیکی کا سکھانے والا اس نیکی کے کرنے والوں کے ساتھ شریک ہوا کرتا ہے پس صرف دو پختہ صورتیں مردہ کو فائدہ پہنچانے کی ہیں۔ دُعا اور صدقات۔ باقی عبادات نہیں پہنچتیں۔ جو حکم زندوں کے لئے ہے وہی مُردوں کے لئے بھی ہے۔ دُعا اور مالی مدد جیسے زندوں کو پہنچتی ہے۔ ویسے ہی مُردوں کو اور نماز روزہ قرآن وغیرہ جیسا زندوں کو نہیں پہنچتا ویسے ہی مُردوں کو نہیں پہنچتا۔ میرے نزدیک تو ثواب کے پہنچنے میں زندہ اور مُردہ برابر ہیں۔ جو چیز ہم زندہ کو پہنچا سکتے ہیں۔ وہی مُردہ کو بھی پہنچ سکتی ہے۔ زندہ کو دُعا کا فائدہ پہنچتا ہے اور زندہ کا قرض ہم اتار سکتے ہیں۔ کسی زندہ کے نام سے ہم صدقہ خیرات دے سکتے ہیں لیکن کسی زندہ کی طرف سے نماز روزہ حج وغیرہ نہیں کر سکتے۔ یہی حال مُردہ کے متعلق بھی ہے۔ لیکن شاید کسی کو یہ کھٹکا ہو۔ کہ حج بدل تو مشہور چیز ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ بدنی عبادات بھی مردہ کی طرف سے ہو سکتی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض لوگوں کو جنہوں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ مرنے والا فلاں عبادت کی نیت اور ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن موت کی وجہ سے نہ ادا کر سکا۔ ان کو اجازت دے دی تھی کہ بے شک مرنے والے کی نیت عملاً پوری کر دو۔ ورنہ حقیقتہً خدا کے ہاں تو مرنے والے کو اپنی نیت کا ثواب مل

ہو چکا تھا پس اگر کسی مرنے والے کی نیت کسی عبادت کے متعلق معلوم ہو جائے کہ وہ اس عمل کے کرنے کا شائق تھا۔ لیکن موقع نہیں مل سکا۔ تو اس مُردہ کی ایسی خواہش اور ارادہ کا پورا کر دینا جائز ہے۔ مگر یہ غلط ہے کہ کسی شخص نے خود تو کبھی قرآن کھول کر نہ دیکھا ہو۔ مگر کوئی مُلّا ایک قرآن ختم کر کے اس کا ثواب اس کی روح کو بخش دے۔ پہلے وہ یہ تو ثابت کرے کہ اسے خود بھی اس کا کوئی ثواب ملا یا نہیں۔ اور اگر ملا تو شریعت کے کس حکم سے اس کو اس ثواب کے تبدیل کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا؟ اب میں حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کا فتویٰ اس بارہ میں پیش کرتا ہوں۔

"میت کو صدقہ وخیرات جو اس کی خاطر دیا جائے پہنچ جاتا ہے۔ لیکن قرآن شریف کا پڑھ کر پہنچانا حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور صحابہ کرام رِضْوَانُ اللّٰہِ عَلَیْہِمْ سے ثابت نہیں۔ اس کے بجائے دعا کی جائے جو میت کے حق میں کرنی چاہئے۔ میت کے حق میں صدقہ خیرات اور دعا کا کرنا ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی کی سنت سے ثابت ہے لیکن صدقہ بھی وہ بہتر ہے۔ جو انسان اپنے ہاتھ سے دے جائے کیونکہ اس کے ذریعے انسان اپنے ایمان پر مہر لگاتا ہے۔"

(روزنامہ الفضل ۸ اکتوبر ۱۹۴۴ء)

شہید کون ہوتا ہے

سوال : احادیث میں مندرجہ ذیل طریقوں سے وفات پانے والے کو شہید کہا گیا ہے۔ شہید کی تعریف اور وفات کے ان اقسام کو شہادت سے تعبیر کرنے کی حکمت کیا ہے؟ کیا یہ سب اقسام بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ (آل عمران : ۱۷۰) کے ماتحت ہیں۔ اور وجہ کے لحاظ سے کونسی فضل ہے؟ جس کے بعد کاتب خط نے ۲۸ قسم کے مرنے والے گنوائے ہیں۔ مثلاً جو اپنے مال کا بچاؤ کرتا مارا جائے یا جو عورت بچہ جننے سے مر جائے۔ یا مثلاً جو شخص کسی سنت نبوی کو زندہ کرے۔ وغیرہ وغیرہ۔

جواب : اصل بات یہ ہے کہ ایمان کے چار مدارج ہیں۔ نبوت ۔ صدیقیت ۔ شہادت اور صالحیت ۔ عام مسلمان جب ان کے نفوس کا تزکیہ اور اصلاح ہو جائے تو وہ صالح ہیں۔ اس سے اوپر شہادت کا درجہ ہے کہ انسان کا ایمان گویا رویت والا ایمان ہو جاتا ہے۔ اور کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اور لازمی ہے کہ ایسے عین الیقین والے ایمان کا صاحب خدا تعالیٰ کے راستہ میں ہر وقت مرنے کو تیار رہے خواہ عملاً وہ اپنے بستر پر ہی مرے پس شہادت ایمان کا ایک درجہ ہے یعنی ایسا شخص شہید ہے۔ خواہ زندہ ہو خواہ مردہ۔ خواہ تلوار سے مرے۔ خواہ تونیزہ سے۔ خواہ دستوں کی بیماری سے خواہ دیگر اسباب سے جب کسی انسان کی روح اور جسم دنیا میں عَیْنَ الْیَقِیْن والے درجہ کا ایمان حاصل کر کے خود خدا کی ذات پر گواہ ہو جاتے ہیں۔ اور الہٰی صفات کا زندہ نمونہ بن جاتے ہیں تو وہ انسان خدا کے ہاں شہید کہلاتا ہے۔ وہ خدا کے وجود اور اسلام کی حقانیت کا خود ایک ثبوت ہوتا ہے۔ اور اس درجہ

کے شخص کو شہید کہتے ہیں۔ اسی طرح صدیق ہمہ تن صدق اور نبی اہلبیت کا نبی اور خدا تعالیٰ کا پیغامبر ہوتا ہے۔ گویا ایمان کی ریل گاڑی میں نبی فسٹ کلاس والے ہیں۔ صدیق سیکنڈ کلاس والے۔ شہید انٹر کلاس والے اور صالح تھرڈ کلاس والے ۔

اب سوال یہ رہ گیا کہ جو شخص اپنی خوشی سے خدا کی راہ میں لڑتا۔ اور مارا گیا وہ تو اس درجہ ایمان پر واقعی پہنچا ہوا تھا جسے شہادت کہتے ہیں۔ لیکن بہت سارے اور لوگوں کو کیوں شہید فرمایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل ایمان کا علم اور درجہ شہادت پر پہنچنے کی حقیقت صرف اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے۔ لیکن ہر چیز کے لئے کچھ ظاہری نمونے بھی ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے ایک مشہور ظاہری نمونہ شہادت کا قرآن نے یہ رکھا ہے کہ جو بھی اپنی خوشی سے خدا کے راستہ میں قتل ہو جائے وہ شہید ہے لیکن سیفی جہاد ہر زمانہ میں موجود نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ شہید بطور نمونہ ہر زمانہ میں موجود رہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بہت سے اور ایسے لوگوں کو بھی شہید کے خطاب سے ممتاز کیا۔ تاکہ وہ ہمیشہ دُنیا میں بطور اسوہ کے رہیں۔ اور ہر وقت یہ سلسلہ شہدا کا چلتا رہے۔ نبی تو کبھی کبھی دنیا کو منور کرتے ہیں مگر کچھ صدیق بہت سے شہید اور بکثرت صالح دنیا میں کم و بیش ہمیشہ موجود رہتے ہیں اور انبیاء کے سلسلے انہی بھلوں کو پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کے لئے قائم کئے جاتے ہیں۔ اگر سیفی جہاد مثلاً سات سو سال تک بند رہے تو کیا شہادت بھی نبوت کی طرح دنیا سے اتنی مدت مفقود رہے گی؟ اس لئے اللہ تعالیٰ نے علاوہ تلوار سے مارا جانے کے دیگر بہت سے ذرائع ہر زمانہ کے لئے ایسے پیدا کر دیئے ہیں۔ کہ لوگ وہ قربانیاں کر کے سیفی شہدا کے برابر یا کم از کم ان کی جماعت میں شمار ہو سکیں ۔ اس لئے اتنی لمبی فہرست ان حالات یا اعمال کی بنائی گئی ہے۔ جن کے ماتحت مومن شہادت کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً عورتیں کیونکر شہادت حاصل کریں؟ ان کے لئے راستہ کھول دیا۔ کہ جو زچگی کی تکالیف کو صبر و ایمان کے ساتھ برداشت کر کے مر جائے وہ شہید ہے ۔

لیکن ان موتوں سے یہ مراد نہیں ہے کہ کافر، منافق، فاسق، فاجر، یا وہ شخص جسے خدا پر ایمان نہ بھی ہو وہ شہید سمجھا جائے گا۔ بلکہ پہلی شرط ہی ایمان کی ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس بیماری یا تکلیف میں وہ راضی بقضاء ہو۔ اعلیٰ نمونہ کا صبر دکھائے اور تکلیف کو اسی طرح خوشی سے برداشت کرکے جان دے جس طرح جنگی شہید تلوار کی دھار کے نیچے جان دیتا ہے۔ خدا کی شکایت نہ کرے بلکہ اس کی لقاء کا شائق ہو۔ یا ایسے صدمات سے مرے۔ جن کو لوگ باعث بدنامی سمجھتے ہوں۔ یا جو بہت ہی تکلیف دہ یا دل ہلا دینے والے ہوں۔ مثلاً طاعون۔ بجلی کی، ڈوبنے کی یا سانپ سے ڈسے جانے کی موت۔ دب کر مر جانا یلبی اور صبر شکن بیماریاں مثلاً مسلسل دق وغیرہ۔ بے قصور قیدی جو قید میں ہی گزر جائے۔ اسی طرح وہ شخص جو اپنی شہادت کے لئے ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہو۔ مگر اسے ظاہری شہادت نصیب نہ ہو سکے۔ وہ بھی اپنی نیت کی رُو سے شہید ہی محسوب ہوگا۔ اسی طرح بعض مخصوص نیک اعمال جو قابلِ رشک ہوں۔ اور جن سے عام لوگوں کو جھجک ہو۔ مثلاً اپنے ہمسایہ کو بچانے میں مارا جانا۔ یا دین کا علم سیکھتے ہوئے یا تبلیغ کرتے ہوئے موت کا آ جانا (جیسے مولوی عبید اللہ صاحب شہید ماریشس) یا غیرت مند عورت جو اپنی عصمت کے بچاؤ کی خاطر جان دے دے۔ غرض بیالیس ہی نہیں خدا کے نزدیک اس سے بھی بہت زیادہ شہید مرد اور شہید عورتیں ہیں۔ اور یہ شرائط محض ان کے ظاہری نشان ہیں۔ باقی اندرونہ کا علم اللہ کو ہی ہے۔ سب کا ایک درجہ نہیں ہے۔ درجے حالات پر اور ایمان کی قوت پر نیز تکالیف پر صبر و استقلال کے دکھانے پر موقوف ہیں۔ حضرت امام حسینؓ تو یقینی شہید تھے۔ مگر حضرت مسیح موعودؑ (آپ پر سلامتی ہو) باوجود تلوار سے نہ مارا جانے کے سینکڑوں شہیدوں کے برابر درجہ رکھتے تھے۔ اور خود شہدا بھی آپس میں الگ الگ درجے رکھتے ہیں۔ اور ان مدارج کا علم بھی خدا ہی کو ہے۔

رہا یہ سوال کہ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ کی آیت کے مطابق سب قسم

کہ شہید اس انعام کو پاتے ہیں یا نہیں۔ سو عرض یہ ہے کہ یہ آیت بظاہر تو خاص ان لوگوں کے لئے ہے جو قتل ہوتے ہیں۔ (جیسا کہ

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ (البقرہ ۱۵۵)

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں اُن کے متعلق (یہ) مت کہو کہ وہ مُردہ ہیں (وہ مُردہ) نہیں بلکہ زندہ ہیں۔

آگے خدا بہتر جانتا ہے۔ جس کو چاہے یہ انعام دے دے۔

غالباً صبر کے لحاظ سے وہ شہادت افضل ہے جس میں رضاکارانہ طور پر اپنی خوشی سے خدا کی راہ میں جان دی جائے۔ اور عقل اور بصیرت کے ساتھ اس دکھ کو برداشت کیا جائے۔ اور سوائے رضائے الٰہی کے اور کوئی مقصد نہ ہو لیکن وہ صابر شاکر مومن جس کی زندگی تکالیف میں کٹی ہو۔ یا اس کی موت خاص قسم کی موت ہو اور اس موت کو وہ اس طرح قبول کرتا ہو جس طرح کہ ایک سیفی مجاہد وہ بھی شہیدوں میں شمار ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کے اندر وہ حقیقی درجہ ایمان اور یقین کا موجود ہے جو شہداء میں ہونا چاہیئے اور اس نے تکالیف بھی ویسی ہی اٹھائی ہیں جیسی مجاہد شہید اٹھاتے ہیں۔

(روزنامہ الفضل ۱۰ اکتوبر ۴۴ء)

دین کی خدمت کے جوش میں والدین سے لاپروائی نہ کرو۔

ایک دوست نے اپنا نام شائع کرنے سے منع کرتے ہوئے یہ سوال لکھا ہے کہ ایک احمدی ہر تحریک میں جو مرکز کی طرف سے کی جاتی ہے سبقت کرتا ہے مگر خدمتِ والدین سے قطعاً لاپرواہ ہے۔ اس کی قربانی اسے کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ جبکہ وہ والدین کی خدمت سے بالکل کورا ہے ؟۔

اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ والدین کے ساتھ دنیا میں نیکی کا سلوک کرو۔ اور ان کے سامنے اُف تک نہ کرو۔ ایسی ہی تاکید احادیث میں بھی آئی ہے کہ بد قسمت ہے وہ جس نے والدین کو پایا مگر والدین گزر گئے اور اس کے گناہ نہ بخشے گئے۔ حضرت اویس قرنی اپنی ضعیف والدہ کی خدمت کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آنے سے محروم رہے۔ تب بھی حضور نے ان کی تعریف فرمائی اور کشتی نوح میں حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی تعلیم دربارہ خدمت والدین سے تو سب احمدی واقف ہیں۔ پس خدمت والدین کے معاملہ میں تساہل نہایت ہی نامناسب امر ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ جو شخص مرکز کی ہر تحریک پر سبقت کرتا ہے وہ ایسا ہو سکے بلکن ہے کہ اگر اس کا بیان سُنا جائے تو اس کا قصور اتنا ثابت نہ ہو۔ واللہ اعلم

اب رہا اس کی قربانی کے فائدہ کا سوال۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کے ہاں ہر عمل کی میزان ہے یا یوں سمجھو کہ ہر عمل کے لئے کچھ نمبر اس طرح مقرر ہیں جس طرح طالبعلم

کے لئے امتحان کے سوالوں کے نمبر ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں دین کی خدمت کا عمل اور امام کی آواز پر لبیک کہنے کا عمل سب سے افضل ہے۔ والدین کی خدمت اور دیگر نیک اعمال اس سے کم درجہ پر ہیں۔ مثلاً ہزار میں سے چار سو نمبر خدمت دین کے ہیں۔ اور والدین کی خدمت کے ایک سو نمبر ہیں۔ اسی طرح تمام اعمالِ صالحہ کے نمبر ملا کر پورے ہزار ہو جاتے ہیں۔ تو جس طرح ایک طالب علم کم از کم تہائی نمبر لے کر پاس ہوتا ہے۔ کچھ اسی طرح کا حساب وہاں کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس نے پاس مارکس لے لئے ہیں۔ تو باوجود کسی شعبہ میں کمی کے وہ پاس ہی سمجھا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ ایسا شخص ہو کہ شرک نہ کرتا ہو اور ایمان کی پانچوں شرائط پر یقین رکھتا ہو۔ اور کفر بواح کی کوئی شق اس میں نہ ہو۔ ایسا کون سا طالب علم ہے جو جان بوجھ کر اپنے نمبر کم چاہتا ہو کیونکہ ممکن ہے کہ کسی غفلت کی وجہ سے وہ فیل ہی ہو جائے۔ پس آپ کے لڑکے کو زیادہ نمبر لینے کے لئے آپ کی خدمت کا تعہد زیادہ کرنا چاہیئے اور آپ کو بھی اس کے دینی جوش کی نہایت درجہ قدر کرنی چاہیئے۔ بلکہ فخر کرنا چاہیئے۔

جب کبھی کسی احمدی کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ الفضل میں حضرت صاحب اور جماعت سے اس دُعا کی درخواست کرتا ہے کہ میرا بچہ خادم دین ہو۔ پھر جس کا لڑکا اس کے اپنے اقرار کے مطابق مرکز کی ہر تحریک پر سبقت کرتا ہے۔ اس کا باپ تو اگر سجداتِ شکر کرتے کرتے مر بھی جائے تو بھی کم ہے۔ ہاں اس لڑکے کے لئے بھی مناسب ہے کہ والدین کو راضی کرے۔ بیوی اور والدین کو راضی کرنا کیا مشکل ہے۔ بلکہ میرے نزدیک تو سب سے آسان ہی کام ہیں۔ علاوہ ازیں اس کو یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ کہیں والدین کی ہمہ وقت ناراضگیوں سے اس کی خدمت دین کی موجودہ توفیقات نہ چھین جائیں۔ کیونکہ نجات کا معاملہ انجام اور خواتیم پر ہے۔

(الفضل ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۴ء)

آیت امانت

سوال

ضلع گوجرانوالہ سے ایک عزیز تحریر فرماتے ہیں۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ سورۂ احزاب کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (احزاب ۷۲)

ترجمہ: ہم نے کامل امانت (یعنی شریعت) کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ لیکن اس کے اٹھانے سے انھوں نے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے لیکن انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ وہ یقیناً بہت ظلم کرنے والا (اور) عواقب سے بے پروا تھا۔

اس آیت میں امانت سے مراد شریعت لی جاتی ہے۔ اور شریعت نام ہے مجموعۂ احکام کا مثلاً چور چورنی کے ہاتھ کاٹو۔ زانی زانیہ کو کوڑے مارو۔ سود نہ لو۔ جوا نہ کھیلو وغیرہ۔ پہاڑوں، آسمانوں اور زمین کو ان احکام سے مخاطب کرنے یا اُن کے سامنے ان احکام کے پیش کرنے کا کیا مطلب ہے۔ اور ان کے انکار، ڈر اور خوف سے کیا مراد ہے؟

جواب

اس آیت کے مختلف معنی کئے گئے ہیں۔ مگر آپ کے سوال کے لحاظ میں صرف ایک پر اکتفا کرتا ہوں۔ اور وہ یہ بھی ہو سکتے ہیں۔

"ہم نے الامانت یعنی قرآن مجید کو آسمانی فرشتوں اور زمینی آدمیوں حتی کہ جبال یعنی بڑے بڑے انبیاء کے آگے بھی پیش کیا۔ مگر ان سب نے اس امانتِ قرآن کے اٹھانے سے انکار کیا اور ڈر گئے لیکن اس انسانِ کامل محمد رسول اللہ نے اُسے اٹھا لیا۔ کیونکہ وہ ظلوم اور جہول تھا۔"

آپ کی ذہانت کی وجہ سے مجھے امید ہے کہ آپ ان معانی سے اپنی دقتیں اب حل کر لیں گے۔ مگر تھوڑی سی توجیہہ میں بھی کر دیتا ہوں۔ اوپر کی عبارت میں بعض الفاظ کو میں نے خط کشیدہ کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ مزید تفسیر کے محتاج ہیں۔

۱۔ امانت کے معنے میں نے قرآن کیوں کئے۔ یہ اس لئے کہ قرآن خود یہ معنی کرتا ہے جہاں فرماتا ہے کہ

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (الحشر ۲۲)

یعنی اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو وہ خدا کے ڈر سے دب جاتا اور پھٹ جاتا۔ سو اس آیت میں نزولِ قرآن سے پہاڑ کا ڈرنا دبنا اور پھٹنا ذکر کیا ہے اور وہاں امانت سے پہاڑوں کا انکار اور ڈرنا لکھا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ قرآن ہی وہ امانت ہے۔ پس یہ تفسیر القرآن بالقرآن ہوئی۔

۲۔ پھر آسمان زمین اور پہاڑ کے آگے واقعی قرآن کا پیش کرنا فضول اور بے معنی بات ہے۔ کیونکہ وہ تو اس امانت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اور ڈرنا تو ذی روح ہی کے لئے ہوتا ہے۔

خاص کر خدا تعالیٰ کی امانت میں کوتاہی سے ڈرنا تو نہایت عقل اور سمجھ کا کام ہے۔ اس لئے یہاں آسمان زمین اور پہاڑ سے مراد آسمانی وجود یعنی فرشتے اور زمین سے مراد زمین کے آدمی یعنی عوام الناس اور پہاڑ سے مراد اس دُنیا کے لوگوں میں سے بڑے بڑے وجود اور ہستیاں یعنی انبیاء اور خواص ہیں۔ اور ایسا محاورہ اور استعارہ ہر زبان میں مستعمل ہے اور خود قرآنِ مجید میں استعمال ہوا ہے۔ غرض اس امانت کے اٹھانے سے سب نے انکار کر دیا۔ یہاں ضروری نہیں۔ کہ ایک ایک کے سامنے قرآن پیش کیا گیا ہو اور اس نے عقلی انکار کیا ہو بلکہ یہ مطلب ہے کہ ان کی طاقت اور فطرت ہی اس بارِ امانت کے اُٹھانے کے قابل نہ تھی چنانچہ زبانِ حال سے انہوں نے انکار کر دیا۔ یہ زبانِ حال سے انکار ایسا ہی ہے۔ جیسا آدم کی اولاد کا زبانِ حال سے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے جواب میں بَلٰى کہنا یا زمین آسمان کا

اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ (حم سجدہ ۵ : ۱۲)

ترجمہ : ہم فرمانبردار ہو کر آ گئے ہیں۔

کہنا۔ اسی طرح ڈرنے سے بھی یہ مراد ہے جیسا کہ سورہ حشر کی آیت میں ان کا حال طور پر ڈرنا مذکور ہوا ہے۔ نہ کہ قالی طور پر۔ یعنی قرآن ایسی عظیم الشان امانت ہے کہ اگر ان ہستیوں پر نازل کی جاتی تو وہ اس امانت کے بوجھ کو نہ برداشت کر سکتے۔ بھلا جو حربہ جو ساری دُنیا کے لئے ابد تک ہو۔ اسے یہ مختص المقام اور مختص القوم پیغمبر کہاں چلا سکتے تھے۔ اور بعض نے تو زبانِ قال سے بھی اس کے اُٹھانے سے انکار کیا۔ مثلاً یہی دیکھ لیں کہ قرآن سے پہلے سب سے اعلیٰ اور ارفع کتاب توراۃ تھی اور سب سے زیادہ مقبول امت یہود کی امت تھی۔ انہوں نے ہی یہ خدا کا پُر جلال کلام سُننے سے انکار کر دیا تھا اور ڈر گئے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو الہام کیا کہ اب میں ان کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالوں گا یعنی قرآنِ مجید۔ (استثنا باب ۱۸ آیت ۱۵ - ۲۰)

چنانچہ توراۃ میں لکھا ہے کہ :۔

•خداوند تمہارا خدا تمہارے لئے تمہارے بیچ سے یعنی تمہارے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سُننا۔ یہ تمہاری اس درخواست کے مطابق ہوگا۔ جو تم نے خداوند اپنے خدا سے حورب کے دن خواب میں کی تھی۔ کہ ہم کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو۔ تاکہ ہم مر نہ جائیں۔ اور خداوند نے مجھے کہا۔ کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا۔ اور اپنا کلام اس کے مونہہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا۔ وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سُنے گا۔ تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔ •

اس عبارت میں أَشْفَقْنَ مِنْهَا (مر نہ جائیں)، قرآنِ مجید (اپنا کلام) امانت (میرا وہ حکم جو وہ نبی لوگوں کو پہنچائے گا۔ اور پھر جس کا حساب خدا ان سے لے گا) خوب واضح کرکے بیان کئے گئے ہیں اور اس آیت کو خوب کرتے ہیں۔

۳۔ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (احزاب ۷۳)

ترجمہ :۔ وہ یقیناً بہت ظلم کرنے والا (اور) عواقب سے بے پرواتھا۔

انسان کامل کو ظلوم وجہول کہنا (جیسا کہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے۔ یہ مقام مدح میں ہے۔ نہ کہ مقام ذم میں۔ یعنی یہ رسول انسان ہے۔ جو خدا کی محبت اطاعت عبودیت اور امانت برداری میں نہایت درجہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والا اور اپنے ہر ذاتی مفاد کو مجہول جاننے والا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھو

حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی کتابوں میں ظلوم و جہول کی بحث)

۴۔ الانسان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود ہی اس لئے مراد لیا ہے کہ اول تو آپ ہی خلاصۂ انسانیت ہیں اور سب سے عظیم الشان انسان ہیں۔ دوسرے اس آیت سے معاً پہلے یہ آیت آتی ہے۔

وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ○ (احزاب ۷۲)

ترجمہ: جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے وہ بڑی کامیابی حاصل کرتا ہے۔

پس اگلی آیت میں اسی رسول کو الانسان کہا گیا ہے۔ اور ذرا مزید غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ تمام سورۃ احزاب دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے متعلق ہی ہے جس میں اول سے آخر تک آپ کی ذات بابرکات کا ہی ذکر ہے اور آخری آیت گویا خلاصہ ہے حضور کے کمالات کا۔ پس چونکہ ساری کی ساری سورۃ میں آپ کا ہی ذکر ہے۔ اس لئے آخری آیت میں بھی الانسان کی طرف اشارہ ہے۔ وہ وہی انسان ہو سکتا ہے جس کی تعریف میں یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔

(الفضل ۹ دسمبر ۱۹۲۲ء)

سورۂ واقعہ اور فاقہ

سوال: حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ "جو کوئی ہر رات سورۂ واقعہ پڑھے گا اُسے کبھی فاقہ نہیں پہنچے گا"۔ سوال یہ ہے کہ ہر رات سورۂ واقعہ کا پڑھنا اور فاقہ سے بچا رہنا ان دونوں باتوں میں کیا تعلق ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو ظاہری تعلق ہے۔ سورۂ واقعہ کو پڑھ کر دیکھیں تو فاقہ سے بچانے والی اشیاء کا ایک انبار اس میں نظر آئے گا اور چونکہ خدا تعالیٰ کے الفاظ میں ایک حقیقت اور برکت ہوتی ہے اس لئے مناسبت ظاہر ہے۔ مثلاً حسب ذیل اشیاء کا ذکر اس سورۃ میں ہے۔ پسندیدہ میوے۔ مرغوب پرندوں کا گوشت۔ بغیر کانٹے کے بیر کیلے تہ بر تہ۔ بکثرت پھل۔ مصفا پانی کے کوزے وغیرہ۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مومن کو قرآن پڑھتے وقت یہ ہدایت مدنظر رکھنی چاہیئے کہ جب شیطان فرعون، نمرود وغیرہ کی شرارتیں اور جہنم کے عذابوں وغیرہ کا ذکر آئے۔ تو ان سے پناہ مانگے اور خشیت کی صورت پیدا کرے اور جب انعامات جنت اور نیک اعمال کا ذکر آئے تو اُن کے طلب کی دُعا کرے۔ اس سورۃ میں تین فرقوں کا ذکر ہے۔ یعنی اصحابُ الیمین سابقینؔ مقربین اور اصحابؔ الشمال ساتھ ہی جو چیزیں ان کو ملیں گی۔ ان کا بھی ذکر ہے۔ پس مومن جب اس سورۃ کو پڑھتا ہے۔ تو وہ ان انعامات کو خود بھی طلب کرتا ہے اور ان عذابوں سے بچنے کی دُعا بھی کرتا ہے اور مومن کی دُعا اکثر قبول ہوتی ہے۔ اس لئے ایسی دُعا کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ بطور ثبوت آخرت کے اس مومن کو دنیا میں بھی ایسے رزق اور

نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ تا کہ اسے جنت کے متعلق بھی اپنی دعا کی قبولیت پر یقین حاصل ہو۔ میں نے قادیان میں ہی کئی لوگوں کو دیکھا ہے۔ کہ غریب و نادار ہیں۔ مگر ان کو باہر سے اور مقامی طور پر ایسی ایسی جنتی نعمتیں پہنچتی رہتی ہیں۔ کہ دیکھنے والا خدا تعالیٰ کے فضلوں پر حیران رہ جاتا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح اول (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے ساتھ خدا کا وعدہ ہے کہ رات کو کبھی فاقہ سے نہیں سوئے گا۔ ممکن ہے ان کا بھی اسی پر عمل ہو لیکن یہی وعدہ سمجھ لو۔ کہ ہر سچے مومن کے ساتھ جو یہ سورۃ پڑھتا ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بطور نمائندہ خدا تعالیٰ کے فرمایا ہے اس میں کون سی تعجب کی بات ہے۔

روزنامہ الفضل ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۴ء

مواعظ و حِکَم

کر نہ کر

چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی بڑی دانائی پر مشتمل ایک کتاب تصنیف فرمائی جس کا نام "کر نہ کر" رکھا۔ جماعت میں بہت مقبول ہے اور کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں اس کتب کا انتساب آپ نے تجویز فرمایا۔

"دُنیا کے سب سے بڑے حکیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی پر"

ان نصائح کے موضوعات حفظانِ صحت، تہذیب و تمدنِ اسلامی۔ مالی معاملات۔ علم اور اخلاقیات ہیں چند فقرات بطور نمونہ درج ہیں۔

- تو صبح کی سیر سے اپنی صحت کو ترقی دے۔
- تُو اتنا کھا کہ بدن کی غذا نہ ہو کر بدن اُس کی غذا ہو جائے۔
- تو کسی دوائی کی شیشی کو بغیر لیبل نہ رکھ۔
- تُو مکان اور کمرے کی اشیاء کو باترتیب اور سلیقہ سے رکھ
- یاد رکھ کہ اسلامی تمدن کی بنیاد حقیقی اخوت پر ہے نہ کہ مادی ٹیپ ٹاپ پر
- تُو اپنے وطن سے محبت رکھ۔
- اپنے بزرگوں پر فخر کرنا اور خود کچھ نہ ہونا حقیقت کے خلاف ہے۔
- اے طالبِ علم تو غور و فکر کی عادت ڈال۔ لکھتے ہوئے سطریں سیدھی لکھنے کی عادت ڈال

- اگر اگلے بزرگوں نے کوئی غلطی کی ہے تو اُن کی پیروی نہ کر مگر اُن پر طعن بھی نہ کر
- تو اسلام یا احمدیت کی تبلیغ سے کبھی غافل نہ ہو۔
- اے خاتون! تیرے حُسن سے زیادہ تیرے اخلاق اور تیرے اخلاق سے زیادہ تیرا دین خدا تعالیٰ کے نزدیک وقعت رکھتا ہے۔
- اگر تو خدا تعالیٰ کا قرب چاہتا ہے تو نوافل پر زور دے۔
- اے ملازم تو سرکاری سٹیشنری اپنے نجی کام میں نہ لا۔

باب یازدہم

شجرہ نسب اور برگ و بار

دُعائے مغفرت

اے خدائے پاک ربّ العالمین ۔۔۔ اے کہ تو میرا بھی سب سے بالیقیں
اے اَلَيْسَ اللهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۔۔۔ ہے تُو ہی رزّاق و ذوالقوۃ متیں
جو بھی چاہے جس کو دیدے بے حساب ۔۔۔ کچھ کمی تیرے خزانوں میں نہیں
ابنِ آدم کے مسخّر کر دیئے ۔۔۔ چاند اور سورج ستارے اور زمیں
دودھ کو پستان میں پیدا کیا ۔۔۔ پیشتر اس سے کہ پیدا ہو جنیں
نعمتیں تیری گنے کیونکر بشر ۔۔۔ یاں تو عاجز ہیں خیارُ المرسلیں
مَیں بھی دَر پر اِک سوالی ہوں کھڑا ۔۔۔ ہاتھ خالی یاں سے لَوٹے کا نہیں
دے بشارت عاقبت بالخیر کی ۔۔۔ مطمئن ہو تا مرا قلبِ حزیں
خوف سے اور حزن سے آزاد کر ۔۔۔ خاکساروں کو نہ دکھ اندوہ گیں
تُو ازل سے تا اَبد قدوس ہے ۔۔۔ مَیں ہوں گنہ بلکہ ہوں گنہ ترین
کیا شکایت غیر کی تجھ سے کروں ۔۔۔ نفس ہی اپنا ہے مارِ آستیں
آتشِ دوزخ سے بِل جائے اماں ۔۔۔ اُس کے سہنے کی مجھے طاقت نہیں
ہو عذابِ قبر یا حشر و صراط ۔۔۔ سب مصائب سے بچا میرے تئیں
میری ذلت اور تباہی دیکھ کر ۔۔۔ خوش نہ ہو کم بخت شیطانِ لعین
روح میری اے مزکّی پاک کر ۔۔۔ چشم پوشی یَا عَفُوَّ المُذنِبِین
درگزر تری بوقتِ احتساب ۔۔۔ از برائے رَحْمَةً لِّلْعَالَمِين
فضل سے اپنے وہ جنّت کر عطا ۔۔۔ جس کو سب کہتے ہیں فردوسِ بریں
ہو جوارِ حضرتِ احمدؐ نصیب ۔۔۔ ہیں ہمارے تو وہی نِعمَ القرین
پردہ پوشی دونوں عالَم میں رہے ۔۔۔ تیری ستاری پر رکھتا ہوں یقیں
مغفرت اے میرے مالک مغفرت ۔۔۔ المدد! اے میرے خَیرُ النّاصرین
میرے ان الفاظ میں تاثیر ڈال ۔۔۔ اور اجابت سے انہیں کر دے قریں
یاالٰہی جو بھی مانگے یہ دُعا ۔۔۔ اُس پہ نازل کر قبولیت دہیں

آمین (بخارِ دل صـ ۱۹۲، ۱۹۳)

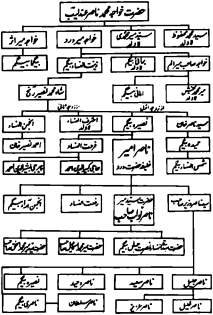
شجرۂ نسب حضرت خواجہ میر درد صاحب و حضرت خواجہ محمد ناصر صاحب
نمبر ۱

۱		۲		۳		۴
خواجہ میر درد	بن	خواجہ محمد ناصر	بن	نواب روشن الدولہ	بن	خواجہ فتح اللہ خان

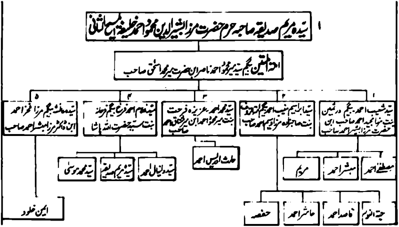
	۵		۶		۷		۸
بن	خواجہ محمد طاہر	بن	خواجہ عوض بخاری	بن	خواجہ سلطان احمد	بن	خواجہ میرک
	۹		۱۰		۱۱		۱۲
بن	سلطان سمرقندی	بن	خواجہ قاسم	بن	خواجہ شعبان	بن	خواجہ عبداللہ
	۱۳		۱۴		۱۵		۱۶
بن	خواجہ زین العابدین	بن	حضرت بہاؤالدین نقشبند	بن	خواجہ عبداللہ بخاری	بن	خواجہ جلال الدین بخاری
	۱۷		۱۸		۱۹		۲۰
بن	سید کمال الدین بخاری	بن	سید حسین ملقب بہ محبوب	بن	سید حسین اکبر	بن	سید عبداللہ
	۲۱		۲۲		۲۳		۲۴
بن	سید فخر الدین	بن	سید لائق	بن	سید محمود اعلیٰ	بن	سید حسین مقبول
	۲۵		۲۶		۲۷		۲۸
بن	سید حسین محمد تقی	بن	سید حسین محمد نقی	بن	سید محمد عبداللہ	بن	سید جامع
	۲۹		۳۰		۳۱		۳۲
بن	سید علی اکبر	بن	امام حسن عسکری	بن	امام علی تقی	بن	امام علی نقی
	۳۳		۳۴		۳۵		۳۶
بن	امام موسیٰ رضا	بن	امام موسیٰ کاظم	بن	امام جعفر	بن	امام باقر
	۳۷		۳۸		۳۹		۴۰
بن	امام زین العابدین	بن	امام حسین	بن	حضرت علی	بن	ابوطالب

اس طرح اکتالیسویں پشت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہ شجرہ تفصیلات کا حامل نہیں ہے۔

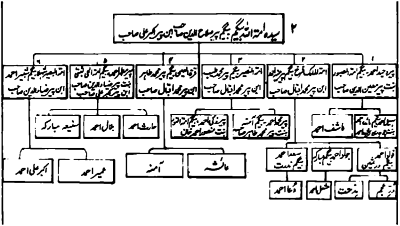
شجرہ نمبر ۲

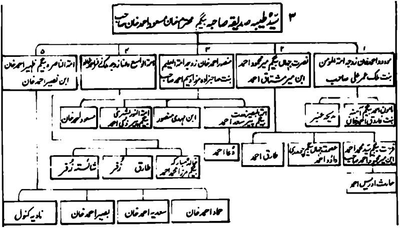


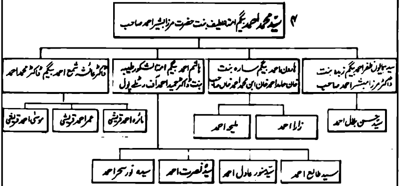
حضرت خواجہ محمد ناصر عندلیب
سید محمد محفوظ
لاولد
سید میر محمدی
لاولد
خواجہ میر درد
خواجہ میر اثر
خواجہ صاحب میر الم
بادل بیگم
لاولد
زینت النساء بیگم
بیگا بیگم
میر محمد بخش
لاولد
املی بیگم
شاہ محمد نصیر رنج
سید ناصر خان
نصیرہ بیگم
اشرف النساء
لاولد
انجمن النساء
حمیدہ بیگم
ناصر امیر
خلیفہ حضرت درد
فرحت النساء
احمد نصیر خان
شمس النساء بیگم
سید ناصر وزیر صاحب
رفعت النساء
انجمن آرا بیگم
ناصر جلیل
ناصر سعید
ناصر وحید
نصیرہ بیگم
ناصر خلیل
ناصر سلطان
ناصری بیگم


۱ سیدہ مریم صدیقہ صاحبہ حرم حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی
امۃ المتین بیگم سید میر محمود احمد ناصر ابن حضرت میر محمد اسحٰق صاحب
۱ سید شعیب احمد ۔ بیگم در ثمین بنت مرزا مجید احمد صاحب ابن حضرت مرزا بشیر احمد صاحب
۲ سید ابراہیم منیب احمد ۔ بیگم امۃ الرؤف بنت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب
۳ سید محمود احمد ۔ عزیزہ فرحت بنت میر محمود احمد ابن میر عبدالخالق احمد صاحب
۴ سید غلام احمد فرخ ۔ بیگم فرحانہ بنت سید حضرت اللہ پاشا
۵ سیدہ ملکہ بیگم مرزا فخر احمد ابن ڈاکٹر مرزا مبشر احمد صاحب
مصطفٰے احمد
مبشر احمد
مریم
جنۃ النور
ناصر احمد
ماشر احمد
حفصہ
طلحٰہ ادریس احمد
سید نبیل احمد
سیدہ مریم صدیقہ
سید محمد موسیٰ
ایمن خلود

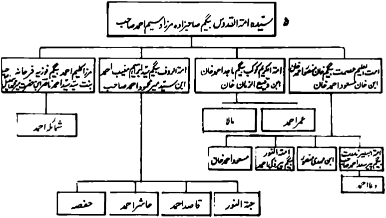
۲

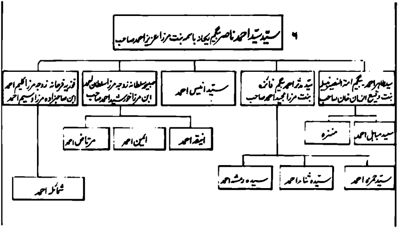

سیدہ امۃ اللہ بیگم بیگم پیر صلاح الدین صاحب ابن پیر اکبر علی صاحب
۱
بنت پیر معین الدین صاحب
۲
ابن پیر محمد اقبال صاحب
۳
امۃ النصیر بیگم پیر محمد طیب
ابن پیر محمد اقبال صاحب
۴
پیر محمد طاہر
ابن پیر محمد اقبال صاحب
۵
بنت پیر ضیاء الدین صاحب
ابن پیر اکبر علی صاحب
۶
ابن پیر ضیاء الدین صاحب
کاشف احمد
پیر محمد احمد - بیگم آمنہ
بنت پیر محمد طاہر صاحب
حارث احمد
بلال احمد
سنیعہ مبارکہ
عائشہ
آمنہ
عمیر احمد
اکبر علی احمد
سعد احمد
بیگم نصرت
دعا احمد


۳
سیّدہ طیبہ صدیقہ صاحبہ بیگم محترم خان مسعود احمد خان صاحب
۱
محمود احمد خان زوجہ امۃ المومن
بنت ملک عمر علی صاحب
۲
نصرت جہاں بیگم میر محمود احمد
ابن میر مشتاق احمد
۳
منصور احمد خان زوجہ امۃ العلیم
بنت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب
۴
امۃ الواسع وحنا زوجہ ملک فہیم اللہ
۵
امۃ الناصرہ بیگم ظہیر احمد خان
ابن نصیر احمد خان
مامون احمد بیگم آمنہ
بنت فاروق احمد خان
ملیحہ عنبر
فرحت بیگم سید محمد احمد
ابن میر محمود احمد صاحب
حارث ادریس احمد
عصمت جہاں بیگم چوہدری
داؤد احمد
طارق احمد
امۃ البصیر نصرت
بیگم میر سعد احمد
دُعا احمد
ابن مہدی منصور
امۃ النور بشریٰ
بیگم میر ذکی احمد
مسعود احمد خان
خالدہ مبارکہ
بیگم مرزا مجید احمد
طارق
ظفر
شائستہ ظفر
حماد احمد خان
سعدیہ احمد خان
بصیر احمد خان
نادیہ کنول

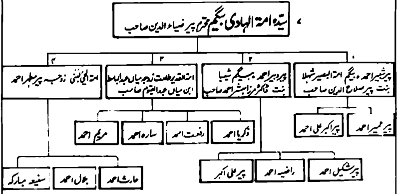


۴
سید محمد احمد بیگم امۃ اللطیف بنت حضرت مرزا بشیر احمد صاحب
سید بلال ظفر احمد بیگم زبدہ بنت ڈاکٹر مرزا مبشر احمد صاحب
نعمان احمد بیگم سارہ بنت خان حامد احمد خان ابن محمد احمد خان صاحب
ہاشم احمد بیگم امۃ الشکور طیبہ بنت ڈاکٹر حمید احمد آف رشلے پول
ڈاکٹر عائشہ شمع احمد بیگم ڈاکٹر محمد احمد
سید حسن بلال احمد
زارا احمد
ملیحہ احمد
مائرہ احمد قریشی
عمر احمد قریشی
موسیٰ احمد قریشی
سیدہ طالع احمد
سید منور عادل احمد
سید نصرت احمد
سیدہ نور سحر احمد


۵
سیدہ امۃ القدوس بیگم صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب
امۃ العلیم عصمت بیگم خان نصر احمد خان ابن خان مسعود احمد خان
امۃ الکریم کوکب بیگم ماجد احمد خان ابن وقیع الزمان خان
امۃ الرؤف بیگم سید ابراہیم منیب احمد ابن سید میر محمود احمد صاحب
مرزا کلیم احمد بیگم فوزیہ فرحانہ صاحبہ بنت سیدہ سید احمد ناصر ابن حضرت میر محمد اسمٰعیل
امۃ البصیر نصرت بیگم پیر سعد احمد صاحب
ابن مہدی منصور
امۃ النور بیگم پیر ذکی احمد
مسعود احمد خان
عمر احمد
مالا
جنۃ النور
قاصد احمد
حاشر احمد
حفصہ
شمائلہ احمد



٦
سید سید احمد ناصر بیگم یگانہ باسمہ بنت مرزا عزیز احمد صاحب
سید طاہر احمد - بیگم امۃ النصیر نبیلہ بنت وقیع الزمان خان صاحب
سید مدثر احمد بیگم فائزہ بنت مرزا مجید احمد صاحب
سیّد انیس احمد
صبیحہ سلطانہ زوجہ مرزا سلطان احمد ابن مرزا خورشید احمد صاحب
فوزیہ فرحانہ زوجہ مرزا کلیم احمد ابن صاحبزادہ مرزا وسیم احمد
سید مباہل احمد
منزہ
سید حمزہ احمد
سیدہ ثنا احمد
سیدہ رمشہ احمد
انیقہ احمد
امین احمد
مرتاض احمد
شمائلہ احمد


۷ سیدہ امۃ الہادی بیگم محترم پیر ضیاء الدین صاحب
۱ پیر شبیر احمد ۔ بیگم امۃ البصیر شہلا بنت پیر صلاح الدین صاحب
۲ پیر دبیر احمد ۔ بیگم شیبا بنت ڈاکٹر مرزا مبشر احمد صاحب
۳ امۃ القدیر طلعت زوجہ میاں عبدالباسط ابن میاں عبدالقیوم صاحب
۴ امۃ الحی لبنیٰ زوجہ پیر مظہر احمد
پیر سمیر احمد
پیر اکبر علی احمد
پیر شکیل احمد
راضیہ احمد
پیر علی اکبر
ذکریا احمد
رفعت احمد
سارہ احمد
مریم احمد
حارث احمد
بلال احمد
سفینہ مبارکہ

۸

سیدہ امۃ الرفیق بیگم بیگم سیّد حضرت اللہ پاشا صاحب

سیّد حمید اللہ نصرت پاشا بیگم وردہ امۃ الملک بنت صاحبزادہ مرزا رفیع احمد

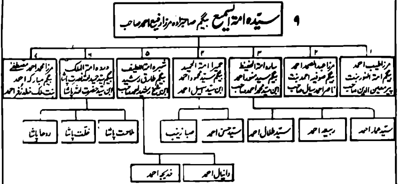
- طلعت پاشا
- خلعت پاشا
- روحہ پاشا

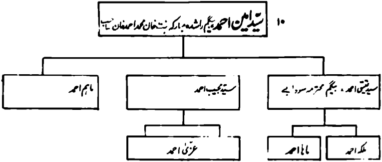
سیّد خضر پاشا ، بیگم امۃ الشکور بنت نانا رفیق احمد صاحب

- ہالہ پاشا

سیّدہ فرحانہ بیگم سیّد غلام احمد فرخ ابن سیّد میر محمود احمد صاحب

- سیّد دانیال احمد
- سیّدہ مریم صدیقہ
- سیّد محمد موسیٰ

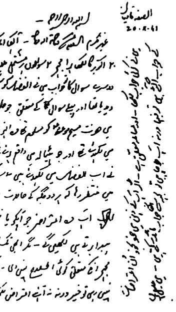

۹
سیدہ امۃ السمیع بیگم صاحبزادہ مرزا رفیع احمد صاحب
۱
مرزا طیب احمد
بیگم امۃ النور بنت
پیر معین الدین صاحب
۲
مرزا عبدالصمد احمد
بیگم صوفیہ احمد بنت
ناصر احمد سیال صاحب
۳
سارہ امۃ الحفیظ
بیگم سید منور احمد
ابن سید محمود احمد صاحب
۴
حمیرا امۃ الحمید
بیگم سید محمود احمد
ابن سید سہیل احمد
۵
شبرہ امۃ اللطیف
بیگم طارق رشید
ابن شیخ رشید احمد صاحب
۶
ودودہ امۃ الملک
بیگم سید حید اللہ نصرت پاشا
ابن سید حضرت اللہ پاشا
۷
مرزا محمد احمد مصطفےٰ
بیگم مبارکہ احمد
بنت ملک خلیل ظفر احمد
سید عمار احمد
ربیعہ احمد
سید طلال احمد
سید حسن احمد
صبا زینب
ملاحت پاشا
طلعت پاشا
روحا پاشا
دانیال احمد
خدیجہ احمد

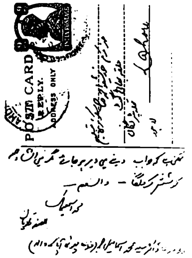

۱۰
سید امین احمد، بیگم راشدہ بارکہ بنت خان محمد احمد خان صاحب
سید نفیس احمد ۔ بیگم محترمہ سودا بے
سید مجیب احمد
ماہم احمد
ملکہ احمد
ماہا احمد
عزیٰ احمد

حضرت میر محمد اسماعیل صاحب کی تالیفات

۱۔ تاریخ مسجد فضل لندن
۲۔ کرنہ کر
۳۔ مقطعاتِ قرآنی
۴۔ اربعین اطفال
۵۔ تحفۂ احمدیت
۶۔ جامع الاذکار
۷۔ بخارِ دل
۸۔ مذہب کی ضرورت
۹۔ حفاظتِ ریش
۱۰۔ آپ بیتی
۱۱۔ دُکھ سُکھ

حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب کی تحریر کا عکس



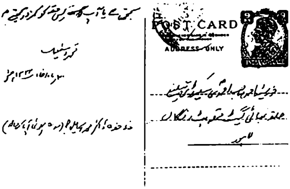


POST CARD
REPLY
ADDRESS ONLY
Lahore
والسلام

الصفہ مایل

عزیز من السلام علیکم

میری طبیعت اچھی نہیں اور میں لکھ پڑھ نہیں سکتا اس لئے
آپ کے سوالات کے جوابات میں اخبار میں کوئی مضمون
فی الحال نہیں لکھ سکتا۔ فی الحال آپ اتنا لکھنا کافی ہے کہ
امیر اقبال کے اوپر جو اعتراضات آپ کو ہیں وہ لکھ کر بتائیں
وگرنہ مجھے تو کوئی واضح نقطہ نظر نہیں آتا۔
امیر امانی کے متعلق یہ عرض ہے کہ جب تک ان کا صحیح مسلک یورپ کو معلوم
نہ ہو سکے گا، اس وقت تک ان کے پیش نظر ابھی مسلمانوں سے ہو جائے گا
تو پھر آپ کی مجلس شوریٰ کی نماز و زکوٰۃ کے متعلق ان کو جو فیصلہ
دیگی وہ ایمان فیصلہ ہوگا۔ باقی ارشاد والسلام از محمد
اس سوال نمبر ۲ کا جواب جو آپ نے میری سمجھ میں آتا ہے وہ اخبار
میں شائع کر دوں گا۔ البتہ آپ مجھے آسانی سے لکھ دیں کہ معترض
کو آپ کیا جواب دیتے ہیں اور وہ اس کے کن حصوں کو گزند



بشکریہ محترم شیخ خورشید احمد صاحب سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر الفضل حال کینیڈا